یوم آزادی

گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

اگست 2017

نگران اعلیٰ

معراج رسول



شیریں حیدر اور رفعت سراج کے سلسلے وار ناو

ناہید سلطانہ اختر، سحر ساجد و ناہید فاطمہ حسنین کی

مصنفہ عذرا آفتاب نے بخشی ہماری بزم کو رونق

پاکیزہ
کراچی

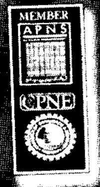
ان اعلیٰ : معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد

اشتہارات : محمد شہزاد خان



رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رابطہ : شعبہ اشتہارات

ہزاد خان 0333-2256789

جشنِ آزادی مبارک

فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

لانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے...... جلد:45 شمارہ:05 اگست 2017ء

سرورق ماڈل: مہرو بٹ

فوٹو گرافی : ایم کاشف

اداریہ

سلسلے وار ناول

منی ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات



Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئینِ عزیز السلام علیکم......!

تمام اہالیانِ وطن کو جشن آزادی کے حسین لمحات مبارک ہوں۔ ماہِ اگست ہم پاکستانیوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ویسے تو وطن کے حوالے سے پورا سال ہی اہمیت کا حامل ہونا چاہیے کہ جب ہم ہر، ہر لمحہ اپنے پیارے ملک کی محبت میں سرشار رہیں اور اس کی تعمیر و ترقی و خوشحالی میں حتی المقدور بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عملی طور پر اپنا، اپنا حصہ ڈالتے رہیں۔

ہر سچا محبِ وطن اپنے ملک، اپنے دیس کو ہر لحاظ سے کامیاب و کامران دیکھنا چاہتا ہے...... اپنے وطن کو معاشی طور پر خوشحال اور جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے مگر یہی محبِ وطن جب اپنے اردگرد نظر دوڑاتا ہے تو حالات اس کی امیدوں کے برعکس نظر آتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ ہم ہر کام یا کوتاہی کی ذمّے داری دوسرے ہم وطنوں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ یہ حُب الوطنی ہرگز نہیں ہے بلکہ اپنی ذات سے ہر اچھے کام کا آغاز کرنا ہی اصل جذبۂ حُب الوطنی ہے...... بڑے، بڑے دعوے کرنا اور دوسروں کو اپنی زبان و بیان کے سحر میں مبتلا کر دینا بہت آسان ہوتا ہے مگر میدانِ عمل میں اترنا دوسروں کے لیے آسان اور اپنے لیے تو بے حد مشکل لگتا ہے......

مگر آج اس یوم آزادی پر آئیں ہم عہد کریں کہ جس، جس شعبے سے بھی ہمارا تعلق ہے۔ اپنی بساط سے بڑھ کر وطن عزیز کے لیے کام کریں گے اور اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن، ترقی یافتہ اور تمام بنیادی سہولتوں سے لیس پاکستان بنائیں گے۔

اس یوم آزادی پر اپنی قومی کرکٹ ٹیم کو بھی پُر خلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ جنھوں نے پاکستانی عوام کو چیمپئنز ٹرافی کی جیت کی صورت میں خوب صورت تحفہ پیش کیا۔

دعا گو ہیں کہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں اسی طرح کی نمایاں کامیابیاں پاکستان کا نصیب بنتی رہیں۔ الٰہی آمین!

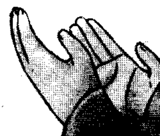
مدیرہ

نزہت اصغر

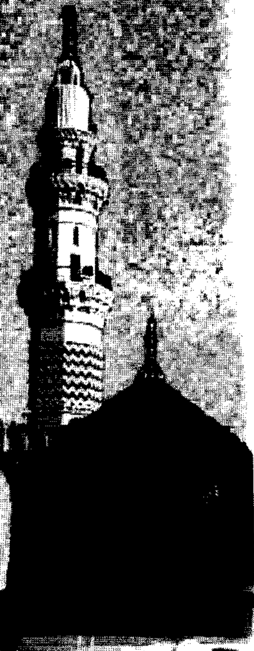
دین کی باتیں

المص (۱) یہ کتاب تم پر نازل کی گئی ہے، تاکہ تم اس کے ذریعے سے (لوگوں کو) ڈراؤ۔ یہ مومنوں کے لیے ایک نعمت ہے، پس تمہارے سینہ میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو (۲) جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو، اور اس کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو، تم میں بہت تھوڑے ہیں جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ (۳) اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کیا، پس ان پر ہمارا عذاب رات کو آیا۔ یا جب وہ (دوپہر کو) قیلولہ کر رہے تھے (۴) جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو ان کا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا، بے شک ہم ظالم تھے۔ (۵) پس ہم ان سے بھی ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے، اور ہم ضرور رسولوں کو بھی پوچھیں گے (۶) اور ہم علم کے ساتھ ان سے ضرور بیان کردیں گے، حالانکہ ہم غائب نہیں تھے (۷) اور اس دن کا تول برحق ہے۔ پس جس (کی نیکیوں) کا پلّہ بھاری ہوا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے (۸) اور جس کی (نیکیوں) کا پلّہ ہلکا ہوا وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کیا کرتے تھے (۹) اور یقیناً ہم نے تمہیں زمین میں قدرت دی ہے، اور اسی میں تمہارے لیے روزیاں قرار دی ہیں۔ تم میں بہت تھوڑے ہیں جو شکر کرتے ہیں (۱۰) اور یقیناً ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنادی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا (۱۱) (خدا نے) فرمایا۔ کس چیز نے تمہیں روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا۔ (وہ) بولا میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا، اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔ (۱۲) (خدا نے) فرمایا کہ تو اس جگہ سے اتر جا۔ تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تو یہاں تکبر کرے، پس تو نکل جا، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے (۱۳) وہ بولا مجھے اس دن تک مہلت دے جبکہ لوگ (زندہ کر کے) اٹھائے جائیں گے (۱۴) (خدا نے) فرمایا بے شک تو مہلت دیے جانے والوں میں سے ہے (۱۵) وہ بولا چونکہ تو نے مجھے ناامید کردیا میں بھی تیرے سیدھے راستے پر ان سب کے لیے (راستہ مارنے) بیٹھوں گا (۱۶) پھر میں ان کے پاس ان کے آگے سے، اور ان کے پیچھے سے، اور ان کے دائیں سے، اور ان کے بائیں سے ضرور آؤں گا۔ اور تو ان میں سے بہتوں کو شکر گزار نہ پائے گا (۱۷) (خدا نے) فرمایا تو یہاں سے ذلیل راندہ ہو کر نکل جا۔ البتہ جو بھی ان میں سے تیری پیروی کرے گا۔ میں ضرور (ان اور) تم سب سے جہنم کو بھردوں گا (۱۸) اور اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو، اور جہاں سے تم دونوں چاہو کھاؤ۔ اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں بے محل کام کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے (۱۹)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۸۔ آیات ۱ تا ۱۹)



دین کی باتیں



آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الْمَاحِیِ الْکُفْرِ وَالْبِدْعَۃِ وَالْعِصْیَانِ ط

افضل الانبیا، ختمی مرتبت، سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام "سیدنا ماحؔ" بھی ہے۔ جس کے مفہوم کفر مٹانے والے، کفر کو محو کرنے والے کے ہیں۔

1۔القرآن: ترجمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجیے کہ مجھے تو یہی حکم ملا ہے کہ اللہ کی بندگی کروں اور اس کا شریک نہ ٹھہراؤں۔ میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف مجھے پھر لوٹنا ہے۔ (آیت ۳۶، سورۂ رعد)

ترجمہ: کہہ دو کہ مجھے اس بات سے منع کیا گیا ہے جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ ان کی پرستش کروں اور میں ان کی کیونکر پرستش کروں جبکہ میرے پاس کھلی دلیلیں آچکی ہیں۔ (آیت ٦٦۔ سورۂ مومن)

2۔الحدیث: حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں یعنی اللہ تعالیٰ میرے ذریعے سے کفر کو مٹائے گا۔ (موطا امام مالک)

ترجمہ: جس بشر کو اللہ کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے یہ اس کے شایان نہیں کہ وہ پھر لوگوں سے کہنے لگے کہ اللہ کے سوا میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہا کرتا ہے کہ اللہ کی کتاب کو سیکھ کر اور شریعت کا درس پا کر تم اللہ والے بن جاؤ۔ یہ نبی تو نہیں کہتا کہ فرشتوں کو یا نبیوں کو بھی رب بنالو بھلا وہ کفر کے لیے کہہ سکتا ہے جبکہ تم لوگ اسلام لا چکے ہو۔

3۔الرائے: ا۔ایک معمولی عقل، سمجھ کا مسلمان جہاں بھی جاتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اس کے ساتھ ہوتی ہیں جو دوسروں پر ضرور اثر کرتی ہیں۔ صبح، دوپہر اور شام کو اسلام کے حکم کا نعرہ (اذان) بلند ہوتا ہے اور وہ سر جو پہلے پتھروں، حیوانوں کے آگے جھکا کرتے تھے اب خدائے واحد کے آگے جھکتے ہیں اسلام نے بنی نوع انسان کے معیارِ اخلاق کو بے حد بلند کر دیا ہے۔ (جوزف تھامسن)

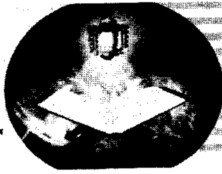
۲۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی ایسی تعلیم دی جس سے ہر قسم کے باطل عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔ (موتی لال ماتھر، ایم اے)

۳۔ اعلیٰ سے اعلیٰ توحید کا مذہب جو دنیا میں پایا جاتا ہے وہ صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین اسلام ہے۔ (ہیکل آرٹسٹ، جرمنی)

4۔الفضائل: ہر نماز کے بعد بکثرت اس اسم پاک "سیدنا ماحؔ" کو پڑھنے کا معمول بنانے سے اللہ تعالیٰ حشر کے دن حساب کتاب میں آسانی پیدا فرمائے گا اور قلبی سیاہی دور ہوگی اور دل نیکیوں کی طرف راغب ہوگا۔ (سبحان اللہ)



قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقتباس



اللہ اور اس کا نور



باب ہفتم

قرآن پاک سے عشق کی پرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

قرآن حکیم میں جانوروں کا تذکرہ

یوں تو قرآن حکیم میں جانوروں کا تذکرہ اجتماعی طور پر آیا ہے لیکن انفرادی طور پر بھی کچھ جانوروں کا ذکر ہے۔ ان کی مکمل تفصیل زیر نظر مضمون میں پیش کی جارہی ہے۔

قرآن حکیم میں پانچ سورتیں ایسی ہیں جو جانوروں کے نام پر نازل ہوئیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

بقرہ (گائے) نحل (شہد کی مکھی) نمل (چیونٹی) عنکبوت (مکڑی) فیل (ہاتھی) اکثر جانوروں کا تذکرہ کئی بار آیا ہے جس کا ذکر آخر میں ہے۔

(1) مچھر (سورۂ بقرہ (2) آیت 26) ''خدا اس بات پر عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان کرے۔''

بچھڑا (سورۂ بقرہ (2) آیات 54,51) ''اور جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ کیا تم نے ان کے پیچھے بچھڑے کو معبود مقرر کرلیا اور تم ظلم کررہے تھے۔

(2) سلویٰ (سورۂ بقرہ (2) آیت 57) ''اور بادل کا سایہ تم پر کیے رکھا اور تمہارے لیے من وسلویٰ اتارتے رہے۔'' (سلویٰ ایک پرندہ ہے، جسے بٹیر کہتے ہیں)

(3) بندر (سورۂ بقرہ (2) آیت 65) ''اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کرگئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہوجاؤ۔''

(4) گائے۔ (سورۂ بقرہ (2) آیات 73,67) مفسرین نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا مالدار شخص تھا مگر بے اولاد تھا۔ اس کا وارث اس کا ایک بھتیجا تھا اس نے مال کی طمع کے سبب اسے قتل کرڈالا مگر اس طرح کہ کسی کو پتا نہ چل سکا کہ قاتل کون ہے۔ لوگ اس

بارے میں جھگڑنے لگے تو کسی نے کہا کہ خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام موجود ہیں، ان سے رجوع کرو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیفیت بیان کی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے باعث گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس پر وہ لوگ گائے کی نشانیاں پوچھنے لگے جیسا کہ قرآن حکیم کے ترجمے میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے پوچھ کر تمام نشانیاں بتائیں۔ غرض یہ کہ گائے ذبح کی گئی۔ حکم ہوا کہ اس کا ایک ٹکڑا مقتول کے اوپر مارو یہ زندہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ٹکڑا مارا گیا تو مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے قاتل کا نام بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ جس طرح تمہاری آنکھ کے سامنے اس شخص کو زندہ کر دیا، اسی طرح آخرت میں بھی سب کو زندہ کروں گا۔

(5) سؤر۔ (سورۂ بقرہ (2) آیت 173) ”اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، حرام کر دیا ہے۔“

(6) گدھا۔ (سورۂ بقرہ، 259 آیت) ایک شخص کی روح خدا نے قبض کر لی اور اسے سو سال تک مردہ رکھا، پھر اس کو جلایا۔ اس نے سمجھا کہ یہی ایک دن یا اس سے بھی کم سویا ہوں۔ پھر چیزوں کو دیکھا جو سڑ چکی تھیں اور گدھا بھی مرا پڑا تھا۔ اسے اللہ نے زندہ کر دیا۔ (یہ قصہ حضرت عزیر علیہ السلام پیغمبر کا ہے)

(7) گھوڑے۔ (سورۂ آل عمران (3) آیت 14)

(8) کوا۔ (سورۂ مائدہ (5) آیت 31) ”جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تا کہ اسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیونکر چھپائے۔“

(9) بھیڑ، (10) بکری، (11) اونٹ، (12) گائے (سورۂ انعام (6) آیت 143، 144)

ترجمہ۔ ”(یہ بڑے چھوٹے چارپائے) آٹھ قسم کے ہیں، دو، دو بھیڑوں میں سے اور دو، دو بکریوں میں سے (ایک نر اور ایک مادہ) اور دو، دو اونٹوں میں سے اور دو، دو گایوں میں سے ایک نر، ایک مادہ۔“

(13) اونٹنی۔ (سورۂ اعراف (7) آیت 73)

ترجمہ۔ ”صالح (علیہ السلام) نے کہا کہ اے قوم! خدا ہی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے معجزہ آ چکا ہے۔ (یعنی) یہی خدا کی اونٹنی تمہارے لیے معجزہ ہے تو اسے آزاد چھوڑ دو کہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے اور تم اسے بری نیت سے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ عذاب الیم تمہیں پکڑے گا۔“

(14) اژدھا، (سورۂ اعراف (7) آیت 107)

ترجمہ: ”موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی تو وہ اس وقت صریح اژدھا ہو گیا۔“

(15) سانپ: (اعراف آیت 116)

ترجمہ: ”فرعون کے جادوگروں نے جادو کی چیزیں ڈالیں تو وہ رسیوں کے سانپ بن گئے (موسیٰ (علیہ السلام) نے جب اپنی لاٹھی ڈالی تو ان کے سانپ نے ان جادوگروں کے سانپوں کو نگل لیا۔)

(16) ٹڈیاں، (17) جوئیں، (18) مینڈک (سورۂ اعراف (7) آیت 133) ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ نے فرعون پر عذاب بھیجا ہے۔“

(19) بیل: سورۂ اعراف (7) آیت 148)

ترجمہ: ”اور قوم موسیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد اپنے زیور کا ایک بچھڑا بنا لیا (وہ) ایک جسم (تھا) جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔“

(20) مچھلیاں: (سورۂ اعراف (7) آیت 163)

(21) کتے: (سورۂ اعراف (7) آیت 176)

ترجمہ: تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی اگر سختی کرو تو زبان نکالے رہے اور اگر یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے رہے، یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

(22) گھوڑے: (سورۂ انفال (8) آیت 60) (جنگ میں گھوڑے تیار رکھنے کا حکم)

(23) بھیڑیا: (سورۂ یوسف (12) آیات 14,13 تا 17) حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں

نے انہیں کنویں میں ڈال دیا تھا اور اپنے والد سے کہا کہ اسے بھیڑیے نے کھالیا۔ (اس قصے کی پوری تفصیل سورۂ یوسف سے پڑھی جاسکتی ہے)

(24) خچر: (سورۂ نحل (16) آیت 8) ترجمہ: ''اور اس نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو۔

(25) شہد کی مکھی: (سورۂ نحل 16) آیت 69,68) ترجمہ: ''اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور اونچی، اونچی چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔''

(26) بکریاں: (سورۂ انبیاء (21) 78) ترجمہ: ''اور داؤد و سلیمان (علیہم السلام) کا حال بھی سن لو کہ جب وہ ایک کھیتی کا مقدمہ فیصل کرنے لگے، کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے۔

(27) مکھی: (الحج (22) آیت 73) ترجمہ: ''لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو کہ جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔''

(28) چیونٹی: (سورۂ نمل (27) آیت 18) ترجمہ: ''یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا کہ چیونٹیو! اپنے، اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔''

(29) ہدہد: (سورۂ نمل (27) آیت 20) ترجمہ: ''اور جب انہوں نے جانوروں کا جائزہ لیا تو کہنے لگے کہ کیا سبب ہے ہدہد نظر نہیں آتا۔ کیا کہیں غائب ہو گیا ہے؟''

(30) مکڑی: (سورۂ عنکبوت (29) آیت 41) ترجمہ: ''جن لوگوں نے خدا کے سوا (اوروں کو) کارساز بنا رکھا ہے، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک طرح کا گھر بناتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تمام گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے۔ کاش یہ اس بات کو جانتے۔''

(31) گھن کا کیڑا (سورۂ سبا (34) آیت 14 (حضرت سلیمانؑ کا قصہ) ترجمہ: ''پھر جب ہم نے ان کے لیے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہیں ہوا۔ مگر گھن کے کیڑے سے جو ان کے عصا کو کھاتا رہا۔''

(32) دنبیاں (ص (38) آیات 24,23,22) حضرت داؤد (علیہ السلام) کے پاس دو شخص اپنا مقدمہ لے کر آئے۔ ایک کے پاس 99 دنبیاں تھیں، دوسرے کے پاس ایک دنبی، وہ کہتا ہے کہ یہ دنبی بھی میرے حوالے کر دو۔ حضرت داؤدؑ نے فیصلہ کر دیا تھا پتا چلا یہ داؤد کی آزمائش تھی (خلاصہ)

(33) شیر: (سورۂ مدثر، (74) آیت 51) یعنی شیر سے ڈر کر بھاگتے ہیں۔

(34) ہاتھی: (سورۂ فیل (105) آیت 1)

(35) ابابیل: (سورۂ فیل آیت 3)

قرآن حکیم میں حساب کا علم

یوں تو قرآن حکیم میں تمام سائنسی علوم پڑھنے کی بار، بار تاکید کی گئی ہے، جس میں نباتات، حیوانیات، حیاتیات، فزکس، کیمسٹری، میڈیکل سائنس، ستاروں کا علم غرض یہ کہ کوئی علم ایسا نہیں جس کے پڑھنے پر زور نہیں دیا گیا ہو۔ ہر جگہ یہ بات دہرائی گئی ہے کہ تم سوچتے کیوں نہیں؟ غور کیوں نہیں کرتے؟ یہ زمین آسمان کس نے بنائے، پیڑ، پودوں کی افزائش، جانور، انسان کی پیدائش، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ سمندر اور اس میں چلتی ہوئی کشتیاں، اڑتے ہوئے پرندے، چاند سورج اور ان کی مخصوص گردش جو ایک ہی دائرے میں تیر رہے ہیں۔ رات اور دن کے بدلنے میں، بارش، طوفان، زلزلے، یہ بغیر ستونوں کے آسمان کس طرح قائم ہیں۔ یہ سب کچھ کون کر رہا ہے اور یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہو رہے ہیں۔ مگر کیسے؟ غور کرو، وجہ معلوم کرو۔ یعنی ریسرچ (تحقیق) کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ سائنس ان ہی سوالات کے جوابات تلاش کرتی ہے۔ ان تمام سائنسی علوم کے علاوہ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن حکیم ہمیں mathematics یعنی حساب کا مکمل علم دے رہا ہے۔ حساب کو father of

science کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے اگر حساب نہ آتا ہوتو کوئی بھی سائنسی مضمون اچھی طرح سے نہیں پڑھا جاسکتا اور نہ ہی پیش رفت ہو سکتی ہے۔ جیسے چاند پر پہنچ جانا، جس میں رفتار، وقت اور کششِ ثقل کا علم ضروری ہے۔ ہر عمل کا ایک میتھ میٹیکل (حسابی) فارمولا ہوتا ہے جو کہ بالکل درست ہوتا ہے۔ اس فارمولے کو اپلائی کر کے (سائنس داں) آگے بڑھتا ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جب تک کوئی انسان سائنس کی بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ میں نے اس مضمون میں بہت اختصار کے ساتھ یہ بات بیان کی ہے کیونکہ اس وقت آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن حکیم نے مکمل گنتی، جمع، تفریق، ضرب، تقسیم سکھائی ہے۔ یہ بنیادی بات ہے، اگر آپ یہ سیکھ لیں گے تو حساب کی اگلی منزلیں اور فارمولے خود بخود طے ہوجائیں گے۔ اس مضمون کو تیار کرنے کے لیے میں نے پوری توجہ کے ساتھ تحقیق کا عمل مکمل کیا۔ پورے قرآن پاک کے ترجمے کو حرف بہ حرف پڑھا پھر آپ کی معلومات کے لیے علم کا خزانہ جمع کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کے لیے یہ مضمون ایک خوشگوار حیرت ثابت ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس معجزے کی تائید غیر مسلموں کے لیے ناگزیر ہوجائے گی۔ میں آپ کو ایک سے لے کر ایک لاکھ سے زائد تک کی گنتی کی لسٹ دوں گی۔ اس کے علاوہ جمع تفریق، ضرب تقسیم بھی بتاؤں گی تمام حوالوں کے ساتھ۔

ایک بات اور...... ایک ہی گنتی چونکہ قرآن حکیم میں بہت بار استعمال ہوتی ہے اس وجہ سے لسٹ میں ایک گنتی کو حوالے کے ساتھ صرف ایک بار لکھوں گی۔ مثلاً 7 کا عدد، 7 آسمان، وظیفہ کی 7 آیات، دوزخ کے 7 دروازے، حضرت یوسفؑ جب قید میں تھے تو بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھی گئی جس میں 7 موٹی گائیں ہیں جن کو 7 دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔ 7 خوشے ہرے، 7 خشک وغیرہ، وغیرہ...... یہ میں نے صرف 7 کے بارے میں مثال دے دی ہے۔ اب لسٹ میں صرف ایک مثال اور حوالہ دیا جائے گا۔

(1) اے نبی کہہ دو وہ اللہ اک ہے۔ (سورۂ اخلاص (112) آیت 1)

(2) وصیت کے وقت دو مرد گواہ۔ (سورۂ مائدہ (5) آیت 104)

(3) عدت تین ماہ۔ (سورۂ طلاق (65) آیت 4)

(4) جو لوگ پاک دامن عورتوں پر بدکاری کا الزام لگائیں اور ان پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو...... (سورۂ نور (24) آیت 3)

(5) بعض کہیں گے وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا۔ بعض کہیں گے وہ پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا۔ بعض کہیں گے وہ سات تھے۔ آٹھواں ان کا کتا۔ (سورۂ کہف (18) آیت 22)

(6) آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ (سورۂ اعراف (7) آیت 54)

(7) جہنم کے سات دروازے ہیں۔ (سورۂ حجر (15) آیت 44)

(8) پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے (سورۂ حاقہ (69) آیت 17)

(9) موسیٰ کو کھلے ہوئے 9 معجزے دیے۔ (سورۂ بنی اسرائیل (17) آیت 101)

(10) آپس میں کہیں گے ہم دنیا میں صرف دس دن رہے۔ (سورۂ طٰہٰ (20) آیت 103)

(11) یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور چاند کو دیکھا ہے وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ (سورۂ یوسف (12) آیت 4)

(12) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں۔ (سورۂ توبہ (9) آیت 36)

(19) جہنم پر انیس داروغہ متعین ہیں۔ (سورۂ مدثر (74) آیت 30)

(20) اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو کافروں پر غالب رہیں گے۔ (سورۂ انفال (8) آیت 65)

(جاری ہے)

..... پہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا . . .
عبادات، معاملات . . .
جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 13

جب تک تاجور کا فون نہیں آیا سفینہ کی سماعتیں منتظر رہیں...... کچھ من چاہا ہونے کی توقع نہ ہونے کے باوجود......سنور نے کے موسموں کی طرح خواہشات کے اجڑنے کے موسم بھی بہت اہتمام سے آتے ہیں۔

اس نے تاجور کا ایک، ایک لفظ دل تھام کر سنا۔

وہ خوش بھی تھیں اور خاصی الجھی ہوئی بھی......

''تمہاری غیر موجودگی میں ان کی آمد کا ایک ہی مقصد سمجھ آتا ہے کہ شاید تم ان کو بہت پسند آئی ہو...... کیونکہ میں تو نہ کبھی ان سے ملی نہ غائبانہ تعارف ہوا۔'' تاجور سوچ، سوچ کر بات کر رہی تھیں۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں اماں......'' سفینہ نے بلاتکلف تردید کی۔ ''ہو سکتا ہے مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے سوچا ہو کہ اس لڑکی کی ماں سے بھی ملنا چاہیے۔ وہ آپ سے فرینڈشپ چلانا چاہتی ہوں۔''



''لڑکی کی ماں سے ملنے کی تکلیف بھی تب ہی اٹھائی جاتی ہے جب لڑکی میں کچھ خاص نظر آیا ہو۔'' اب تاجور نے خوشگوار اور دوستانہ انداز میں کہا تھا۔

''اندازے لگانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا...... جب ملیں گی تو خود بخود پتا چل جائے گا۔ زارا تو بہت خوش ہوگی اماں...... اس کے فیورٹ آرٹسٹ نے کل اس کے گھر میں اس کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔'' سفینہ نے اپنی مغموم کیفیت کو بہلاتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی...... ذہن کے پردے پر زارا سرمستی کی کیفیت میں شاداں و رقصاں نظر آ رہی تھی۔

اس نے ماں کو انجانے میں اپنے جذبات سے کھیلنے کی مزید اجازت نہیں دی اور جلد ہی اپنی طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اماں مجھے کپڑے پریس کرنا ہیں...... پھر رش ہو جائے گا۔ بعد میں آپ کو کال کرتی ہوں۔'' ان کلمات کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا تاجور کے خدا حافظ سننے کا بھی انتظار نہیں کیا۔

☆☆☆

کیمل کلر کوٹ پینٹ، سرخ ٹائی، ٹائی پن، کف لنکس، خوشبو بات...... سیتا ٹکر ٹکر ساحل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''شکر ہے...... میں نے skype پر آپا سے پھونکیں لگوا لیں...... ورنہ تم تو نظرِ بد سے مجھے یہیں گرا دیتیں۔''

''میں تو آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں...... آپ مسٹر امیر الدین ہی ہیں ناں......؟'' سیتا نے اب آنکھیں پٹپٹائیں۔

''یس...... آف کورس...... بھوت بھی اتنے ہینڈسم اور ڈیشنگ نہیں ہو سکتے۔'' ساحل نے گردن اکڑا کر بڑے تفاخر سے جواب دیا۔

''آپ کو اچانک سے کیا ہوا ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔''

''کل تمہیں بتایا تھا ناں کہ میری ترقی ہو گئی ہے...... بلکہ boost کیا ہے...... بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ممبر ہوں...... بہت احترام سے بات کرنا مجھ سے......'' ساحل نے اپنی ٹیبل کی دراز سے ضروری چیزیں نکالتے ہوئے خاصے مغرورانہ انداز میں ڈپٹ کر کہا۔

''ہے بھگوان...... اتنی جاہل بھی نہیں ہوں...... بورڈ آف ڈائریکٹر وہ ہوتا ہے جو کمپنی میں شیئر ہولڈر ہوتا ہے...... اس کے بھی کروڑوں کمپنی میں لگے ہوتے ہیں۔'' سیتا کوئی خبر شیخی مارنے سے زیادہ نہ لگی...... تو منہ بنا کر بولی۔

''ڈپٹی ڈائریکٹر ہوں...... میم کی جگہ سیکنڈ آفس چلاؤں گا۔ میم ایک ہی وقت میں دو آفس نہیں چلا سکتیں۔ اس آفس میں میم کے اختیارات میرے پاس ہوں گے۔ اب پاور میں ہوں بھئی۔ تم بھی ذرا دل لگا کر کام کرنا...... تمہیں بھی ڈس مس یا سسپینڈ کر سکتا ہوں۔'' ساحل نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہے بھگوان...... ذرا سی دیر میں سب بھول گئے...... آپ نئے، نئے آئے تھے تو میں نے کس طرح سے آپ کو help out کیا تھا۔'' نرم دل سیتا کی آنکھوں میں احسان فراموشی کے مظاہرے پر آنسو چمکنے لگے۔

''میں نے کچھ نہیں کیا مس سیتا...... لوگ اسی طرح اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔'' ساحل جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہا تھا۔

''مسز شیکھر، ناٹ مس......'' سیتا نے برا مان کر ٹوکا تھا۔

''ایک دن میں تمہارے سارے احسانات کا بدلہ اتار دوں گا مسز شیکھر...... رام گم ہو گیا تھا تو تھوڑا صبر سے



انتظار کرلیتیں۔ یہ شیکھر تو راون سے بھی گیا گزرا ہے...... سولہ ہزار کی نوکری پر بٹھا کر اپنی اولاد پروان چڑھا رہا ہے۔ خیر تم تو ہو ہی سیتا...... مگر...... ڈونٹ وری...... اب تمہاری پروموشن کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کروں گا۔'' ساحل نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا اور بیگ اٹھا کر چلتا بنا...... سیتا شادیِ مرگ کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا واقعی مسٹر امیر الدین اتنی پاور میں آگئے ہیں؟''

☆☆☆

''آج شام میں وہ ساڑی پہنوں گی جو تمہاری نانی نے تمہاری پیدائش پر مجھے گفٹ کی تھی۔'' پرنس اسٹوڈیو جانے کے ارادے سے لاؤنج میں داخل ہوا ہی تھا کہ لیڈی صوفیہ نے اسے آلیا۔ وہ چونک کر پلٹا پھر مسکرا دیا۔

''اتنی پرانی ساڑی...... آپ کے پاس تو بہترین ساڑیوں کا کلیکشن ہے۔''

''وہ بہت شاندار ساڑی ہے...... بڑی کلاسک...... وہائٹ شیفون پر پنک ریشم اور پوت کا کام...... اس کے ساتھ پنک ڈائمنڈ کی جیولری...... یہ ساڑی میں نے اسی دن کے لیے سنبھال کر رکھی تھی۔ یوں سمجھو منت سی مانی ہوئی تھی کہ جس دن میں اپنے پوتے کے لیے پروپوزل لے کر جاؤں گی اس روز پہنوں گی۔'' لیڈی صوفیہ ایک سرخوشی کی کیفیت میں بولتی ہوئی ویلویٹ صوفے میں دھنس گئیں۔

''پروپوزل......! لیکن آج تو ایسا کچھ نہیں ہونے جارہا...... آج تو دو فیملیز کا انٹروڈکشن ہے اور بس......''

پرنس نے قدرے گھبرا کر لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھا۔

''ہماری طرف سے تو سب کچھ اوکے ہے۔ اب ماحول پر منحصر ہے...... پروپوزل دیا بھی جاسکتا ہے......''

لیڈی صوفیہ خاصی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

''مگر یہ مناسب نہیں ہوگا...... کیونکہ آج کے ڈنر میں سفینہ تو شریک نہیں ہوگی، وہ تو لاہور جا چکی ہے۔ گرینڈ مام......'' پرنس بجائے خوش ہونے کے پریشان دکھائی دینے لگا۔

''جب میں happy moments انجوائے کرنے جا رہی ہوں تو ایسے میں مت ٹوکا کرو پرنس...... خوشی کو پانی کی طرح ڈھال کی طرف بہنے دو......'' لیڈی صوفیہ کا موڈ خراب ہونے لگا۔

''ایک تو مجھے خوشی راس نہیں آتی، پہلے ہی ڈرتی ہوں جب ہمت کرتی ہوں خود کو سمجھاتی ہوں کہ یہ کوئی فارمولہ نہیں ہے۔ خوشی راس نہیں آئی یہ الگ بات...... خوشی ملتی تو رہی ہے ناں۔'' وہ بات کرتے، کرتے رکی تھیں۔ شاید اپنی کسی یاد کے زیرِ اثر تھیں۔

''اُف وہ کہر میں ڈوبی رات...... لندن دھند میں لپٹا ہوا تھا، بڑی سردی تھی۔ دھند میں روشنیاں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مگر اس روز مجھے بالکل بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے بہت شاندار سی گرین ویلویٹ کا لانگ ڈریس پہنا ہوا تھا۔ جس پر پرل لگے ہوئے تھے۔ وہ ڈریس میری ساس نے ڈیزائن کیا تھا کیونکہ میں بہت کم عمر تھی۔ میرے سلیکشن پر کسی کو بھروسا نہیں تھا۔ میری ماں نے بھی کہا کہ تم سب کچھ اپنے سسرال والوں پر چھوڑ دو...... وہ اپنی عزت کی خاطر بہترین سلیکشن کریں گے۔ اس وقت بھی وہ ڈریس کم و بیش پانچ ہزار پاؤنڈز کا ہوگا...... مائنڈ اٹ اس وقت کے پانچ ہزار پاؤنڈز...... اس میں اتنے پرل لگے ہوئے تھے کہ میں بوجھ سے دبی جاتی تھی۔ میری انگیج منٹ رنگ میں بہت خوب صورت ڈائمنڈ اور بڑا سا روبی لگا ہوا تھا۔''

''جی...... وہ میں دیکھ چکا ہوں...... وہ رنگ آپ کئی بار دکھا چکی ہیں۔'' پرنس نے ماضی کے سنہری اوراق پلٹتی دادی کو بڑی برجستگی وسادگی سے یاد دلایا۔

''اوہ یس...... وہ رنگ بھی اب سفینہ کی امانت ہے۔'' لیڈی صوفیہ کو قدرے سکون بھی محسوس ہوا کہ پرنس وہ دیکھ چکا ہے۔

''میں انگیج منٹ رنگ پہن کر اسکول جاتی تھی...... اس وقت میں جونیئر کیمبرج کی اسٹوڈنٹ تھی۔ میری ٹیچرز، کلاس فیلوز میری رنگ دیکھ کر کہتی تھیں...... میں بہت لکی ہوں۔ شاید انہی میں سے کسی کی نظر لگی تھی مجھے......'' بولتے، بولتے لیڈی صوفیہ اب کسی اور سمت نکل گئیں...... ربط ٹوٹ گیا...... ایک دم سوچ میں پڑ گئیں۔

''پتا نہیں میں تمہیں کیا بتا رہی تھی۔'' وہ یادداشت پر زور ڈالنے لگیں۔

''جی، آپ اپنی انگیج منٹ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔''

''اوہ...... ہاں بہت شاندار ڈنر تھا...... میں بہت گھبرا رہی تھی۔ تمہیں معلوم ہے میں بہت کم عمر تھی۔ مگر میری ساس نے میری خوب صورتی کی وجہ سے میرا سلیکشن کیا تھا...... وہ کہتی تھیں اس لڑکی میں ایسٹ اور ویسٹ کا کمال combination نظر آتا ہے۔ وہ کتنی دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہت پیار سے سمجھاتا رہا کہ تمہیں بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں...... میں ہر وقت تمہیں گائڈ کرنے کے لیے آس پاس ہی ملوں گا...... اور اس روز اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے سلیکشن پر بہت خوش ہے۔'' وہ بولیں۔

''اور ہاں پرنس...... اس نے یہ بھی کہا تھا میری ہر بات کا یقین کر لینا...... میں پرامس نہیں کروں گا...... پرامس نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ آنے والی کل کا تو کسی کو بھی نہیں پتا ہے...... لگتا ہے اس کے پاس میٹا فزکس

کی knowledge تھی...... اسے کچھ پتا تھا مگر ایک لڑکی کو تو وعدے سے عشق ہوتا ہے...... وعدے اسے میٹھی نیند سلاتے ہیں مگر وہ بہت clever (ہوشیار، چالاک) تھا۔ وعدہ ہی نہیں کرتا تھا۔'' لیڈی صوفیہ کی نگاہ میں خفگی کا تاثر نمایاں ہونے لگا۔

''پھر مجھے پتا چل ہی گیا...... کہ آخر وہ وعدہ کیوں نہیں کرتا تھا...... وہ سچائی کی پرستش کرتا تھا...... وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے جھوٹا کہے۔'' بولتے، بولتے لیڈی صوفیہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ وہ ضبط کرنے کی کوشش میں خاموش ہوگئیں۔

پرنس، بوڑھی دادی کو بڑی ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''وعدہ نہیں کرنا چاہیے...... جب چلے جانا طے ہے تو وعدے کس کام کے؟'' انہوں نے ایک سسکاری لے کر بدقت تمام جملہ مکمل کیا...... ''اس نے کبھی یہ نہیں کہا میں تمہارے لیے یہ کروں گا یا وہ کروں گا...... وہ تو یہی کہتا تھا صوفیہ خوشی کا جو لمحہ ہاتھ آئے اسے پکڑ لو...... ہاتھ سے جانے نہ دو...... ہم موجودہ لمحے میں زندہ ہیں، یہ لمحہ ہمارا ہے، ماضی کے کسی لمحے نے اپنا ادھار چکایا ہے تو یہ ہمیں ملا ہے۔ ہم نے چھینا نہیں، خود بخود مل گیا ہے...... آؤ اس لمحے کو یادگار بنائیں... آہ......'' لیڈی صوفیہ نے رک کر ٹھنڈی آہ بھری۔

''چلا گیا...... یادیں چھوڑ کر...... ہاں وہ چلا گیا......''

''کیا ہم سفینہ کے گھر خالی ہاتھ جائیں گے گرینڈ مام......؟'' پرنس کو ذرا راہ ملی تو اس نے لیڈی صوفیہ کا ذہن دوسری سمت پلٹانے کی کوشش کی۔

''ناٹ ایٹ آل...... ہم آج تک کسی کے گھر بغیر تحائف کے نہیں گئے...... تحائف دیے بغیر ہم اپنی دولت انجوائے نہیں کرسکتے...... اس دولت میں تو ان سب کا حصہ ہے جن سے ہم پیار کریں یا جو ہم سے پیار کریں...... سفینہ تو ہمارا سوئٹ ڈریم ہے...... ہم اس کے لیے اور اس کی ماں کے لیے بہت خوب صورت تحائف لے کر جائیں گے...... تم اس فیملی کو اپنی کوئی پینٹنگ ضرور گفٹ کرنا......'' وہ واقعی بہل گئیں...... اب ساری توجہ شام کی تیاری پر مرکوز ہوگئی تھی۔

''شیور......! آپ کو یاد ہے میں نے پانچ چھ سال پہلے ایک پینٹنگ بنائی تھی...... نیلے سمندر پر دو بند آنکھوں کا اسکیچ اور بند آنکھوں پر چمکتے ہوئے ستارے...... اس پینٹنگ کو فرسٹ پرائز ملا تھا...... بڑی، بڑی آفرز آئی تھیں مگر میں نے اسے سیل نہیں کیا...... آج بھی وہ اسی طرح محفوظ ہے۔'' پرنس نے دادی کا ہاتھ تھام کر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کیا۔

''بھول گئی تھی مگر اب یاد آگیا...... مگر تم ابھی وہ پینٹنگ گفٹ نہیں کرو گے...... یہ تو تم شادی پر سفینہ کو گفٹ کرو گے...... وہ اسے اپنے بیڈ روم میں سجائے گی۔ اس کی جگہ اس کی ماں کا گھر ہرگز نہیں ہوسکتی۔'' لیڈی صوفیہ نے قطعیت کے ساتھ پرنس سے اختلاف کیا اور آگے کی راہ بھی سجھا دی۔

''ٹھیک ہے پھر آج کے لیے میری طرف سے تازہ پھولوں کا بُکے ہی ٹھیک رہے گا۔'' پرنس نے دادی کی تجویز آسانی سے مان لی۔ لیڈی صوفیہ نے ہاتھ بڑھائے تو پرنس نے سر جھکا دیا۔ لیڈی صوفیہ نے اس کا چہرہ تھام کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

"God bless you" وہ اپنی چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ تراشیدہ ہونٹ مسکراہٹ کی روشنی سے چمک اٹھے تھے۔



زارا دیر سے وارڈ روب کھولے کھڑی تھی۔ اب تک وہ چار ڈریس نکالنے کے بعد واپس لٹکا چکی تھی۔
''کیسے نرالے گیسٹ آ رہے ہیں...... کوئی ڈریس سمجھ ہی نہیں آ رہا...... جیسے کوئی کوئین آ رہی ہو......'' اس نے جھنجلا کر پھر لٹکے ہوئے ملبوسات پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ رائل بلیو لانگ ڈریس جو اعلیٰ قسم کے ریشم سے بنا ہوا تھا اور تاجور نے اس کی اٹھارویں برتھ ڈے پر خصوصیت سے تیار کرایا تھا اسی پر بار، بار نظر جا کر ٹک جاتی تھی۔ سفینہ ہوتی تو وہ اس سے مشورہ لیتی......
مگر...... سفینہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے تو وہ اہتمام سے تیار ہونا چاہتی تھی...... سفینہ کے سامنے تو اس کا چراغ ویسے ہی نہ جلتا...... اسے تو آج مقابلہ جیتنا تھا...... پرنس کی دادی کو متاثر کرنا تھا۔
آج تو اس کے دیرینہ خوابوں کو تعبیر ملنے جا رہی تھی...... پرنس جو انجانے میں اس کے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہو بیٹھا تھا...... آج اس کے گھر آ رہا تھا۔ وہ آج کی رات یادگار بنانے کے لیے تل گئی تھی۔ یہ موقع شاید دوبارہ نہیں ملنا تھا۔
بہر حال اس نے رائل بلیو لانگ ڈریس ہی منتخب کر لیا۔ اب میچنگ جیولری کا مرحلہ تھا۔ ہائی ہیل موجود تھی مگر جیولری جو اس نے خود ہی چنی تھی آج کے موقع پر بالکل بیکار محسوس ہو رہی تھی۔
شاید سفینہ کے جیولری باکس میں اسے کچھ اپنے مطلب کا مل جائے...... اس نے سوچا اور وارڈ روب کے پٹ بند کر کے سفینہ کے بیڈ روم میں جانے کا ارادہ کیا۔

☆☆☆

پرنس نے سفینہ کے خاکے میں رنگ بھرنا شروع کر دیے تھے۔ زرد دوپٹے کا آنچل، دیکھتی ہوئی جھکی نظریں، لانبی پلکیں...... جھالر کی طرح گھنی...... اس نے تھوڑی دیر برش چلا کر برش رکھ دیا۔ اور غور سے تصویر کی طرف دیکھنے لگا...... ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
''کیا رعبِ حسن ہے...... پرنس بھی آنکھ بھر کر تمہیں نہیں دیکھ سکتا...... جتنا ترس رہا ہوں، تمنا کی تڑپ بڑھتی جاتی ہے۔ گرینڈ مام کی خاطر تمہارے گھر جا رہا ہوں ورنہ تمہاری غیر موجودگی میں وہاں کیا رکھا ہے۔ مگر یہ پیش قدمی بہت خوب صورت ہے۔ ایک بار گھر پہنچ جائیں پھر سمجھو گھر دیکھ لیا۔'' وہ تصویر سے باتیں کرنے میں محو تھا۔ انٹر کام کی آواز نے چونکا دیا۔
ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا...... دوسری طرف اس کا پرسنل سیکریٹری تھا۔
''سر کیا مجھے آپ کے ساتھ ڈنر پر جانا ہوگا......؟ ابھی تک آپ نے کوئی انسٹرکشن نہیں دی۔''
''نہیں، یہ ایک چھوٹا سا ڈنر ہے۔ کوئی پارٹی یا فنکشن نہیں...... اور شاید وہاں مجھے سگار بھی نہیں پینا چاہیے...... بس ڈنر سوٹ تیار کرنا ہے اور ہاں ٹائی کی میچنگ کا رومال لگانا نہیں بھولنا'' اس نے مختصر ہدایت کی اور انٹر کام بند کر دیا...... پھر ایزل کا رخ دیوار کی طرف موڑ دیا۔ تاکہ کوئی اسٹوڈیو میں داخل ہو تو سفینہ کی تصویر پر نظر نہ پڑے۔
''میں اپنے گھر اور اسٹوڈیو میں بہت خوش تھا۔ مگر تم سے مل کر لگا زندگی میں تو بہت بڑی کمی تھی۔ تھینک گاڈ...... تم سے ملنے سے پہلے کسی کمی کا احساس نہیں تھا...... ورنہ زندگی کتنی تکلیف دہ ہو جاتی۔'' اس نے وسیع و عریض عالیشان و خوب صورت اسٹوڈیو پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی اور لائٹس آف کر کے باہر آ گیا۔

☆☆☆

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' تاجور نے حیران ہو کر زارا کو ٹوکا جو دو نوکروں کے ساتھ ڈائننگ میں پینٹنگ

لگوا رہی تھی۔

یہ وہ پینٹنگ تھی جو اس کے بیڈروم میں سرہانے لگی ہوئی تھی

"اماں..... اچھی لگ رہی ہے..... اب دیکھیں ناں پرنس اپنی پینٹنگ کو اس گھر میں لگا دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے۔" زارا نے اس انداز میں جواب دیا کہ وہ اس سلسلے میں کسی اعتراض کو خاطر میں نہیں لائے گی۔

"تو ڈرائنگ روم میں لگوا دیتیں..... یہاں بہت عجیب لگ رہی ہے۔" تاجور نے تذبذب کی کیفیت میں جواب دیا۔

"چھوڑیں اماں..... بس یہیں ٹھیک ہے۔" زارا نے ضدی انداز میں کہہ کر اپنا رخ موڑ کر نوکروں کی طرف کرلیا..... گویا اب وہ اس موضوع پر تاجور سے کوئی بات نہیں کرے گی۔

"عجیب اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہو..... اس طرح کا آرٹ کون ڈائننگ میں سجاتا ہے۔" تاجور کا انداز ایسا تھا کہ گویا انہوں نے یہ عمل بادلِ ناخواستہ قبول کرلیا ہے..... شاید ان کے لاشعور میں بھی پرنس کی خوشنودی کی آرزو چھپی ہوئی تھی..... وہ اتنے اہم مہمانوں کا استقبال سفینہ کے حوالے سے کررہی تھیں..... کیونکہ سفینہ کی ملاقات اس آمد کا سبب بن رہی تھی۔

انہوں نے ایک کوفت بھری نگاہ زارا پر ڈالی اور اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئیں۔

زارا اب دیوار پر لگی پینٹنگ کی طرف ناقدانہ انداز میں دیکھ رہی تھی کہ ٹھیک لگی ہے یا اونچی نیچی محسوس ہورہی ہے۔

☆☆☆

"آپ مانیں نہ مانیں حماد..... مگر میرا دل کہہ رہا ہے کہ لیڈی صوفیہ، سفینہ کے سلسلے میں وہاں جارہی

ہیں۔اب دیکھیے ناں ہم سے کتنے پرانے تعلقات ہیں......آج تک ہمارے گھر نہیں آئیں......جب بھی انوائٹ کیا پرنس شہیر اکیلے آئے۔'' حماد حسین کی بیگم افزیہ شام کی تیاری میں مصروف تھیں۔طبعیت بحال کرنے کے لیے سیلون ہو کر آئی تھیں۔چہرہ دمک رہا تھا۔بالوں میں رولرز لگے ہوئے تھے۔

''اگر میں آپ کی بات مان لوں تو کوئی مضائقہ بھی نہیں......میرے خیال میں اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا......آخر ایک نہ ایک دن لڑکی کی شادی تو کرنا ہوتی ہے۔اور سفینہ...... یہ بچی تو شروع دن سے مجھے پسند ہے......بہت رکھ رکھاؤ اور بات کرنے کا سلیقہ ہے اس میں......کم عمری کے باوجود اس کی سنجیدگی اسے باوقار بناتی ہے۔اپنی عزت کرانا جانتی ہے۔'' حماد حسین نے سفینہ کی دل کھول کر تعریف کی۔

''جب ماہین کی دوستی سفینہ سے ہوئی تو میں بہت مطمئن ہوگئی تھی کہ ماہین نے کوئی ڈھنگ کی دوست تو بنائی......آپ نے بھی نوٹ کیا ہوگا......ماہین پر سفینہ کی کمپنی کا بہت اثر آیا ہے۔اب پہلے کی طرح بے دھڑک بات نہیں کرتی......دوسرے کی بات بھی بہت توجہ سے سنتی ہے۔رزلٹ بھی بہت اچھا آتا ہے۔'' افزیہ نے خود کو آئینے میں دیکھ کر سیرم لگانا شروع کر دیا......

''صحبت کا اثر تو ہوتا ہے...... یہ توفیکٹ ہے۔'' حماد حسین نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے بیگم سے اتفاق کیا۔

''ویسے اگر ایسا ہو گیا تو اس کا مطلب ہے سفینہ بہت لکی ہے...... پرنس بہت میچور سوچ رکھتا ہے......بہت محتاط ہے......سب سے بڑھ کر اپنی دادی کی خدمت کرتا ہے، ان کو خوش کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔یہ سعادت مندی ہمیشہ خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتی ہے...... پرنس کی شادی کا تو بہت لوگ انتظار کر رہے ہیں، یہ ایک یادگار شادی ہوگی......لیڈی صوفیہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گی۔'' حماد حسین اب شاور لینے کے ارادے سے چیئر سے اٹھ چکے تھے۔

''کسر چھوڑنی بھی نہیں چاہیے۔انہوں نے کون سا چار پانچ پوتے ، پوتیوں کی شادی کرنی ہے۔'' افزیہ نے مسکرا کر حماد حسین کی طرف دیکھا تھا۔

حماد حسین اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈریسنگ کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

''یہ بھی ٹکٹ کے ساتھ رکھ لینا۔'' لیڈی صوفیہ نے ایک بک جو بہت خوب صورت ریپر میں پیک کی گئی تھی پرنس کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ کوئی ناول ہے؟'' پرنس نے بک لیتے ہوئے سوال کیا۔

''یس......آف کورس......میں نے سوچا سفینہ کی چھوٹی بہن کے لیے بھی کوئی گفٹ ہونا چاہیے۔'' لیڈی صوفیہ نے اپنی چھڑی پر سارا زور ڈالتے ہوئے کہا اور واپس جانے لگیں۔

''یہ کس کا ناول ہے گرینڈ مام......؟'' پرنس نے بک ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ سفینہ کی بہن کے لیے لیڈی صوفیہ کا انتخاب کیا ہے؟

''Harper lee کا بیسٹ سیلر ناول To kill a mocking bird'' انہوں نے پلٹ کر جواب دیا۔

"its a best one...oh good" پرنس انتخاب پر خوش دکھائی دیا۔

''ہوں......humour اور tragedy کا شاہکار ہے......اس عمر کے بچوں کو اس طرح کی چیزیں پڑھنا چاہئیں جو انہیں پُر امید بنائیں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔

''امید ناامیدی وہ کیفیات ہیں جن پر انسان کا اختیار کہاں......'' پرنس اپنی پُرامید آنکھیں دیوار پر جمائے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

زارا کا دل مچل رہا تھا کہ سفینہ کو فون کر کے گھر میں ہونے والے ڈنر کی تفصیلات بتائے......اس کی آواز سے اس کا ردِعمل محسوس کرے اور لطف اندوز ہو......پھر خود ہی اس نے ارادہ بدل دیا یہ سوچ کر کہ آج کے ڈنر کی فوٹوز سفینہ کو سینڈ کر دے گی......پھر اگلے دن فون پر بات کرے گی......اس نے طے کیا ہوا تھا کہ آج وہ پرنس کے ساتھ ڈھیر ساری سیلفیز بنائے گی۔

مغرب کے بعد اس نے اپنی تیاری شروع کر دی تھی۔رائل بلیو لانگ ڈریس زیب تن کر کے اس نے بہت اہتمام سے بال سنوارے اور میک اپ کیا......پھر سفینہ کے جیولری باکس سے نکالی ہوئی جیولری پہنی......بڑے، بڑے ٹاپس اور نیکلس......ایک ہاتھ میں بریسلیٹ دوسرے میں جگمگ کرتی رسٹ واچ......آستینیں کہنیوں سے چار انچ اوپر تھیں......دودھیا باز و رائل بلیو کلر میں بے حد نمایاں ہو رہے تھے۔تیاری مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنا ناقدانہ جائزہ لیا......بہت حسین نظر آ رہی تھی......خود پر فدا ہوتے ہوئے پرفیوم سے خود کو مہکایا پھر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔تیاری کے دوران وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

''یقیناً وہ اپنے گھر سے نکل چکے ہوں گے......'' معاً اسے ایک خیال آیا اور اس نے گھنٹی بجا کر نوکر کو طلب کیا......جو فوراً ہی حاضر ہو گیا۔

''جی بی بی صاحب......؟''

''وہ توقیر سے بُکے منگوائے تھے، وہ لے آیا؟''

''جی بی بی صاحب......وہ لاؤنج میں ٹیبل پر رکھے ہوئے ہیں۔'' یہ سن کر وہ مطمئن ہو گئی اور نوکر کو جانے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

''کیا ہوا حماد......کس کا فون تھا؟'' افزیہ ڈریسنگ سے باہر آئیں تو حماد حسین کو بہت فکر مندانہ انداز میں بیڈ کے کنارے پر بیٹھے سیل فون کی طرف گھورتا پا کر پوچھ رہی تھیں۔

حماد حسین نے چونک کر خالی، خالی آنکھوں سے افزیہ کی طرف دیکھا۔

''برنی صاحب کی مسز کا فون تھا......برنی صاحب کو تھوڑی دیر پہلے زبردست اٹیک ہوا ہے۔کارڈیو تو لے گئے ہیں مگر ان کی حالت بہت سیریس ہے۔'' برنی صاحب، حماد حسین کی کمپنی کے سب سے پرانے ورکرز میں سے ایک اور چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔

''مائی گاڈ۔'' افزیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا......وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔صرف میچنگ سینڈل پہننا باقی تھے۔

''برنی صاحب کی مسز بہت پریشان ہیں، دونوں بیٹے باہر ہیں، بیٹی آج شام ہی بحرین واپس گئی ہے۔مسز برنی اس وقت بالکل اکیلی ہیں۔اصرار کر رہی ہیں کہ میں فوراً اسپتال پہنچوں......'' حماد حسین عجیب تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھے۔

افزیہ کے تو جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی......دھپ سے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔

''سچویشن یہ ہو گئی ہے کہ مسز برنی کو اس وقت ہمارے اخلاقی اور مالی سہارے کی ضرورت ہے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔

''ماشاء اللہ ان کے دونوں بیٹے ڈالرز چھاپ رہے ہیں، میں نہیں سمجھتی کہ ان کو مالی طور پر کوئی پرابلم ہوسکتی ہے۔'' پیش آنے والے کسی بڑے خرچ نے افزیہ کو قدرے متفکر کر دیا...... دل کا معاملہ تھا۔ لاکھوں کی بات بھی ہوسکتی تھی۔

''وہ تو بعد میں دیکھنا ہوگا...... اس وقت تو میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔ میں لیڈی صوفیہ اور تاجور بھابی سے معذرت کر لیتا ہوں۔ البتہ آپ جانا چاہیں تو......''

''میں اکیلی تو نہیں جاؤں گی۔ لیڈی صوفیہ سے میری کوئی خاص بات چیت نہیں ہے، مجھے نہیں پتا انہیں کس طرح سے ٹریٹ کرنا چاہیے، میں بہت کانشس ہو جاؤں گی۔'' انہوں نے تذبذب کی کیفیت میں ہاتھ میں پہنے ہوئے کنگن اتارنا بھی شروع کر دیے۔

''بہت نائس خاتون ہیں...... فکر کرنے کی ضرورت نہیں...... وہ خود اتنی خوب صورت باتیں کرتی ہیں کہ تمہیں زیادہ بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔'' حماد حسین نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بیگم کو تسلی دی۔

''نہیں...... ذہن تو آپ کی طرف لگا رہے گا...... میں بالکل بھی انجوائے نہیں کر سکوں گی۔'' افزیہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''ہوں......'' حماد حسین نے ہنکارا ابھرا۔

''وہ جو کہتے ہیں ناں کہ دانے، دانے پر مہر ہوتی ہے۔ شاید آج اس گھر کے دانے پر ہمارے نام کی کوئی مہر نہیں۔'' وہ سوچتے ہوئے گویا ہوئے ذرا دیر میں کمرے کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا۔

''میں فون کر کے دونوں سے معذرت کر لیتا ہوں۔ آئی ایم سوری افزیہ۔'' حماد حسین نے اپنی بنی سنوری بیگم سے پہلے معذرت کی۔

''نو پرابلم حماد...... اس میں بھلا آپ کا کیا قصور بنتا ہے۔ میں چینج کر کے آپ کے ساتھ چلتی ہوں...... برنی صاحب ہمارے فیملی ممبر کی طرح ہیں ایسے موقع پر ان کی مسز کو حوصلہ دینا ہمارا فرض بنتا ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔ حماد حسین نمبر ملا رہے تھے۔

☆☆☆

پرنس اپنے پی اے کی طرف بہت گم صم کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔

''حماد صاحب نے معذرت کی ہے...... کمال ہے عین وقت پر......''

''سر وہ کسی ایمرجنسی سچویشن کی بات کر رہے تھے۔ شاید ان کے کسی ایمپلائی کی بہت سیریس کنڈیشن ہے۔'' پی اے حماد حسین کے کہے ہوئے جملے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں جواب دے رہا تھا۔

''انہوں نے ایڈریس لکھوا دیا ہے۔ وہ میں ابھی ڈرائیور کو دے دیتا ہوں۔'' اس نے مزید کہا۔

''اوہ یس...... ٹھیک ہے۔'' پرنس اچانک ملنے والی خبر پر قدرے الجھ گیا تھا...... سوچتے ہوئے جواب دے کر لیڈی صوفیہ کی طرف بڑھنے لگا جو ابھی تک اپنے بیڈ روم میں تیاری میں مصروف تھیں۔

☆☆☆

''اوہ میرے خدایا...... حماد بھائی میں تو سن کر پریشان ہو گئی ہوں۔ آپ نہیں ہوں گے تو میں بہت ان کمفرٹیبل فیل کروں گی۔'' تاجور کے تو جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ بڑے اعتماد سے بزنس چلانے والی تاجور اس وقت انتہائی ذہنی خلفشار کا شکار ہو رہی تھیں۔ ان کے متعلق کچھ سنی سنائی دیو مالائی جیسی کہانیوں کی وجہ سے بھی وہ بہت زیادہ حساس ہو رہی تھیں۔

''بھابی یقین کریں...... اس وقت افزیہ بالکل تیار میرے سامنے بیٹھی ہے۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں بس گھر سے نکلنے ہی والے تھے۔'' حماد حسین معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

''اسی کا نام زندگی ہے...... ہم کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں اور ہو کچھ اور جاتا ہے...... جس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا...... میں تو سن کر پریشان ہوگئی ہوں۔'' تاجور بے ساختگی سے گویا ہوئیں۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، لیڈی صوفیہ کا لائف اسٹائل بہت مختلف سہی مگر دونوں دادی پوتا بہت سادہ مزاج ہیں...... کوئی ان کے رہن سہن سے بالکل بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ بہت سادہ اور معصوم سے ہیں۔ صاف، صاف سیدھی سچی باتیں کرتے ہیں' آپ پورے کانفیڈنس سے ان کو ویلکم کہیں...... بہترین میزبان ہونے کا ثبوت دیں...... جس پر مجھے تو ذرا برابر شک نہیں ہے۔''

حماد حسین کی باتوں سے تاجور کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہونے لگا۔

''ٹھیک ہے...... مگر میں پھر بھی کہوں گی اگر آپ کچھ لیٹ بھی آجائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' وہ غائب دماغی سے دوچار تھیں بہ مشکل خود کو سنبھالتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''بہت مشکل ہے بھابی...... اسپتال پہنچنے کے بعد اصل سچویشن کا اندازہ ہوگا......'' حماد حسین نے اب بالکل واضح دوٹوک معذرت کی تھی۔

☆☆☆

''آپا...... یہ تو کالے پانی کی سزا ہے...... ذرا وقت دیکھیں ابھی تک آفس میں ہوں......'' ساحل فون پر اپنی بڑی بہن آمنہ سے بہت جھلا کر بات کر رہا تھا۔ کوٹ اسٹینڈ پر لٹک چکا تھا۔ ٹائی کرسی کی پشت پر پڑی ہوئی تھی۔ آستینیں فولڈ ہو کر کہنیوں تک جا پہنچی تھیں۔ بالوں میں مانگ غائب ہو چکی تھی۔ شرٹ کے اوپری دو بٹن کھل چکے تھے۔

''ارے بھائی...... سیٹھ خون پی کر پیسہ دیتا ہے...... پرائیویٹ جاب کوئی آسان کام نہیں...... تمہیں پہلے ہی سرور (شوہر) نے کہا تھا کہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرلو...... گورنمنٹ جاب بھی ملے گی بڑا سا گھر بھی...... گاڑی، ڈرائیور، خانساماں، مالی، کتنے تو نوکر مل جاتے ہیں۔'' آپا کو بھائی کی دُہائی نے بے چین کر دیا۔

''کمال کرتی ہیں...... ہر سال سیکڑوں لوگ سی ایس ایس کا ایگزام دیتے اور پاس بھی ہو جاتے ہیں تو فوراً ہی کیا ڈپٹی کمشنر لگ جاتے ہیں؟ پولیس ڈپارٹمنٹ تو مجھے پسند ہی نہیں...... سینئرز سارا وقت ذلیل کرتے رہتے ہیں...... سرور بھائی چاول کے بیوپاری ہیں انہیں کیا پتا نوکری کیا ہوتی ہے...... ایک پاؤ چاول اور پر نہیں تو لتے مشورے مفت میں ...... دیتے ہیں۔ پتا نہیں آپ کو ابھی تک حق مہر بھی دیا ہے یا ادھار کے کھاتے میں لکھ دیا ہے...... ابا نے تو مہرِ معجل لکھوایا تھا جو فوراً دینا ہوتا ہے۔'' ساحل نے سارا ذہنی دباؤ بہنوئی کی طرف منتقل کر دیا۔

''توبہ ہے، میں نے تو تمہارا چڑچڑا پن دیکھ کر ایک بات کہہ دی تھی...... بعد میں بات کروں گی...... نوکری کرنا ہے تو دماغ ٹھنڈا رکھو...... رات تو بہت خوش تھے کہ ترقی ہوگئی ہے...... بیس گھنٹوں میں یہ حال ہوگیا۔ اچھا خدا حافظ......'' آپا کی طرف سے فون بند ہوگیا...... یا پھر فون کا پیکج ختم ہوگیا تھا۔ کب سے آپا کہہ رہی تھیں فلاں نیٹ ورک کی سم لے لو۔ اس مشورے کو اس نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اس کے پاس دوسرے نیٹ ورک کا نمبر تھا جو اکثر بزنس مین کے پاس ہوتا ہے۔ اس کے پاس تو نمبر بھی ایگزیکٹو تھا یعنی اس وقت کا جب موبائل فون پاکستان میں نیا نیا آیا تھا۔ بیس ہزار کی کمیٹی نکلتے ہی اس نے موبائل فون لے لیا تھا۔

''ہونہہ...... ان کی بتائی گئی سم لے لی تو ساری رات فون بند نہیں کریں گی......'' ابھی اسے یہاں مزید دو گھنٹے

بیٹھنا تھا...... کچھ لوگ سائٹ آفس میں میٹنگ کررہے تھے ان سے میٹنگ رپورٹ لے کر تاجور کو بھیجنا اس ضمن میں تاجور کی خصوصی تاکید تھی۔

''پتا نہیں یار کن لوگوں کی لاٹری نکلتی ہے اور کس کا پرائز بانڈ...... میرے تو ڈی این اے میں محنت و مشقت ہی ہے۔'' وہ کلس کر سوچ رہا تھا۔

''ابا ایک اسٹیل کے کارخانے میں سولہ، سولہ گھنٹے ڈیوٹیاں دیتے تھے۔ اماں ان کے انتظار میں جاگتے، جاگتے چپکے سے ہمیشہ کی نیند سوگئیں۔ کیا خبر اس جہان میں بھی ڈیوٹیاں دے رہے ہوں۔ اور میری ماں وہاں بھی جاگ رہی ہو۔'' اس نے کڑھتے ہوئے سیل فون پر آوٹ ڈور پلانر اشفاق کا نمبر ملایا تاکہ پتا چلے میٹنگ کہاں تک پہنچی۔

☆☆☆

لیڈی صوفیہ کے ساتھ ان کی دو ملازمائیں بھی تھیں۔ تاجور کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ دونوں دادی، پوتے کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ کوئی چوتھا، پانچواں بھی ہوگا۔

ڈرائیور کے سلسلے میں وہ اپنے نوکروں کو ہدایت دے چکی تھیں کہ وہ سیکنڈ فلور کے لاؤنج میں اسے کھانا کھلادیں۔

زارا شوق کی انتہا پر دمکتے چہرے کے ساتھ ماں کے ہمراہ مہمانوں کا استقبال کررہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ جس سے آٹوگراف لینے کے لیے اس نے سردھڑ کی بازی لگادی تھی آج وہ اس کے گھر آیا ہے۔

لیڈی صوفیہ کو دونوں ملازماؤں نے سہارا دے کر مرسڈیز سے اترنے میں مدد دی پھر ان کی قیمتی چھڑی دائیں ہاتھ میں تھمادی۔

لیڈی صوفیہ کار سے اترتے ہوئے پُرشوق نگاہوں سے سامنے کی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں میزبان ماں، بیٹی ان کے استقبال کو کھڑی تھیں۔ چھڑی بھی انہوں نے یوں تھامی جیسے ضروری کام کے دوران کوئی فضول سی مصروفیت آڑے آگئی ہو۔

پرنس دوسرے دروازے سے اترا تھا۔ وہ گھوم کر سامنے آیا...... جیٹ بلیک ڈنر سوٹ، مسٹرڈ ٹائی اور ہم رنگ رومال جو کوٹ کی اوپری جیب میں بہت خوب صورت انداز میں رکھا ہوا تھا۔

دونوں کے کار سے اترتے ہی ماحول میں قیمتی اور دھیمی، دھیمی سی خوشبویات کی لپٹیں اٹھنے لگیں...... ماحول بہت پُرکیف ہوگیا تھا۔ اتنی خوب صورت تیاری کے ساتھ مسحور کُن خوشبوؤں میں بسی بوڑھی عورت تاجور نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

شاندار ساڑی کے ساتھ مکمل جیولری پہنے ہوئے...... مسکارے سے بوجھل پلکیں جھپکاتی ہوئی...... قریب آئیں تو پتا چلا...... آنکھوں کے گرد لائنر کی لکیر ہے...... اور آنکھوں کے اندر سرمے کی لکیر بھی...... ایک لمحے کے لیے تو تاجور کے ہوش اڑ گئے تھے...... کہ پتا نہیں وہ ان مہمانوں کے شایانِ شان تیاری بھی کر پائی ہیں یا کمی رہ گئی ہے۔

زارا ٹکر، ٹکر بالکل بچوں کے سے بے ساختہ و پُرشوق انداز میں دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی کیفیت میں اس نے دونوں مہمانوں کو خوب صورت پھولوں کے حسین گلدستے پیش کیے جو دونوں نے فوراً ہی اپنی ملازماؤں کو تھمادیے۔

لیڈی صوفیہ کی آنکھیں تک مسکرارہی تھیں۔ بڑے پیار سے تاجور کو گلے سے لگایا، بوسہ دیا پھر زارا کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''ماشاء اللہ سفینہ کی بہن بھی بہت پیاری ہے...... ماں کا تو جواب نہیں۔'' انہوں نے ایک بار پھر تاجور کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھا جو سفید چمکتی ہوئی سلک کی ساڑی میں ملبوس تھیں۔ کانوں میں موتیے کی کلیوں کی

بالیاں اور گلے میں سچے موتیوں کا گلوبند...... کلائیوں میں بھی موتیے کے گجرے تھے...... جن کی بھینی، بھینی خوشبو بہت دل نشین تھی۔

پرنس نے سر کو خم دے کر تاجور کو آداب کیا پھر اس کی نظر زارا کی طرف گئی۔ میک اپ اور ہیئر اسٹائل کی وجہ سے وہ دور سے زارا کو نہیں پہچان سکا تھا مگر انتہائی قریب آ کر دیکھا تو چونک پڑا۔

ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ آنکھیں یہ مسکراتے ہونٹ...... اسے اپنا بنایا ہوا پھر ضائع کیا ہوا خاکہ فوراً یاد آ گیا تھا۔

زارا اس کے بدلتے ہوئے تاثرات اور حیرت کا عکس دیکھ کر بے اختیار کھلکھلا پڑی...... وہ سمجھ گئی تھی کہ پرنس نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ رہی تھی۔ کم عمری کے باعث وہ یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ سیکڑوں لوگوں سے ملاقات کرنے والا مصور صرف اسی کو کیوں یاد رکھے گا...... مگر اس کی خود پسندی تھی کہ اسے پورا یقین تھا کہ پرنس نے اسے پہچان لیا ہے۔

''آپ...... آپ......'' ابھی وہ بس اتنا ہی بول پایا تھا کہ زارا نے فوراً ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

''جی...... میں وہی ہوں...... پانچ ہزار کے نوٹ پر آپ سے آٹوگراف لینے والی۔''

''یہ میری چھوٹی بیٹی ہے زارا......'' تاجور نے جھٹ تعارف کرایا۔

''اچھا، اچھا میں تو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ سفینہ کی چھوٹی بہن ہے...... ہوں...... زارا...... بہت پیارا نام ہے۔''

پرنس کے ساتھ عین اسی طرح کی صورت حال تھی۔ جو سفینہ کو پرنس کے گھر میں پیش آئی تھی۔ ایک دم گم صم سا ہو کر رہ گیا۔ وہ چند سیکنڈ میں کئی مرتبہ زارا کی طرف دیکھ چکا تھا۔

زارا، پرنس کو بار، بار اپنی طرف دیکھتا پا کر پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آج وہ اتنی خوب صورت لگ رہی ہے کہ پرنس اسے بار، بار دیکھ رہا ہے۔ تاجور نے اندر کی طرف پیش قدمی کی تو دونوں خادمائیں لیڈی صوفیہ کو دائیں بائیں سے تھام کر تاجور کی تقلید کرنے لگیں۔

پرنس اور زارا ہم قدم تھے...... پرنس خاصا الجھا ہوا تھا مگر مسلسل اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوششیں بھی کر رہا تھا۔

''شکر ہے وہ محض اسکیچ تھا...... مکمل تصویر نہیں...... ورنہ گرینڈ ماما تو شاید زارا کو پہچان ہی لیتیں۔'' اسکیچ میں زارا کے بال بکھرے ہوئے تھے آج اس نے سمیٹے ہوئے تھے۔ میک اپ اور جیولری سے بھی بہت فرق پڑتا ہے۔

نمائش کے دوران ہونے والی ملاقات میں زارا نے معمول کا لباس پہنا ہوا تھا۔ میک اپ تھا نہ جیولری کی دمک......

ایک مصور کی نگاہ تو کیمرے کے مماثل ہی ہوتی ہے۔ پانچ ہزار کے نوٹ پر آٹوگراف لینے والی شوخ و شنگ لڑکی کا چہرہ وہ اتنی جلدی کیسے بھول سکتا تھا؟

تاجور کی تقلید میں وہ سب ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے تھے۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم جو رئیسوں کے ہاں ایک عالیشان کمرا ہوتا ہے بہترین صوفہ سیٹ...... آرائشی اشیا سے سجا ہوا...... مگر وہ پرنس کے گھر کے ڈرائنگ روم کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔

لیڈی صوفیہ نشست پر بیٹھ گئیں اور ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بجائے تاجور کی طرف دیکھا اور بہت محبت سے مسکرائیں۔

''آپ اِدھر میرے پاس بیٹھیں...... آپ کو دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب آپ سے باتیں کر کے بھی دیکھتے ہیں۔'' لیڈی صوفیہ نے انہیں اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اتنا اچھا بولنا نہیں آتا...... کہیں آپ کو مایوسی نہ ہو۔'' تاجور نے ان کے پہلو میں براجمان ہوتے ہوئے بڑی شگفتگی سے کہا۔

''آپ کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہم لفظ مایوسی راستے ہی میں پھینک آئے......آج تو بس امید بھری باتیں ہوں گی۔'' لیڈی صوفیہ نے تاجور کا ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں میں لے کر بہت پُرمسرت انداز میں مذاق کیا۔

زارا اور پرنس بڑے سے مخملیں صوفے کے دونوں کناروں پر بیٹھ چکے تھے اور لیڈی صوفیہ اور تاجور کی گفتگو بہت دلچسپی سے سن رہے تھے۔

پرنس کا ذہن مسلسل دو حصوں میں تقسیم تھا......وہ سامنے بھی دیکھ رہا تھا اور توجہ زارا پر بھی تھی۔

دیوار پر ایک بہت بڑے سنہری فریم میں تاجور اور سفینہ کی تصویر لگی تھی۔ تاجور ٹریک سوٹ میں تھیں اور سفینہ ان کی پشت پر گلے میں بانہیں ڈالے ہنس رہی تھی۔ تصویر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت سفینہ کی عمر بہ مشکل ڈھائی تین سال ہوگی...... صحت مند، خوب صورت، ہنستی مسکراتی ماں کی قربت سے لطف اندوز ہوتی ہوئی۔

''یہ تصویر میں آپ ہیں؟'' پرنس نے زارا کی طرف دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

زارا کو اس سوال سے خاصی کوفت ہوئی جیسے سفینہ کا نام لینا پہاڑ اٹھانے جیسا تھا...... بڑی مہارت سے اپنی کیفیت پر غالب آکر مسکرائی۔

''نہیں......میری بڑی سسٹر سفینہ کی ہے۔''

لیڈی صوفیہ نے دونوں کی بات سن لی تھی......سفینہ کے نام میں ساری دلچسپی تھی......گردن موڑ کر خود بھی دیکھنے لگیں۔ پھر تاجور کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''اس ٹریک سوٹ میں تو آپ اس ساڑی سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں۔''

تاجور قدرے شرمندہ، شرمندہ انداز میں مسکرائیں۔

''یہ جوانی کی تصویر ہے......فرق تو پڑتا ہے ناں......'' وہ یہ کہہ کر دھیرے سے ہنس پڑی تھیں۔

''ابھی آپ کون سی بوڑھی دکھائی دیتی ہیں......بوڑھے تو ہم ہیں...... اتنے بوڑھے کہ ہمارے جونیئرز بوڑھے اس دنیا سے جا چکے ہیں۔'' لیڈی صوفیہ نے بشاشت سے جواب دیا۔

زارا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پرنس کو لے کر ٹیرس پر چلی جائے......اسے خدشہ تھا کہ لیڈی صوفیہ اور تاجور انہیں اپنی باتیں کرنے کا موقع نہیں دیں گی......ملازم اندر آکر مہمانوں کو فریش جوس پیش کر رہا تھا......زارا بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ اس نے جوس لینے سے بھی انکار کر دیا تھا......وہ یہ قیمتی لمحات اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے چین تھی۔

''آپ کی آمد سے یقین کریں مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ نے بہت عزت افزائی کی۔'' تاجور کا ہاتھ ابھی تک لیڈی صوفیہ کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ بہت تشکرانہ مسکراہٹ کے ساتھ لیڈی صوفیہ سے مخاطب تھیں۔ اتنی شاندار، چاق و چوبند اور انتہائی بوڑھی خاتون کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔ جو اُن سے زیادہ میک اپ کیے ہوئے تھیں۔ یورپی کلچر کے عین مطابق جہاں بوڑھی رئیس خواتین نوجوان لڑکیوں سے زیادہ خود کو بنا سنوار کر رکھتی ہیں۔

''یہ کریڈٹ تو سفینہ کو جاتا ہے...... اتنی پیاری بیٹی ہے آپ کی کہ بس ایک ملاقات ہوئی اور اس نے اپنا بنا لیا۔''

زارا نے بری طرح چونک کر لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھا تھا......دل کو کچھ ہوا......عجیب نامانوس سی کیفیت تھی جس کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔

پرنس نے مسکرا کر سر جھکا لیا تھا...... پرنس کی اس ادا نے تو گویا اس کی جان ہی نکال دی۔

''تھینک یو سو مچ......!'' تاجور بیٹی کی تعریف سن کر شکریہ ادا کر رہی تھیں۔

''پرنس کے لیے بہت رشتے آ رہے ہیں......مگر میری اپنی ایک سوچ ہے میں اس پر کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں......ذہین اور سادہ مزاج لڑکی...... بہت ذمے دار ہوتی ہے۔اور پریکٹیکل لائف، احساسِ ذمے داری کا تقاضا کرتی ہے......بس میں فضول کے تکلفات اور ڈنر سے پہلے کام کی بات کرنا چاہتی ہوں۔'' لیڈی صوفیہ کی بات سن کر تاجور کو اپنا گمان حقیقت میں بدلتا محسوس ہوا......یعنی جو وہ سمجھ رہی تھیں اسی کے مطابق ہونے جا رہا تھا۔

''یہ ہماری پہلی ملاقات ہے......مگر سفینہ سے ملاقات ہونے کے بعد یوں سمجھیں ہم ہزاروں بار مل چکے ہیں......میں آج سے سفینہ کو اپنی بہو کی شکل میں دیکھ رہی ہوں...... عجیب سی خوش فہمی ہے کہ آپ انکار نہیں کریں گی۔'' اتنا کہہ کر لیڈی صوفیہ نے تاجور کا ہاتھ چھوڑ کر انہیں کندھوں سے تھام کر بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگا لیا......

تاجور تو ہکا بکا رہ گئی تھیں......آتے ساتھ ہی بغیر لگی لپٹی کام کی بات کر ڈالی...... جیسے انہیں کہیں جانے کی جلدی ہو۔

زارا اپنی جگہ پر بیٹھی محسوس کر رہی تھی کہ اس کی ٹانگیں پتھر کی ہوگئی ہیں اور وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہی......

پلک جھپکتے میں منظر بدل گیا تھا۔

اس کا اپنا اندازہ تھا کہ آج کے ڈنر کے بعد پرنس کے گھر میں آنا جانا ہوجائے گا اور بہت خاموشی سے وہ پرنس تک اپنے جذبات پہنچانے کی کوشش کرے گی......اسے بار، بار جتائے گی کہ وہ اس کے فن کی پرستار ہوتے ہوتے مصور کے عشق میں مبتلا ہوگئی ہے۔

پرنس نے یہ سوچ کر زارا کی طرف دیکھا تھا کہ سفینہ کو پروپوز کرنے کے بعد زارا کا فطری ردِعمل کیا ہے۔اس کا خیال تھا کہ وہ خوشی سے مسکرا رہی ہوگی اور قدرے حیران، حیران بھی ہوگی......مگر زارا کا چہرہ تو کسی مویشی کی طرح بالکل بے تاثر تھا۔

وہ پائے کا مصور ہی اس وجہ سے بنا تھا کہ اسے رنگوں سے انسانی جذبات واحساسات اجاگر کرنے پر ملکہ حاصل تھا۔

وہ اس ہنر میں اتنا طاق ہو چکا تھا کہ اب انسانوں کے چہرے پر بہت غور سے نہیں دیکھتا تھا......

حادثاتِ زندگی و وارداتِ قلبی کا سارا نصاب اس کے ذہن پر نقش تھا......بس برش چلانے کے لیے ایک کیفیت درکار ہوتی تھی۔زارا نے پرنس کو اپنی طرف دیکھتا پا کر سنبھلنے کی کوشش کی......زبردستی مسکرائی بھی......مگر پرنس حقیقی اور مصنوعی رویّوں کو یوں پہچانتا تھا جیسے بھیڑ میں ماں اپنے بچے کو پہچانتی ہے۔

اسے قدرے حیرت تو ہوئی کیونکہ ایسے مواقع پر عموماً چھوٹی بہنیں بہت پُرجوش و بے تحاشا خوشی کا اظہار کرتی پائی جاتی ہیں۔یہ الگ بات کہ پرنس کو بھی قطعی اندازہ نہیں تھا کہ لیڈی صوفیہ اتنی جلدی مدعا بیان کر دیں گی......اس کا خیال تھا یہ بات ڈنر کے بعد کافی پینے کے دوران ہوگی۔

مگر لیڈی صوفیہ بڑھاپے کی وجہ سے ہونے والی فطری اعصابی کمزوری کی وجہ سے بچوں کی طرح بے ساختگی سے اپنی بات کر جاتی تھیں......اور عمر کے اس حصے میں وہ اس بات سے بے نیاز ہو چکی تھیں کہ زندگی میں عجلت و تاخیر کے کیا معنی ہوتے ہیں......وہ جو کہنا چاہتی تھیں کہہ دیتی تھیں......اسی لیے کہا گیا ہے کہ بوڑھا، بچہ برابر ہوتا ہے۔

''ایکسکیوز می......!'' زارا اس سے زیادہ اداکاری کے جوہر دکھانے سے قاصر تھی کہ مسکرا کر باہر جانے کی اجازت چاہی۔

تاجور نے عام سے انداز میں زارا کی طرف دیکھا......اس وقت مکمل طور پر وہ صرف لیڈی صوفیہ کی طرف

متوجہ تھیں......اور اتنے بہترین رشتے پر حیرت آمیز خوشی سے ہمکنار ہورہی تھیں۔

’’یہ تو میری عزت افزائی ہے لیڈی صاحبہ......آپ نے اتنے بڑے شہر میں میری بیٹی کو منتخب کیا......لیکن ایک اصولی سی بات ہے سفینہ سے بات کیے بغیر میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔‘‘

’’لیس......آف کورس......یہ تو اس کا حق ہے۔آپ ضرور بات کیجیے مگر زیادہ دیر نہیں کیجیے گا......میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے۔‘‘لیڈی صوفیہ نے اپنی دھیمی آواز میں تاجور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جی......؟‘‘تاجور نے چونک کر لیڈی صوفیہ کے بجائے پرنس کی طرف دیکھا۔

’’آپ کو شاید میری ایج کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ ہو۔فرسٹ ورلڈ وار کے بعد میری پیدائش ہوئی تھی......اور سیکنڈ ورلڈ وار کی victim (متاثرہ) ہوں......یہ وہ آگ و خون کا طوفان تھا جو میری ساری خوشیوں کو برباد کر گیا۔میں اپنے محبوب سے جدا کر دی گئی۔‘‘بولتے ، بولتے لیڈی صوفیہ کی آواز بھرّا گئی۔تاجور بھونچکا سی ان کی شکل تکنے لگیں......عجیب تماشا تھا......عمر کی اس منزل پر وہ اپنے محبوب کا ذکر کررہی تھیں۔وہ بھی اپنے پڑپوتے کی موجودگی میں......مارے حیرت کے تاجور گنگ سی ہوگئیں۔

’’روز ویلٹ نے 1940ء میں ایک قانون منظور کرایا تھا جس کے مطابق 21 سال سے لے کر 36 سال تک کی عمر کے لوگوں کو لازمی فوجی تربیت حاصل کرنا تھی......پھر یہ ظالم اور زہریلی ہوائیں برطانیہ میں بھی داخل ہوگئیں ، میرے شوہر کو فوج میں جانے کا ذرہ برابر شوق نہیں تھا......وہ تو بہت آرٹسٹک ذہن رکھتا تھا۔میرے سسر نے ایک پسٹل میرے شوہر کو دیا تھا۔وہ رکھ کر بھول جاتا تھا۔کبھی یاد آجاتا تو کئی ، کئی دن ڈھونڈتا تھا۔اسے تو گولی بارود سے نفرت تھی۔وہ امن کے گیت گانے والا......بہشتی پرندہ تھا......اُف میرے خدایا جب اسے خون میں نہلایا گیا ہوگا......تو اس کی کیا کیفیات ہوں گی۔‘‘یہاں تک بول کر لیڈی صوفیہ ہچکیوں سے رونے لگیں۔

تاجور کو یوں لگ رہا تھا گویا ڈرائنگ روم روشنی کی رفتار سے گول ، گول گھوم رہا ہو......

پرنس نے فوراً سچویشن سنبھالی۔خادمہ ٹشو پیپر لیے قریب جا کھڑی ہوئی تھی۔

’’ڈونٹ وری......گرینڈ مام کو اچانک سے کسی بھی وقت میرے گرینڈ فادر یاد آجاتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے ان کی ایسی ہی کیفیت ہوجاتی ہے۔‘‘پرنس نے لیڈی صوفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تاجور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’oh my God......یہ تو نفسیاتی مریضہ ہیں۔‘‘تاجور نے گھبراہٹ چھپانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

’’اگر لیڈی صاحبہ کو اس وقت ریسٹ کی ضرورت ہے تو میں ان کو بیڈ روم میں لے جاتی ہوں۔ایسی کنڈیشن میں کوئی میڈیسن بھی لیتی ہیں؟‘‘تاجور کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

لیڈی صوفیہ نے تاجور کی بات سنتے ہی اپنی خادمہ انجیلا سے ٹشو پیپر لے کر آنسو صاف کیے......اور لرزیدہ سی آواز میں گویا ہوئیں۔

’’oh ...sorry'I am so fine......آپ کو پریشان کیا۔‘‘

پرنس نے دوسری خادمہ سے ٹشو پیپر لے کر خود بھی دادی کے آنسو صاف کیے......اور تاجور کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا......یوں جیسے کہہ رہا ہو۔

’’اب سب کچھ ٹھیک ہے۔‘‘



زارا اپنے کمرے میں بند سناٹے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''ایسا کہاں ہوتا ہے؟'' اس نے تو کبھی دیکھا نہ سنا...... کہ کوئی گھر میں پہلی بار آئے اور بہت سی بات چیت کیے بغیر کسی لڑکی کو پرپوز کر دے۔

وہ کلائی سے بریسلیٹ نوچنے کے انداز میں اتار رہی تھی...... دماغ سن ہو رہا تھا کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ گہرے صدمے نے اس کے حواس منجمد کر دیے تھے۔

وہ تو سوچ کر بیٹھی تھی کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے گی۔ اور پرنس کو یقین دلا کر رہے گی کہ ساری دنیا میں وہ اس کی واحد سچی پرستار ہے...... اس کے آرٹ کی عاشق ہے...... ہمیشہ اس کی نئی پینٹنگز کی نمائش کا انتظار کرتی رہتی ہے...... جیسے ہی خبر ملتی ہے سارے کام چھوڑ کر آرٹ گیلری جاتی ہے۔

مگر یہ کیا ہوا کہ کچھ بھی نہ ہوا...... اور سب کچھ ہو گیا......

اس کی حالت غیر ہو رہی تھی...... یوں...... گویا کہ پتنگ کٹنے کے بعد پتنگ باز چرخی پر ڈور لپیٹ رہا ہو۔

اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی......

''اتنی خوب صورت لگ رہی تھی جیسے پری......'' مگر...... پرنس اور دادی تو سفینہ کو سوچتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے سفینہ کے حوالے سے...... بالکل اسی طرح جس طرح سفینہ کی ماں کی طرف دیکھا ہوگا...... پرنس نے تو شاید اسے پہچاننے کی کوشش کی ہو...... جان بوجھ کر نہ سہی بلکہ لاشعوری طور پر......

دوسری اتفاقی ملاقات ہمیشہ پہلی اتفاقی ملاقات کا پرتو ہوتی ہے۔
وہ تو منتظر ہی رہی کہ پرنس پہلی دلچسپ ملاقات کے حوالے سے اس سے کوئی بات کرے گا مگر وہ تو خاموش ہی رہا...... کیا لیڈی صوفیہ نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
پل بھر میں چاروں اور دھول اُڑنے لگی تھی...... بالکل تازہ پھول یک دم مرجھا کر شاخوں سے ٹوٹ، ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔
اس نے ایک مرتبہ پھر خود کو آئینے میں دیکھا، آج کی تاریخ کے کتنے قیمتی گھنٹے اس نے ضائع کر دیے تھے، ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور دل خالی گنبد کی طرح تھا...... کسی دل پذیر کلام و پیام سے خالی...... بس طوفانی ہواؤں کی شائیں، شائیں سے گونجتا ہوا۔
اب نہ کھڑے چین تھا نہ بیٹھے...... حیرانی و پریشانی تھی، سرگرانی تھی یوں...... گویا مسافر سو تا رہ گیا اور قافلہ آگے بڑھ گیا...... منزل گم ہو گئی۔

☆☆☆

''بہت ساری معلومات تو سفینہ سے مل چکی ہیں...... ماشاءاللہ آپ کا میکا اور سسرال سوسائٹی میں بہت عزت دار سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے پرنانا طفیل فاروقی صاحب مسلم لیگ کے اسٹوڈنٹس ونگ میں بہت مشہور تھے۔ تحریکِ آزادی میں اس وقت کے پُرجوش اور بہادر نوجوانوں کا ایک بھرپور رول ہے۔'' لیڈی صوفیہ جیسی ضعیف العمر خاتون کی یادداشت نے تو تاجور کو حیرت سے گنگ کر دیا تھا۔
''ماشاءاللہ آپ کو سب کچھ یاد ہے۔'' وہ بہ مشکل یہی کہہ سکیں۔
''ہوں book lovers اچھی میموری رکھتے ہیں...... آپ کو یہ سن کر شاید اور بھی حیرت ہو...... تحریکِ آزادی کے زمانے کے اخبارات آج بھی میری لائبریری میں محفوظ ہیں۔'' لیڈی صوفیہ نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا۔
پرنس اس گفتگو سے خاصا بور ہو چکا تھا اور بڑی بے چینی سے زارا کا انتظار کر رہا تھا۔
اگر زارا اٹھ کر نہ جاتی تو اب تک وہ سفینہ کے بارے میں ڈھیروں باتیں کر چکے ہوتے...... بہن ہونے کے ناتے زارا، سفینہ کے بارے میں بہت دلچسپ حقائق بھی اس کے سامنے لا سکتی تھی۔
جبکہ لیڈی صوفیہ سفینہ کو باقاعدہ پرپوز کر چکی تھیں، وہ کھل کر زارا سے سفینہ کے ٹاپک پر بات کر سکتا تھا۔ مگر اتنا پُرجوش استقبال کرنے والی زارا اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔
''کہیں اس کا پہلے سے کہیں جانے کا پروگرام تو نہیں تھا؟ شاید اسی لیے تھوڑی سی کمپنی دے کر اٹھ گئی ہو......'' وہ اندازوں سے کھیل رہا تھا۔ تاجور اب پہلے سے زیادہ گرم جوش انداز میں لیڈی صوفیہ کی باتیں سن رہی تھیں...... حیرت و دلچسپی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ اسی لمحے ملازم نے کھانا لگا دینے کی اطلاع دی۔
تاجور نے خادمہ سے پہلے لیڈی صوفیہ کا ہاتھ بہت پیار سے تھام لیا۔
''ارے وہ بے بی کہاں چلی گئی...... کیا وہ ہمارے ساتھ ڈنر نہیں کرے گی؟'' لیڈی صوفیہ کو اچانک زارا کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔
''آپ آیئے...... وہ ڈائننگ میں آ جائے گی۔''
تاجور کا ایک ہاتھ لیڈی صوفیہ کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے سے انہوں نے پرنس کو بھی آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔
پرنس نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور نکلتے، نکلتے ''بے بی سفینہ'' پر ایک نگاہ دوڑائی جو اپنی ماں کی پشت پر سوار تھی۔

☆☆☆

''کام کام کام......
دن بھر کریں ہم کام
جب کام سے تھک جائیں تو خوب کریں آرام
آرام کا ہے نام
ماسٹر موٹی فون۔''

وہ بھرے انداز میں گنگناتا ایک طرف سے دانت پیستا دھڑام سے بیڈ پر گر گیا تھا۔
پہلا دن......سائٹ کے کئی چکر......فون کالز، ای میلز......میٹنگز ایفی شینسی دکھانے کے چکر میں لنچ بھی رہ گیا تھا۔
ویران روڈ پر اس نے سو سے اوپر کی اسپیڈ سے گاڑی چلائی تھی۔ لیکن جیسے ہی جگمگاتی بارونق روڈ پر آیا......سامنے ہر طرح کی گاڑیاں سیلاب کی طرح نہیں ندی کی طرح بہہ رہی تھیں ہر دو منٹ بعد بریک، کار اے سی اور آٹو میٹک تھی......جو ابھی اس کی تو نہیں تھی مگر کمپنی کے کسی سینئر کے زیرِ استعمال رہی تھی۔ اب عارضی طور پر اس کو دے دی گئی تھی۔
اتنی باسہولت ڈرائیو کے باوجود وہ یوں تھکن سے نڈھال نظر آرہا تھا جیسے کار کو انجن سے چلا کر نہیں گھسیٹ کر لایا ہو۔
''یار یہ لوئر مڈل کلاس تو بڑی عیاش ہے، شام پانچ بجے اپنے گھر میں بیٹھ جاتے ہیں......بیویوں سے پاؤں دبواتے ہیں جیسے پہاڑ کھود کر آرہے ہوں......گورنمنٹ جاب میں تو سالے کام ہی نہیں کرتے بس حاضریاں لگوا کر تنخواہ بٹورتے ہیں۔ اسٹیٹس بنانا پھر اس کو مین ٹین کرنا......کس قدر مشکل کام ہے۔ توبہ، توبہ......'' اسے اپنی فرصتیں یاد آنے لگیں......دماغ کو ذرا سکون محسوس ہوا تو بھوک ستانے لگی۔ بہت خاص جگہ کا پزا اور سلاد ساتھ لایا تھا اچانک ہی تھکن پر بھوک غالب آگئی......جھٹکے سے اٹھ بیٹھا......واش روم میں جا کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے...... بھوک کی شدت نے منہ دھونے سے باز رکھا......پزا کھانے سے پہلے کولڈ ڈرنک کا ڈھکن کھول کر خالی پیٹ دو چار گھونٹ بھرے اور پھر پزا پر ٹوٹ پڑا تھا۔

☆☆☆

''دیکھنا زارا تمہیں وڈیو بنا کر ضرور سینڈ کرے گی۔'' ماہین سونے سے پہلے کی تیاری میں مصروف تھی، شاور لینے کے بعد اپنے بال سکھا رہی تھی۔ ڈرائیر آف کرتے ہوئے اس نے چھیڑ چھاڑ کے انداز میں سفینہ سے کہا۔
سفینہ جو خود کو مصروف ظاہر کرنے کے چکر میں کتابوں کے ڈھیر میں جیسے کوئی خاص کتاب تلاش کر رہی تھی۔
ماہین کی بات پر دل کو کچھ ہوا تو تھا......اس نے صرف ایک نظر ماہین پر ڈالی مگر خاموش رہی۔
''ممی کو فون کر کے پوچھتی ہوں کیا ہو رہا ہے تمہارے گھر پہنچ گئیں یا ابھی راستے میں ہیں۔'' ماہین کا جوش و خروش دیدنی تھا لیکن سفینہ کی طرف سے ہر بات کے جواب میں خاموشی تھی۔ ماہین کو نمبر ملاتا......پا کر تجسس کی لہریں وجود میں دوڑتی ضرور محسوس ہو رہی تھیں......وہ اپنے پورے حواسوں کے ساتھ ماہین کی طرف متوجہ تھی۔ بظاہر لگتا تھا کہ اپنے کام میں مصروف ہے۔
''السلام علیکم ممی......'' ماہین کا رابطہ ماں سے ہو گیا تھا۔ بڑی بے ساختگی سے سلام کیا تھا۔
''آپ کیا کر رہی ہیں......ابھی کہاں ہیں؟'' وہ سفینہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی۔
''کیا ابھی گھر میں ہیں......؟ کمال ہے......آپ ابھی تیار ہی نہیں ہوئیں؟'' ماہین کا جوش و خروش خود بخود

دھیما پڑ گیا۔ چہرے پر کوفت کے تاثرات تھے۔ سفینہ نے یہ سن کر بے اختیار اپنے موبائل فون پر ٹائم دیکھا تھا۔

''ہیں......؟ نہیں جا رہی ہیں...... کیا مطلب...... آپ تو صبح کہہ رہی تھیں، کہ جلدی میں ہوں ابھی سیلون جا رہی ہوں...... بعد میں بات کروں گی۔'' یوں لگ رہا تھا ماہین کے اعصاب پر زور سے دھچکا لگا ہو۔

سفینہ بھی اپنا کام بھول کر عجیب سی کیفیت میں ماہین کی طرف دیکھ رہی تھی جو دوسری طرف سے ہونے والی بات سننے میں مصروف تھی۔

''اوہ...... تو پھر آپ لوگ آج ڈنر پر نہیں جا رہے......؟'' ماہین کا لہجہ مایوسی کا غماز تھا...... آج تو اس نے جی بھر کر سفینہ کو تنگ کرنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔

''اچھا، اچھا...... پرنس جا رہے ہیں...... آپ نے فون کر کے آنٹی کو بتا دیا......؟'' وہ اب معمول کے انداز میں بات کر رہی تھی۔

''او کے...... پھر بات کروں گی...... ٹیک کیئر ممی......'' یہ کہہ کر ماہین نے سیل فون ایک طرف ڈال دیا...... اور سفینہ کی طرف دیکھا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... ممی، پاپا نہیں جا رہے مگر یہ کنفرم ہو گیا ہے کہ پرنس اپنی گرینڈ مام کے ساتھ تمہارے گھر پہنچ چکے ہیں۔''

''پہنچ چکے ہیں۔'' سفینہ کے دل کو کچھ ہوا...... وہ نظر چرا کر نئے سرے سے کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

''زارا کو فون کر کے پتا کرو...... کیا ہو رہا ہے؟ کیا سین چل رہا ہے؟'' ماہین نے سفینہ کا سیل اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی۔

''کیا بچوں والی حرکتیں کر رہی ہو ماہین...... مجھے نہیں کرنا فون وون...... تم پتا نہیں کیا سمجھ بیٹھی ہو...... فضول میں تنگ کرتی رہتی ہو۔ پرنس ہو سکتا ہے، بہت سے لوگوں کی نظر میں بہت خاص ہوں...... مگر میں ہرگز امپریسڈ نہیں ہوں...... کسی کو سپر لگژری لائف گزارتے دیکھ کر ہم لوگ خواہ مخواہ امپریس ہو جاتے ہیں...... کوئی کسی کو کچھ دیتا ہے کیا جس کے پاس جو ہوتا ہے وہ اس کا اپنا ہوتا ہے...... کوئی حسین ہے تو اپنے لیے...... رئیس ابن رئیس ہے تو اپنے لیے۔ آئندہ میرے سامنے پرنس کا نام مت لینا...... بس کہہ دیا۔'' ماہین ہکا بکا سفینہ کا نرالا روپ دیکھ رہی تھی۔

''س...... س...... سفینہ یہ ایک دم سے تمہیں کیا ہو گیا؟ اس ٹون میں تو تم نے مجھ سے کبھی بات نہیں کی۔ I am v.v shocked'' ماہین آنکھیں پھاڑے حیرت سے سفینہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''دیکھو ماہین...... تم میری دوست ہو...... ہنسی مذاق کرتی ہو میں تمہارے ہنسی مذاق کو انجوائے کرتی ہوں۔ تم نے خود ہی سے فرض کر لیا کہ میں پرنس کو سیریس لے رہی ہوں؟ ایسا کچھ نہیں ہے...... میں نے جاگتے میں کبھی خواب نہیں دیکھے...... اور دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔''

سفینہ کو یوں لگا جیسے وہ ماہین کو سخت سست سناتے سناتے رو پڑے گی۔

اس نے خود کو مزید بولنے سے اس لیے باز رکھا مبادا ماہین دل پر گرنے والے آنسوؤں کی آہٹ سن لے...... کہیں اس کے سامنے آنکھیں چھلک جائیں۔

مضبوط کردار، مضبوط اعصاب، احساسِ ذمے داری سے مالا مال ضرور تھی مگر تھی تو دوشیزہ جسے اپنے اولین خواب خزانے جیسے لگتے ہیں۔

وہ واش روم میں جا گھسی...... ماہین سناٹے میں کھڑی رہ گئی۔

(جاری ہے)

اپنی تو آگ بھی پیاری

ناہید سلطانہ اختر



نام تو ان کا نقاش یوسف تھا مگر اہلِ محلّہ میں عرفیت ''ڈاکٹر موٹو'' مشہور تھی۔ وجۂ عرفیت ان کا بہ اعتبار پیشہ ڈاکٹر ہونا اور ان کی غیر معمولی بھاری بھرکم جسامت تھی۔ ڈاکٹر موٹو چالیس، پینتالیس کے پیٹے میں تھے۔ چندیا چکنی تھی۔ دھوپ میں کھڑے ہو جاتے تو باقاعدہ چمکتی نظر آتی۔ ہنوز کنوارے تھے۔ سرکاری فلیٹ میں اکیلے رہتے کبھی کبھار گاؤں سے ان کی والدہ یا چھوٹا بھائی آکر چندون کو مہمان ہوتے تو فلیٹ کی بالکونی میں کچھ ہلچل سی دکھائی دیتی ورنہ بالکونی سنسان پڑی رہتی۔ ڈاکٹر موٹو اینستھیٹسٹ یعنی مریضوں کو بے ہوشی دینے والے ڈاکٹر

تھے۔ سرکاری اسپتال سے وابستہ تھے اور سننے میں آیا تھا کہ بہت لائق ڈاکٹر تھے۔ پڑوسی ملک کے سفیر کو اس کے ہرنیا کے آپریشن کے لیے اس قدر سہولت سے بے ہوشی دی تھی کہ وہ ان کا باقاعدہ معتقد تھا۔

محلے میں ڈاکٹر موٹو کے سب سے زیادہ گہرے مراسم پھل فروش حمید سے تھے جس نے برسا برس سے ایک سرکاری فلیٹ کے مخدوش گیراج میں اپنی دکان ڈال رکھی تھی۔ حمید صبح سویرے فروٹ منڈی سے تازہ پھلوں کی کھیپ لے کر آتا اور انہیں گیراج میں رکھ دیتا۔ دن بھر فروٹ کی چوبی پیٹیاں کھول، کھول کر انہیں اپنے چھابڑے میں سجائے جاتا۔ کوالٹی عمدہ، قیمت نہایت مناسب اور تول انتہائی اطمینان بخش ہوتی لہٰذا اس کے پاس گاہکوں کی آمدورفت دن بھر جاری وساری رہتی۔ سرکاری فلیٹوں کے عقب میں واقع پرائیویٹ کوٹھیوں کے خوش حال مکینوں کو ''ہوم ڈیلیوری'' کے لیے وہ دن میں وقفے، وقفے سے تین چار مرتبہ اپنا چھابڑا پھلوں سے بھر کر سر پر اٹھاتا اور کوٹھیوں کی طرف پھیرا لگانے چلا جاتا۔ شام تک اس کا سارا سودا ختم ہو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر موٹو پھل فروش حمید کے مستقل گاہکوں میں تھے۔

ڈاکٹر موٹو کا فلیٹ حمید کے ٹھیلے کے عین مقابل تھا۔ صبح اسپتال جانے سے پہلے ڈاکٹر موٹو، حمید کے ٹھیلے کا چکر لگاتے۔ پھلوں کی چکھا چکھی میں حسبِ دستیابی دو چار کیلے، ایک آدھ سیب، ایک دو امرود مع مسالا، انگوروں کا ایک خوشہ، گرما کی دو تین قاشوں پر بڑی خوبی سے ہاتھ صاف کرتے پھر پولی تھین کے ایک تھیلے میں موسم کا تقریباً ہر وہ پھل جو حمید کے ٹھیلے پر دستیاب ہوتا ڈلوا کر بھاری بھرکم تھیلا اپنے فلیٹ کی طرف لے جاتے۔ حمید سے ان کا حساب کتاب ہفتہ وار چلتا۔ اتوار کے دن وہ حمید کا ہفتے بھر کا حساب چکتا کرتے۔ حمید اکثر اپنے دوسرے گاہکوں کو بتاتا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت کا راز پھلوں کا بے تحاشا استعمال تھا۔ گھر، گھر سے کوڑا اٹھانے کے لیے آنے والی جمعدارنی کا کہنا تھا ڈاکٹر موٹو کے ڈسٹ بن میں پھلوں کے اتنے چھلکے ہوتے ہیں کہ ان سے گلاس بھر جوس نکالا جا سکتا ہے۔ چھی، چھی کیسی غلیظ سوچ تھی جمعدارنی کی۔ ڈسٹ بن سے نکلے چھلکوں کا جوس!

ڈاکٹر موٹو کے جتنے پھل فروش حمید سے خوشگوار تعلقات تھے اسی قدر محلے کے بچوں بالخصوص حارث سے ناخوشگوار! بچوں کے سلام کے جواب میں وہ اکثر انہیں بھنّا کر دیکھتے۔ حارث سے تو جیسے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا لیکن حارث کا استقلال بھی مثالی تھا۔ ڈاکٹر موٹو کو دیکھتے ہی وہ لہک کر بہ آواز بلند سلام داغتا جواباً ڈاکٹر موٹو اسے دشمن کی نظر سے دیکھتے۔ حارث سے ڈاکٹر موٹو کے اس بغضِ للّٰہی کا سبب اس محلے میں حارث اور اہلِ خانہ کی قدم رنجہ فرمائی کے بعد آمدہ یومِ آزادی پر دھواں دھار پٹاخے بازی تھی۔ ڈاکٹر موٹو کے فلیٹ والی عمارت اور حمید کے ٹھیلے کے درمیان موجود میدان میں حارث اور اس کے دوستوں نے یومِ آزادی پر پٹاخے چھوڑے تو ڈاکٹر موٹو نے پہلے تو انہیں اپنے فلیٹ کی بالکونی سے جھانک کر تنبیہ کی۔ نہ مانے تو ان پر اوپر سے پانی پھینکا۔ بچے پھر بھی میدان چھوڑ کر نہ بھاگے تو ڈاکٹر موٹو نیچے اترے اور انہوں نے اسی میدان میں پتھر اٹھا کر بچوں کی طرف پھینکنا شروع کر دیے۔ بچے پھر بھی باز نہ آئے تو ڈاکٹر موٹو نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ پہلے چھوٹی، چھوٹی، ہلکی، ہلکی پھر ایسی بھاری بھرکم کہ محلے والوں کو پہلی مرتبہ یہ پتا چلا کہ ڈاکٹر موٹو اعلیٰ درجے کے گالی نواز بھی تھے۔ اس دن کے بعد ڈاکٹر موٹو کی ''حارث اینڈ پارٹی'' سے ٹھن گئی۔ حارث اور اس کے دوستوں کو دیکھتے ہی ڈاکٹر موٹو کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ چہرے کے خطوط سے یوں لگتا جیسے کوئی کڑوی، کسیلی چیز منہ میں آ گئی ہو مگر حارث انہیں پھر بھی مستقل مزاجی سے سلام داغے جاتا۔

شبِ برأت آئی تو محلے کے بچوں نے پھر پٹاخے بازی کی۔ حارث پیش، پیش تھا۔ ڈاکٹر موٹو نے یومِ آزادی والی تاریخ پھر دُہرائی۔ گالیاں دینے کے بعد واپس اپنے فلیٹ میں گئے۔ ون فائیو پر فون کر کے پولیس کو اپنا حوالہ دیا اور پٹاخے بازی کرنے والے ناہنجار بچوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اپنے علاقے میں آنے

کی دعوت دی۔ پولیس کی وین آئی تو بچے اِدھر اُدھر بھاگ لیے جو ہاتھ آئے ان میں حارث بھی تھا۔ پولیس والوں نے بچوں کو ڈانٹا اور کہا کیوں شریف لوگوں کی نیندیں خراب کرتے ہو چلو اپنے گھر بھاگو۔ میدان صاف ہو گیا لیکن پولیس کی گاڑی جانے کے کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر موٹو کے فلیٹ کے سامنے میدان میں ڈھیروں بچے دیکھتے ہی دیکھتے اکٹھے ہو گئے اور سب نے مل کر ایسی دھواں دھار پٹاخے بازی کی کہ اہلِ محلہ نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور ڈاکٹر موٹو پولیس والوں کی شان میں ایسی ویسی کہتے پائے گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر موٹو کے پولیس بلانے پر بعض نوجوانوں اور بڑوں کو اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے احتجاجاً بچوں کو نہ صرف پٹاخے چھوڑنے پر اکسایا بلکہ دامے، درمے، سخنے کمک بھی بہم پہنچائی۔

شب برأت اور یوم آزادی پر بچوں کی جانب سے پٹاخے بازی اور ڈاکٹر موٹو کی طرف سے دشنام طرازی سالانہ روایت بن گئی۔ محلے کے بچوں اور ڈاکٹر موٹو میں سال بھر بلا کی ٹھنی رہتی۔

جہاں تک بڑوں کا تعلق تھا ڈاکٹر موٹو اپنے ''کنوارپنے'' کے باعث بہت سے اہلِ محلہ کی نظروں میں تھے۔ کسی کے گھر میں بہن بیٹھی تھی کسی کے گھر بیٹی، کسی کی بھانجی تو کسی کی بھتیجی اور جس کے کوئی نہ تھی وہ اپنے کسی جاننے والے کی مدد کرنے کا خواہاں...... رشتے ناتے کرانے والیوں کو بھی ڈاکٹر موٹو سے کافی دلچسپی تھی۔ ایسے رشتوں کی تو خاص ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ لوگ آرزو کرتے ہیں اکیلے اور خود مختار لڑکوں کی...... ''لڑکا'' وہ بھی ڈاکٹر، سرکار کا ملازم، اکیلا اور خود مختار! کیا ہوا اگر چندیا صاف تھی۔ بعض کہتے ہیں ایسا مرد خوش قسمت ہوتا ہے تو بعض اسے مرد کے صاحبِ مال و متاع ہونے کی نشانی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر موٹو کی گنجی چندیا کے باوجود اُن کے رشتے میں دلچسپی رکھنے والوں کی محلے میں کمی نہ تھی!

مگر ان آرزومندوں پر بار، بار دُہرائے جانے والے اس منظر نے بجلی گرادی کہ ڈاکٹر موٹو کے فلیٹ میں انہی کی طرح بھاری ڈیل ڈول والی سفید کوٹ میں ملبوس ایک خاتون ڈاکٹر کی آمدورفت شروع ہو گئی جو شاید عادتاً یا محض دیکھنے والی نظروں کو دکھانے کے لیے اپنے ہاتھ میں اسٹیتھ اسکوپ لیے اپنی گاڑی سے اترتی اور کشاں، کشاں ڈاکٹر موٹو کے فلیٹ میں چلی جاتی۔ محلے بھر میں سب سے پہلے حارث کی جہاندیدہ دادی نے تاڑا کہ اس خاتون سے ڈاکٹر موٹو کا چکر چل رہا تھا۔ بات پھیلی اور کھوجیو نے کھوج لگائی تو پتا چلا مذکورہ خاتون کسی نجی اسپتال سے بطور ماہر زچہ و بچہ وابستہ تھی۔ باپ ریٹائرڈ ایڈیشنل سیکریٹری تھے۔ کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ ڈاکٹر موٹو کو مذکورہ نجی اسپتال میں کسی مریضہ کو آپریشن سے قبل بے ہوشی دینے کے لیے بلایا گیا تھا۔ وہیں اس خاتون گائنا کالوجسٹ سے ان کا افیئر شروع ہوا تھا۔

حمید کی زبانی لوگوں کو پتا چلا کہ ڈاکٹر موٹو نے پھل زیادہ خریدنے شروع کر دیے تھے' جمعدارنی نے بتایا ان کے ڈسٹ بن میں اب ملک پیک کے خالی ڈبے اور کولڈ ڈرنکس کی خالی بوتلیں بھی نکلنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر موٹو کی ڈاکٹر دوست گاڑی سے اترتی تو اس کے ہاتھ میں اسٹیتھ اسکوپ کی جگہ کھانے پینے کے مختلف آؤٹ لٹس شاپرز ہوتے۔ ڈاکٹر موٹو کے سناٹوں میں ڈوبے رہنے والے فلیٹ سے اب نصرت فتح علی کی آواز آس پاس کے گھروں تک پہنچنے لگی۔

خنجر ہیں تیری آنکھیں تلوار تیری آنکھیں
زندہ نہ رہنے دیں گی اے یار تیری باتیں......اور......
تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آکر تو دیکھو!

ڈاکٹر موٹو کو عشق ہو گیا تھا۔

چند ماہ یہ سلسلہ چلا پھر ایک دن ڈاکٹر موٹو کی والدہ اور بھائی گاؤں سے آ گئے۔ بھائی نے بالکونی کو رنگ برنگے قمقموں سے آراستہ کرنا شروع کیا اور ان کی والدہ نے محلے داروں کو بتایا۔ دو دن بعد ڈاکٹر موٹو کی شادی تھی۔

دو دن بعد ان کی شادی ہو گئی۔ اگلی صبح ڈاکٹر موٹو کی دلہن اپنے میکے جانے کے لیے فلیٹ سے نکلی تو اہلِ محلہ نے دیکھا یہ تو وہی خاتون تھی جو گزشتہ کئی ماہ سے بہت

با قاعدگی سے ان کے گھر آ جا رہی تھی۔

ڈاکٹر موٹو اب کنوارے نہ رہے، شادی شدہ ہو گئے۔ ان کا رشتہ کرانے کے آرزو مند بے امید ہو کر بیٹھ رہے۔ ان کے فلیٹ سے نصرت فتح علی کی تانیں سنائی دینا بند ہو گئیں اور فلیٹ کی ہمہ وقت بے پردہ نظر آنے والی کھڑکیوں پر گہرے گلابی پردے تنے رہنے لگے۔

ڈاکٹر موٹو کے ہاں اب دو موٹر کاریں تھیں۔ ایک ان کی اپنی اور دوسری ان کی بیگم کی۔ صبح کو دونوں اپنی، اپنی کار میں کام پر جاتے۔ شام کو اکثر دونوں اکٹھے ایک گاڑی میں بیٹھ کر سیر کو نکلتے۔ ان کی بیگم بڑے کرّوفر سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتیں اور اہلِ محلّہ میں سے شاذ ہی کسی کو لفٹ کراتیں۔ اسی لیے ان کے امید سے ہونے کی خبر خاصی تاخیر سے اہلِ محلّہ پر کھلی۔

ڈاکٹر موٹو کی بیگم نے ایک بیٹے کو جنم دیا اور یوں وہ ایک بیٹے کے باپ بھی بن گئے۔ بیگم صاحبہ کچھ دن چھٹی پر رہیں پھر دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگیں۔ بچے کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ایک کل وقتی ملازم رکھ لیا گیا جو بچے کی دیکھ بھال کے ساتھ گھر کے کام کاج بھی نمٹاتا۔

بچہ کچھ بڑا ہوا تو ڈاکٹر موٹو اسے اکثر گود میں لے کر ٹہلانے کے لیے گھر سے باہر لانے لگے۔ بچے کے ساتھ ان کا لاڈ اور احتیاط بچے سے ان کی غیر معمولی محبت کا اظہار کرتے۔ اسے سینے سے لگائے اکثر وہ اپنا گال اس کے گال سے مس کر کے زیرِ لب نہ جانے کیا کچھ بولے جاتے۔ اہلِ محلّہ بچے سے ڈاکٹر موٹو کی والہانہ محبت کے نظارے دیکھتے لیکن خود صاحبِ اولاد ہونے کے باوجود محلے کے بچوں بالخصوص حارث سے ان کے رویّے میں سر مو فرق نہ آیا۔ محلے کا کوئی بچہ جب جوشِ ہمسائیگی میں ڈاکٹر موٹو کے بچے کا گال یا ہاتھ چھونے یا پاؤں گدگدانے کی کوشش کرتا تو وہ پیار کرنے والے کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیتے یا اسے جھڑک کر بھگا دیتے۔ ایسے میں حارث کے گھر کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی دادی بڑبڑاتیں۔

''توبہ، توبہ، یہ ڈاکٹر موٹو تو اولاد والا ہو کر بھی اکل کھرا ہی رہا۔''

''میرے ہاں تو جب بلال پیدا ہوا تو مجھے دنیا کا ہر بچہ اچھا لگنے لگا تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کیسے آدمی ہیں۔ اپنے بچے کے سوا انہیں ہر بچہ برا لگتا ہے۔'' محلے کی ایک آنٹی کہتیں۔

ڈاکٹر موٹو محلے کے بچوں کو اب بھی سلام کا جواب دینا گوارا نہ کرتے۔ بچوں کا میدان میں کرکٹ کھیلنا انہیں اب بھی ناگوار گزرتا۔ شبِ برأت اور یوم آزادی پر ان کی پٹاخے بازی پر وہ اب بھی اسی طرح برہم ہوتے۔ کبھی اپنے فلیٹ کی بالکونی سے ان پر پانی کی دھار چھوڑتے کبھی پتھر مارتے اور کبھی گالم گلوچ پر اتر آتے۔

ڈاکٹر موٹو کا بچہ بڑا ہونے لگا۔ پہلے وہ اسے گود میں لے کر بہلایا کرتے تھے اب اس کی انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ، ساتھ ٹہلانے لگے۔ اسے چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتے دیکھ کر ان کی باچھیں کھلی پڑتیں۔

ڈاکٹر موٹو کا بیٹا میدان میں بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب اپنا دایاں پاؤں زمین پر رکھ کر بائیں پاؤں کے پنجے کے بل میدان کے ایک کونے پر بیٹھ جاتے اور اپنے دونوں بازو وا کر دیتے۔ ان کا بیٹا آیان دور سے دوڑتا ہوا ان کی طرف آتا اور وہ اسے اپنے دونوں بازوؤں کے درمیان سمیٹ کر سینے سے لگا لیتے اور والہانہ اس کے گال چومنے لگتے۔

آیان اور بڑا ہو گیا۔ اب وہ چھوٹا سا بلا لے کر شام کو میدان میں آ کھڑا ہوتا۔ ڈاکٹر موٹو کے ہاتھ میں گیند ہوتی۔ وہ اپنے بیٹے کو بالنگ کراتے اور وہ بیٹنگ کرتا۔ محلے کا کوئی بچہ درمیان میں آنے کی کوشش کرتا تو ڈاکٹر موٹو اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے۔

آیان سمجھ دار ہو گیا۔ اب اس نے باپ کی ہدایات نظر انداز کر کے محلے کے بچوں سے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیے۔ ڈاکٹر موٹو کے ہزار تردد، واضح ہدایتوں اور تنبیہ آمیز صداؤں کے باوجود اس نے محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر موٹو بالنگ کرانا چاہتے تو وہ صاف کہہ دیتا۔

''نہیں پاپا! آپ کے ساتھ نہیں کھیلنا مجھے۔''

محلے کے بچوں کے ساتھ آیان کے تعلقات روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔

آیان اسکول جانے لگا۔ ڈاکٹر موٹو نے اس کا داخلہ شہر کے سب سے مہنگے پرائیویٹ اسکول میں کرایا تھا۔ آیان بڑے ٹھاٹ باٹ سے اسکول جاتا۔ اچھی خوراک اور بہترین نگہداشت کے باعث وہ پانچ سال کی عمر میں سات، آٹھ برس کا بچہ دکھائی دینے لگا تھا۔ ڈاکٹر موٹو اور ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی موقع ملتے ہی آیان کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اس محلے کے بچے اس کے ساتھ کھیلنے کے لائق نہیں تھے۔

''تو پھر ہم یہاں رہتے کیوں ہیں؟'' ایک روز آیان نے سوال کیا۔

''کیونکہ تمہارے پاپا کا اسپتال یہاں سے نزدیک ہے۔'' ڈاکٹر موٹو کی بیگم نے پیار سے اس کی ناک چھو کر کہا۔

شبِ برأت آئی تو پٹاخوں کی آواز سن کر آیان اپنے فلیٹ کی بالکونی میں نکل آیا اور بالکونی میں رکھی کرسی پر چڑھ کر باہر دیکھنے لگا۔ پٹاخوں کے دھماکے اور ان سے نکلتی چنگاریاں اسے مبہوت کر رہی تھیں۔

''یہ گندے بچے ہیں۔'' ڈاکٹر موٹو نے آ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

وہ آیان کو بالکونی سے کمرے میں لے گئے۔

پٹاخوں کا شور بڑھا تو انہوں نے اپنے آزمودہ ہتھکنڈے آزمانے شروع کر دیے۔ پہلے بچوں پر پانی پھینکا پھر نیچے اترے کنکر پتھر چن کر لائے اور بالکونی سے بچوں پر برسانے شروع کر دیے پھر حسبِ عادت گالم گلوچ شروع کر دی۔ آیان چپ چاپ دیکھتا رہا۔

یومِ آزادی پر محلے کے بچوں نے اپنے، اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگائیں تو ڈاکٹر موٹو کو بھی آیان کی فرمائش پر جھنڈیاں لا کر آراستہ کرنا پڑیں۔ رات کو محلے کے بچوں نے اپنے گھروں پر چراغاں کیا تو آیان کی ضد پر وہ بھی مومی شمعیں لا کر بالکونی کی منڈیر پر آراستہ اور روشن کرنے پر مجبور ہوئے مگر محلے کے بچوں کی پٹاخے بازی پر انہوں نے کم و بیش پہلے جیسے ردِعمل کا اظہار کیا۔

آیان بالکونی میں کھڑا دیکھتا رہا۔

اگلے برس یومِ آزادی پر آیان نے بھی پٹاخے اور پھلجھڑیاں خریدنے کی فرمائش داغی تو ڈاکٹر موٹو نے اسے سمجھایا۔

''یہ گندے بچوں کا کام ہے۔ اچھے بچے پٹاخے نہیں چھوڑتے۔''

آیان نے ضد نہیں کی۔

اس سے اگلے برس آیان اپنی فرمائش پوری نہ کیے جانے پر مچل، مچل کر رو دیا۔

یومِ آزادی اور شبِ برأت دونوں مواقع پر محلے کے بچوں نے ہر سال کی طرح خوب رونق لگائی اور وہ اسی طرح بکتے جھکتے اور بڑبڑاتے رہے۔

لیکن اس سے اگلے برس یومِ آزادی کی شام حارث کی دادی نے دوسری منزل پر واقع اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے ایک نیا منظر دیکھا۔

ڈاکٹر موٹو اپنے بیٹے آیان کے ساتھ اپنے فلیٹ کے سامنے واقع بچوں کے کھیلنے کے میدان میں کھڑے تھے۔ آیان کے ہاتھ میں ایک ڈبیا تھی جس میں سے وہ یکے بعد دیگرے پٹاخے نکال، نکال کر باپ کو دے رہا تھا۔ ڈاکٹر موٹو کے ہاتھ میں دیا سلائی تھی۔ آیان کے ہاتھ سے پٹاخا لے کر وہ دیا سلائی جلاتے اور پٹاخے کو سلگا کر دور اچھال دیتے پٹاخا ایک دھماکے کے ساتھ پھٹتا تو میدان میں ان دونوں کے آس پاس کھڑے بچوں میں سے بعض اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے دور ہٹ جاتے اور بعض شور مچاتے اِدھر اُدھر بھاگ لیتے۔ آیان بہت خوش تھا اور اس کی خوشی عکس بن کر ڈاکٹر موٹو کے چہرے پر جھلملا رہی تھی۔

حارث کی دادی محوِ حیرت کچھ دیر یہ منظر دیکھتی رہیں پھر پلٹیں اور کمرے کے اٹیچڈ باتھ کے بند دروازے کو زور، زور سے دھڑ دھڑاتے ہوئے حارث سے جو یومِ آزادی کی تیاریوں کے لیے غسل کر رہا تھا بآوازِ بلند بولیں۔

''حارث! اے حارث! جلدی نکل غسل خانے سے ذرا دیکھ تو ڈاکٹر موٹو کو آج کیا ہو گیا ہے۔''



ناولٹ

من جانِ بازم

سحر ساجد

آخری حصہ

''محبت کوئی چھوڑنے لائق شے نہیں ہے...... یہ شروعات دیکھ کر کی جاتی ہے نہ اختتام...... اسے ہونا ہو تو ہو جاتی ہے، نہ ہونا ہو تو کوئی زور بھی نہیں چلتا۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ دل کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟ ساتھ کیوں چھوٹ جاتے ہیں؟ دوریاں کیوں آن ٹپکتی ہیں؟ فاصلے ایسے کیوں حائل ہو جاتے ہیں جو مٹائے نہیں مٹتے...... کیوں...... آخر کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ زندگی ہے...... جہاں کوئی نہ کوئی ایسی رہ گزر سامنے آجاتی ہے کہ ساتھ، ساتھ چلنے کی شدید ترین خواہش کے باوجود...... ساتھ چلا جا نہیں سکتا...... تعلق کی شدت کے باوجود تعلق قائم رکھا جا نہیں سکتا...... اسے ٹوٹنا ہوتا ہے سو ٹوٹ جاتا ہے یا توڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی حادثہ، کوئی واقعہ، تعلق پر کسی بھاری بھرکم پتھر کی طرح گرتا ہے اور اسے اِک ناگوار بوجھ بنا چھوڑتا ہے۔ تو محبت اختتام کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے اور نہ ہی شروعات کو دیکھ کر...... اسے جس طرح سے ہونا ہوتا ہے یہ ہو جاتی ہے...اور جس طرح سے ٹوٹنا ہوتا ہے، یہ ٹوٹ بھی جاتی ہے۔ کوششیں بارآور نہیں ثابت نہیں ہوسکتیں، نہ اس



کے ہونے میں اور نہ اس کے ٹوٹنے میں......تو اے زندگی خوش آمدید......جہاں تعلق بنتے بھی ہیں اور ٹوٹتے بھی......

☆☆☆

''جو ہوا وہ ہی بہتر تھا۔''

وہ دونوں اِک دوسرے کی زندگی میں......اِک دوسرے کو بہت کچھ سمجھانے آئے تھے، یہ بتانے آئے تھے اور بس...... بعض خواہشات یعنی آرزوئیں اور تمنائیں شدید ہونے کے باوجود پوری نہیں ہوسکتیں، پوری نہیں کی جاسکتیں...... حیدر اور ہنیا کا جوڑ نہیں تھا تو بس نہیں تھا۔ یہ میرے اور آپ کے اور حتیٰ کہ ان دونوں کے بھی لاکھ چاہنے کے باوجود نہیں ہونا تھا۔ سو نہیں ہوا......نہیں ہوسکتا تھا۔ تو حیدر جب اسپتال سے گھر شفٹ ہوا تو ثنا تب بھی اسے وزٹ کرتی رہی۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی لائی تھی حیدر سے ملوانے۔ وہ دن اس کا آخری دن تھا پاکستان میں، اگلی صبح اس کی فلائٹ تھی اور وہ پہلا دن تھا جب وہ اداس نظر آئی۔ اس کے پاس کرنے کو باتیں تو تھیں مگر اس دن ہر دوسرے سیکنڈ میں وہ اپنی پہلی کہی بات کو بھول سی جاتی تھی۔

''میں کیا کہہ رہی تھی......'' اور پھر اسے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہنا پڑتا، حیدر اس کا اچھا دوست تھا، ایک مخلص دوست اور ثنا نے ثابت کیا کہ کم از کم وہ تعلق نبھانے میں اپنی دوست جیسی نہیں، اس آخری دن وہ اسے پارک لے کر گئی۔ انہوں نے بہت سی یادوں کو یاد کیا تھا، بے تکے قہقہے لگائے......وہ بھول گئی تھی بھول جاتی تھی مگر پھر بھی بولتی رہی......اور یہ اِک حقیقت تھی ثنا کے مختصر سے ساتھ نے حیدر پہ بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ اسے خود کو مضبوط بنانے میں کمک ملی تھی اور پھر جب وہ اس کو اس کے دروازے پر چھوڑنے آئی تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔

ثنا آج بھی......بلاناغہ نہ سہی، مسلسل نہ سہی لیکن اکثر حیدر کو فون کیا کرتی تھی۔ اور تعلق جو بھی تھا اسے ایسے ہی نبھایا جاسکتا تھا۔

وفا صرف محبت کے تعلق میں ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہر رشتے، ہر ناتے، ہر تعلق میں موجود ہوتی ہے اور یہ محبت سے بڑی چیز ہوتی ہے یقین کریں کہ یہ محبت سے بڑی چیز ہی ہے۔

☆☆☆

اور مومی نے بہت اچھا کیا جو حیدر سے کم از کم محبت کی بات نہیں کی تھی۔ اس نے حقائق کی بات کی تھی۔ وفا کی بات کہی تھی اور اس شام شفق کی سرخی کو شام کی سیاہی سے گلے ملتے دیکھتے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا۔ ہر دفعہ آسمانوں سے دکھ ہی نہیں اتارا جاتا...... ہر دفعہ تکلیف تھوڑی ہی اترتی ہے...... ہر دفعہ ایسا تھوڑی ہوتا ہے بھلا......

کوئی ہاتھ، شفا والا بھی ہوتا ہے۔ زخم اتنی آسانی سے مسلے بھی نہیں جاتے۔ انہیں مندمل ہونے میں بھی وقت لگتا ہے۔ انتظار وہ بھی تکلیف دہ، تو زخموں کو مسلنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا جاتا...... بس اِک جلا عطا کردی جاتی ہے۔

''تو کیا وہ واقعی مومی سے شادی پر راضی ہوگیا تھا؟'' حد ہوگئی بھئی......ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں آپ؟ اس نے تو بس مومی کا اعتبار کرلیا تھا۔ گر کسی پہ بوجھ بن کر ہی زندگی گزارنی تھی تو ہنیا کیا بری تھی؟ چلو ذرا سی بے وفا نکلی تو کیا ہوا......محبت تو تھی ناں اس سے تو اسی محبت کا تاوان وصول کرتے ہوئے اسی کو ہی آزما لیا جاتا......

وہ خود کو اشرف گردانتا تھا......اور یہ اپنے اشرف ہونے کی وہ توہین سمجھتا تھا کہ وہ کسی بھی......کسی بھی عورت کو محض اپنے لیے خود کے ساتھ باندھ کر رکھ دے۔ چاہے وہ ہنیا ہوتی یا مومی......وہ جن نہیں تھا جو اتنا مضبوط ہوتا اور یہی تو ساری غلطی تھی......وہ جن نہیں تھا...انسان تھا......انسان......جو جب خود کو سمجھ لے......جان لے اور ڈٹ جائے تو تو کیا پہاڑ تو کیا جن اس کے لیے سب مسخر کردینے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

☆☆☆

اور اس دفعہ حسیب اپنا ٹرانسفر رکوا نہ پائے تھے۔ ان کا ٹرانسفر مری، لوئر ٹوپہ کی نان فلائنگ ائربیس پر

کر دیا گیا تھا۔
کوئی بھی خوش نہیں تھا مگر جانا تو تھا ہی اب......سب سے زیادہ ڈسٹرب مومی تھی۔ جب کچھ صحیح ہونے کی ذراسی امید بندھی تھی تو یہ ایک الٹا کام ہو گیا تھا......اگلے ماہ تک حسیب کو لوئر ٹوپہ میں رپورٹ کرنی تھی۔
گھر والے مان گئے تھے لیکن وہ خود سے رشتہ ڈالنے سے تو رہے......اور مومی کو حیدر کے جواب کا انتظار......وہ جتنا بھی بددل ہو کر آئی تھی، ناامید ہو کر آئی اس کے باوجود اسے جواب کا انتظار تھا۔ انسان......اپنے چھوٹے سے چھوٹے معاملات کے لیے معجزوں کے انتظار میں رہتا ہے......تو مومی بھی ایسے ہی کسی معجزے کے انتظار میں تھی......اس نے تو بڑی لڑائی لڑی تھی......کوشش کی تھی......حالات کو اِک صحیح سمت کی طرف لے جانے کے لیے اور اب اس کوشش اور جنگ کے بعد......اِک معجزے کا ہو جانا وہ حق سمجھتی تھی۔
اور حیدر کا جواب......؟
سمیعہ کافی دنوں تک تو اس سے بات کر ہی نہیں سکیں......اور جب بات ہوئی تو......
''ممی کمال کرتی ہیں آپ بھی......! مجھے اس حالت میں کسی سے شادی کرنا ہوتی ناں تو وہ بنیا ٹھیک تھی یہاں میں سرجری کے لیے جانے کی تیاری میں ہوں اور وہاں آپ کو میرے سر پر سہرا سجانے کا شوق ہو رہا ہے......کم آن ممی......کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ بے حد تپ کر بولا۔
''حیدر کبھی تو فوجی سے انسان بن جایا کرو۔'' وہ بددلی سے بولی تھیں۔
''اور آپ کبھی تو ان ایموشنل ہو کر دکھایا کریں۔'' وہ بیزار ہوا۔
''حیدر......'' وہ اٹھ کر اس تک آئی تھیں......اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔
''میں کون سا سہرا ہاتھ میں لیے کھڑی ہوں، تم جا رہے ہو خیر سے جاؤ......لیکن جب تم ساتھ صحت کے لوٹو گے تو تب......'' اور وہ اچھی طرح سے ان کے تب کا مطلب جان گیا تھا۔
''ممی......'' اس نے گہری سانس بھری۔ ''تب کی تب دیکھی جائے گی......ابھی میں کچھ کہہ سکتا ہوں نہ ہی کسی کو تب کی آس پر چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔
let the thing be clear'' وہ اس جواب پر کچھ ناامید سی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بے دلی سے نیم مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے اس کا ہاتھ تھپک کر متفق ہونے کا اظہار کیا تھا۔

☆☆☆

سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔
اور پھر وہ دن بھی چڑھ کر آ گیا تھا جب اسے لندن کے لیے اپنی پرواز پکڑنی تھی......سمیعہ اتنے بہت سارے دن میں آج پہلی بار اسے گلے سے لگا کر پھوٹ، پھوٹ کر روئی تھیں......منزہ کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ عادل بھی موجود تھا۔
اخراجات کافی زیادہ تھے۔ اور اس کے لیے کرنل صاحب نے اپنے پلاٹس بیچے تھے اور جب سے کلب والوں کو حیدر کے ساتھ ہونے والے حادثے کا علم ہوا تھا انہوں نے اسے کلب کی اعزازی ممبر شپ دیتے ہوئے اس کے مستقل ممبر ہونے کی فیس re fund کر دی تھی......گو کہ عموماً ایسا ہوتا نہیں......یقیناً کلب کا اونر اچھے دل کا تھا تو جب سب انتظامات مکمل ہو چکے......رقم کا بندوبست ہو گیا۔ تو حیدر لندن کے سرد موسموں سے ملنے چلا گیا تھا۔
منزہ نے شاید زیادہ اسٹریس لیا تھا۔ ٹھیک اسی رات اس کی حالت بگڑی تھی۔ بی پی ہائی......اتنا کہ ڈاکٹر نے سی سیکشن تجویز کیا تھا۔ ورنہ بے بی کی جان کو خطرہ تھا......اور بے بی محض سات ماہ کی کمزور سی بچی تھی۔ جسے انکیوبیٹر میں رکھا گیا تھا۔ ماں بے ہوش، بچی انکیوبیٹر میں اور سمیعہ ہوش کھو دینے کے واسطے بالکل تیار......اُدھر سے حیدر کی پریشانی......عادل نہ ہوتا تو

یقیناً وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ چکی ہوتیں۔

اتنے سالوں بعد عادل کی اولاد دنیا میں آئی تھی لیکن......جس طرح آئی تھی جن حالات میں آئی تھی، وہ ذہنی توازن خراب کردینے کے لیے کافی تھا۔سمیعہ بچی کے ساتھ ہوتیں تو عادل، منزہ کے پاس......اور جب وہ پیدا ہوئی تو۔۔کچھ خرابی کی بنا پر بچی کا معدہ واش کرنا پڑا۔ وہ......وہ اتنی بیمار ہوگئی تھی کہ جان بچانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کی جارہی تھیں۔

منزہ کا الگ رو، روکر برا حال اور ضد کہ مجھے بیٹی کو دیکھنا ہے......اپنے بچے کو دیکھنا ہے......اور حالت یہ کہ دو قدم بھی نہ چل سکتی تھی اور بچی کو کیسے اس کے پاس لایا جاتا، اس کی ضد پر عادل بچی کی چند تصاویر کھینچ لایا تھا......اور جب اس نے وہ تصویریں دیکھیں نالیوں میں جکڑی......انکیوبیٹر میں موجود......اس کی بچی وہ تو اتنی کمزور تھی کہ سانس بھی مشکل سے لیتی تھی۔

منزہ ہونٹ تصویر پر رکھے زاروقطار روئے جارہی تھی۔عادل کے لیے اسے سنبھالنا ناممکن سا ہو رہا تھا۔

سمیعہ الگ سے خراب کیفیت میں تھیں۔گھر جانے کا کسی کو ہوش ہی نہیں تھا۔گھر سے کھانا آجایا کرتا تھا۔دو چار دن بعد وہ بھاگم بھاگ گھر جاتیں اور چینج کرکے آجاتی تھیں، ان کا سیل فون کدھر تھا کچھ معلوم نہیں تھا۔ اور وہاں لندن میں حیدر بھی اسپتال میں ایڈمٹ ہوچکا تھا۔

اور یہ اتنا سارا سب کچھ ایک ساتھ ہی ہونا تھا اور پھر اس طرح سے ہوا تھا کہ سب کچھ الجھ کر گڈمڈ ہوکر رہ گیا تھا۔

قدرت کے اپنے ہی طریقے......اپنے ہی قانون۔

پلیٹ میں رکھ کر دی جانے والی نعمت کی قدر کون کرتا ہے؟ انسان تو وہ ناشکرا ہے کہ جو من وسلویٰ سے منہ موڑ کر اپنی خواہش کا تابع ہوا تھا رزق آسمان سے اترتا تھا......بنا کسی تردد کے کسی مشکل کے کسی کوشش کے......تو قدر کیسے ہوتی؟ تو ایک طاقت ہے......فطرت اور جس کے اپنے طریقے اور اپنے قانون ہوتے ہیں۔

☆☆☆

وہ لوگ وہاں سے جانے والے تھے فی الحال پیکنگ صرف بے حد ضروری چیزوں کی گئی تھی۔بیس میں شفٹ ہونا آسان نہیں تھا.....کہاں یہ گھر اور نہ معلوم وہاں بیس میں کیسا گھر ملے گا۔اگلی صبح روانگی تھی اور بس یہیں پر آکر مومی خود کو روک نہیں پائی تھی۔کال کا جواب ریکارڈڈ ٹیپ سے آیا تھا۔اس نے چند لمحے ٹھہر کر پھر سے کال کی اور پھر وہ ہی جواب، وہ بے طرح پریشان ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے رک کر سوچا......کھڑکی میں کھڑے ہوکر اُن کے گھر کو دیکھا، گھر کی لائٹس آن تھیں......اور پھر وہ رکی نہیں تھی۔

اسٹول کو گلے میں لیتے ہوئے وہ تیز، تیز قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اتری......اور چند سیکنڈز میں ان کے گھر کے گیٹ پر تھی اور آج تو چوکیدار بھی گیٹ پر موجود نہیں تھا۔مومنہ کو کال بیل بجانا پڑی......کئی دفعہ اطلاعی گھنٹی پہ ہاتھ رکھنے کے بعد افضل کا چہرہ نظر آیا تھا۔

''مومی باجی آپ......؟'' اس نے حیران ہوتے ہوئے اسے گیٹ کی چھوٹی سی کھڑکی سے دیکھا اور پھر فوراً دروازہ کھولا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ رکی نہیں سیدھی اندر کی طرف بڑھی تھی۔

''گھر پہ کوئی نہیں ہے مومی باجی......'' افضل کی بات سن کر وہ ٹھٹک کر رکی اور مڑ کر دیکھا۔

''منزہ بھابی کی بیٹی پیدا ہوئی ہے اور وہ بہت بیمار ہے جی......آنٹی جی تو کئی دنوں سے گھر ہی نہیں آئیں وہیں اسپتال میں ہیں۔''

مومی کے ماتھے پر بل پڑے تھے جو کہ پریشانی کو ظاہر کررہے تھے۔

''اور حیدر......وہ؟''

''حیدر بھائی اور کرنل صاحب وہ تو جی لندن گئے ہیں۔''

''لندن؟ کیوں......؟''

اور اس کے ''کیوں'' پر افضل نے اسے اِک

حیرت کی نظر سے دیکھا تھا۔

''آپ کو نہیں پتا......ان کا تو آپریشن ہونا تھا۔''

''کیا......کیا ہونا تھا؟'' وہ بے ساختہ دو قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

''آپریشن......آپریشن......''

اور بس......اسی چیز کی کمی تھی جیسے......

موی کو لگا کہ اسے اٹھا کر دوبارہ سے پھر سے اسی برزخ......اسی جہنم میں لا پھینکا گیا تھا کہ جب اس نے اپنے باپ کا تابوت بنا جسد کے گھر میں آتے دیکھا تھا۔

''سمیعہ آنٹی ایسا کیسے کر سکتی ہیں کیسے؟ وہ کیسے اپنے بیٹے کو مرنے کے لیے۔'' وہ حیرت اور بے یقینی سے سوچتی تھی۔ ''تو کیا ایک اور تابوت......ایک اور تابوت جو کہ اب خالی نہیں ہوتا......اِک لمبے چوڑے وجود کے ساتھ آتا۔ تو کیا یہ اس کی زندگی میں ایک بار پھر لکھ دیا گیا تھا......ایک بار پھر سے......'' وہ بے اختیار لڑکھڑائی تھی۔

''فوجی مر جاتے ہیں، بھری جوانی میں ہی وقت سے پہلے ہی تو وہ بھی کیا وہ بھی؟''

خوف......وہ ہی اس کا پرانا خوف......عود کر آیا تھا۔ اندھیرے کی سیاہیوں کے ساتھ آیا......اور اس کے وجود کو نگل گیا تھا......کھا گیا تھا......اسی لیے تو وہ کسی ملٹری مین سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ مر جاتے تھے، مر جایا کرتے تھے۔

☆☆☆

وہ جس طرح تیز، تیز قدموں کے ساتھ بڑھتی گئی تھی......واپس اس سے کہیں تیز قدموں کے ساتھ لوٹی تھی۔

''ایک اور موت ایک اور تابوت......نہیں......وہ نہیں دیکھ سکتی......'' اس نے سعد کو ائر فورس میں جانے نہ دیا......کلائی کاٹ لی......صرف اسی خوف کی وجہ سے کہ وہ سعد کے وجود کو تابوت میں لیٹا نہیں دیکھ سکتی تھی......اس سے بہتر تھا کہ وہ خود ہی نہیں رہتی اور اب......اب پھر......

یہ اس کے ساتھ ہی کیوں ہوتا تھا......کیوں؟

کمرے میں آ کر بیڈ پر وہ کئی گھڑیاں ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ بیٹھی رہی تھی۔

''نہیں......اسے کوئی تابوت، کوئی موت اب کی بار نہیں دیکھنی تھی۔ زندگی نے اگر اس کے ساتھ یہ ہی کرنا تھا تو اتنی طاقت تو وہ رکھتی ہی تھی کہ خود کو اس آنے والے لمحے سے دور لے جا سکے......اتنی دور کہ جہاں سے کسی کو اس کا نشان تک نہ ملے۔ اسے اب یہاں رہنا تھا......نہ کسی سے رابطہ رکھنا تھا۔''

ایک جھپٹا مار کر سیل فون اٹھایا اس کے پرزے الگ کر دیے سم نکالی دانتوں سے چبائی اور تھوک دیا۔

سیل اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

ان لوگوں نے کل صبح نکلنا تھا لیکن موی کی وجہ سے وہ اسی سہ پہر کو نکلے تھے۔

زندگی نے گر اس کے ساتھ یہی کرنا تھا کہ اس کی پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کو اکھاڑ کر رکھ دینا تھا......تو اسے ایسے کسی لمحے سے ملنے کے لیے خود کو تیار ہی نہیں کرنا تھا......اسے اب بھاگنا تھا اور اتنی سی طاقت تو رکھتی ہی تھی کہ راہِ فرار پا سکے......

☆☆☆

وہ گر نہ کھانے پر آتی تو سارا، سارا دن چائے کے کپ پہ کپ چڑھائے جاتی......موویز دیکھنے پہ آتی تو سارا، سارا دن ایل سی ڈی آن رہتی تھی اور رات کی بھی تخصیص نہ کرتی۔

گر کمرا نشین ہونے پر آتی تو کئی، کئی دن کمرے سے باہر نہیں آتی اور گھر سے باہر نکلتی تو سارا دن مری کی اونچی نیچی سڑکوں پر خوار ہوتی رہتی......بے مقصد چلتی رہتی......نا معلوم اس طرح چل، چل کر وہ کس جذبے کو تھکا دینا چاہتی تھی۔ گل جو بھی اس کے جاگرز میں مقید پیروں کو دیکھتیں تو جانتیں کہ اس کے پیر فنگل انفیکشن کا شکار ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ پھر سے......ایک بار پھر سے وہ سولہ سال کی موی بن گئی تھی......وہ ہی سولہ سال کی موی......اسے چپ لگ گئی تھی اسے شدید شکایت تھی، سخت شکوہ تھا کہ یہ کیا......کیا ہے یہ؟ کہ جب بھی اس نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی، زندگی گزارنے کی جدوجہد کی تو ٹھیک تب ہی اس

کے پیرا کھاڑ دیے گئے، اس کی کوششوں کو نیست و نابود کر دیا گیا کیوں؟...... کیوں آخر......؟

وہ خاک تھی، راکھ تھی، اس میں کچھ نہ بچا تھا مگر اب...... اب وہ جل رہی تھی...... بھڑک رہی تھی...... اور اِک ''کیوں'' کے سوال نما گرداب میں بے طرح سے پھنسی ہوئی تھی۔ تو کیا اس کے لیے دنیا میں کوئی راحت...... کوئی سکھ، کوئی خوشی، کوئی آرام نہ تھا، کیا زندگی نے اسے یوں ہی بن کر ملنا تھا...... یوں ہی بے ترتیب، بے ڈھنگی، بھدی، بے رنگ وہ تو رنگ بھرنے چلی تھی زندگی میں مگر یہ سارے رنگ سیاہ کیسے پڑ گئے ...... کیسے؟ اور سوال حل نہ ہوتا تھا، سمجھ میں نہیں آیا اور وہ خود کو تھکاتی...... مری کی سڑکوں کی لمبائی ناپتی تھی اتنی کہ اب تو سڑک کے اینٹ روڑے بھی اس کے جوتوں کی دھمک پہچاننے لگے تھے۔ مری کی نم بوجھل ہوا، اس کے وجود کی خوشبو سے آشنا ہونے لگی تھی۔ درخت اسے ترحم سے دیکھا کرتے وہ جو اِک آوارہ سی لڑکی تھی...... وہ جو کہ بدرنگ جینز، بے رنگ شرٹ میں ملبوس ہوا کرتی تھی اور گلے میں اِک اسٹول کا تکلف کیے رکھتی تھی۔ اور گھر والوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کوئی بھی تو نہیں...... اب کہ اسے کیا ہوا تھا......؟ کیا؟ یہ معما تھا...... اسرار تھا...... وہ پھر سے ایسی کیوں ہوگئی تھی...... اِک شک سا تھا کہ شاید حیدر...... مگر یقین کون کرتا...... کہ موی اتنی جذباتی تو کبھی نہیں رہی تھی۔

وہ ابھی، ابھی آوارہ گردی کر کے لوٹی تھی۔ جاگرز پہ موجود مٹی کی تہ یہ اعلان کرتی تھی کہ مسافت لمبی تھی۔ وہ اوندھے منہ گرد آلود بال و بے ترتیب حلیے کے ساتھ بیڈ پر گری پڑی تھی۔

''موی کھانا کھالو......'' عائلہ نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

''مجھے نہیں کھانا......'' وہ اسی طرح لیٹے، لیٹے بولی تھی اور عائلہ نے اسے دوسری بار نہیں کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ موی نے نہیں کہا ہے تو مطلب نہیں ہی ہے۔ وہ کچھ مایوس ہو کر ڈائننگ ٹیبل تک آئی تھی۔

''نہیں آئی......؟'' حسیب نے اسے یوں آتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ اور عائلہ نے مایوسی سے سر ہلا کر جواب دیا تھا۔ حسیب یک دم چپ ہوئے تھے۔

''بھابی اس سے پوچھیں تو سہی...... اسے آخر ہوا کیا ہے...... مسئلہ کیا ہے؟ کہیں یہ وہ پرپوزل والا مسئلہ تو نہیں......؟ پہلے وہ آنا نہیں چاہ رہی تھی اور پھر یوں آنے کی ضد سمجھ سے باہر ہے۔'' اور گل نے آہستگی سے سر ہلا دیا تھا۔ سعد ٹھیک کہتا تھا وہ بدن کا وہ حصہ تھی کہ جس کا کاٹ کر رکھ دینا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ پورا جسم دُکھتے رہنا تھا۔

جب گل اس کے کمرے میں آئیں تو اس کی حالت نے انہیں حیران نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک اوندھے منہ پڑی تھی۔ گل نے آہستگی سے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے کانوں سے ہینڈ فری اتارے تھے۔ اس نے تیزی سے سیدھے ہوتے ہوئے یہ حرکت کرنے والے ہاتھوں کو دیکھنا چاہا تھا۔

اور ممی کو دیکھ کر وہ یک دم سست پڑی تھی اس کے تیکھے چتون نرمی سے ڈھلے تھے۔

''جی......'' مگر باوجود کوشش کہ وہ اپنی آواز کو نرم نہ بنا سکی تھی۔ وہ سرد اور سپاٹ تھی۔ گل اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔

''تم نے حیدر کے بارے میں بات کی تھی مجھ سے موی تو......''

''تو...... تو یہ کہ اب مجھے شادی ہی نہیں کرنی...... کبھی بھی نہیں...... اللہ کا واسطہ ہے ممی...... میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ نہیں کرنی ہے مجھے شادی وادی اور آپ، آپ کو بھی مرنا ہے ناں تو مر جائیں۔ کیا ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں...... آسمان نہیں ٹوٹتا، زمین نہیں پھٹتی...... کچھ بھی تو نہیں ہوتا...... جیسے بابا کے بعد میں مری نہیں، آپ کے جانے سے بھی نہیں مروں گی۔ نہ انہیں میری پروا تھی نہ آپ کو ہے تو پھر ٹھیک ہے کریں اپنی صحت برباد...... لیں ٹینشن......

مجھے کیا؟'' وہ غصے سے صرف زور، زور سے نہیں بولتی تھی......بس سلگتا سا لہجہ تھا...... آنچ دیتا تھا اور دل کو جکڑتا اور گل...... حیران......کیا؟ کیا......؟ مومی نے بابا کا نام لیا۔ بابا کہہ کر پکارا......اس نے اتنے سالوں بعد بابا کہا......گل نے بے ساختہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔

''میرے جیسے بچوں کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے ممی......'' اور اس نے بیچارگی سے بولتے ہوئے گل کے سینے میں منہ چھپا لیا تھا۔

''مومی......کیا ہوا ہے بیٹے......؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔''

''ممی اتنی لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی تو ان کی مائیں مر جاتی ہیں کیا؟ مجھے شادی نہیں کرنی...... پلیز ممی......پلیز......''

اور وہ ان کی کب سنتی تھی......محض اپنی کہتی تھی۔ کسی بچے کی طرح سہم کر، منہ بسورتے ہوئے، بولتی جارہی تھی۔ اور گل وہ الجھن بھری پریشانی کا شکار تھیں۔ اور سمیعہ سے ان کا کوئی کانٹیکٹ نہیں تھا کہ وہ ان سے ہی پوچھ لیتیں، مومی کا ہی تعلق تھا ان سے...... اور وہ مومی کے حوالے سے ہی جانتی تھیں۔

''مومی......میری جان کچھ تو بتاؤ بیٹے......'' ان سے رہا نہیں گیا تو اس کا سر اٹھاتے ہوئے انہوں نے دوبارہ پوچھا تھا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی......بس۔'' اور مومی کے اندر جیسے یہ جملہ بند کر کے رکھ دیا گیا تھا۔ ریکارڈ کر دیا گیا تھا۔

گل اسے دیکھ کر رہ گئی تھیں آخر ہوا کیا تھا؟ کیا؟

☆☆☆

مومی کو کیا سمجھے تھے آپ کہ واقعی ہی میں اسے ''محبت'' ہو گئی تھی۔

''ہاہاہا......'' وہ اپنے مطلب کے لیے، اپنی غرض کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتی تھی۔ اپنے دماغ سے سوچتی تھی اور کر گزرتی تھی۔ اور اس ایک چیز کے لیے الٹا ہونا پڑے یا سیدھا......غلط ہو یا صحیح...... جھوٹ، سچ، ضد، غصہ ناراضی، خودکشی، ایموشنل بلیک میلنگ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی......کچھ بھی......

گل اور سمیعہ مائیں تھیں۔

حیدر کی ماں......حیدر سے محبت کے اظہار پر پگھلتی تو اس کی اپنی ممی......اس کے خود کے محبت میں گرفتار ہونے پر......حسیب مرد تھے۔ ایسی باتوں سے بہلائے نہیں جا سکتے تھے۔ اور حیدر......اوہ کم آن...... مومی پاگل تو نہیں تھی جو حیدر سے محبت کی بات کرنے بیٹھ جاتی۔

اس نے وفا کی بات کی تھی اور ایک اسی بات میں وہ سچی تھی۔ خالص...... اس بات میں وہ جھوٹی نہیں تھی۔ شادی کرنے پر خلوصِ دل سے تیار اور نبھانے پر بھی......بس اِک صحیح کام کرنے کے لیے اسے جتنا بھی غلط ہونا پڑے پروا نہیں تھی۔ جو جہاں پر مر سکتا تھا ......مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حیدر مان جائے شادی ہو جائے ......بس پھر سب ٹھیک......پھر وہ اپنے عمل سے سب ثابت کرنے والی تھی۔ حالات کا رخ اپنے حق میں کرنے کی وہ ہی پرانی عادت اور ایک طاقت ہے......قدرت......فطرت......نعمتوں کو ایک حد تک فار گرانٹڈ لینے دیتی ہے اور پھر اس کے اپنے طریقے......اپنے قانون......

☆☆☆

ہر ویلے تانگاں یار دیاں
میں تاں بیٹھی کاں اڈاواں
آپ و نجھاں کہ میں قاصد و نجھاں
میرا تھیں گئوں حال بیماراں
غلام فریداں
میں تاں اویں وچھڑی
جیویں وچھڑی کونج قطاراں

اور وہ قدموں کو روک نہ پائی...... جو بے اختیار ہو کر اس آواز کی سمت میں اٹھتے تھے......دل جیسے کچھ اور مر گیا تھا......خالی ہو کر رہ گیا تھا......کالی جینز کے اوپر سیاہ کرتا اور شانوں کے گرد براؤن شال لپٹی

ہوئی.....بالوں کی لٹیں چہرے کے اطراف پھیلی ہوئی.....اور وہ بے اختیار ہو کر چلتی تھی یوں جیسے آواز نہ تھی.....کوئی باندھ کر رکھ دینے والی چیز تھی.....جس سے اسے باندھا گیا اور اب کھینچا جا رہا تھا۔

عمراں لنگیاں پیاں پار
عمراں لنگیاں پیاں پار
کدے ناں.....ہائے کدے ناں
سکھ سنیہا گلیا
آ لے نہ وس دے کالیا
پھلاں دے رنگ کالے
سرخ گلاباں دے موسم وچ
پھلاں دے رنگ کالے

تو جب سرخ گلاب عین اپنے جوبن کے دنوں میں عین بہار کے وقت.....یک دم سیاہ پڑ جائیں تو کیا ہوتا ہے.....کیسا ہوتا ہے.....کیا تھا وہ.....؟ وہ کیا تھا آخر.....جو جسم کو، جان کو کاٹ رہا تھا.....کاٹ کے رکھ رہا تھا.....یہ کیا تھا؟ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

پردیس کیوں پردیسی ہو یو
نملی کر کے چھوڑ دیتو ای
تے میں بیٹھی لکھ گلیاں دے رولاں
غلام فرید .....میں تاں دوزخ سڑ ساں
جے میں مکھ ماہی والوں پھیراں

اور وہ اِک جھٹکے کے ساتھ رک گئی تھی۔ کوئی کھوکھا سا تھا جہاں پر ریڈیو چل رہا تھا۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا..... اس کی بکھری لٹیں اڑیں.....شال لہرائی اور اس نے جان لیا کہ جلنا کیسا ہوتا ہے؟ سڑنا کیسا ہوتا ہے اس سب کے باوجود اِک حیرانی تھی جو اسے مار کر رکھ دینے کے درپے تھی..... یہ سب کیوں ہو رہا تھا، کیوں؟

میرے ساتھ ہی کیوں.....؟
پھلاں دے رنگ کالے
سرخ گلاباں دے موسم وچ
پھلاں دے رنگ کالے

یہ کون تھا جو بیٹھ کر موی کو دیکھتا رہا تھا.....نوٹ کرتا رہا تھا اور پھر لکھتا رہا..... یہ کون تھا..... ہاں کون؟

☆☆☆

اب تک تو وہ مر بھی گیا ہوگا..... تابوت آ چکا ہوگا.....سمیعہ آنٹی نے کیسے برداشت کیا ہوگا سب کیسے.....؟ اور سڑک سنسان تھی.....ارد گرد درخت تھے جو کہ آسمان کو چھوتے .....سنسان سڑک کے عین وسط میں وہ سیاہ لباس میں ملبوس لڑکی چلتی تھی اور اس بات سے قطعاً بے خبر تھی کہ وہ چلتی تھی..... یہ ٹھیک وہ ہی موسم تھا کہ جب سرخ، سرخ گلاب، سیاہ پڑ جایا کرتے ہیں۔

''کیوں.....میرے ساتھ ہی کیوں؟''

اسی ایک سوچ نے اسے haunt کر رکھا تھا۔ جکڑ کر رکھ دیا تھا.....وہ کسی جن کی طرح اس پر حاوی تھی۔ ہوا اس کے بکھرے بالوں کو اڑائے جا رہی تھی اور وہ ہر اِک چیز سے بے نیاز ہو کر چلتی چلی جاتی تھی۔

عمراں لنگیاں پیاں پار
اور دور کہیں کوئی گاتا تھا۔

☆☆☆

یہ سچ تھا کہ گل ماں تھیں.....حسیب کا تجربہ تھا لیکن جو موی کی نفسیات کو سمجھتا تھا.....سمجھ سکتا تھا وہ کوئی اور نہیں صرف سعد تھا..... جب کئی دنوں تک.....راول پنڈی سے آنے کے بعد سے لے کر موی نے سعد سے بات نہ کی تو گل کو سب بتانا پڑا تھا.....اور وہ آ گیا تھا۔

''موی.....''

وہ ابھی ابھی آوارہ گردی کر کے آ رہی تھی۔

بیڈ کے کنارے ڈھیلے وجود کے ساتھ.....اپنا آپ چھوڑے بیٹھی تھی.....سعد کو اسی کے آنے کا انتظار تھا۔

وہ پنجوں کے بل اس کے پیروں میں آ بیٹھا اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھا اور بے حد پیار سے بولا۔

''موی.....'' موی نے آہستگی سے سر اٹھایا۔

''ایک بات بتائیں گی.....لیکن بالکل سچ، سچ.....جھوٹ نہیں۔'' وہ خاموش رہی۔

''حیدر سے کیوں شادی کرنا چاہتی تھیں

آپ......اب اگر آپ نے یہ کہا کہ آپ کو محبت تھی تو میں آپ کو تھپڑ ماروں گا......'' اور مومی......اسے پُرتعجب نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی۔ سعد کے چہرے کا تاثر کہتا تھا کہ ہاں وہ جھوٹ بولنے پر ایسا ہی کر گزرے گا......وہ مارے گا اسے تھپڑ......

مومی نے سر جھکایا تھا۔

''ممی کی وجہ سے۔''

''اور......؟''

''کچھ بھی نہیں......''

''اگر کچھ بھی نہیں تو یہ حال کیوں؟''

اور مومی لاجواب......چپ......ہونٹ بھینچے ہوئے۔

''اور کیا وجہ تھی مومی؟ آپ کو ملٹری اور ملٹری والوں سے نفرت تھی ناں......؟''

''مومی......؟'' چپ رہنے پر سعد نے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تھا۔ ''تو پھر کیوں یہ حال؟''

''مجھے کسی بھی ملٹری مین سے شادی نہیں کرنی تھی سعد......کبھی بھی نہیں......لیکن ممی کی حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے......مجھے ایسا لگا کہ وہ پرفیکٹ چوائس ہے......اس کے ساتھ اب اور کیا ہوسکتا تھا، کیا ہونا تھا۔ اب اللہ اس کے بعد اب اس کے ساتھ کچھ اور برا تو نہیں کرسکتے تھے ناں......فوجی ہونے کے باوجود مجھے وہ اپنے لیے پرفیکٹ لگا کہ......اب اور کوئی حادثہ نہیں ہوگا اس کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ لیکن میں غلط تھی۔ وہ حادثہ......اسے موت کی طرف لے جائے گا......مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے بھی عمر سے پہلے ہی مرجانا ہے......اسے بھی چلے جانا ہے، چھوڑ جانا ہے جیسے باقی سب کرتے ہیں......اسے بھی یہ کرنا ہے۔''

اور سعد نے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

''کیا پتا وہ زندہ ہو؟''

''نہیں، نہیں ہوسکتا۔''

''کیوں......؟''

''کیوں......؟'' اور مومی نے سوال حیرت سے دُہرایا۔

''بابا زندہ رہے تھے کیا؟ کیا وہ ٹھیک اسی عمر میں نہیں چلے گئے تھے کہ جب......''

''وہ زندہ ہے مومی......اسے کچھ بھی نہیں ہوا......کچھ بھی نہیں۔'' اور سعد نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

اس نے وہ ہی کیا تھا جو کوئی بھی وہ شخص کرتا جو مومی کو سمجھنے کا دعویدار ہوتا۔

وہ سمیعہ سے مل کر آیا تھا۔

☆☆☆

منزہ کی حالت، حیدر کی سرجری اور پھر بچی کی نازک صورتِ حال ان سب چیزوں نے مل کر سمیعہ کو حواس سے بیگانہ کر کے رکھ دیا تھا۔ کئی دنوں تک تو انہیں مومی یاد ہی نہیں آئی تھی۔

اور جب بچی کی حالت ٹھیک ہوئی......وہ سروائیو کر گئی......منزہ کو بھی ڈسچارج کر دیا گیا......وہ گھر آئیں تو......کرنل صاحب سے رابطے کے لیے انہیں اپنے سیل فون کی ضرورت محسوس ہوئی تھی......ورنہ تو اب تک عادل کے سیل فون پر ہی رابطہ تھا اور اب عادل بھی ڈیوٹی پر واپس جاچکا تھا۔

فون چیک کرنے پر......انہوں نے مومی کی کالز دیکھی تھیں اور......

''افضل......مومی آئی تھی میرے پیچھے؟''

''جی آئی تھیں مومی باجی......''

''تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟''

''وہ جی آپ گھر ہی نہیں آئیں تو مجھے یاد ہی نہ رہا......'' سمیعہ نے تف کی نظروں سے اسے دیکھا اور مومی کو کال ملائی تھی۔ اور اب ان کے لیے ایک ریکارڈڈ پیغام حاضر تھا۔

اس کے بعد انہیں مومی کے گھر ہی جانا چاہیے تھا......اور گھر......گھر بند تھا۔

''یا میرے خدا......یہ کیا ہوگیا۔''

مومی کے علاوہ کسی اور کا نمبر موجود نہیں تھا ان کے پاس......

"اور مومی......وہ کیسے اس طرح سے چلی گئی...... کیسے؟" یہ محض اتفاق تھا کہ حسیب، مومی کی ضد پر کسی کو بتا بھی نہیں سکے تھے کہ پوسٹنگ کہاں ہوئی ہے۔

اور اب تک انہوں نے واپس گھر کا چکر بھی نہیں لگایا تھا۔ اور اتنے دن گزر گئے کہ گرمیوں نے رخصت چاہی اور سردیوں کا موسم آنے کی اجازت مانگتا تھا اور سمیعہ پریشان سی پریشان کہ مومی کہاں چلی گئی تھی۔

کہاں......؟ کوشش کے باوجود کوئی اتا پتا نہیں ملا تھا۔

اور تب ہی ٹھیک تب ہی......

ایک دن سعدان کے پاس آگیا تھا۔

وہ بہار کا وہ پھول تھا...... جو خزاں کے موسم میں کھل اٹھا تھا۔

☆☆☆

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ یک دم اس کے ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہوئی تھی۔

"سرجری کا مطلب، مر جانا نہیں ہوتا مومی...... آپ نے خود سے یہ کیسے فرض کر لیا تھا؟" وہ بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

وہ بے یقینی، حیرت، الجھن اور ناسمجھی کا بیک وقت شکار ہوئی تھی۔

"مجھے وہاں جانا ہے سعد......" اور پھر مڑ کر اس کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر وہ بے قراری سے بولی تھی۔

"ٹھیک ہے چلیں گے، ضرور چلیں گے مگر......"

"نہیں آج، ابھی......"

"مومی......" سعد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"سعد ابھی...... مجھے ابھی جانا ہے۔" وہ بے تاب تھی اور بے حد ضدی...... ہٹ دھرم، لہجے میں

چاچو کی گاڑی میں فیول فل کروا کر وہ اسی حلیے میں مومی کو لے کر نکلا تھا...... ممی کو نہیں بتایا تھا۔ ہاں البتہ اپنے گھر کی چابیاں وہ اٹھا لایا تھا۔ گھر سے دور جا کر ایک کال کر کے کہا تھا۔

"ہم پنڈی جا رہے ہیں......" اور بس...... گل کی سنی نہ اپنی سنائی...... زندگی میں پہلی بار وہ مومی کا ساتھ دینے جا رہا تھا۔ اس کی ضد پوری کرنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

سمیعہ کے گھر جب وہ پہنچے تو شام ہونے والی تھی۔

مومی بے صبری سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اتری تھی۔

گھر کا دروازہ آج بند نہیں تھا، کھلا تھا۔

اور اس کے تیز قدم بے ساختہ ٹھٹک کر رکے اور پھر پہلے جیسی رفتار نہیں پکڑ سکے...... وہ سست قدموں، حیران نظروں سے ارد گرد دیکھتی ہوئی اندر آئی تھی...... گھر میں معمول سے زیادہ روشنی تھی۔

"مومی باجی......" افضل اسے دیکھتے ہی چہکا تھا۔

"آنٹی؟" یک لفظی سوال......

"گھر میں کوئی نہیں ہے جی وہ سب ائر پورٹ گئے ہوئے ہیں۔" اس نے اسی طرح چہکتے ہوئے بتایا تھا۔

اور مومی کو اذن ہوا کہ وہ الٹے قدموں مڑ جائے۔ وہ بھاگتے ہوئے باہر آئی۔ سعد گاڑی پارک اور لاکڈ کرنے کے بعد اندر آرہا تھا۔

"ائر پورٹ چلو ائر پورٹ......" تیزی سے بولتے ہوئے وہ اس سے پہلے گاڑی تک پہنچی تھی اور اب لاکڈ دروازے کے ہینڈل کو جھٹکے دیتے ہوئے کھولنے کی کوشش میں تھی اور اس کے انداز میں حواس باختگی نہیں تھی...... بے قراری تھی۔

"مومی یہیں پر انتظار کر لیتے ہیں۔"

"نہیں، مجھ سے نہیں ہوگا......"

"افوہ...... یہ کھلتا نہیں......" اس نے یک دم اپنا جاگر والا پیر ٹائر پر دے مارا تھا۔

سعد نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے...... ہا...... کر کے گہری سانس باہر نکالی اور گاڑی کا لاک کھولا تھا۔

اور پھر گاڑی...... ہوا کو مات دیتی ہوئی سڑکوں پر بھاگتی رہی تھی۔

اور ائر پورٹ کون سا دور تھا...... پاس ہی تو تھا۔

☆☆☆

لوگوں کی اتنی بھیڑ میں کسی ایک شناسا چہرے کو کھوج لینا یقیناً مشکل کام تھا۔

مومی پاگل تھی......اور ٹھیک انہی کے سے انداز میں وہ سمیعہ کو ڈھونڈ رہی تھی کہ یک دم وہ منزہ، عادل سبھی کی نظروں کی گرفت میں آئے تھے۔

وہ سب ریلنگ کے پار کھڑے......آنے والوں کے انتظار میں تھے۔

مومی ان تک جا نہیں سکی تھی......چند قدم کے فاصلے پر جا کر رک گئی......دل دھڑکتا تھا......نہیں......شاید دھڑکن کھو رہا تھا......اناؤنسمنٹ کی آواز سر پر ہتھوڑے کی طرح لگتی تھی۔

اردگرد پھیلی لوگوں کی بھنبناہٹ دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی......وہ بار، بار سر کو جھٹک کر نظر کو قائم رکھنے کی کوشش میں تھی......اس کے جسم میں خواہ مخواہ گرم، گرم سی لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ بار، بار ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہی تھی۔ گرم، گرم لہروں کے بعد ٹھنڈے، ٹھنڈے پسینے بھی آنے لگتے۔ کوئی عجب sensation سی تھی۔ سعد نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ان تک جانے کا اشارہ کیا تھا۔ مومی نفی میں سر ہلاتے ہوئے دو قدم پیچھے کو ہٹی......وہ وہیں منتظر کھڑی رہی اور اس کی عین پشت پر سعد......جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ اور مومی......خوفزدہ، بے چین، بے قراریوں جیسے انہونی کے ہو جانے کا ڈر ہو اور پھر......پھر اس نے بے اختیار ایک دفعہ پھر سے سر کو جھٹکا اور نظر کو فوکس کیا......ہا......وہ یک دم منہ پر دونوں ہاتھ رکھے پیچھے کو لڑکھڑائی......وہ، وہی تھا......تو کیا وہ وہ ہی تھا۔

کرنل صاحب اس کی وھیل چیئر کے ساتھ تھے اور وہ باہر کی طرف آ رہے تھے۔ مومی کی سانس رک گئی۔ رگیں کھنچ سی گئیں۔ اور وہ ساکت تھی......ایک دم ساکت......سمیعہ اور منزہ جذبات سے پُر تھیں۔ عادل مسکرا رہا تھا مگر آنکھ نم تھی، وھیل چیئر ذرا سے فاصلے پر آ کر رکی۔ سیاہ کاٹن کا کلف زدہ سوٹ......سیاہ ہی گاگلز......زرد چہرہ ہلکی شیو، اور وہ پہلے سے زیادہ پُرکشش نظر آیا......کمزوری کے باوجود ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ کرنل صاحب نے ایک مخصوص اسٹک اسے پکڑائی...... حیدر نے بایاں بازو پھیلایا......اسٹک کا سہارا لیا۔ اور......اور......اوہ میرے خدا......اوہ میرے خدا......یا خداوند یہ رحم تھا......ٹھیک یہی......یہی تو......یہی تو اس کا رحم تھا کہ وہ لمحہ...... وہ منظر ان کی زندگیوں میں لکھ دیا گیا تھا۔ آنکھوں کو دیکھنا نصیب ہوا تھا...... یہ مشکل ہی سہی......لڑکھڑا کر ہی سہی مگر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر سینہ تان کر ماں کو دیکھا......اپنا وزن بائیں کندھے تلے اسٹک پر ڈالا اور ایک بھرپور......فوجی سلیوٹ ماں کو کیا تھا......کرنل صاحب بھی اسے سہارا دیے ہوئے تھے۔ اور سمیعہ......انہوں نے سسکتے ہوئے بے اختیار ہو کر اپنی بانہیں پھیلائی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتی سی، آہستہ سی اسٹک اور کرنل صاحب کے سہارے سے چلتا ہوا ماں تک آیا......اور وہ کیا منظر تھا۔ واللہ کیا منظر تھا......لفظ کہاں اتنی سکت رکھتے تھے کہ اسے بیان کرتے...... وہ اب آواز کے ساتھ رو رہی تھیں اور اس کا منہ چوم رہی تھیں۔ منزہ عادل کے کندھے سے ٹکی......ہچکیاں لے رہی تھی اور ان سب سے ذرا فاصلے پر موجود وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے ساکت......حیران اور بے یقین تھی......تو وہ......وہ زندہ تھا، زندہ......اور پلک کو وہ اتنی اجازت نہ دیتی کہ وہ جھپکتی......وہ حیدر کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ یک ٹک، مسلسل، یقین کر لینے کی پوری کوشش میں مل کر پھر سے بے یقین ہوتے ہوئے اس نے منہ سے ہاتھ ہٹائے اور کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلتے ہوئے وہ حیدر تک آئی اور عین اس کے سامنے آ کر رک گئی۔

''مومی......؟'' سمیعہ کی حیرت بھری آواز ابھری۔ منزہ بھی حیران ہوئی اور وہ......وہ کھلے منہ، پھیلی آنکھوں اور سخت بے یقینی سے ایک ٹک اسی ایک انداز میں حیدر کو دیکھتی تھی......اس کا بس چلتا تو

ہاتھ بڑھا کر چھو کر دیکھتی اور تب بھی بے یقین کی بے یقین رہتی۔

''مومی......!'' سمیعہ نے اس کا کندھا ہلایا......

اس نے دیکھے بنا ہاتھ جھٹک دیا مگر نظر نہ ہٹائی، نہ پلک جھپکی اور ......اور زندگی میں پہلی دفعہ'' وہ'' embarrass ہوا......اس نے بے اختیار گلا کھنکھارا تھا مگر مومی تو جیسے آج تہیہ کر کے آئی تھی اسے جی بھر کر embarrass کرنے کا اور اب اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے۔

''ایکسکیوزمی......'' اس نے برہم سے لہجے میں کہا اور جواباً ....

''ہا......'' مومی اِک بار پھر سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر پیچھے کو لڑکھڑائی۔ اور پھر......وہ یوں ہی منہ پر ہاتھ رکھے جھکی......دُہری ہوئی اور اس کے بعد سیدھا ہوتے ہوئے اس نے اِک بھرپور خوشی سے بھرپور مگر wild سی چیخ ماری تھی۔ ان سب کے منہ کھلے حیدر سمیت اور سعدؔ اوہ میرے خدا......وہ کہاں منہ چھپائے آخر کہاں؟ یہ مومی بھی ناں......اس نے دانت پیسے مگر اتنی دیر تک مومی اِک عدد اور جنگلی سی چیخ مار چکی تھی......اب کی بار وہ خوشی کے اظہار کے طور پر دو پیروں پر اچھلی اور اپنے پیچھے کھڑی سمیعہ کے گلے جا لگی تھی......سعد نے شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت اس کے پیچھے نہیں تھا اور شکر انہوں نے بھی ادا کیا کہ وہ ان ہی کے گلے آن لگی تھی۔ کہیں وہ خوشی کا اتنا خالص، بھرپور اور wild سا اظہار تھا کہ حیدر نے اب کے خود کو اِک حیرت کا شکار ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا......بے ترتیب حلیہ، ملگجا لباس، بندھے مگر پھر بھی بکھرے سے بال اور سب کی توجہ کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھ کر چیختی ہوئی وہ لڑکی......اس نے پہلی بار.... غور سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

اور اس کے بعد اس کے بعد مومی نے بھلا کیا، کیا سعد کے ساتھ اِک اچھی سی ٹریٹ اڑانے کے بعد......وہ واپس تو نہیں گئی تھی۔ وہ اپنے گھر آ گئے تھے۔

''ہم کل واپس جائیں گے اور......''

''کیا......؟ ہم کہیں نہیں جا رہے۔'' اپنے بیڈ پر دونوں ہتھیلیوں پر وزن ڈالے وہ پیچھے ہو کر بیٹھی تھی۔ گردن اٹھا کر سعد کو دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی تھی۔

''کیا مطلب؟'' سعد حیران ہوا اور اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔

وہ مسکرائی، اٹھ کر کھڑکی تک آئی۔ اس بقعۂ نور بنے گھر کو دیکھا۔

''ممی کو فون کرو اور ان کو بولو چاچو کے ساتھ آ جائیں......تب تک تم ہم یہ گھر بھی صاف کر لیں گے۔'' چوکھٹ پر دونوں ہاتھ رکھے آگے کو جھکی وہ کہہ رہی تھی۔

''آپ کا ساتھ دینا مجھے مہنگا پڑا......بہت مہنگا......'' سعد نے اپنی کیپ اتار کر زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ تپا تھا اور مومی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ کُن کا جو حکم تھا اور جو کہ لکھ کر رکھ چھوڑا گیا تھا......تو وہ حکم اپنی مقررہ ساعت پر وقوع پزیر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

حیدر کے بائیں بازو کو کنٹرول کرنے والا نرو مجروح ہوا تھا......لیکن وہ جس بھی شدت کے ساتھ مجروح ہوا تھا......اِک کامیاب سرجری کے بعد بازو حرکت کے قابل ہو چکا تھا......گو کہ اس میں کافی وقت صرف ہوا تھا پھر سے تھراپی......ایکسرسائز......اور اس کے بعد کہیں جا کر بازو حرکت میں آیا تھا......اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گیا تھا۔

چھ گھنٹے کا طویل صبر آزما آپریشن اور اس کے بعد جا کر......وہ اس قابل ہو سکا تھا۔ اس حادثے میں وہ fifth degree نروانجری کا شکار ہوا تھا۔ ٹانگ کو کنٹرول کرنے والا نرو کٹ گیا تھا۔ جسے اس سرجری کے دوران repair کیا جانا تھا۔ بہرحال یہ کچھ اتنی کامیاب سرجری نہ بن سکی تھی...... حیدر کو ابھی تک ٹانگ میں numbness کی شکایت تھی وہ ٹانگ کو

نارمل طرح سے موو نہیں کر پاتا تھا۔ مدد کرنے کے لیے leg braces استعمال کیے گئے تھے اور ایک مخصوص اسٹک...... اسی بنا پر وہ چلنے کے قابل ہوسکا تھا مگر زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ پاؤں بھی اسی طرح سے ٹیڑھا تھا جس کی وجہ سے اس کی چال میں لنگڑاہٹ بڑی واضح تھی۔ اور اسے خاص طرح کے جوتے پہننے پڑتے تھے۔ ہیلتھ ایشوز ابھی تک تھے۔ اور یہ ساری عمر ساتھ، ساتھ ہی چلنے تھے۔ لیکن یہ اس کا رحم تھا...... اللہ عزّوجل کا رحم تھا کہ وہ پھر سے...... ایک دفعہ پھر سے زمین کی سختی کو اپنے پیروں تلے محسوس کرنے کے قابل تو ہوا تھا، کیا ہوا جو وہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتا...... کھڑا نہیں رہ سکتا تھا، ٹانگ میں مسئلہ تھا اور ساری عمر ہی رہنا تھا مگر وہ جو تکالیف تھیں جو رفع کردی گئی تھیں...... اس سے دور ہٹا دی گئی تھیں۔ اس کے مقابلے میں یہ کیا تھا...... کچھ بھی نہیں...... ذرا سا بھی نہیں......

ہمت کو گہن نہیں لگا تھا...... اور یہ لگ بھی کیسے سکتا تھا۔

☆☆☆

گھر بھر میں ایک رونق تھی جو چار سو پھیلی سی محسوس ہوتی تھی۔ خوشی تھی جو کہ اُڑی، اُڑی سی پھرتی تھی۔

طمانیت، سکھ، سکون، راحت اور یہ سب کئی سالوں بعد...... تو پھر ان کا مطلب...... احساس...میں اور آپ نہیں جان سکتے...... یہ وہ ہی جانیں کہ جن کی زندگیوں میں یہ عرصے بعد آیا تھا۔

مومی کی شادی ہورہی تھی...... اور یہ بتانا یقیناً ایک حماقت ہوگی کہ کس سے ہورہی تھی۔

اور مومی کے وہ ہی فساد......

بالوں کو کٹوانا چاہتی تھی اب...... کوئی مووی دیکھ لی تھی۔ تو بس...... اسی کی ہیروئن کی طرح کا ہیئر کٹ جو کہ وتیج کٹ تھا۔ سب پٹختے رہیں سر گرا سے زندگی میں پہلی بار پارلر جانا تھا تو بس...... اسی ایک کام کے لیے جانا تھا لیکن......

''مومنہ تمہاری کال ہے......'' اسے آواز دے کر بلایا گیا تھا۔

''ہیلو......''

''بال کٹوا رہی ہو......؟''

''ہاں......''

''کیوں......؟''

''وہ فلاں مووی کی فلاں ہیروئن نے ایسے کٹوائے تھے تو مجھے پسند آئے...... سوٹ کررہے تھے اسے۔''

''وہ مووی کی ہیروئن تھی اور تم...... تم تمہیں......'' اور اِک خاموشی......

''تو...... نہ کٹواؤں......؟'' مومی کو خاموشی ناگوار گزری......

''تمہاری مرضی......'' اور فون بند......

اور یہ ان دونوں کے مابین...... ابھی تک کی ہونے والی پہلی گفتگو تھی۔

''تو میں کیا اسے ذرا سی بھی ہیروئن نہیں دکھتی کیا......؟'' چند لمحوں بعد وہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی اِک الجھن بھرے انداز میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

کوئی اِک احساس...... نامعلوم سا احساس...... اس طرح کے اپنے ہونے کا احساس بھی نہ دلاتا تھا...... خود کا پتا نہیں بتاتا اور نہ ہی کھوج لگانے دیتا تھا...... تو بس ٹھیک اسی احساس نے مومی کو بال کٹوانے سے روک دیا تھا۔

عائلہ نے اب کی بار...... بالکل صحیح بندے سے رجوع کیا تھا۔ اب ذرا کاٹ کر دکھائے بال...... شادی تھی مومی کی...... مذاق تھوڑا ہی تھا...... جسے مومی کے بے تکے پن کی نذر کردیا جاتا۔

☆☆☆

ہاٹ ریڈ کلر کا انتہائی گھیر دار اور سنہرا کامدار فراک، ریڈ سلک کا کھڑا پاجامہ اور بھاری سرخ دوپٹا جس کے کناروں پر چوڑی پٹی کی طرح سنہرا دمکتا کام

تھا۔ سارا لباس سرخ اور سنہرے رنگ کا تھا......سیدھے بال......کان کی لو کے پاس سے کرلز میں تبدیل ہو جاتے تھے اور ان بالوں میں جابجا اٹکے سنہری موتی......الٹی مانگ نکال کر سارے بال ایک طرف کندھے پر رکھے گئے تھے۔

مہندی نہیں لگائی تھی اس نے......پسند نہیں تھی...... چوڑیاں البتہ پہن رکھی تھیں۔ یہ دونوں بازوؤں میں بھر، بھر کر......سرخ اور سنہری چوڑیاں ماتھے پہ ٹیکا نہیں تھا، جھومر تھا......لباس کے کام جیسا سنہری، بڑے سے آویزے......گردن سے نیچے......کالربون کے آخری سروں کو چھوتے ہوئے۔ سنہری ہی بھاری پائل......گلے میں ہار اور اونچی ہیل کا جوتا......جس سے چلنے کی پریکٹس کر لینے کے باوجود بھی وہ خود کو اتنا ہی نکما پاتی تھی کہ جتنا کہ پہلے دن پیروں میں ہائی ہیل پہنتے وقت تھی......''کاش کہ میں جوگرز پہن سکتی......'' اور اپنے نکما ثابت ہونے پر اس نے جھنجلا کر خواہش کا اظہار کیا تھا۔ دل کشی، رعنائی، خوب صورتی......ان سب نے آج پہلی بار موی کے وجود پر اپنی چھب دکھائی تھی......آج لگتا تھا کہ وہ اِک لڑکی ہی ہے......چہرے پر سب سے نمایاں......لباس کے ہم رنگ سرخ رنگ کی لپ اسٹک تھی جو اتنی جچ رہی تھی کہ کیا کبھی کسی کو جچتی ہوگی اور جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو......تو بے اختیار ایک جھٹکا کھا کر وہ آگے کو جھکی اور منہ آئینے کے قریب لے کر جا کر غور سے خود کو دیکھا......پھر ذرا سا پیچھے ہٹی اور ایک دفعہ پھر سے خود کو دیکھا......کبھی دائیں رخ سے تو کبھی بائیں رخ سے......

''عائلہ آنٹی......''

''ہوں کیا؟'' عائلہ اس کی چیزیں سنبھالنے میں مصروف تھی۔

''آپ نے مجھے کبھی بتایا کیوں نہیں کہ مجھ پر اس طرح کے ڈریسز بھی سوٹ کر سکتے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ میں تو بس......جینز، شرٹ پہننے کے لیے پیدا کی گئی ہوں۔'' گردن اٹھا کر چہرہ ذرا سا اوپر کیے وہ اب بھی خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔

اور عائلہ کا دل چاہا کہ سارے لحاظ آج کے دن کے......سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر کم از کم ایک کرارا سا تھپڑ تو اسے ضرور ہی جڑ دے......لیکن......ہا......اس نے تف کے سے انداز میں اسے دیکھ کر سر جھٹکا تھا۔ اس کا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ طے تھا۔

میرج ہال کا سیکنڈ فلور بکڈ تھا۔ رخصتی کے وقت جب اسے سیڑھیوں سے نیچے لایا جانے لگا تھا تو وہ عین سیڑھیوں کے آغاز پر رک گئی۔ سب نے حیرت سے اسے دیکھا اور خیریت کی دعا مانگی کہ یا میرے اللہ اب اس وقت یہ اڑی......

''ایک منٹ......'' اپنے بائیں رخ پر موجود لڑکی کہ جس نے اس کا فراک تھام رکھا تھا......کے بازو پر موی نے ہاتھ رکھا۔ ذرا سا نیچے ہو کر ہائی ہیل جوتے کا اسٹریپ پیر کو جھٹکا دے کر اسے اتارا۔ پھر دائیں رخ پر موجود عائلہ کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس کے بازو پر وزن ڈالتے ہوئے اس نے دوسرا جوتا بھی پہلے جیسے انداز میں ہی اتارا تھا۔ سب حیرت سے کبھی اسے اور کبھی آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے بے اختیار ایک سکون کی گہری سانس لی اور پھر جھک کر اپنا جوتا اٹھایا اور بولی۔

''چلیں......''

اور وہاں موجود حاضرین کو چلنے کے لیے ذرا سی وقت کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا۔

''اِدھر دو......'' عائلہ نے دانت پیس کر کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے جوتا لیا تھا۔ اب دلہن اچھی لگتی تھی یوں جوتا اٹھائے اترتی ہوئی۔ خاک فائدہ ہوا اس کیٹ واک کا جو عائلہ اسے سمجھا سمجھا کر اور کروا کروا کر تھک گئی تھی۔

ننگے پاؤں سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ کر جوتا پہننا چاہتی تھی کہ عائلہ نے باقاعدہ اس کے بازو پر اِک تھپڑ دے مارا۔

''انسان بنو مومی......''بس نہ چلتا تھا اس کا......ورنہ وہ اسے کچا ہڑپ کر جاتی۔

''تو کیا کروں......؟'' معصومیت ایسی کہ سو معصوم مرے ہوں گے تو تب اس کا دنیا میں آنا ٹھہرا۔

عائلہ نے جھک کر اس کے پیروں کے پاس جوتا رکھا......کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اِک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''پہنو......'' مومی نے کھڑے، کھڑے مشکل سے نہیں بے حد مشکل سے جوتا پہنا تھا۔ کبھی دائیں کو گرنے لگتی تو کبھی بائیں کو۔

اور جب یہ معرکہ سر ہوا تو عائلہ نے نیچے بیٹھ کر اس کے جوتے کے اسٹریپ بند کیے تھے۔

''تھینک یو......'' مسکرا کر کہتے ہوئے ایک آنکھ دبا کر اس نے فلائنگ کس پھینکی تھی۔

''مرو، اب کیا فائدہ اس پریکٹس کا۔'' اسے غصے سے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے عائلہ نے کہا تھا۔

''بھئی میں گر جاتی سیڑھیوں سے تو......نہیں پہنچ جاتی ہیل مجھ سے تو اب کیا کروں؟'' وہ الٹا ناراض ہوئی تھی۔

اور عائلہ کر کیا سکتی تھی......ماسوائے سرد سی سانس بھرنے کے......اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا مومنہ مجیب عالم کے معاملے میں......

☆☆☆

کلائیوں میں موجود سرخ اور سنہرے رنگ کی چوڑیوں پہ انگلی پھیرتے ہوئے وہ نروس تھی......جذباتی ہو رہی تھی یا پریشان تھی؟ یا کچھ بھی نہیں......کوئی احساس......نہ جذباتی پن......؟

تو......spell of cold ٹوٹا نہیں تھا۔

جب وہ سولہ سال کی تھی......تو اِک حادثے نے اسے انفیکٹ کیا تھا۔ رگوں میں دوڑنے ـــ والا خون کب، تھا......؟ یہ تو سرد سا کوئی سیال تھا اور بس......مومی آج بھی نارمل انسانوں والا کوئی بھی احساس......کوئی بھی جذبہ محسوس نہیں کر پاتی تھی......

ایگریشن.....نفرت اور خوف..... یہ سب تھا جو کہ تب سے اب تک تھا.....اور.....اور کچھ بھی نہیں.....

ان چوڑیوں پہ انگلی پھیرتے ہوئے وہ یک دم ساکت ہوئی تھی۔ اس نے دونوں بازو اٹھا کر عجیب نظروں سے اپنی کلائیوں کو دیکھا۔

اس کا باپ.....اس کی ناراض نظروں کی پروا کرتے ہوئے اسے چوڑیاں دلانے لے جارہا تھا۔

''مومی آج کوئی تکلیف دہ بات نہیں کرنا۔'' گل نے کہا تھا اور اس نے چوڑیاں پہن لی تھیں۔ لیکن اب.....وہ بے حد تعجب سے اپنی بھری کلائیوں کو دیکھ رہی تھی اور یہ بالکل غلط موقع پر ہوا تھا۔ اس کے اندر کچھ ابلا تھا۔ اس نے یک دم اِک طیش سے کھینچ کھینچ کر چوڑیاں اتارنی چاہی تھیں۔ کچھ پھنسی، کچھ ٹوٹ گئیں۔ ہاتھ کی پشت پر کھب کر موجب تکلیف بنیں.....مگر یہ کہ تکلیف محسوس کسے ہوتی تھی۔ قریب تھا کہ وہ ساری کلائی سے یوں چوڑیاں اتار، اتار کر بیڈ پر پھینکتی جاتی ہاتھ اور کلائی کی جلد زخم خوردہ ہوتی رہتی لیکن.....

لیکن اچانک کھٹکا ہوا.....مومی کے نروز نے آٹو میٹک رسپانس کیا..... ہاتھ رکا اور سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہ حیدر تھا۔ اس نے حیرت سے اس کے ہاتھ جو کہ اب کلائی پہ ساکت دھرا تھا۔ اور بیڈ پہ پڑی ٹوٹی چوڑیوں کو دیکھا تھا۔

اور مومی محض اِک لمحے کے لیے رکی تھی۔ پھر سے اپنے مشغلے میں مصروف ہوئی تھی۔

حیدر... بیساکھی کے سہارے، آہستہ رفتار سے چلتا ہوا اس تک آیا۔ بیڈ کے کنارے کے ساتھ ... بیساکھی رکھی.....اور ہاتھ کا دباؤ، بیڈ کی پائنتی پر ڈال کر وہ بیٹھا تھا۔ تب تک مومی ایک کلائی کو چوڑیوں سے آزاد کروا چکی تھی اور اب اتنے ہی طیش کے ساتھ وہ دوسری کلائی سے چوڑیاں اتار رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' وہ خود کو روک نہ پایا اور بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

''چچ.....کیا پاگل پن ہے یار دیکھو تو ہاتھ کا کیا حال کرلیا ہے۔'' وہ اب اس کے ہاتھ کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اور مومی.....دم بخود.....ساکت یوں جیسے اپنی سانس کی حرکت کو بھی روک دینا چاہتی ہو.....اتنی ہی ساکت ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اور پلک جھپکتی نہ تھی نظر ٹوٹتی نہیں تھی۔

حیدر نے اس کے یوں دیکھنے کو.....تعجب سے دیکھا اور مومی نے نظریں اس سے ہٹائیں..... بے یقینی سے اپنے ہاتھ کو دیکھا جو کہ حیدر کے ہاتھ میں تھا.....پھر سے نظریں اٹھا کر حیدر کو دیکھا اور پھر سے اپنے ہاتھ کو.....یوں جیسے وہ کسی چیز کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔

بوجھ نہ پا رہی تھی۔ کوئی احساس تھا بالکل ہی انجانا سا..... نیا جیسا کہ آج سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوا.....حیدر کو اس کی حرکت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اور رک کر اپنے ہاتھ کو دیکھتی رہی.....حیدر نے ہاتھ نہ چھوڑا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ مومی کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔

مومی نے ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا.....حیدر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے اٹھا لیا۔

وہ احساس.....جو کہ لمس کی صورت.....جلد کے نیچے سے ہو کر خون میں منتقل ہو رہا تھا اور کسی چیز کو توڑ کر رکھ دینے کا موجب بن رہا تھا.....وہ یک دم.....حیدر کا ہاتھ اٹھاتے ہی بھک سے اڑا اور اڑ کر غائب.....اس طرح سے کہ جیسے ہاتھ کی پشت پر کچھ تھا ہی نہیں۔

وہ چند لمحے نا سمجھی سے اس کیفیت کا شکار رہی.....اور پھر سے حیدر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا..... یوں جیسے وہ یقین کرنا چاہتی ہو کہ کیا ہو رہا تھا۔ وہ کس وجہ سے ہو رہا تھا۔ اور، اور وہ لمس پھر سے اثر دکھانے لگا۔ سرد سیال.....مدت بعد اپنی اصل حالت میں لوٹنے لگا تھا.....پگھلنے لگا تھا۔ وہ بے یقین تھی اور اس لمس کو خون میں منتقل ہوتا محسوس کرتی

یک دم پھر اس نے شاکڈ ہو کر دونوں ہاتھ منہ پر رکھے تھے۔

''یا میرے خدا..... یہ کیا تھا..... کیا؟'' اور اب وہ اِک شدید ترین حیرت کے جھٹکے کے ساتھ پر ہاتھ رکھے حیدر کو دیکھے جا رہی تھی۔ ''ہیں؟ یہ کیا تھا..... کیا؟''

اور حیدر......

وہ چند لمحے اس کے عجیب سے رویے کو دیکھتا رہا..... پھر مسکرایا۔ اور جب مسکراہٹ روک نہ پایا تو ہنس دیا۔ ایسا ابنارمل بی ہیور..... دنیا کی کسی دلہن کا گر ہو سکتا تھا تو وہ دلہن..... نو ڈاؤٹ مومنہ مجیب عالم ہی ہو سکتی تھی۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک سوئے ہوئے محل میں سوئی شہزادی کے پاس جب کوئی شہزادہ آتا ہے تو جادو کا توڑ محض سوئیاں نکال دینے سے نہیں ہوتا۔ یہ اعجاز صدیوں سے لمس کو حاصل رہا ہے تو آج سے پہلے تک..... برف کی شہزادی پہ ہونے والے برف کے طلسم کو یہ منتر نہیں ملا تھا۔ یہ توڑ حاصل نہیں ہوا تھا۔

تو اس کے چاروں طرف پھونکا گیا برف کا سحر..... اٹھا لیا گیا تھا۔ ہٹا دیا گیا تھا تو کُن اپنے فیکون کے لمحے سے آن ملا۔

☆☆☆

ممی نے کہا تھا کہ سعد کے کانوکیشن کی تقریب ہے تو لہٰذا وہ اور حسیب جا رہے ہیں..... موی نے کہا اسے بھی جانا ہے..... لیکن دو لوگ ہی جا سکتے تھے۔ اس سے زیادہ allowed نہیں تھے، وہ اتنی ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی کہ ان کے آنے تک..... وہ حیدر کے ساتھ وہاں گھر ہی آ گئی تھی اور اب انتظار تھا۔ واپس آتے آتے انہیں شام ہو گئی تھی۔

عائلہ نے کافی اہتمام کیا تھا چائے پر..... حیدر پہلی بار ان کے گھر آیا تھا۔ موی شرافت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہوئے تمیز دار بیوی کے روپ میں نظر آتی..... سرو کر رہی تھی اور چہک رہی تھی۔

وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ وہ ابھی ابھی ٹرے لے کر آئی تھی اور ٹیبل پر رکھنے ہی لگی تھی کہ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی تھی۔

''موی.....'' اس آواز کو پہچاننے کے لیے اسے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سعد تھا..... وہ یوں ہی کھڑے، کھڑے جوش سے مڑی تھی۔ اِک طاقت لگا کر، ایک لڑائی لڑ کر، اپنی رگیں کاٹ کر ان کا خون بہا کر یہ دن دیکھنے کو آیا تھا۔ وہ دیکھنے جا رہی تھی کہ سعد پائلٹ نہیں بنا تھا وہ ایک عام انسان بن کر آیا تھا......

اِک عام انسان..... سویلین..... تو اب سے وہ عام انسان تھا عام......

وہ جوش سے مڑی..... ٹھٹکی..... آنکھیں پھٹ سی گئیں..... ہاتھ بے جان اتنے کہ ٹرے چھوٹ کر نیچے جا گری تھی۔ اس کے جسم پہ پورے جسم پر لرزش آفت کی طرح ٹوٹی تھی۔ ناک کے نتھنے.... پھڑپھڑائے..... ہونٹ کانپنے اور وہ زندگی کی بدترین حقیقت کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ سعد نہیں تھا وہ سعد نہیں تھا..... وہ بابا تھے بابا..... وہ بابا تھے۔

کئی لمحے..... کئی لمحے گزرے اور ہر گزرے لمحے میں اس نے انکار کر دیا کہ وہ بابا نہیں تھے۔ لیکن وہ تو وہی تھے۔

آنکھوں میں یکبارگی کچھ چبھا..... اور آنکھوں نے اپنا طے شدہ ردِعمل ظاہر کر دیا۔ وہ بھر آئیں۔ اتنے سالوں بعد مدت بعد تو بالآخر وہ بھر ہی آئیں۔

آنسو کناروں تک آئے اور لڑھکنے لگے یوں جیسے وہ خود بہا دیے جانے سے انجان ہوں..... گالوں پر اِک لکیر سی بنتی گئی..... اور بہتی چلی گئی......

قدم خود میں جان کو ختم پاتے تھے لیکن کمال یہ کہ پھر بھی حرکت کرتے تھے۔

وہ اسی بے یقینی، حیرت، تعجب کا شکار ہو کر سعد تک آئی تھی۔ اس نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر..... اس کے کالرز کو پکڑنا چاہا تھا۔ لیکن ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں..... اور سعد نے اپنے سینے پر رکھے

اس کے بے دم ہاتھوں کو گرنے نہیں دیا...... اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

مومی چند لمحے...... کپکپاتے ہونٹوں بہتی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

''با......با......'' اور پھر صدیوں سے قید اِک سسکی آزاد ہوئی۔ سعد نے اسے گلے لگایا۔

''بابا......!'' اور اب کی بار...... وہ اس کے یونیفارم کو مٹھیوں میں جکڑے چیخ کر بولی......تو وہ قید چیخ بھی آج آزاد ہوئی۔ سعد اس کو دونوں بانہوں میں بھرے خود کو اور اسے قابو کرنے کی کوشش میں تھا......

لیکن......قابو آج کہاں......؟

باپ کو آج پہلے دن......پہلی بار روئی تھی......قابو آج کہاں......اور وہاں کون تھا کہ جس کی آنکھ نہ بھر آئی ہو......حسیب، گل، عائلہ، مشی بھی سہم کر ماں کے ساتھ چپکی تھی۔ اور حیدر......

وہ ہاتھ کی مٹھی ہونٹوں پر رکھے......سرخ چہرے کے ساتھ وہ......واحد تھا جو کہ ضبط کی بہترین مثال نظر آتا تھا۔

سعد عام انسان، نہیں پائلٹ بن کر لوٹا تھا۔

مومی کو دھوکا دیا گیا تھا۔ یہ بھلا ہوتا کیسے......سعد کیسے نہ جوائن کرتا ائیر فورس it's in flesh... in blood سعد کے اندر یہ فیڈ تھا......اسے پائلٹ ہی بننا تھا......ہاں......وہ کم ہمت ضرور ہوا تھا لیکن ہمیشہ ایک حل، ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی ایک حل......عقل کے ڈھونڈ لینے کے واسطے رکھ دیا جاتا ہے۔ تو وہ ''حل'' ڈھونڈ لیا گیا تھا۔

یہ کہاں کی عقل مندی تھی کہ چند لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے passion کو چھوڑ دیتا......یہ ہوتا تو کیسے ہوتا......

عائلہ تک کو یہ بات ٹھیک اس دن معلوم ہوئی تھی......یہ بس حسیب اور گل ہی جانتے تھے۔

اور ایک یہ ہی ''حل'' تھا جو وقت نے تب بجھایا تھا۔

یہ تقدیر تھی...... جو کہ ماتھے پر داغ دی گئی تھی۔ نہیں بدل سکتی ...... چاہے مومی جتنی اور بھی کوشش کر لیتی جتنی اور جنگیں بھی وہ لڑنا چاہتی ناں تو لڑ کر دیکھ لیتی......یہ نہیں بدلنی تھی......اور نہیں بدلی۔

وہ اب خاموشی سے سعد کے کندھے سے سر ٹکائے کسی معصوم بچے کی طرح اس کے بازو کے گھیرے میں بیٹھی تھی۔

وہ ہر چند لمحے بعد اس کے گالوں پر لڑھکنے والا پانی صاف کر دیتا تھا۔ اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو نرمی سے سلجھا کر پیچھے کر دیتا۔

''مومی آپ جتنا بھی بچ لیں۔ جس قدر بھی پہلو بچا لیں لیکن جان لیں کہ آپ اس نسل کی عورت ہیں......وہ کہ جس نسل سے میری ماں ہے اور پھر میری ماں کی ماں اور......ہاہ......آپ نہیں بچ سکتیں۔ بڑی زیادتی کی آپ نے...... بڑی ہی زیادتی......جو آپ نے پاکستان ائرفورس کو ایک ذہین دماغ سے محروم کر دیا...... یہ حق تھا پاکستان کا......پاک ائرفورس کا آپ پر اور یاد رکھیے گا کہ حق خود اپنا آپ وصول کر لیتا ہے۔''

اس کے بالوں کو سلجھاتے ہوئے نرمی سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

اور مومنہ خاموش ہو کر سنتی تھی کہ یہ ہار کا دن تھا......جیت کا نہیں......

☆☆☆

ایک سیاہ سوک نے اسلام آباد کی طرف سے آنے والی سڑک سے موڑ کاٹا اور وہ ائرپورٹ لنک روڈ پر مڑ گئی تھی......گاڑی کے اسٹیئرنگ کو دو نسوانی ہاتھ تھما رہے تھے۔ سیٹ بیلٹ باندھے ہوئے لمبے گھنے بالوں کا گردن سے کچھ اوپر باندھا ہوا جوڑا......آنکھوں پہ گاگلز اور سنجیدہ چہرہ......فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ ایک پانچ سال کی بچی تھی۔ اور ابھی گاڑی کے بند شیشے کے ساتھ ناک چپکائے باہر کے نظاروں میں مگن تھی۔

گاڑی رفتار سے چلتی ہوئی اشارے پہ رکی تھی۔
''ڈیم اٹ......'' نسوانی ہاتھ یک دم اسٹیئرنگ پر زور سے پڑا تھا۔ اور وہ بری طرح سے بیزار نظر آئی تھی۔ وہ کوئی vvip موومنٹ تھی کہ جس کی وجہ سے ٹریفک روک دی گئی تھی۔ کوئی ہائی پروفائل شخصیت آرہی تھی۔ وہ بیزاری سے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے...... ٹریفک کھلنے کے شدید انتظار میں تھی کہ اچانک شیشے پر دستک ہوئی تھی۔ بچی نے مڑ کر یاں کو دیکھا تھا۔ دستک اسی کے والے دروازے پر ہوئی تھی۔
اس نے شیشہ نیچے کیا۔
''بچی کا فراک دروازے میں آیا ہوا ہے۔'' اس دستک دینے والے نے کہا تھا۔
اس نے اس بات پہ گھور کر بچی کو دیکھا اور دروازہ کھول کر فراک اندر کرنے کو کہا تھا۔
ٹھیک اسی وقت ٹریفک ذرا سی آگے کو پھسلی تھی۔ وہ یک دم اس طرف متوجہ ہوئی اور گاڑی آگے بڑھائی تھی اور پھر سے ٹریفک رک گئی۔
گاڑی اب اشارے سے چند قدم کے فاصلے پر تھی کہ......
''ماما...... ملٹری مین۔''
اس نے اپنی بیٹی کی جوش بھری آواز سنی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ کوئی حرکت کرتی یا کچھ سوچتی...... اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ بچی جھٹ سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور بھاگتے ہوئے اس آرمی والے کی طرف گئی تھی۔
ٹریفک رکا ہوا تھا اور وہ بجلی کی سی رفتار سے گاڑیوں کے بیچ سے گزر رہی تھی۔ وہ گاڑی دوبارہ لاک کرنا بھول گئی تھی۔
ہنیا کا رنگ یک دم فق ہوا تھا۔
بتی کسی بھی لمحے سبز ہو سکتی تھی...... وہ نکل کر اس تک جا بھی نہیں سکتی تھی کہ ٹریفک چل پڑی تو...... محض اس کی گاڑی کی وجہ سے جام ہو کر رہ جائے گی۔ سانس روکے وہ اپنی بیٹی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ اب

اس آرمی ٹریفک کنٹرولر کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اور بڑے جوش سے اس سے ہاتھ ملا رہی تھی۔
اور ہنیا...... اس نے دم بخود ہو کر بیٹی کی اس حرکت کو دیکھا تھا۔
بتی سبز ہوئی...... اس نے آگے لے جا کر گاڑی سائڈ پر روکی...... اور نظریں بیٹی پر...... وہ بار، بار مڑ کر اسے دیکھ رہی تھی کہ جس کا ہاتھ اب ٹریفک کنٹرولر نے پکڑ رکھا تھا تا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ وہ تیزی سے گاڑی سے نکل کر اس تک آئی اور رکھ کر ایک تھپڑ بیٹی کے منہ پر مارا تھا۔
کیوں مارا تھا؟ وہ خود بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔
ٹریفک کنٹرولر نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا لیکن ہنیا وہ اس کے یونیفارم، اس کے لمبے چوڑے وجود اور سر پر رکھی بیرٹ سے نظریں چرائے بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اچانک بیٹی کا ہاتھ اس آرمی والے کے ہاتھ سے چھڑایا اور اسے بری طرح سے کھینچتی ہوئی گاڑی تک لائی اور لا کر سیٹ پر پٹخا تھا۔
بچی اب منہ بسور رہی تھی۔ آنکھیں مل، مل کر رو دینے کو تھی۔

''کیوں گئیں تم...... کیوں؟'' وہ غصے سے دہاڑی۔
"I love pak army" لفظ منہ سے آزاد ہوئے اور ہنیا پر ڈھے پڑے۔ بیٹی کے جواب نے ہنیا کو کہیں کا نہیں چھوڑا...... وہ حیرت کے صدمے سے اُسے دیکھتی رہی۔
بچوں میں جینز کے ساتھ خصوصیات نہیں آتیں کچھ جذبے بھی اگلی نسل میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کی ہی بیٹی تھی۔

اور پھر اس نے تھک کر گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔
اپنی بیٹی کے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اِک بے بس سے انداز میں گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔
"I love pak army" یہ کچھ اور یاد نہیں آیا تھا...... وہ ہی ذہن کی گرفت میں آیا تھا

جو کہ آج تک بُھلایا ہی نہیں جاسکا تھا۔ وہ خواب اور تعبیر ...... ہاں یہ اسے مل گئی تھی ...... ٹھیک اپنی شادی سے ایک رات پہلے جب وہ بیڈ پر لیٹی اسی خواب کو سوچ رہی تھی تو تعبیر کسی الہام کی طرح دل پر اتری تھی۔

اور وہ جھٹکا کھا کر لیٹے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''اس تکلیف میں اس نے خود کو مبتلا اس لیے دیکھا تا کہ یہ جان سکے کہ حیدر پر آنے والی تکلیف کس قدر شدید تھی اور جب اس حالت میں کوئی چھوڑ کر چلا جائے ۔ٹھیک وہ ہی کہ جس کا نام آپ نے اسی تکلیف کے لمحے میں پکارا تھا۔ تو کیا...... کیا ہوتا ہے۔''

تو آج بھی...... آج بھی وہ اس خواب کے اثر میں تھی...... باہر نہیں نکل سکی تھی۔ اور زندگی کے ہر اک نئے طلوع ہونے والے دن میں آگہی کچھ اور حاصل ہوا کرتی تھی کہ ادھورا شخص، مکمل زندگی...... مکمل شخص، مکمل ہی زندگی...... لیکن وہ خود...... وہ خود کیا مکمل تھی......؟ تھی کیا؟

☆☆☆

ایک دفاعی رسالے میں حیدر کی اسٹوری چھپی تھی۔ ایک پرائیویٹ چینل نے ایک اوپن ڈیبیٹ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ڈیبیٹ میں طلبا بطور حاضرین تھے۔ دو پینلو تھے جو کہ حمایت اور مخالفت میں بولنے والے افراد پر مشتمل تھے۔ کچھ دانشور، اینکر پرسنز آرمی کے ایک ریٹائرڈ جنرل...... ایک اعلیٰ افسر اور حیدر بھی انوائیٹڈ تھا اور رسالے میں اسٹوری چھپنے کی وجہ سے حیدر نظر میں آیا تھا۔ اس کا ارادہ تو نہیں تھا جانے کا لیکن موی کے اصرار پر وہ یہاں آیا تھا...... وہ اس اصرار کو موی کی ایکسائٹمنٹ سمجھا تھا۔ اور موضوع بہت حساس تھا۔

اور جب حیدر سے سوال کیا گیا تو وہ بولا۔

''ہمارے رہنما صرف اپنا مفاد ...... اپنی سیاست...... اپنی دوستیاں دیکھتے ہیں اور نبھاتے ہیں۔ اس کے لیے کتنے جوان معذور ہوتے ہیں، کتنے زخمی ہوجاتے ہیں، کتنے شہید...... انہیں مطلق پروا نہیں ہوتی۔ وہ صرف اور صرف مفاد اور دوستی کو مدِنظر رکھتے ہیں تو کیا یہ کرپشن نہیں؟ رہنماؤں کے اِک فیصلے سے کئی جانیں جاتی ہیں۔ دور کیوں جائیں مجھے دیکھیے...... میں اس کی مثال ہوں...... میں نے تعلیم حاصل کی...... اکیڈمی کو بھگتا اور پھر کمانڈو... کی ٹریننگ کو بھی اور جب میں ایک فعال کمانڈو بن کر نکلا تو میرے سامنے مقصد یہ ہی تھا کہ گر جان جائے تو ملک کے لیے اور ہوا کیا......؟ ایک...... وار میں...... میں نے اپنے جسم کا ایک حصہ کھو دیا...... اتنی تکالیف برداشت کیں، ساری عمر کے لیے معذور ہوگیا اور اس وار میں حصہ لینے کا فیصلہ ہمارا نہیں تھا۔ ہمارے رہنماؤں کا تھا۔ مجھے ساری عمر، اپنی ساری عمر میں اس بات کا بے حد رنج رہے گا کہ جو چیز میرے ملک کی تھی وہ ایک متنازعہ وار کی نذر ہو کر رہ گئی۔''

اس نے پہلی بار اپنے دکھ، اپنی تکلیف کو لفظوں میں بیان کیا تھا۔ ہال میں اِک ساعت کے لیے خاموشی چھائی تھی اور پھر تالیوں کی آواز گونجی تھی۔

اور تالیاں بجاتی موی...... اِک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ حاضرین سے سوالات لینے کا سلسلہ شروع ہوا تو کچھ لوگوں نے کافی سخت سوال کیے اور موی زیادہ دیر برداشت نہ کر پائی۔ اس نے بھی سوال کرنے کی غرض سے ہاتھ کھڑا کیا تھا اور جب موقع ملا تو......

''مجھے کوئی سوال نہیں کرنا...... کچھ خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ میں ایک شہید کی بیٹی ہوں...... وہ ہی شہید کہ جس نے اپنا طیارہ سویلین آبادی پر گرنے نہیں دیا تھا۔ میرا شوہر میجر حیدر علی، اس وقت سامنے اسٹیج پر بیٹھا ہے اور معذور ہو چکا ہے۔'' (حیدر کا رینک اس حادثے کے بعد سے اپ کر دیا گیا تھا) اس کے یوں کہنے پر ہال میں اوہ کی آوازیں گونجی تھیں۔

''میرا اکلوتا بھائی...... ایک پائلٹ ہے، جس کے لیے میں نے پوری کوشش کی تھی وہ پائلٹ نہیں بن سکے۔ یہاں تک کہ اپنی کلائی کی رگ بھی کاٹ دی تھی

لیکن...... ''کئی آوازیں پھر سے ابھریں اور مومی نے اک گہری سانس لی تھی۔ ''لیکن یہ کہ وہ کسی سویلین کی اولاد نہیں تھی کوئی اکلوتا بیٹا نہ تھا کہ جس کی ماں اسے فوج جوائن کرنے سے روکتی...... ہم جانیں دان کرنے والوں کے قبیلے سے ہیں۔ ہم لہو، اعضا اس دھرتی کو دیتے آئے ہیں اور یہ ہوتا رہے گا۔ یہ لوگ کسی بھی مومی سے...... کسی بھی مومنہ سے رکنے والے یا ٹھہرنے والے نہیں ہیں کیونکہ فوج ان کا passion ہے اور پروفیشن بھی۔ میرا ماننا ہے کوئی بھی پروفیشن اپنے عروج کو تب ہی پہنچتا ہے۔ داستانیں تب ہی رقم ہوتی ہیں جب اسے صرف پروفیشنل نہیں بلکہ passionate لوگ ملتے ہیں اور آرمی کیا ہے...... یہ انہی passionate لوگوں کا ادارہ ہے ان کا نہیں جو اسے صرف as a profession جوائن کرتے ہیں اور یہی لوگ...... ٹھیک یہی لوگ اسے گندا کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ یہ درست ہے ہر محکمے میں، ہر جگہ اچھے، برے لوگ ہوتے ہیں، آرمی ہم جیسے لوگوں سے ہے...... ان سے نہیں جو کرپٹ کہلاتے ہیں...... یہ نسلوں کی داستان ہے جو کبھی رکے گی نہیں، چاہے کوئی بھی مومنہ مجیب عالم...... جتنی بھی کوشش کرلے...... جتنی بھی طاقت آزمالے یہ رکے گا نہیں...... رک سکتا ہی نہیں...... حتیٰ کہ کل کو گر مومنہ اپنی اکلوتی اولاد کو فوج کے حوالے کرنے سے انکار کردے تو سامنے بیٹھا وہ شخص یہ ہونے نہیں دے گا...... وہ یہ سلسلہ رکنے نہیں دے گا...... اور یہ نسلوں کی کہانی ہے جو روانی سے بہتی ہے اور بہتی رہے گی۔ اور کوئی اور مومنہ اسے روک نہیں سکتی...... کسی بھی طرح سے نہیں...... کسی بھی طور سے نہیں...... وہ یہ ہرگز نہیں کرسکتی۔''

یہ کہہ کر وہ رکی نہ تھی...... تالیوں کی گونج میں کرسیوں کے درمیان بنے راستے میں سے گزر کر وہ ہال سے باہر نکلی تھی۔ باہر رات اپنے پر پھیلا کر چارسو پھیل چکی تھی۔ فضا میں خنکی تھی...... سرد ہوا کے تھپیڑے تھے۔ آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی تھی۔ چہرہ تپ رہا تھا۔ کئی لمحے وہ اسی طرح سے کھڑی رہی پھر یک دم اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔ چونکانے اور مڑ کر دیکھنے پر مجبور کرنے والی حیدر کی اسٹک کی آواز تھی۔ وہ اسے یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکرایا جواباً اس نے ہلکی مگر اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا، اپنا بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلایا مومی نے اسے سہارا دیا اور وہ دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ سرد ہوا کے تھپیڑے جب ان کے وجود سے ٹکراتے تو پھر مڑ کر حیران نظروں سے ان کے آسودہ چہروں کی جانب تکتے۔

وہ کتنے مکمل لگتے تھے ناں......

''تو تم اس لیے آئی تھیں...... اور مجھے بھی بھیجا تھا؟'' مومی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر مسکرائی۔

''ہاں۔'' ایک لفظی جواب ڈھٹائی کا عنصر لیے ہوئے تھا۔ وہ ہنس دیا...... یوں جیسے اس کا کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''تمہارا بھی جواب نہیں ہے مومی......'' اس نے جیسے اعتراف کیا۔ اب کی بار مومنہ ہنس دی تھی۔ ذرا سا کھل کر...... ایک دفعہ پھر سے وہ ساتھ، ساتھ مگر خاموشی سے چلنے لگے تھے۔ فضا کے سکوت کو اسٹک کی ٹک، ٹک کی آواز توڑتی تھی اور وہ دونوں مگن ہو کر چلتے جاتے تھے۔

''ہنیا یاد آتی ہے؟'' مومی کو جیسے اچانک یاد آیا تھا۔ ایک غیر متوقع سوال جو کہ پہلی بار پوچھا گیا تھا۔

''ہاں......'' حیدر نے آرام سے جواب دیا۔

''کیوں......؟'' اور یہ پوچھتے وقت انداز میں جیلسی یا کوئی خاص بات محسوس نہ ہوتی تھی۔

''کیوں......؟'' وہ حیران ہوا۔ اس نے اسی کے انداز میں دہرایا۔

''کیسے یاد نہ آئے مومی......! کیسے؟ زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ حادثہ ہے۔ بھلایا کیسے جاسکتا

ہے۔ میں اسے غلط نہیں سمجھتا...... وہ ٹھیک تھی۔ جو کام وہ نہیں کر سکتی تھی وہ پیچھے ہٹ گئی اور یہ ہی بہتر تھا اور اس سب میں...گر مجھے تکلیف پہنچتی ہے تو کیا، کیا جاسکتا ہے۔'' انداز سنجیدہ تھا۔

''اسے ساتھ دینا چاہیے تھا حیدر......!'' مومی کو اعتراض ہوا۔

''وہ ساتھ دیتی تو تم کہاں سے آتیں؟'' اسے نرم نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا گیا۔ مومی کے قدم یک دم رکے تھے۔ وہ ان نرم نگاہوں کو دیکھتی رہی۔ یوں جیسے ان نظروں کو اپنے اندر تک اتار لینا چاہتی ہو۔

''اور مومی؟ مومی کیا ہے؟'' پھر دھیمی آواز میں پوچھا گیا تھا۔

حیدر نے کِھل پڑنے والی مسکراہٹ کو بے اختیار روکا تھا۔ تو وہ ہنیا کے بارے میں فیلنگز نہیں جاننا چاہ رہی تھی۔

''میری شفا، میرا مرہم......'' ذرا سے توقف کے بعد وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا تھا...... وہ بلش ہوئی تھی۔

''جھوٹ......'' اور ردِ عمل کے طور پر اس نے حیدر کے سینے پر زور سے الٹا ہاتھ دے مارا تھا۔

''آہ......'' وہ بے ساختہ دُہرا ہوا۔

''سدھر جاؤ یار......'' مصنوعی خفگی سے کہا گیا تھا۔

اور مومی اس کے کندھے سے سر ٹکائے کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ وہ اب پارکنگ میں پہنچ چکے تھے۔

''ثنا آرہی ہے۔'' گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے حیدر نے اطلاع دی تھی۔

''گاڈ......اب یہ کون سی والی ہے؟'' حیرانی سے منہ بنا کر پوچھا گیا تھا۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھولتے، کھولتے رکی تھی۔

''شٹ اپ مومی...... دوست ہے میری...... یہ بہت اچھی دوست......تم سے ملنے آرہی ہے۔'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ گاڑی آٹو میٹک تھی۔ مومی گاڑی میں بیٹھتے، بیٹھتے زور سے ہنسی۔ یوں جیسے حظ اٹھایا ہو۔

حیدر نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر گاڑی اندھیرے میں ڈوبے مختلف بل کھاتے رستوں پر اِک ہموار رفتار سے چلتی رہی۔ بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح زندگی اپنی ڈگر پر ہموار رفتار سے چل پڑی تھی۔

☆☆☆

قریب صبح چھ بجے کا وقت ......صبح کے دھند لکے میں ڈوبا پارک سردیوں کے دن......سانس کے نام پر منہ سے دھواں سا نکلتا تھا۔ اِک قریب بارہ سال کا بچہ خاکی پینٹ اور فل بازوؤں کی سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس، جاگنگ ٹریک پر بھاگ رہا تھا۔ فضا میں کہر سی چھائی ہوئی تھی۔ خنکی عروج پر اور اس بچے سے ذرا فاصلے پر اک مردِ جانباز اپنی اسٹک کے سہارے چلتا ہوا آرہا تھا۔

''جوان......''

''یس سر......!''

''مورال کیسا ہے؟''

''ہائی سر......''

''اپ ٹو......؟''

''اسکائی سر......''

اور اس بچے کی ''اسکائی سر'' کہنے کی اونچی آواز لبوں سے آزاد ہوتی......صبح کے دھند لکے کے ساتھ مدغم ہوئی اور پارک میں اِک بازگشت بن کر گونجی تھی۔ جانباز کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

''جاں بازی کیا تھی؟''

''ٹھیک یہ ہی......''

''اور وہ کون تھا؟''

''من......جاں......بازم۔''

"the few...the proud...the commandos"

(ختم شد)

دل تو میرا یہی تھا کہ میں چھری اس کے گلے پر پھیر دیتی...... بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اس کے برابر میں جلدی، جلدی ہی سہی فروٹ چاٹ کے لیے پھل کاٹتے ہوئے یہی اندازہ لگا رہی تھی کہ کس طرح اور کون سے طریقے سے اگر چھری اس کے گلے پر پھیروں تو کچھ یوں ہو کہ اسے بلکنے کا بھی موقع نہیں ملے...... جب میں نے دیکھا کچھ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ بڑی پھرتی سے کچن میں چاروں طرف تلے ہوئے سموسوں اور پکوڑوں کو دو چار پہلے سے رکھی گئی ٹرے میں سجانے کے چکر میں ایک جگہ ٹک نہیں رہی تو میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا...... چھلکوں کو کچرے میں پھینکنے کے بہانے چولھے کے پاس پہنچی اور تیل کی کڑاہی جس پر وہ تھوڑی دیر پہلے آدھی سے زیادہ جھکی ہوئی تھی ایک ہی جھٹکے سے الٹا دی۔ کھولتا جھاگ اڑاتا تیل تیزی سے

بیٹی

ہاجرہ ریحان



کڑاہی کی حدوں سے نکل کر پہلے تو چولھے پر پھیلا اور پھر جگہ بنا تا زمین پر گرنے لگا... اور کڑاہی خالی ہو کر بے ہنگم شور کے ساتھ لڑھکتی دور جا گری...... اس کے تیزی سے کام کرتے دونوں ہاتھ رک گئے...... اس نے صرف ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا...... چہرے پر حیرت تھی جو فوراً ہی کربناک ہوگئی ایک ہلکی سی دبی، دبی چیخ اور بس...... اور تب مجھے احساس ہوا کہ تیل چھلک کر مجھ پر بھی گر چکا تھا۔

لاؤنج میں موجود مہمانوں کا شور تھم سا گیا سب اندازہ لگا رہے تھے چیخ مصنوعی تھی یا واقعی کوئی حادثہ ہو چکا ہے...... کچھ لوگ باورچی خانے میں داخل ہوئے...... جن میں اس کا اور میرے شوہر آگے، آگے تھے۔ ایک ہی لمحے میں سب کو سمجھ آگئی کہ کیا واقعہ رونما ہو چکا ہے، مجھے میرے شوہر نے نرمی سے پکڑ کر ایک طرف کر دیا جبکہ اس کا شوہر گاڑی باہر نکالنے کا کہہ کر جلدی سے پلٹ گیا تھا...... تھوڑی ہی دیر میں ہم افطاری کو بھول کر اسپتال کی طرف جا رہے تھے...... مجھے ذرا سی مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا...... اس کا شوہر ہمیں ہمارے گھر تک چھوڑ کر دلا سے دیتا رخصت ہو گیا اور بار، بار کسی بڑے نقصان سے بچنے پر اللہ کا شکر ادا کرتا رہا۔

''کیا جلنا کافی نقصان دہ ہوتا ہے؟'' میں یہی سوچتے، سوچتے گھر میں داخل ہوگئی۔

اگر جلنے سے اتنا نقصان ہوتا ہے تو یہاں تو میں پہلے ہی جل چکی تھی...... راکھ ہو چکی تھی...... پھر کیوں نہیں کسی کو کچھ محسوس ہوا...... کیوں لوگ مجھے معمول کے مطابق لے رہے تھے...... دل کا جل جانا بھی تو کچھ کم نقصان دہ نہیں ہوتا ناں......

☆☆☆

نرگس کی شادی پر میں کتنا خوش تھی...... آٹھ سال میری شادی کو ہونے والے تھے۔ اور یہ سال میں نے بڑی مشکل سے گزارے تھے کہ مجھے اس سے ہر بات کرنے کی عادت تھی اور جب کوئی ایسی بات جو ہم میاں بیوی میں جھگڑے کا باعث بنتی اگر نرگس کو بتاتی تو وہ میری بات سمجھ نہیں پاتی تھی...... اور مجھے تھک ہار کر کہنا پڑتا تھا کہ جب تمہاری شادی ہوگی پھر پوچھوں گی۔ اب میرے پوچھنے کے دن قریب آگئے ہیں۔ میں مسرور تھی، اس کو کئی بار چڑا بھی چکی تھی۔ ایک میں ہی اس کی دیوانی نہیں تھی۔ اس کے خاندان والے، رشتے دار، دوست احباب، اس کی ساری اسٹوڈنٹ سب ہی کو وہ اچھی لگتی تھی۔ سب ہی اس کی تعریف کرتے تھکتے نہیں تھے مگر اس کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے پہل تو ہر محلے والے، رشتے دار، دوست یہاں تک کہ اسٹوڈنٹ سے بھی کہا گیا تھا کہ کوئی رشتہ ہو تو بتائیں...... پھر عاملوں کے چکر لگنے لگے۔ ہر روز ایک نیا تعویذ اس کے گلے میں لٹکتا نظر آتا۔ میری بچپن کی وہ ایسی دوست تھی جس سے مزاج میں ہم آہنگی اب تک موجود تھی۔ مگر یہ ہم آہنگی وہاں مات کھانے لگی جب میں نے اس کے لیے اپنے دور دراز کے ایک کزن کا رشتہ بھجوایا جو ایک آٹھ سالہ بچی کا باپ تھا۔ وہ سخت ناراض تھی...... کسی کی بات اس کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ سیدھی سی بات تھی اب وہ اس عمر میں نہیں تھی کہ اس کے لیے کنوارے لڑکوں کے رشتے آتے مگر وہ اس ایک حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس کو کافی سمجھاتی رہی اور بقول اس کے لیکچر جھاڑتی رہی...... بالآخر میں نے اسے اس رشتے کے لیے راضی کر ہی لیا...... مجھے تو کم از کم اس کا شوہر بہت بھایا تھا۔ تمیز دار بندہ تھا، پڑھا لکھا...... اپنا گھر اور میڈیکل اسٹور کا مالک تھا، خوشحال تھا، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ شادی کے تیسرے ہفتے ہی اس کا رات گئے میرے فون پر میسج آگیا۔

''حد ہوتی ہے...... تم سب نے مجھے پھنسا دیا۔''

''کیا ہوا......؟'' میں نے گھبرا کر فوراً پوچھا۔

اس نے بتایا کہ اس کے شوہر کی بچی سوتے میں ڈر گئی تو اس کا باپ اب اس کے کمرے میں جا کر سو گیا ہے...... مجھے بڑی حیرت ہوئی...... میں نے جواب دیا

کہ ”آخر تم لوگوں نے بچی کو اپنے ہی کمرے میں کیوں نہ سلا لیا.....“ جس پر وہ بھڑک گئی۔

”کیوں میں پاگل ہوں کہ اس لڑکی کو اپنے بستر پر سلاؤں..... اور تم پلیز اپنا لیکچر نہ شروع کر دینا..... میں بہت جلی ہوئی ہوں اس وقت.....“

آٹھ سال کی بچی کتنی بڑی ہوتی ہے..... معصوم اور بن ماں کی..... اب جو نرگس کی شادی کے باعث میں اس بچی سے قریب ہوئی تو مجھے اس بچی پر رحم بھی بہت آتا..... اس کی شخصیت میں ٹھہراؤ تھا۔ آنکھوں میں ویرانی ایسی تھی کہ میں جب بھی ذرا غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتی تو دل بیٹھنے لگتا۔ دبلی پتلی..... اپنی ہم عمر لڑکیوں سے ذرا نکلتے ہوئے قد کی وہ دور سے پہچان میں آ جاتی تھی..... میں اسے ایک دو بار اسکول لینے چلی گئی..... اس سے دوستی کرنے کے لیے مجھے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے مگر پھر ہم دونوں میں ایک عجیب سا رشتہ خود بخود بن گیا خاموشی کا..... ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خاموش رہتے..... نہ اسے کچھ کہنے کی ضرورت پڑتی نہ ہی میں اسے ٹوکتی..... کیسی عجیب بات تھی وہ میرے ساتھ، ساتھ رہتی۔ میری نظروں سے اندازہ لگا لیتی کہ میں اب کیا کرنے، کہنے جا رہی ہوں اور یہی حال میرا تھا۔ میرے لیے اس کی چال ڈھال، بیٹھنے، مجھے نظر بھر کر دیکھنا ہی کافی تھا۔ اور پھر میں اکثر اسے اسکول سے لینے چلی جاتی، کبھی کسی کتابوں کے میلے میں..... کسی پارک میں بھی ہم شام گزارنے لگے تھے۔ ہمارے ساتھ ہماری خاموشی ہوتی اور ایک دوسرے کا ساتھ..... ایک دن میں نے اسے اسکول سے لیا اور حسبِ عادت وہ میری سیٹ کے برابر میں بیٹھی تھی۔ ہم ایک سگنل پر کھڑے ہوئے تو ایک اشتہاری بورڈ پر کچھ خودکشی کے بارے میں لکھا تھا جو اس نے زور، زور سے اٹک، اٹک کر پڑھنا شروع کر دیا..... گاڑی چل پڑی اور وہ اشتہار پڑھنے سے رہ گئی..... اس نے میری طرف پلٹ کر دیکھا اور مدھم سے لہجے میں کہنے لگی۔

”نئی امی میری وجہ سے خودکشی کر لیں گی؟“

میرے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کپکپا گئے..... میں نے آئس کریم کی دکان دیکھ کر گاڑی روک لی اور آئس کریم کا آرڈر دے کر اس کے دوبارہ کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی..... آئس کریم کھاتے ہوئے وہ پھر بولی۔

”نئی امی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ میری وجہ سے کسی دن اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لیں گی۔ وہ کہتی ہیں کہ اگر میں کہیں چلی جاؤں تو وہ خوش رہیں گی..... میرا وجود ان کو اچھا نہیں لگتا..... میں منحوس ہوں۔“

”بس.....“

میں نے اسے ٹوک دیا..... اس نے بڑے اطمینان سے آئس کریم ختم کی..... اور ہم پھر سے روانہ ہوئے..... گھر کے باہر اتر کر وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گئی اور دونوں ہاتھ کھڑکی سے اندر ڈال کر باقاعدہ لٹک سی گئی..... میں نے اس کی ناک پر آنے والے پسینے کو ٹشو سے صاف کرنا شروع کر دیا..... وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی۔

”اگر..... اگر آپ مجھے رکھ لیں تو..... پاپا اور نئی امی خوش ہو جائیں گے۔“ اس نے معصوم سے لہجے میں مجھے مشورہ دیا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی بھاگ کر گھر کے دروازے سے اندر چلی گئی جو پہلے ہی گاڑی کے ہارن پر کھولا جا چکا تھا۔ وہ تو بچی تھی مگر اس نے شاید سوچ سمجھ کر نشانہ لگایا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز تھی اور میں خود کو سمجھ نہیں پا رہی تھی، یہ بے اولاد ہونے کا دکھ تھا یا پھر کسی بچے کا مجھ پر ایسے اندھے اعتماد کی خوشی تھی..... جو بھی تھا میری سوچ سے بالاتر تھا اور میں شام گئے تک خود کو بہلاتی رہی..... مگر اس کی معصومیت سے بھری نظر وہ لمحہ بھر کو آنکھوں کی شرارت، چمک جو اس کی عمر کے بچوں کی آنکھوں میں اکثر ہوتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں بس اس ایک لمحے کو ہی نظر آئی تھی۔ مجھے بار، بار بے چین کر دیتی تھی..... دل تو تھا کہ ابھی جاؤں اس کو گود میں بھر کے لے آؤں اور پھر کبھی خود سے جدا نہ کروں..... ہم دونوں بنا کہے ایک دوسرے کی بات سمجھ

لیتے ہیں...... یہ معمولی بات نہیں تھی یہ بڑا خاص رشتہ ہے روح سے روح مل گئی تھی شاید......

دوسرے دن مجھے اس کے والد کا فون آ گیا۔ انہوں نے بھی وہی بات دُہرائی۔ میں خوشی سے.... بے قابو ہو رہی تھی۔ انکار کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ ایک دو دن کے بعد اس پر باقاعدہ بات کرنے کا کہہ کر ہم نے فون بند کر دیا.... میرے شوہر کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں بھی وہی سوکھی سہمی ہوئی سی بچی اچھی لگتی تھی۔

مگر اچانک وہ سب کے سب سمٹ گئے...... مجھے کسی نہ کسی بہانے سے گھر پر بلانا بند کر دیا گیا۔ اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں اور وہ لوگ آناً فاناً شہر سے باہر چھٹیاں گزارنے چلے گئے۔ میں سوچتی ہی رہ گئی...... ایک مہینے کے بعد وہ دونوں میاں، بیوی خود تو چلے آئے اور بچی کو اپنی ایک بانجھ خالہ کو دے آئے...... بقول نرگس کے رشتے داروں کا پہلا حق ہوتا ہے۔ میں یہ بات سن کر بہت دکھی ہو گئی۔ دل بہت...... بے چین رہنے لگا اور میری خود کی طبیعت بگڑی، بگڑی سی رہنے لگی...... چلو مجھے نہ دیتے مگر کم از کم اسے اتنی دور تو نہ بھیجتے...... اب تو میری نظروں میں بس اس کا خیال ناچتا رہتا۔ یہاں تھی تو روز ملاقات ہو جاتی تھی...... میرا کوئی حق نہیں تھا، ان کی بچی تھی...... میں شکایت بھی کرتی تو کچھ حاصل نہیں تھا۔ دکھ ایسا تھا کہ اکثر اسکول کی چھٹی کے وقت میں کچھ بھی کر رہی ہوتی چھوڑ چھاڑ کر ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتی...... اور دل میں وہم کرتی رہتی...... مجھے یقین تھا کہ وہ بچی بھی کوئی خاص خوش نہیں ہو گی...... یہ صرف میری دوست کا کیا دھرا تھا۔ اس کے لیے میں یہ سب اسے نیچا دکھانے کے لیے کر رہی تھی۔

چند مہینے یوں ہی گزر گئے اور پھر میں نے وہ بری خبر سنی جس کو سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بچی سردی لگ کر بیمار ہوئی اور علاج بروقت نہ ہونے کی وجہ سے ڈبل نمونیہ کا شکار ہو کر چل بسی...... میں دکھ سے دُہری ہوئی جا رہی تھی۔ کافی دنوں تک مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے میرا سب کچھ چھین لیا ہو...... میں دن، مہینے سال کا فرق بھول گئی اور غم سے نڈھال ہو گئی۔

اور پھر اچانک مجھے افطاری کی دعوت دی گئی...... میں حیران تھی کہ میری دوست اس قدر سنگدلی دکھا کر مجھ سے پھر سے تعلقات بحال کرنا چاہتی ہے۔ جو ظلم اس نے کیا، اسے خدا کا خوف تک نہیں...... یہ سب وہ مجھے چڑانے کے لیے کر رہی ہے۔ وہ مجھے کیا دکھانا چاہتی ہے، ہماری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ان لوگوں نے ضد باندھ لی۔

''آپ نہیں آتے تو ہم آپ کو آ کر لے جائیں گے۔'' میں جانتی تھی کہ اس کا شوہر اس کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر وہ حکم دے گی تو اس سب کے باوجود وہ ہمیں لینے آ جائے گا۔ میں جب اس کے گھر پہنچی تو دعوت پر لوگوں کا ہجوم اور خوشی دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ابھی تو بچی کو گزرے مہینے ہی کتنے ہوئے تھے...... اور پھر میرے اندر جو غصے اور بغاوت کی لہریں اٹھنا شروع ہوئیں تو میں نے وہ کر دکھایا جو شاید میں زندگی بھر کسی کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ کھولتی تیل بھری کڑاہی میں اس کے اوپر بھی انڈیل سکتی تھی اور یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ کبھی پیدا نہیں ہو سکے گا۔

ہم دونوں جہاں پہلے خاندان میں ہونے والے ہر فنکشن میں ساتھ، ساتھ جاتے تھے اب کچھ یوں جاتے جب یقین ہوتا کہ دوسرا وہاں موجود نہیں ہو گا...... رشتے دار بھی سمجھ گئے تھے لہٰذا ایک نامعلوم عہد کے مطابق اگر اسے دعوت دی جاتی تو مجھے دعوت نہ ملتی اور اگر مجھے دعوت نامہ مل جاتا تو مجھے یقین ہوتا کہ اس محفل میں اس کو دعوت نہیں دی گئی ہے۔ سالوں گزر گئے۔ خداوند تعالیٰ نے میری آہ سنی اور مجھے دو لڑکوں سے نوازا...... نرگس کے ہاں بھی اولادیں ہوتی گئیں جن کے بارے میں مشترکہ رشتے دار ہونے کی وجہ سے اطلاع ملتی رہتی تھی۔ میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت

میں مصروف تو رہتی مگر جب کبھی کوئی بھی فرصت کا لمحہ پاتی مجھے اس بچی کا خیال ستانے لگتا...... قسمت نے بھی یوں جذبات سے کھیلا کہ اولاد تو ہوئی مگر بیٹی نہ ملی۔

مجھے میرے بڑے بیٹے وقار نے ایم بی اے کرنے اور پھر نوکری پر لگ جانے کے بعد اس کی تصویر دکھائی تو میں ذرا سا گھبرا گئی۔ اصل میں اس کے چہرے پر برص کے سفید کالے دھبے تصویر میں صاف نظر آرہے تھے...... میں نے غور سے وقار کی طرف دیکھا وہ میرے سامنے ہی بیٹھا دھیرے، دھیرے مسکرا رہا تھا۔ میرے استفسار پر کہ خاندان میں آنا جانا ہوگا...... دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا...... ان سب میں ایسی دلہن لے کر جانا اور پھر اگر کسی نے کبھی کوئی طنز یا مذاق یا بنایا تو اس کو برداشت کرنا، کیا وہ ان سب کے لیے تیار ہے؟ وقار...... میری ہی اولاد تھا، میں جانتی تھی کہ اس کے اندر کبھی حسن پرستی نہیں تھی وہ لوگوں کے دلوں میں جھانکنے کا عادی تھا مگر پھر بھی یہ ایک بہت اہم قدم تھا اور زندگی بھر کا ساتھ...... وقار نے مجھے دلاسا دیا کہ لڑکی کے ساتھ یہ مسئلہ تو ضرور ہے مگر وہ اس کی کلاس فیلو رہ چکی ہے اور وہ دونوں میں کافی باتیں مشترک ہیں، وہ جانتا ہے کہ لڑکی بھی کچھ کم مضبوط کردار نہیں رکھتی۔ وہ دونوں مل کر بہت اچھے سے زندگی گزارنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

میں نہ تو انکار کرسکی اور نہ ہی آگے بات بڑھانے کے لیے ہامی ہی بھر سکی تھی کیونکہ مجھے دوسرے لمحے وقار نے بتایا کہ لڑکی نرگس کی بیٹی ہے...... مجھے حد سے زیادہ دکھ ہونے لگا...... جب وقار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ نرگس کے تین بیٹے اور سب سے چھوٹی یہ لڑکی ہے مگر نرگس کو اپنی اس اکلوتی لڑکی سے شدید نفرت ہے...... اور لڑکی کو صرف اپنے باپ کا سہارا ہے۔ میں پریشان ہوگئی کہ آخر میں کس طرح اور کس منہ سے نرگس کے ہاں اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے جاؤں گی مگر وقار اور میرے شوہر صاحب مجھے بہلاتے رہے۔ وقار کے مطابق وہ لڑکی کے والد سے پہلے ہی مل چکا ہے اور انہوں نے وقار کو داماد کے طور پر قبول بھی کرلیا ہے بس یہ رسم دنیا نبھانے کے لیے مجھے ان لوگوں کے گھر باقاعدہ رشتہ لے کر جانا ہے اور آخر کار دونوں کے ہمت بندھانے پر میں نے ایک دن ایک رشتے دار کے ذریعے اپنی آمد کا پیغام نرگس کے ہاں بھیجا جو فوراً ہی قبول کرلیا گیا...... وقار بہت خوش تھا اور بار، بار احسان مند سا ہو کر میرے گلے لگ جاتا تھا۔

جیسے ہی گاڑی نرگس کے گھر کے سامنے رکی مجھے اختلاج ہونے لگا...... میں نے مدد طلب نظروں سے کبھی شوہر صاحب کو تو کبھی اپنے لڑکوں کی طرف دیکھنا شروع کردیا...... مگر تینوں ہی مجھے خوش دلی سے بہلاتے آخر کار نرگس کے ڈرائنگ روم تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔

تھوڑے سے ہی انتظار پر نرگس اور اس کا شوہر بھی آگئے...... دونوں ہی طرف سے ایک نامانوسیت سی تھی۔ جیسے بات کرنے کو کچھ بیچ میں رہا ہی نہیں ہو...... تھوڑی دیر تک تو مرد حضرات حالاتِ حاضرہ پر بات چیت کرتے رہے مگر پھر آہستہ، آہستہ وہ سب باتیں بھی ماند پڑ گئیں۔ اب وقار بار، بار میری طرف دیکھ رہا تھا کہ میں کب بات شروع کرتی ہوں...... میں نے تھک ہار کر ہمت باندھی اور گلا کھنکھار کر نرگس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔

''جس چیز کو میں مانگ نہ سکی تھی اور جو تم نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لی تھی...... آج میں دوبارہ تم سے ''وہی'' مانگنے آئی ہوں۔''

نرگس نے گہری سانس لے کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا جو تمام معاملات سے آگاہ تھے۔ اور ان کے مسکراتے رہنے پر اس نے چڑ کر پوچھا۔

''میں نے تم سے چھین لی تھی...... مگر کیا؟''

میری آنکھوں میں آنسو آچکے تھے...... میں نے اسی بوجھل لہجے میں جواب دیا۔

''بیٹی......''

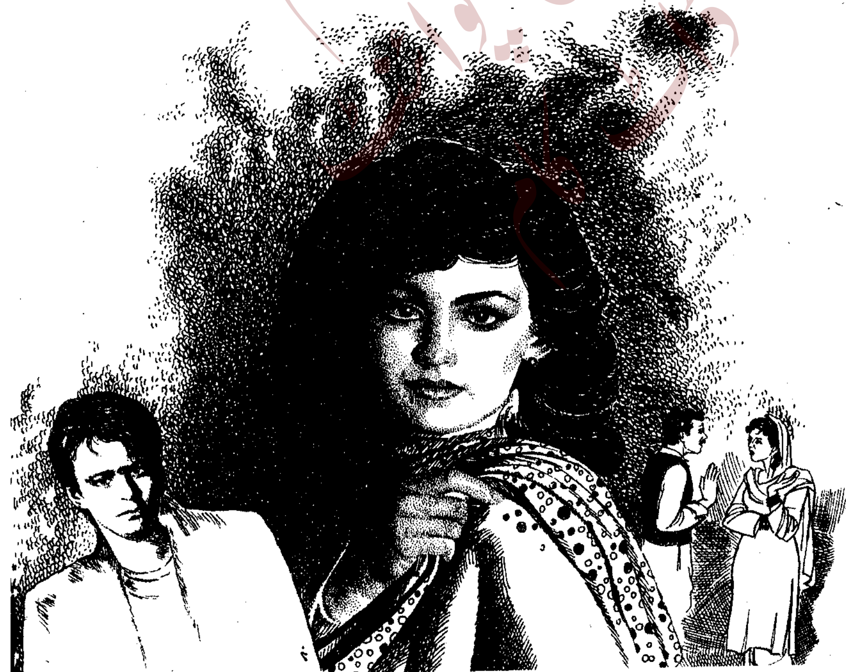
ناولٹ

مُسافت

غزالہ عزیز

دوسرا اور آخری حصہ

اور اگلے دن سلیم صاحب نے آپا کو امجد کے رشتے سے مناسب لفظوں میں انکار کر دیا تھا۔ تاکہ ان کی خاموشی پا کر وہ کسی خوش گمانی کا شکار نہ ہو جائیں...... حسبِ توقع اس انکار کا انہوں نے بہت برا منایا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح مظلوم بھاوج کی ذات کو ہی ملامت کا نشانہ بنایا تھا۔ ان کی نظر میں آسیہ چاہتی ہی نہیں تھیں کہ اس نئی قرابت داری سے بہن، بھائی کا رشتہ مزید مضبوط ہو سکے۔ انہوں نے تو بھائی کو کماؤ بیوی سے دبنے کا طعنہ تک دے دیا تھا۔ لیکن سلیم احمد نے سارے الزام اپنے سر لے لیے...... ورنہ رقیہ بانو سے کیا بعید تھی کہ ثانیہ کا انکار سن کر سارے خاندان میں اسے بدنام کر کے رکھ دیتیں...... کیا ہوا جو وہ اُن کی سگی بہن تھیں مگر وہ ان کے مزاج اور خصلت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے بیٹی کے ساتھ بیوی کو بھی بہن کے عتاب سے پہلی بار بچالیا تھا۔ بہر حال یہ قصہ یہیں ختم ہو گیا...... اور آسیہ نے سکھ کی سانس لی ورنہ ان کی جان تو دُہرے مصائب کی چکی میں پس رہی تھی۔ اور اب سلیم احمد کے صائب عمل نے انہیں ایک نئی آزمائش





جھیلنے سے بچالیا تھا۔ البتہ وہ ثانیہ کے رویّے سے سخت خائف ہوئی تھیں۔ وہ اپنی مرضی کا اظہار ان کے سامنے سہولت سے انکار کر کے کر سکتی تھی اور آسیہ بیگم خود بھی اس رشتے کے لیے ہامی بھرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اسے باپ کے سامنے آکر اس طرح اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ انہوں نے کب ثانیہ کی ایسی تربیت کی تھی مگر سلیم احمد نے بیٹی کی اس حرکت پر ان کی تربیت کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ اور وہ اپنی صفائی میں حسبِ معمول کچھ کہہ نہیں سکی تھیں۔ ثانیہ کی حرکت نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔

وہ اسے سمجھانا چاہتی تھیں۔ اس لیے اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ ثانیہ بیڈ پر اپنی کتابیں اور نوٹس پھیلائے بیٹھی ایگزامز کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ چلتی ہوئی آکر ثانیہ کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''تمہیں اپنے ابا کے سامنے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے، میں نے ایسی تربیت کی ہے تمہاری۔'' ثانیہ نے چہرہ اٹھا کر ماں کو دیکھا تھا۔ ان کے لہجے میں شکوے سے زیادہ ملال بول رہا تھا۔ ثانیہ کو افسوس ہوا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ واقعی جذباتی ہوگئی تھی۔

''تو اور کیا کرتی میں امی...... پہلے بھی شاہ زیب کے ساتھ میرا رشتہ ابا نے ہی طے کیا تھا۔ حالانکہ میں نے کتنا منع کیا تھا کہ مجھے ابھی کوئی منگنی، شادی نہیں کرنی ہے، میری پڑھائی ڈسٹرب ہوگی مگر آپ نے اور ابا نے اپنی مرضی کی تھی اور مجھے آپ لوگوں کی بات ماننی پڑی تھی لیکن اس رشتے کا کیا انجام ہوا...... آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ اور آپ اب بھی یہ چاہتی ہیں کہ میں ایک بار پھر ابا کے بنا سوچے سمجھے کیے گئے دوسرے غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ جاتی۔ کیا آپ جانتی نہیں کہ... بے جوڑ رشتے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے ہیں...... اور سچ تو یہ ہے کہ میں ابھی شادی ہی کرنا نہیں چاہتی۔ نہ امجد بھائی سے اور نہ کسی اور سے پلیز مجھے سکون سے اپنی پڑھائی مکمل کرنے دیں۔'' ثانیہ نے آخری جملہ لجاجت سے کہا۔

''مگر میں تمہارے ابا سے بات کر تو رہی تھی، تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہاری شادی امجد سے ہونے دوں گی۔ یہ فیصلے بڑوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، اس میں بچوں کو دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ تمہارے ابا کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا تمہارا اس طرح بات کرنا۔'' انہوں نے اسے پھر احساس دلایا تھا۔

''آئی ایم سوری امی...... میں ابا سے بھی معافی مانگ لوں گی۔ حالانکہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا ہے، مجھے اپنی زندگی کے بارے میں ہونے والے فیصلے سے متعلق بولنے کا، اپنی مرضی کے اظہار کا پورا حق ہے اور آپ کو اندازہ بھی ہے۔ شاہ زیب سے رشتہ ختم ہونے کے بعد میں کسی ذہنی اذیت سے گزری ہوں۔ معلوم نہیں کیوں آپ والدین اپنے بچوں کے لیے اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا حق تو استعمال کر لیتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ آپ لوگوں کا یہ فیصلہ اولاد کے حق میں بہتر ہوگا بھی یا نہیں...... اگر ابا اس رشتے کے لیے اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے تو شاید میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا ہوتا جو ہوا ہے۔''

وہ بالکل صحیح کہہ رہی تھی اور آسیہ بیگم کو احساس ہو رہا تھا کہ انہیں واقعی بیٹی کے ذہنی کرب کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ وہ بچی ہے، کم عمر اور ناسمجھ ہے، جلد ہی اس واقعے کو بھول جائے گی مگر وہ غلطی پر تھیں، حالات اور واقعات چاہے اچھے ہوں یا برے انسانی ذہن پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں...... اور اچانک ہی انہیں خیال آیا تھا کہ آج صبح ہی تو ان کی جیٹھانی ساجدہ بیگم نے فون پر شاہ زیب اور رمشہ کی منگنی طے ہونے کی اطلاع دی تھی...... اور آج شام باقاعدہ منگنی کی تقریب بھی رکھی گئی تھی۔ جس میں سارے خاندان والوں کو مدعو کیا گیا تھا سوائے ان لوگوں کے۔ یہ سن کر آسیہ کے دل کو گہری چوٹ پہنچی تھی۔ گویا عارف بھائی اور عطیہ بھابی نے سچ مچ اسے پرایا کر دیا تھا۔ یعنی سلیم

احمد کے غصے میں کیے گئے فیصلے سے عارف بھائی نے سچ مچ ماموں زاد بہن سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ آسیہ تو انہیں سگے بھائی کا ہی درجہ دیتی تھیں۔ اور اب وہ سوچ رہی تھیں کہ یہ بات وہ ثانیہ کو بتائے یا نہیں بیٹی کے دکھ پران کا دل بھر آیا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی اور ثانیہ کا سر اپنے شانے سے لگا کر اس کے بالوں کو سہلانے لگیں۔

''مجھے معاف کردو بیٹا...... اگر میں تمہارے ابا کو یہ فیصلہ کرنے سے ہر ممکن باز رکھنے کی کوشش کرتی تو شاید تمہیں یہ دکھ کبھی سہنا نہیں پڑتا۔ لیکن میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ تمہارے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔ تم بس اطمینان سے اپنی پڑھائی کرو۔'' ان کے لہجے میں نمی کے ساتھ عزم بھی تھا۔ وہ اولاد کے حق میں کوئی غلط فیصلہ نہیں ہونے دیں گی۔ اور اسی لیے امجد کے رشتے کے سلسلے میں انہوں نے بیٹی کے حق اور اس کے بہتر مستقبل کے لیے شوہر کے سامنے اسٹینڈ لے لیا تھا۔ اور سلیم احمد کو ان کی بات مان کر رقیہ بانو کو امجد کے رشتے سے انکار کرنا ہی پڑا۔

ثانیہ نے چہرہ اٹھا کر ماں کے پُرعزم چہرے کو دیکھا اور وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ثانیہ کے چہرے پر سکون کا تاثر ابھرا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ صبح ہی ابا سے معذرت کرلے گی۔ اسے واقعی ان سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

☆☆☆

اگلے دن فاریہ جو اس کی کزن ہونے کے ساتھ، ساتھ دوست بھی تھی اپنے جدید موبائل کیمرے میں شاہ زیب اور رمشہ کی منگنی کی تصویریں لیے ثانیہ کے پاس چلی آئی۔ تاکہ اسے دکھا سکے کہ شاہ زیب اپنے والدین کے اس فیصلے سے کتنا پُرسکون اور مطمئن نظر آرہا ہے۔ لہٰذا ثانیہ کو بھی اس سے رشتہ ختم ہونے پر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کی کوئی پروا ہی نہیں کرنی چاہیے۔

''تمہیں اس شاہ زیب کی پروا کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے یقین ہے، تمہیں اس سے کہیں زیادہ اچھا اور محبت کرنے والا بے لوث ساتھی ملے گا۔'' فاریہ نے اپنے طور پر اس سے ہمدردی میں تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن ثانیہ اب خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔

''مجھے اس کی منگنی یا تصویروں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔'' وہ بڑی بے نیازی سے بولی۔ ''وہ جس سے چاہے شادی کرے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ وہ میری زندگی سے نکل چکا ہے لہٰذا آج کے بعد تم اس کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کروگی۔'' ثانیہ نے اسے شاہ زیب کی منگنی کی پکچرز دکھانے سے منع کردیا تھا۔ اس لیے فاریہ بھی موبائل ایک طرف رکھ کر اسے تسلی دینے لگی۔

''آئی ایم سوری ثانیہ...... میں تو بس اس لیے دکھانا چاہ رہی تھی کہ تمہیں شاہ زیب کی اصلیت کا پتا چل جائے...... رمشہ سے منگنی کرکے وہ کتنا خوش اور مطمئن ہے اس لیے تمہیں بھی اس کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے۔''

''مجھے واقعی اس کی کوئی پروا نہیں ہے، پلیز...... کوئی اور بات کرو فاریہ...... اس ٹاپک کو بس یہیں ختم کردو۔'' ثانیہ نے برجستہ لہجے میں کہا تو فاریہ کو فوری اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس لیے وہ ثانیہ کا دھیان بٹانے کے لیے دوسری بات کرنے لگی۔

''ویسے رزلٹ کے بعد تمہارے کیا پلان ہیں، کالج میں ایڈمیشن تو لوگی ناں......؟ میں تو سوچ رہی ہوں کہ ہم دونوں ایک ہی کالج میں ایڈمیشن لے لیں۔ ای کو بھی میرے اکیلے کالج آنے جانے پر اعتراض نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ساتھ جایا کریں گے۔'' فاریہ نے واقعی موضوع بدلتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا تو ثانیہ اس کی تائید کرنے لگی۔

وہ آپس میں ڈسکس کرنے لگیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تو عامر اسے وہاں بلانے چلا آیا تھا تو اس نے وقت دیکھا۔ ساجدہ بیگم نے ہی اسے فاریہ

کو بلانے بھیجا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی فاریہ کے ساتھ آسیہ بیگم کے پاس ہمدردی کے لیے آئی تھیں۔ عامر کو اپنے سامنے دیکھ کر فاریہ کی آنکھوں میں چمک اور گالوں پر تمتماہٹ سمٹ آئی تھی۔

''تم دونوں کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو باہر آجاؤ، تائی جان گھر جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں اور تمہیں بلا رہی ہیں فاریہ......'' عامر نے ساجدہ بیگم کا پیغام من و عن وہاں آکر سنایا۔

اور وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

عامر اور فاریہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اور یہ بات صرف ثانیہ جانتی تھی۔ گھر کے بڑوں کو اس پسندیدگی کا علم نہیں تھا۔ کیونکہ عامر اپنی تعلیم مکمل کر کے جاب حاصل کرنے کے بعد ہی گھر میں اپنے اور فاریہ کے رشتے کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اور ثانیہ تو ان دونوں کی دلچسپ نوک جھوک سے محظوظ ہوتی چلی آئی تھی اور عامر کے ذومعنی جملوں سے بخوبی واقف تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں اچھے گریڈز سے پاس ہوگئی تھیں۔ دونوں نے ایک ہی کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ یوں ثانیہ بھی جلد ہی کالج کی مصروفیات میں مگن ہوگئی...... ویسے بھی ہر حادثے کو بھلانے کے لیے وقت بہت بڑا امر اہم ہوتا ہے...... لہٰذا کچھ وقت گزرا تھا۔ جس کے بعد ثانیہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ آج کل کے دور کی لڑکی تھی، ماضی میں خود کو زندہ رکھ کر اپنی زندگی برباد کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے سب کچھ بھول کر زندگی میں آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کم عمری میں جوڑے گئے رشتے ہوں یا دلوں کے تار...... ٹوٹتے ہیں تو پھر عمر بھر ایک کی کسک چھوڑ جاتے ہیں، ثانیہ بھی ایک حساس لڑکی تھی۔ جس کا دل ٹوٹا تھا اور ثانیہ کے معاملے میں شاید یہ وقت نے طے کرنا تھا۔ کیونکہ ابھی زندگی کو بہت آگے تک سفر کرنا تھا۔

دوسرے فاریہ جیسی زندہ دل لڑکی کے ساتھ نے بھی اس کی ذات کو سہارا دیا تھا۔ رشتے دار تو وہ تھے ہی اوپر سے ایک ہی محلے میں قریب، قریب رہتے تھے۔ اس لیے دونوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ فاریہ تو اکثر ان کے گھر رکنے بھی آجاتی تھی۔ البتہ ثانیہ کم ہی فاریہ کی طرف جاتی تھی۔ کچھ اس کا مزاج بھی خود کو لیے دیے رکھنے والا تھا۔ کچھ تائی جان کی طبیعت بھی الگ تھی۔ ان کے درمیان اگر گہری دوستی تھی تو اس کا زیادہ کریڈٹ فاریہ کے مزاج کو جاتا تھا۔ وہ بہت جلدی لوگوں سے گھل مل جاتی تھی۔ اور ثانیہ تو اس کی کزن بھی تھی لیکن اب دونوں کا کالج اور کلاس بھی ایک ہوگئی تھی۔ لہٰذا اب ثانیہ بھی اسٹڈیز کے سلسلے میں فاریہ کے گھر آنے جانے لگی تھی۔ دونوں ساتھ پڑھتی اور مل کر نوٹس بناتیں...... اور آج تو ثانیہ ان کے گھر عامر کی جاب لگنے کی خوشی میں مٹھائی لے کر فاریہ کی طرف آئی تھی۔ اور اسد جو صحن میں رکھی چیئر پر بیٹھا لیپ ٹاپ پر بزی تھا۔ ثانیہ کو سامنے دیکھ کر خوشگوار حیرت سے مسکرایا تھا۔ وہ آج کل اپنی جاب کے سلسلے میں دن بھر گھر سے باہر رہتا تھا، اس لیے ثانیہ سے آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ اس وقت اتفاق سے دروازہ اس نے ہی کھولا تھا۔

''ارے واہ...... آج تو بڑے، بڑے لوگ ہمارے گھر آئے ہیں...... ورنہ لوگ تو اتنے قریب رہ کر بھی عید کا چاند ہوتے جارہے ہیں۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا تو ثانیہ جھینپ کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا، جسے دیکھ کر یکلخت ہی اسد کی مسکراہٹ سمٹی تھی۔

''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' اسد نے اس کے ہاتھ میں موجود خوب صورت پیکنگ میں ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ جواباً وہ ہولے سے مسکرائی۔

''عامر بھائی کی جاب لگ گئی ہے اسی لیے امی نے مٹھائی بھجوائی ہے۔''

''اچھا، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، بہت مبارک

ہو۔'' اس نے خوش دلی سے مبارک باد دی تھی۔

''خیر مبارک...... تائی جان اور فاریہ نظر نہیں آرہیں۔'' ثانیہ نے اِدھر، اُدھر دیکھتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''امی اور فاریہ تو بازار گئی ہیں، ابو اندر لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے ہیں، تم بیٹھو، میں انہیں بلاتا ہوں۔'' اسد نے اندر کی جانب جانے کے لیے مڑنا چاہا تھا۔

تب ہی ثانیہ نے اسے روک دیا۔

''رہنے دیں اسد بھائی، تایا جان کو آرام کرنے دیں، میں تو بس یہ مٹھائی دینے آئی تھی۔ آپ تائی جان کو دے دیجیے گا۔ میں چلتی ہوں۔'' ثانیہ نے مٹھائی کا ڈبا اسد کو پکڑاتے ہوئے جواباً کہا۔

''ارے بھئی...... اتنی بھی کیا جلدی ہے، کچھ دیر تو بیٹھو......''

''نہیں اسد بھائی...... میں پھر کبھی آؤں گی، ابھی امی نے جلدی آنے کو کہا تھا۔ ابھی محلے میں اور جگہ بھی مٹھائی تقسیم کرنی ہے، میں چلتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... جیسے تمہاری مرضی......''

اسد نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا۔ اسی لیے وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکی۔ اور اس کے روکنے کے باوجود واپس گھر چلی آئی۔ اسے مناسب نہیں لگا تھا۔

اگلے دن ساجدہ بیگم نے فون پر اور فاریہ نے کالج میں ثانیہ کو عامر کی جاب کی مبارک باد دی تھی۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات تو اکثر مسجد میں نماز کے لیے آتے جاتے ہوتی رہتی تھی۔ اس لیے وسیم احمد چھوٹے بھائی کو مبارک باد اسی شام ہی دے چکے تھے۔ حال احوال کے ساتھ مزاج پرسی بھی ہو جاتی تھی۔ کالج میں فاریہ کی زبانی ہی ثانیہ کو پتا چلا تھا کہ اسد آج کل نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر جانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے، اگرچہ یہاں بھی اس نے ایک دو فرمز میں انٹرویوز دے رکھے تھے مگر وہ باہر جا کر قسمت آزمانا چاہتا تھا۔ وسیم احمد کا اپنا میڈیکل اسٹور تھا، جسے وہ اکیلے ہی سنبھالتے تھے۔ اسد کبھی کبھار ہی جاتا تھا۔ لہٰذا باہر جانے کے لیے اس نے اپنے ایک دو دوستوں سے بات کر رکھی تھی اور کچھ رقم کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ بس ویزے کا بندوبست اور دیگر معاملات دقت طلب تھے۔

اور اسد اپنی پوری کوشش کر رہا تھا کہ یہ معاملات جلد ہی نبٹ جائیں...... جبکہ ساجدہ بیگم کسی اونچے امیر گھرانے میں اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ جو شادی کے بعد اعلیٰ جہیز کے ساتھ کچھ پراپرٹی بھی مکان یا فلیٹ کی صورت میں لائے تاکہ ان کے بیٹے کے طفیل ان کا معیارِ زندگی بھی راتوں رات بدل جائے۔ جس کے لیے لوگ عمر بھر تگ و دو کرتے رہتے ہیں لیکن اسد کو شادی کے نام پر یہ جوا کھیلنے میں کوئی فی الحال دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی دلچسپی تو اچانک ہی ثانیہ کی ذات میں بڑھ گئی تھی۔ دراصل اپنی اسٹڈیز کے حوالے سے ثانیہ کا ان کے گھر آج کل آنا جانا پہلے سے زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اور اچانک ہی اسد کو ثانیہ اچھی لگنے لگی تھی۔ اور وہ سنجیدگی سے اس کی ذات میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ورنہ پہلے تو شاہ زیب سے اس کی منگنی کے باعث اسد نے کبھی ثانیہ کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اور اب نظروں کے زاویے کے ساتھ دل کی دنیا میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ اور وہ اس خوشگوار تبدیلی سے خوش تھا۔ مگر ثانیہ یا گھر میں اس نے کسی پر اپنے دل کی بدلتی کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ فاریہ سے بھی نہیں...... جس کے ساتھ اس کا بڑے بھائی کے رعب والا رشتہ نہیں تھا۔ دونوں بہن، بھائی کی آپس میں کافی دوستی تھی۔ لیکن اسد نے یہ پسندیدگی ابھی اپنے دل کے نہاں خانوں تک ہی محدود رکھی تھی...... کیونکہ وہ اپنی ماں کے مزاج کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔

اگر ان کا ارادہ ثانیہ کو بہو بنانے کا ہوتا تو بہت پہلے یہ کام ہو چکا ہوتا۔ مگر ثانیہ کا گھرانا بھی ان کی طرح مڈل کلاس فیملی سے تھا...... اور ساجدہ بیگم نے اکلوتے بیٹے کی شادی کے حوالے سے بڑے اونچے، سنہرے خواب دیکھ رکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ثانیہ کو بہو

بنانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچیں گی۔ اس لیے مصلحتاً اس معاملے میں فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا تھا۔ اور ابھی تو اسے ثانیہ کی طرف سے بھی کوئی حوصلہ افزا امید نہیں تھی۔ وہ پہلے جذباتی دھچکے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی...... سب کچھ اسد کے سامنے تھا...... اس لیے وہ پیش قدمی میں جلد بازی دکھانا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ وہ دونوں بہن، بھائی مزاجاً بہت بے تکلف اور جلد گھلنے ملنے والے تھے، اس لیے ثانیہ نے بھی اسد کے مزاج کے پیشِ نظر اس کی اس تبدیلی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ تو فاریہ نے ہی اسد کی چوری پکڑی تھی۔ جب اسد نے ثانیہ کی برتھ ڈے پر گفٹ لے کر اپنی طرف سے اسے دینے کے لیے فاریہ سے کہا اگر وہ خود دیتا تو شاید ثانیہ ناراض ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اسد سے زیادہ فرینک نہیں تھی۔ اسی اندیشے کے پیشِ نظر اسد نے بہن سے مدد مانگی تھی۔ اور اصل بات جان کر فاریہ بھائی کو چھیڑنے لگی۔

''آپ تو چھپے رستم نکلے بھائی...... اگر ایسی بات تھی تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... اور اب تک چپ کیوں تھے۔ ہم شاہ زیب سے پہلے آپ کا پروپوزل لے جاتے۔'' فاریہ نے نروٹھے لہجے میں کہا تو وہ وضاحت دینے لگا۔

''پہلے ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی فاریہ...... میں نے اس سے پہلے کبھی ثانیہ کو کزن کے علاوہ کسی اور نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب وہ اچانک مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔'' اسد نے بہن کے سامنے وہی کہا جو سچائی تھی۔ اور فاریہ نے مان بھی لیا تھا۔ ظاہر ہے، شاہ زیب کے ساتھ منگنی پر اسد اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ البتہ بھائی کے اعتراف پسندیدگی کے بعد اب فاریہ کو بھی اسد کی طرف سے فکر لاحق ہوگئی تھی کہ وہ ثانیہ کو پا بھی سکے گا یا نہیں...... کیونکہ اسے اپنی ماں کی خواہش کا اچھی طرح علم تھا۔ دولت مند بہو پانے کے لیے وہ ثانیہ کو اپنانے کا کبھی نہیں سوچیں گی...... اور اپنی اس پریشانی کا اظہار اس نے بھائی کے سامنے بھی کر دیا۔

''لیکن بھائی...... امی تو کبھی ثانیہ کے ساتھ آپ کی شادی نہیں کریں گی۔ وہ کسی امیر کبیر گھرانے کی لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں، جہاں سے ڈھیروں جہیز کے ساتھ بہو کے نام پلاٹ یا فلیٹ ملنے کی بھی امید ہو...... اور سلیم چچا کی طرف سے یہ سب ملنا ممکن نہیں ہے، ایسے میں آپ امی کو کس طرح منائیں گے۔'' فاریہ کی بات کی اس نے بھی تائید کی۔

''جانتا ہوں...... مگر فی الحال تم اس بارے میں امی سے کوئی بات نہیں کرو گی...... جب تک میرے باہر سیٹل ہونے کا پکا انتظام نہیں ہو جاتا...... اس کے بعد میں خود امی کو منالوں گا...... ویسے بھی مجھے اپنا فیوچر خود بنانا ہے، بس تمہیں مجھے ایک فیور دینا ہوگا۔''

''وہ کیا بھائی......؟'' فاریہ نے برجستہ کہا تھا...... کیونکہ ثانیہ کو اپنی بھابی بنانے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ویسے بھی عامر کے حوالے سے اسے ثانیہ سے پہلے سے زیادہ ہمدردی ہوگئی تھی۔ شاہ زیب سے ثانیہ کی منگنی ختم ہونے کا اسے بھی افسوس تھا۔ جواباً اسد اسے سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

''بس تم امی کو یہ رشتہ کرانے والی عورتوں سے دور رکھنے کی کوشش کرنا...... ایسا نہ ہو کہ وہ سچ مچ کسی امیر گھرانے میں رشتے کی بات چلالیں اور پھر میرے لیے سب کچھ ہینڈل کرنا مشکل ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے بھائی...... امی کو تو میں سنبھال لوں گی مگر آپ ثانیہ کو اپنے دل کی بات بتانے میں زیادہ دیر مت لگائیے گا۔ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں، ایک بار اگر دل ٹوٹ جائے تو دوبارہ کسی دوسرے پر اعتبار کرنے میں محتاط ہو جاتی ہیں لیکن آپ کی بات الگ ہے، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔'' اور فاریہ کو اتنی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر اسد نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

''ٹھیک ہے دادی اماں...... میں آپ کی بات

اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، اب آپ یہاں سے جائیں مجھے ضروری میل کرنی ہے، اور ہاں یہ گفٹ ثانیہ کو کل ضرور دے دینا...... میں فون پر اسے وش کردوں گا۔'' اسد نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے گفٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو فاریہ نے صاف انکار کردیا۔

''جی نہیں...... یہ گفٹ آپ خود ثانیہ کو دیں گے، رہی بات اس کی ناراضی کی تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کزن ہیں اس کے...... اور پھر میں ہوں ناں...... کوئی گڑبڑ ہوئی تو سنبھال لوں گی۔ اس لیے آپ ثانیہ کے دل میں اپنی جگہ بنانے کا یہ موقع ہرگز نہیں گنوایئے گا۔'' فاریہ نے واقعی پتے کی بات کہی تھی۔ اور اسد کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ وہ کمرے سے جاتے، جاتے کسی خیال کے تحت رک گئی تھی۔ پلٹ کر بیڈ کی جانب آئی تھی۔

''ویسے بھائی، آپ ثانیہ کو کیا گفٹ کررہے ہیں؟'' فاریہ نے گفٹ کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بھائی کو دیکھا اور وہ اس کی شرارت کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا۔

''لان کا ڈیزائنر سوٹ ہے۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو ثانیہ کے لیے ڈیزائنر سوٹ...... اور میرے لیے......؟ مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ آخر، اتنی فیور دے رہی ہوں آپ کو......'' اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو اسد کو اس کی معصوم سی بلیک میلنگ پر ہنسی آگئی۔

''تمہارے لیے بھی ڈیزائنر سوٹ ہے۔ میں پہلے ہی تمہارے روم میں رکھ آیا ہوں، جا کر دیکھ لو...... تمہارا فیورٹ کلر ہے۔'' اور یہ سن کر فاریہ کی خوشی کے مارے آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''سچ بھائی، تھینک یو بھائی...... یو آر گریٹ......'' فاریہ نے بے ساختہ خوشی کے اظہار کے ساتھ بے قراری سے اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگائی تھی اور اس کی اس بچکانہ حرکت پر اسد ایک بار پھر

مسکرائے بغیر نہیں رہا۔

☆☆☆

کچن کا پھیلاوا سمیٹ کر ساجدہ بیگم تھکی ماندی اپنے کمرے میں آئیں تو وسیم صاحب کو کسی گہری سوچ میں ڈوبے پایا تھا۔ چائے کی پیالی ایک طرف ویسے ہی رکھی تھی۔ جو شاید اب ٹھنڈی بھی ہو چکی تھی۔ وہ اچنبھے سے شوہر کو دیکھتے ہوئے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''آپ کس سوچ میں ڈوبے ہیں، آپ کی چائے بھی ٹھنڈی ہو رہی ہے اب دوبارہ گرم کرنی پڑے گی...... میری کمر تو پہلے ہی تھکن سے چور ہو رہی ہے۔''

وسیم صاحب نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی چائے کی پیالی کو اٹھایا پھر دائیں جانب بیٹھی ہاتھ سے کمر کو سہلاتی ساجدہ بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ مگر پھر بھی شوہر کی گرم چائے پینے کی عادت کا سوچ کر ان کے ہاتھ میں موجود پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ تاکہ دوبارہ گرم کر کے لائیں۔

''لائیں...... میں گرم کر کے لا دیتی ہوں...... آپ کو ٹھنڈی چائے مزہ نہیں دے گی۔'' ساجدہ بیگم نے دکھتی کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی تو وسیم صاحب نے ان کا ہاتھ تھام کر واپس بٹھا دیا۔

''رہنے دو، تم پہلے ہی تھکی ہوئی ہو، ویسے بھی چائے کو دوبارہ گرم کیا جائے تو اس کی تازگی پہلے جیسی نہیں رہتی ہے۔ اور یہ اتنی بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے، میں گزارہ کر لوں گا۔ لیکن تمہیں اب اپنی تھکن کا علاج کرنے کے لیے سنجیدگی سے فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''ارے اب بڑھاپے میں تھکن نہیں ہوگی تو کب ہوگی...... ساری عمر گزر گئی گھر داری سنبھالتے ہوئے، آگے بھی گزر جائے گی۔ ویسے بھی عورت کی تھکن کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ مگر آپ کس فیصلے کی بات کر رہے ہیں۔'' وسیم صاحب کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کو ساجدہ بیگم نے اچنبھے سے دیکھا تھا۔

''ارے بھئی...... اب تم اتنی بھی بوڑھی نہیں ہو...... رہی بات علاج کی تو بیٹوں کی ماؤں کی تھکن کا علاج بیٹوں کی شادی ہوتی ہے تاکہ بہو آ کر گھر کی ذمّے داری سنبھال سکے، تم بھی بہو لا کر اپنی ذمّے داریوں سے ریٹائر ہو جانا۔ اس لیے اسد کی شادی کا فیصلہ اب جلدی کر لو تو اچھا ہوگا۔'' وسیم صاحب نے بالآخر اس تمہید کا اصل مقصد بیان کر دیا تھا۔

''فیصلہ تو میں کب کا کر بھی چکی ہوں...... رشیدہ خالہ کو رشتہ ڈھونڈنے کے لیے بھی کہہ دیا ہے۔ مگر پہلے اسد کو معقول نوکری تو مل جائے۔ اب بیروزگار بیٹے کا رشتہ مانگنے جاؤں گی تو کون اپنی بیٹی دینے کا سوچے گا۔''

اور ساجدہ بیگم کے رشتہ ڈھونڈنے کی بات پر وہ چونکے تھے۔ خاندان میں اتنی ساری لڑکیاں موجود تھیں۔ پھر ڈھونڈنے والی بات انہیں سمجھ نہیں آئی تو بیوی کے سامنے اپنی سوچ کا اظہار کیے بغیر نہیں رہے۔

''ارے بھئی...... جب خاندان میں اتنی لڑکیاں موجود ہیں تو تمہیں اسد کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے لیے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اور میں تو سوچ رہا ہوں کہ سلیم اور آسیہ بھابی سے اسد کے لیے ثانیہ کا رشتہ مانگ لیتے ہیں، دونوں کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔'' اور شوہر کی بات سن کر ساجدہ بیگم کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ انہوں نے تو اکلوتے بیٹے کے لیے کسی امیر کبیر گھرانے کی لڑکی کو بہو بنا کر سارے خاندان میں شان سے گردن اکڑا کے گھومنے کے خواب دیکھ رکھے تھے۔ اور وسیم صاحب جانے کہاں سے اپنی بھتیجی کا ذکر لے آئے۔ انہوں نے ناگواری سے شوہر کو دیکھا۔

''ارے واہ...... میرے بیٹے کے لیے وہ آپ کے فقطے بھائی کی بیٹی ہی رہ گئی ہے...... جس کا رشتہ پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے...... جس کی سارے خاندان میں بدنامی ہو رہی ہے۔ اور ان کی حیثیت ہی کیا ہے، میرے اکلوتے بیٹے سے رشتہ جوڑنے کی...... میں اسد کی شادی ثانیہ سے کبھی نہیں کروں گی۔'' ساجدہ بیگم نے نخوت سے کہا تو وسیم صاحب کو ان کا یہ تکبرانہ انداز بہت برا لگا تھا۔ اگر سلیم احمد کا گھرانا سفید پوش تھا تو وہ

کون سا امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

وہ بھی ان کی طرح سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے تھے......اور سب سے بڑھ کر ان کے نزدیک رشتے ناتے اپنے جیسے لوگوں میں جوڑے جائیں تو زیادہ پائیدار ثابت ہوتے ہیں......ورنہ اونچ نیچ کے رشتوں میں ساری زندگی اونچ نیچ ہی چلتی رہتی ہے۔ اور یہ بات ساجدہ بیگم کو سمجھانا بہت مشکل تھی لیکن وہ انہیں سرزنش کیے بغیر نہیں رہے۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ساجدہ بیگم...... منگنی ٹوٹنے میں بھلا ثانیہ کا کیا قصور ہے اور رشتہ کیوں توڑا گیا......اس کی بابت سارا خاندان جانتا ہے، اب بھلا کسی کی بیٹی کے بارے میں بات کرنے کا کیا فائدہ......شاہ زیب کے ماں، باپ کو جو مناسب لگا وہ انہوں نے کیا......رہی بات حیثیت کی تو ہم کون سا لینڈ لارڈ ہیں۔ اور اسد کی ابھی نوکری بھی نہیں لگی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ سلیم کو اپنے بھتیجے کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور پھر ثانیہ ہماری بھی تو بیٹی ہے، وہ ہماری بہو بن جائے گی تو سلیم اور آسیہ بھابی کے دکھ کا مداوا بھی ہو جائے گا۔ آخر......اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔'' وسیم صاحب نے بیوی کی فرسودہ سوچ کو مثبت رخ دینے کی کوشش کی تو انہوں نے بھی برجستہ اپنی منطقی دلیل پیش کی۔

''ہاں...ہم بھی سفید پوش ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی سفید پوش گھرانے کا رشتہ امیر گھرانے سے نہیں جڑ سکتا۔ اور آج اچھے لڑکے اور اچھے رشتے امیر گھرانوں کو بھی مشکل سے ملتے ہیں اور میرا تو اکلوتا بیٹا ہے، میں تو اس کا رشتہ کسی اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں ہی کروں گی۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھالیں، میں ثانیہ کو کبھی اپنی بہو نہیں بناؤں گی۔ بھلا آپ کے نکمے بھائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دینا ہی کیا ہے، آدھی سے زیادہ زندگی تو گھر بیٹھ کر بیوی کی کمائی کھاتے رہے ہیں اور آگے بھی یہی کرنا ہے آپ کے لاڈلے بھائی نے۔''

''بس کرو ساجدہ بیگم......تمہیں میرے بھائی، بھاوج کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مانا کہ سلیم شروع سے مزاجاً بے پروا رہا ہے۔ اس نے اپنی ذمّے داریوں کا احساس نہیں کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم رشتے داری کا لحاظ کیے بغیر میرے سامنے میرے چھوٹے بھائی کو ذلیل کروگی۔'' وسیم صاحب نے ناگواری سے بیوی کو ٹوکا تھا۔ جو اپنی، اندھی خواہشوں کے سامنے قرابت داری اور سگے رشتوں کا لحاظ بھی بھول گئی تھیں۔

''ہاں...تو میں نے کیا غلط کہا ہے، آسیہ نے ساری زندگی مرد بن کر گھر اور بچوں کی ذمّے داری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہے۔ کرائے کا گھر اور تین بچوں کی پڑھائی کے ساتھ پانچ افراد کے گھریلو اخراجات......کل کو ریٹائر ہوگی تو گھر بنائے گی یا بچوں کی شادیاں کرے گی......اور ثانیہ کو کیا ملے گا جہیز میں......ان کے پلّے تو کوئی جائداد بھی نہیں ہے، مجھے ایسے کنگلوں سے بہو نہیں لانی ہے اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے، اب آپ اس بارے میں مجھ سے کوئی بحث نہیں کریں گے۔''

اور وسیم صاحب نے تاسف سے بیوی کی طرف دیکھا تھا۔ جن کی آنکھوں پر دولت اور مادیت پرستی کی پٹی بندھی تھی۔

ساجدہ بیگم نے ہمیشہ کی طرح شوہر کو نکمے بھائی کا طعنہ دیا تھا......جو شروع سے مزاجاً بے پروا اور غیر ذمّے دار واقع ہوئے تھے۔ شادی ہونے کے بعد بھی جنہوں نے اپنی ذمّے داریوں کا احساس نہیں کیا تھا...... بار' بار نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی ٹک کر ایک جگہ سنجیدگی سے کام نہیں کیا......وہ تو شکر تھا کہ آسیہ کی سرکاری نوکری تھی۔ اسی کی کوشش سے ایک کمپنی میں نوکری لگی تھی۔ جو کچھ عرصے بعد ہی سلیم نے سپروائزر سے جھگڑے کی صورت میں خود ہی چھوڑ دی تھی۔ انہیں لگے بندھے وقت پر جا کر اپنی ڈیوٹی نبھانا دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔ آسیہ جو گھر کی ذمّے

داری اٹھا رہی تھیں...... پھر انہیں کام کرنے کی کیا ضرورت تھی...... اور وسیم صاحب کو بیوی کی یہی عادت بری لگتی تھی وہ رشتوں سے زیادہ روپے، پیسے اور حیثیت و مقام کو اہمیت دیتی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے سلیم احمد کے بارے میں کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کے لیے دوسروں کو قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں تھا۔ یہی بات وہ ساجدہ بیگم کو سمجھانا چاہتے تھے۔

''تو کیا میں نے کبھی اسے سمجھانے کی کوشش نہیں کی...... ہمیشہ سے بڑے بھائی کا فرض نبھاتا آیا ہوں، اسے اس کی کوتاہیوں کا احساس بھی دلایا ہے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ انسان کی بری عادتوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی فطرت اور مزاج کو نہیں۔''

''ٹھیک کہا آپ نے...... کیونکہ پختہ عادتیں پکے لوہے کی طرح ہوتی ہیں وہ اب پکی عمر میں کیا بدلتے۔ اور ہماری تو عمر گزر گئی اس طرفہ تماشے کو دیکھتے ہوئے۔ یہ تو بیچاری آسیہ کا ہی حوصلہ ہے جو ایسے بے حس و نکھٹو آدمی کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے لیکن مجھ میں ایسے لوگوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ لہٰذا آپ مجھے اور میرے بیٹے کو تو اس ناپسندیدہ رشتے کے جنجال سے معاف ہی رکھیں۔ بس بات یہیں ختم ہوگئی۔'' ساجدہ بیگم نے دوٹوک لہجے میں بات ختم کر کے بیڈ پر لیٹ کر وسیم صاحب کی جانب سے کروٹ لے لی تھی۔

وسیم صاحب مایوسی و افسردگی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو حد سے زیادہ سنگدلی کا مظاہرہ کر چکی تھیں۔ جانے وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں یا پھر واقعی دولت کی طاقت نے اپنی حیثیت انہیں بھی جتلا دی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے پھر تھک کر کچھ دیر بعد لائٹ آف کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔

☆☆☆

رات میں فون پر فاریہ نے عامر کو جاب کی مبارک باد دی۔

''خیر مبارک......'' عامر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''لیکن اگر یہ خوش خبری تم خود مجھے سناتے تو مجھے زیادہ اچھا لگتا۔'' فاریہ نے خوشی کا اظہار کے ساتھ شکوہ بھی کر ڈالا تھا۔

''کم آن فاریہ...... مجھے کل ہی تو اپائنمنٹ لیٹر ملا ہے اور آج امی نے سارے خاندان اور محلے میں مٹھائی تقسیم کروادی ہے۔ میں تو آفس جوائننگ کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ ابھی تمہارا فون نہیں آتا تو میں خود تمہیں کال کرنے والا تھا۔'' عامر نے رسانیت سے اس کی شکایت دور کرنے کی کوشش کی۔ فاریہ کو اس کی جاب کی اتنی خوشی تھی کہ اس نے زیادہ بحث نہیں کی اور اصل مدعا پر آگئی۔

''اچھا ٹھیک ہے، یہ بتاؤ کہ آگے کیا ارادے ہیں تمہارے...... تم آسیہ چچی کو کب میرے اور اپنے رشتے کی بات کرنے بھیج رہے ہو۔''

فاریہ چاہتی تھی کہ اس سے پہلے کہ ساجدہ بیگم، اسد کی طرح اس کے لیے بھی رشیدہ خالہ سے کہہ کر کسی رشتے کا انتظام کریں۔ عامر کو اپنے اور اس کے رشتے کے بارے میں اپنے گھر والوں سے بات کرلینی چاہیے۔ اسے یقین تھا کہ ماں کا نہ سہی لیکن بھائی اور باپ کا ووٹ عامر کے حق میں ہی ہوگا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی شادی کی بابت یوں عامر سے خود بات کرنی پڑے گی۔

''تم اس کی فکر مت کرو...... وقت آنے پر یہ بات بھی کرلوں گا۔ ابھی تو میری جاب شروع ہوئی ہے، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' اور عامر کی بے پروائی نے اسے تپا دیا تھا۔

''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے اور میں کون سا ابھی شادی کی بات کر رہی ہوں لیکن رشتہ تو طے ہو سکتا ہے ناں...... ایسا نہ ہو کہ تم مناسب وقت کا انتظار کرتے رہو...... اور امی، ابو میرا رشتہ کہیں اور طے کر دیں۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

اور فاریہ کی بات نے واقعی عامر کو ڈرا دیا تھا۔ اس نہج پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اسی لیے وہ فوراً ماں سے اس بارے میں بات کرنے کے لیے تیار

ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، میں کل ہی امی سے بات کروں گا۔ جو کام کل ہونا ہے۔ وہ آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

اور عامر کا جواب سن کر فاریہ کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ بکھر گئی۔ جو بات وہ عامر کے لبوں سے سننا چاہتی تھی۔ عامر نے کہہ دی تھی۔ وہ واقعی اسے کھونے کے احساس سے ڈر گیا تھا۔

یعنی تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

☆☆☆

ہر سال اپنی برتھ ڈے پر ثانیہ، ماں کا لایا ہوا کیک کاٹ کر خوش ہو جاتی تھی۔ دونوں بھائی اسے گفٹ دے دیتے۔ لیکن اس بار وہ کیک کاٹنے کا اہتمام بھی نہیں چاہتی تھی۔ ماں کو بھی اس نے منع کر دیا تھا۔ مگر فاریہ نے آسیہ چچی سے بات کر کے ثانیہ کو شام میں سرپرائز دینے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ سو وہ بھی تیاریوں میں لگ گئی تھیں اور شام میں جب فاریہ کیک لے کر اسد کے ساتھ ان کی طرف آئی تو ثانیہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہی تھی۔ آسیہ کے ساتھ مل کر فاریہ نے جانے کب لاؤنج میں برتھ ڈے منانے کا سارا اہتمام کر ڈالا تھا۔ اور پھر زبردستی ثانیہ کو تیار ہو کر کیک کاٹنے کے لیے فاریہ نے ہی منایا تھا۔ اور وہ سب کی خوشی کے لیے مان گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بلیک اینڈ شاکنگ پنک کرتی اور بلیک ٹراؤزر بینٹ میں میچنگ دوپٹے کو سلیقے سے شانوں پر پھیلائے آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر نیچرل پنک لپ اسٹک گلوس لگائے سادگی سے تیار ہو کر ... وہاں آئی تو سب کی ستائشی نگاہوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ سادگی میں بھی بہت دلکش لگ رہی تھی۔ اور اسد تو اپنے دلی جذبوں کی تبدیلی کے باعث الگ ہی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو سادگی میں بھی اسے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر سب کی پُرجوش تالیوں میں اس نے کیک کاٹا تھا۔ اور سب نے اسے گفٹس دیے تھے۔ اسد نے بھی دیا تھا۔ کچھ دیر بعد آسیہ بیگم نے سب کے لیے کھانا لگا دیا تھا۔ جو خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ وسیم صاحب اور ساجدہ بیگم مغرب کے بعد ہی آئے تھے۔ ان کے آنے کے کچھ دیر بعد آسیہ بیگم نے کھانا سرو کر دیا۔

کھانے کے بعد جہاں بڑے لوگ صحن کے تازہ ماحول میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہیں ثانیہ اور فاریہ تازہ ٹھنڈی ہوا کے لیے اوپر چھت پر آ گئی تھیں۔ کیونکہ فاریہ چاہتی تھی کہ اسد کو اکیلے میں ثانیہ کے ساتھ بات کرنے کا چھوٹا سا موقع فراہم کر سکے۔ اس لیے وہی ثانیہ کو منا کر چھت پر لائی تھی۔ وہ دونوں تاروں بھرے آسمان کے بیچوں بیچ چمکتے روشن چاند کی طرف دیکھتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگائے باتیں کر رہی تھیں تب ہی اچانک لائٹ چلی گئی۔ اسی وقت اسد نے اوپر آتی سیڑھیوں پر قدم رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر فاریہ جلدی سے نیچے سے ایمرجنسی لائٹ لانے اور ثانیہ کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر سیڑھیوں کی جانب بھاگی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ثانیہ بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے قدم بڑھاتی یک دم سامنے کھڑے اسد نے موبائل فون کی ٹارچ آن کر دی تھی۔

جو عین ثانیہ کے چہرے پر روشن ہوئی تھی۔ چھت پر چاروں طرف پھیلے اندھیرے میں موبائل ٹارچ کی روشنی میں اسد اور ثانیہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ لمحوں میں انتہائی فسوں خیز ماحول بن گیا تھا۔ سامنے اچانک اسد کو دیکھ کر وہ کنفیوز ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ اگرچہ اوائل تاریخوں کا چاند آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ جس کی چاندنی کے فسوں میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اسد اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ پیچ کلر کے کاٹن کے کُرتے اور سفید شلوار میں ڈریس اپ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اور ثانیہ پہلی بار اس کی موجودگی میں یوں گھبرا رہی تھی۔ کیونکہ اسد کے سیل فون کی ٹارچ کی روشنی ثانیہ کے صبیح چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اور وہ چاندنی کے نور میں نہائی کھڑی ثانیہ کے دلکش چہرے کو مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ ماحول میں

املیف سی خاموشی پھیلی تھی۔ ثانیہ کنفیوز سی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر جلد ہی اس نے خود کو نارمل کر کے اسد کی نگاہوں کے ارتکاز کو اپنی آواز سے توڑا تھا۔

''ارے اسد بھائی...... آپ یہاں...... یہ فاریہ کہاں چلی گئی ہے۔ میں دیکھتی ہوں جا کر اسے۔''

اور اسد کو لگا کہ چھن سے سارا طلسم ٹوٹ گیا ہے۔

ثانیہ وہاں سے جانے کے لیے آگے بڑھی تھی۔ تب ہی اسد کی آواز نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک لیا تھا۔

''فاریہ نیچے سے ایمر جنسی لائٹ لینے گئی ہے۔ دراصل مجھے نیچے کچھ گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے یہاں تازہ ہوا میں آ گیا۔ لیکن اگر تم ان کمفر ٹیبل فیل کر رہی ہو تو میں واپس نیچے چلا جاتا ہوں۔''

اسد واقعی اسے نروس دیکھ کر وہاں سے جانے کے لیے مڑنے لگا تھا۔ جبھی ثانیہ نے یک دم اسے روک دیا۔ یہ صحیح تھا کہ اسد کی موجودگی اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تھا۔

''ارے نہیں اسد بھائی...... ایسی کوئی بات نہیں ہے، دراصل میں اور فاریہ بھی اسی لیے کھلی ہوا میں چھت پر آئے تھے۔ اور ہمیشہ کی طرح اچانک لائٹ چلی گئی۔'' ثانیہ نے مسکراتے ہوئے اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کی تھی۔ اور اسد اس کے کھلتے چہرے پر چٹکی چاندنی کے سحر میں کھونے لگا...... وہ مسکراتے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ورنہ شاہ زیب کی وجہ سے پچھلے دنوں وہ جس جذباتی کشمکش سے گزری تھی۔ فاریہ کی زبانی اسد کو ہر بات کا علم تھا۔ اسی لیے اس سارے جذباتی بحران کے بعد ثانیہ کے چہرے پر اچانک در آنے والی مسکراہٹ کو دیکھ کر اسد بے دھیانی میں اپنے اظہار پر اختیار نہیں رکھ سکا تھا۔

''اسی طرح مسکراتی رہا کرو...... تمہارے چہرے پر سنجیدگی سے زیادہ مسکراہٹ اچھی لگتی ہے کیونکہ زندگی بہت خوب صورت شے ہے... اور مسکرانے والے لوگ اپنی زندگی کے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی خوب صورت بنا سکتے ہیں۔'' اسد نے مسکراتے ہوئے دوستانہ لب و لہجہ اختیار کیا تو ثانیہ جو پہلے چونک کر اسد کے لہجے پر غور کرنے لگی تھی۔ اب اس کی دوستانہ مسکراہٹ دیکھ کر... بے اختیاری میں پھر سے مسکرا دی۔ تب ہی فاریہ ہاتھ میں ایمر جنسی لائٹ لیے چلی آئی تھی۔ اور اسد کے ساتھ ثانیہ کو خوشگوار موڈ میں باتیں کرتے دیکھ کر فاریہ کو انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ یقیناً اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ اسی لیے تو بہانے سے نیچے گئی تھی۔ تاکہ اسد کو ثانیہ سے بات کرنے کا موقع مل جائے لیکن اسد نے ایسی کوئی بات ثانیہ سے نہیں کی تھی۔ جسے سوچ کر فاریہ خوش نظر آ رہی تھی۔

''ارے اسد بھائی، آپ یہاں ہیں...... میں آپ کو نیچے تلاش کر رہی تھی۔ امی گھر چلنے کے لیے کہہ رہی ہیں، اسی لیے میں آپ کو ڈھونڈتی ہوئی یہاں چلی آئی۔'' فاریہ نے اپنے لبوں کی مسکراہٹ کو ثانیہ کی موجودگی میں چھپاتے ہوئے کہا تو اسد بھی موبائل ٹارچ آف کر کے وضاحت دینے لگا۔

''ہاں...... وہ نیچے کچھ گرمی اور گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لیے میں یہاں کھلی ہوا میں چلا آیا...... اچھا ثانیہ اب ہم چلتے ہیں۔'' اسد نے فاریہ کو جواب دینے کے بعد ثانیہ کی طرف دیکھ کر اجازت طلب کی تھی۔

''ہاں ثانیہ ...... اب ہم چلتے ہیں، آج واقعی بہت انجوائے کیا ہے۔ اگر کبھی کبھار اس طرح کی گیٹ ٹو گیدر ہو جائے تو کتنا اچھا لگے گا۔ اور تم بھی کبھی ہماری طرف چکر لگا لیا کرو...... ہمیشہ میں ہی تمہاری خیر، خبر لینے آتی ہوں۔'' فاریہ نے موقع مناسب دیکھ کر شکوہ بھی کر ڈالا تھا۔

''اب تو آنا ہی پڑے گا۔ تمہارے ساتھ کمبائن اسٹڈی جو کرنی ہوتی ہے۔'' جواباً وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

عامر نے اگلے دن ہی آسیہ بیگم کے سامنے موقع

دیکھ کر فاریہ سے اپنے رشتے کی بات کی تھی۔اور آسیہ بیگم کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔اتنی جلدی وہ جوان ہو کر اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہوگیا۔اور انہوں نے اب تک اس کی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔شاید اس لیے کہ ابھی، ابھی تو عامر کی جاب لگی تھی۔اور وہ چاہتی تھیں کہ کچھ عرصے بعد عامر کی تنخواہ سے بچت کر کے اس کی شادی کے لیے سوچیں گے۔آخر......شادی بیاہ کے موقعوں پر اتنے بہت سے اخراجات ہوتے ہیں......اور اب تک تو وہ اکیلے ہی اس مہنگائی کے دور میں پانچ افراد کے کنبے کی کفالت کر رہی تھیں۔اب عامر اُن کا سہارا بننے جا رہا تھا۔اس لیے انہیں احساس ہوا تھا کہ شادی نہ سہی وہ رشتہ تو طے ہی کر سکتی ہیں۔اور یہ جان کر کہ وہ فاریہ کو پسند کرتا ہے۔انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔کیونکہ انہیں خوشی ہوئی تھی......فاریہ اچھی لڑکی تھی۔خوش مزاج اور خوب سیرت بھی......بہو کی صورت میں انہیں اور کیا چاہیے تھا۔اس لیے انہوں نے عامر کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ اس کے ابو سے اس بارے میں بات کر کے جلد ہی وسیم احمد اور ساجدہ بیگم کی طرف عامر کا باقاعدہ رشتہ لے کر جائیں گی۔اور عامر کی دلی مراد بر آئی تھی۔وہ بہت خوش تھا۔ثانیہ کو پتا چلا تو اسے بھی خوشی ہوئی......اور سلیم احمد کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔لہٰذا اگلے دن ہی دونوں نے جیٹھ جیٹھانی کی طرف جانے کا پروگرام بنایا تھا۔مگر اتفاق سے ان کا دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی کا پروگرام تھا۔اس لیے انہوں نے بیوی سے یہ کہہ کر ساتھ جانے سے معذرت کر لی کہ اس بار وہ چلی جائیں۔اگلی بار وہ بھی ساتھ چلے چلیں گے۔آخر ساتھ میں ہی تو بڑے بھائی کا گھر تھا حالانکہ آسیہ نے انہیں سمجھایا بھی تھا کہ اس وقت ان کا جانا ضروری ہے۔لیکن سلیم احمد نے بات کو سنجیدگی سے لینے کے بجائے ٹال دیا تھا کہ قریبی رشتے داری میں اس طرح کی فارمیلٹی نبھانے کی کیا ضرورت ہے۔لہٰذا مجبوراً آسیہ کو اکیلے ہی جانا پڑا۔کیونکہ وہ فون پر اپنے آنے کی بات کر چکی تھیں۔فون بھی وسیم احمد نے ریسیو کیا تھا......اور خوش دلی سے بھاوج کو آنے کی دعوت دی تھی۔اب آسیہ بیگم نے ارادہ بھی کر لیا تھا اور وعدہ بھی......اس لیے وہ خود ہی ان کی طرف چلی آئیں۔لیکن یہ کیا......ساجدہ بیگم نے تو ان کا مدعا جان کر رشتے داری کا لحاظ کیے بغیر آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

''ارے واہ......آسیہ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنی نازوں پلی بیٹی تمہارے گھر بیاہ دوں گی۔''

وسیم صاحب نے اچنبھے سے بیوی کی طرف دیکھا تھا۔انہیں بیگم سے اس رویے کی توقع نہیں تھی کہ وہ رشتے داری تو دور گھر آئے مہمان کی عزت کا بھی لحاظ نہیں کریں گی جبکہ آسیہ بیگم خفت سے نگاہیں چرانے لگی تھیں۔وسیم صاحب نے ناگواری سے بیوی کو گھر کا تھا لیکن انہوں نے شوہر کی تنبیہی نگاہوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے انکار کا موقف پوری طرح آسیہ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا تھا۔

''معاف کرنا آسیہ......تمہیں برا ضرور لگے گا۔مگر سچ یہی ہے۔سلیم بھائی نے اپنی زندگی جس......بے پروائی اور غیر ذمے داری سے گزاری ہے وہ تمہارا ہی حوصلہ ہے۔جو تم نے ساری زندگی انہیں برداشت کر لیا۔مگر میں اپنی بیٹی کو کسی تجربے کی بھٹی کا ایندھن نہیں بننے دوں گی۔کل کو اگر عامر بھی باپ کے نقش قدم پر چل نکلا تو میری معصوم بچی کا کیا ہوگا۔میری بچی میں نکھٹو شوہر کو گھر بٹھا کے کھلانے کا حوصلہ نہیں ہے۔اس لیے ہماری طرف سے تو معذرت ہی سمجھو اس رشتے کے لیے۔''

انہوں نے تو بے مروتی کی حد کر دی تھی۔وسیم احمد نے آنکھوں کے تنبیہی اشاروں سے انہیں کتنا روکنے کی کوشش کی تھی۔مگر وہ دیورانی کے سامنے اپنے دل کا غبار نکالے بغیر نہیں رہی تھیں اور آسیہ شرمندگی سے گنگ بیٹھی تھیں۔ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ساجدہ بیگم انہیں اس طرح آئینہ دکھاتے ہوئے صاف انکار کر دیں گی۔اگرچہ ساجدہ بیگم کا خدشہ غلط

بھی نہیں تھا۔ بیٹے اکثر مزاج و اطورا میں باپ پر ہی جاتے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے عامر اور عاصم اپنے باپ کے مزاج پر نہیں گئے تھے۔ دونوں محنتی اور لگن سے ہر کام کرتے تھے۔ اسی لیے عامر کی خوشی کی خاطر آسیہ بیگم نے جیٹھانی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''ایسی بات نہیں ہے ساجدہ بھابی......عامر بالکل بھی غیر ذمے دار اور بے پروا لڑکا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ نوکری کے لیے اتنی کوششیں نہ کرتا......اور پھر ضروری تو نہیں ہے کہ بیٹا، باپ کی پیروی میں اسی کے نقشِ قدم پر چلے۔ اب سلیم کے ساتھ بدقسمتی ہوگئی تو اس میں عامر کا کیا قصور......آپ میرا یقین کریں بھابی...... میں نے اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کی ہے اور عامر، فاریہ کو بہت خوش رکھے گا۔'' آسیہ بیگم نے لجاجت سے کہا۔ وسیم صاحب شرمندگی کے مارے انہیں تسلی بھی نہیں دے پا رہے تھے۔ وہ بیوی کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے خود کوئی فیصلہ کر کے بھاوج کو جواب دینا نہیں چاہتے تھے۔ حالانکہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ساجدہ بیگم کو چپ کروا کے خود اپنا فیصلہ سنا دیں کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن مجبوراً خاموش رہے تھے۔ لیکن ساجدہ پھر بھی خاموش نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے دیورانی کی آس توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''ارے چھوڑو آسیہ...... یہ دلاسے مجھے نہیں بہلا سکیں گے۔ اور بڑے بوڑھوں نے کچھ غلط نہیں کہا ہے آپت پوت، پراپت گھوڑا...... بہت نہیں تو تھوڑا، تھوڑا...... پورا نہ سہی مگر بیٹا ہمیشہ باپ کا پرتو ہی ہوتا ہے۔ اور میں فاریہ کی زندگی کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔ ویسے بھی میری فاریہ کو رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔''

ان کے دوٹوک جواب کے بعد آسیہ بیگم کو مزید کوئی بات کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھیں اور جیٹھ سے اجازت لے کر چلی گئیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سلیم احمد بیوی کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ ورنہ سچ کا جو آئینہ ساجدہ بیگم نے انہیں دکھایا تھا۔ سلیم احمد کو اس میں اپنا چہرہ دیکھ کر احساس ہو جاتا کہ انہوں نے محبت کے نام پر آسیہ کے صبر کو کس طرح آزمایا ہے۔ اُدھر آسیہ کے جانے کے بعد وسیم احمد بیوی پر پھٹ پڑے۔ ان کی برداشت جواب دے چکی تھی۔

''مجھے تم سے اتنی بے مروتی اور بدلحاظی کی امید نہیں تھی ساجدہ بیگم......ارے رشتے داری کا نہ سہی گھر آیا... مہمان سمجھ کر ہی آسیہ بھابی کا لحاظ کر لیتیں۔ اور آخر برائی کیا ہے عامر کے رشتے میں۔'' انہوں نے بیوی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اب بھی اپنے موقف پر ڈٹی رہی تھی۔

''اور مجھے بھی آپ سے یہ امید نہیں تھی، آپ بیٹی کے باپ ہیں یا اس کے دشمن...... جو اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کا رشتہ کر کے اسے عمر بھر کے لیے ناکردہ گناہ کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ مگر میں آپ کو اپنی بیٹی کی زندگی قربان کرنے نہیں دوں گی۔ فاریہ اور اسد کی شادی کہاں کرنی ہے اس کا فیصلہ میں خود کروں گی۔'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اور ہمیشہ کے مصالحت پسند، صلح جُو مزاج رکھنے والے وسیم احمد بیوی کی سوچ سے اختلاف کے باوجود خاموش ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اور ساجدہ بیگم کے انکار سے جہاں عامر اور ثانیہ کو بے حد مایوسی اور تاسف ہوا تھا۔ وہیں آسیہ بیگم کو اپنی سبکی کا احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس رشتے سے عامر کی خوشی وابستہ تھی۔ اسی لیے وہ جیٹھ، جیٹھانی کے پاس پورے یقین کے ساتھ گئی تھیں کہ عامر کے لیے وہاں سے انکار نہیں ہوگا۔ لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جیٹھانی ان کے سامنے انہی کے شوہر کی شخصی خامیوں اور کمزوری کو جواز بنا کر عامر کے رشتے سے انکار کر دیں گی۔ البتہ آج آسیہ بیگم کو یہ احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ سلیم احمد نے اپنی فطری کمزوریوں کے ہاتھوں ساری عمر اُن

کا صرف استحصال ہی نہیں کیا...... بلکہ ان کی بے لوث محبت و خدمت کا بھی استحصال کیا ہے۔ وہ تو اس خوش گمانی میں مبتلا تھیں کہ سلیم احمد نے ان سے محبت کی وجہ سے شادی کی تھی۔ مگر اب ساجدہ بیگم کے دیے گئے طعنوں سے گمان ہونے لگا تھا کہ سلیم احمد کے نزدیک آسیہ کی پُرکشش سرکاری نوکری اس فیصلے کا محرک بنی تھی۔ حالانکہ اس وقت تو انہوں نے آسیہ سے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اس لیے آسیہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور آسیہ نے ان کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ اور شاید ہر عورت یونہی مرد کی محبت پر اعتماد کر کے اپنی قسمت کی ڈور اس کے ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ مگر آسیہ کو کیا پتا تھا کہ لوگ محبت کو بھی نفع و نقصان کے پیمانے پر رکھ کر فیصلے کرتے ہیں۔ آسیہ کے حصے میں تو شاید خسارہ ہی آیا تھا۔ وہ سلیم احمد کی ذات سے حد درجہ بدگمان ہو رہی تھیں۔ بلکہ عمر بھر کی تھکن کے ساتھ اپنی ذات کی بے وقعتی کا بھی ادراک ہو رہا تھا۔ اور چونکہ فیصلہ ان کا اپنا تھا، اس لیے کسی سے شکوہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر تو چپ ہی لگ گئی تھی۔ لیکن ساجدہ بیگم کے انکار کی وجہ جان کر سلیم احمد چپ نہیں رہے تھے۔ آسیہ کے سامنے ساجدہ بیگم کو غائبانہ صلواتیں سنائی تھیں۔ ان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''ارے، وہ ہوتی کون ہیں میرے بارے میں ہرزہ سرائی کرنے والی...... اور تم وہاں سے چپ چاپ کیوں چلی آئیں۔ ان کی بیٹی میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو ہم اسے بہو بنانے کے لیے مرے جا رہے ہیں اور ہمارے بیٹے میں کس بات کی کمی ہے۔ وہ سمجھتی کیا ہیں خود کو...... تم دیکھنا...... میں اپنے بیٹے کی شادی بہت اعلیٰ اور دولت مند گھرانے میں کر کے دکھاؤں گا۔ وسیم بھائی نے ضرورت سے زیادہ چھوٹ دے رکھی ہے بیوی کو...... ورنہ ایسی منہ پھٹ عورت کو تو لگام ڈال کر رکھنی چاہیے۔'' آسیہ بیگم خاموشی سے شوہر کو گرجتے برستے دیکھ رہی تھیں۔ اب انہیں کیا بتاتیں کہ یہ خواہش ان کے بیٹے کی ہی ہے جو فاریہ کو پسند کرتا ہے۔ اور اسی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

''بس...... میں نے کہہ دیا ہے کہ آج کے بعد ساجدہ بھابی اور ان کے گھر کے کسی فرد سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔''

وہ تو اپنا فیصلہ سنا کر کمرے سے باہر نکل گئے...... پیچھے آسیہ بیگم گم صم بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ ساجدہ بھابی نے سلیم احمد کی شخصی کمزوریوں کا جو آئینہ انہیں دکھایا تھا اس میں جھانک کر شاید سلیم احمد کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو جائے۔ کیونکہ اب وہ اس طویل ہوتی مسافت سے تھکنے لگی تھیں۔ مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ ظرف اور حوصلہ ہر کسی میں نہیں ہوتا ہے۔ اور سلیم احمد جیسے بے پروا و بے حس انسان میں تو ہرگز نہیں تھا۔ جو آج بھی بیوی کی مشقت بھری زندگی کی قربانیوں کے احساس سے عاری تھے اور آسیہ بیگم نے ان حالات کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر سمجھوتا کر لیا تھا۔ کچھ باتیں انسان کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں، اس لیے تقدیر سے لڑنے کے بجائے اس پر صبر کیا جاتا ہے۔ آسیہ بیگم نے بھی کر لیا تھا۔ مگر فاریہ تقدیر پر یا حالات پر سمجھوتا کر کے صبر کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اسے جب ساجدہ بیگم کے انکار کا پتا چلا تو اس نے صاف لفظوں میں ماں کے سامنے اعتراف کر لیا کہ وہ عامر کو پسند کرتی ہے اور وہ بھی...... اور اس کی خواہش پر ہی عامر نے اپنی ماں کو اس کے رشتے کے لیے بھیجا تھا۔ لہٰذا وہ عامر کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

ساجدہ بیگم کو بیٹی سے اس بے باکی و گستاخی کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو فاریہ کے منہ سے عامر کو پسند کرنے کا اعتراف سن کر ہی حق دق رہ گئی تھیں۔ بیٹی ان کی ناک کے نیچے کزن کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتی رہی۔ اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔ انہیں بیٹی سے زیادہ خود پر غصہ آ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی نادانی پر بھی جو وہ عامر سے شادی کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسے لاکھ سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر

سب بے سود ہوگیا۔ فاریہ بھی آج کے زمانے کی باشعور لڑکی تھی۔ منطق و دلیل سے ان کی سوچ سے اختلاف کیے بغیر نہیں رہی تھی بلکہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''مجھے معاف کردیں امی...... لیکن میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔ شادی کے لیے کسی معقول انسان کو پسند کرنا بری بات نہیں ہے۔ مذہب اور شریعت بھی لڑکی ،لڑکے کو مرضی کے اظہار کا حق دیتی ہے۔ میں مانتی ہوں، آپ کے خدشات بجا سہی...... لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں اور ضروری نہیں ہے کہ عامر بھی باپ کا مزاج اور فطرت لے کر پیدا ہوا ہو...... کیونکہ ہر انسان اپنا الگ مزاج اور فطرت کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ اور اتنے برسوں کی رشتے واری میں مجھے اتنا تو اندازہ ہوگیا ہے کہ عامر کی فطرت اور مزاج کیسا ہے۔ اور ویسے بھی مجھے عامر کی محبت پر پورا بھروسا ہے۔ وہ اپنے ابو کے نقشِ قدم پر کبھی نہیں چلے گا۔ آپ نے اس رشتے سے انکار کیا ہے۔ اس لیے آپ ہی چچی جان کے گھر جا کر اس رشتے کے لیے اقرار بھی کریں گی۔ کیونکہ میں عامر کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

اور بیٹی کے دوٹوک فیصلے کو سن کر ساجدہ بیگم کو تو آگ ہی لگ گئی تھی۔ انہیں امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح اپنی من مانی کے لیے ضد پر اتر آئے گی۔ لہٰذا انہیں اپنی ضد چھوڑنی پڑی کیا کرتیں...... جوان اولاد ماں، باپ کو اسی طرح بے بس و مجبور کردیتی ہے۔ وہ بھی مجبور ہوگئیں۔ بلکہ ہونا پڑا......

''ٹھیک ہے اگر تمہیں بھی آسیہ کی طرح محبت کے نام پر فریب کھانے کا شوق ہے تو ضرور اپنی زندگی میں یہ تجربہ کرکے دیکھ لو مگر کل کو مجھ سے کوئی شکایت مت کرنا۔'' انہوں نے بیٹی کی جانب خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ گویا اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اور فاریہ نے اسی وقت صدقِ دل سے دعا مانگی تھی کہ اسے اس فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔ اسے محبت سے زیادہ اپنے رب کی مہربانی پر بھروسا تھا جو آسمانوں سے زمین پر بسنے والے انسانوں کے جوڑے بناتا ہے، لہٰذا اگر اس کا نصیب عامر کے ساتھ لکھا ہے تو وہ اپنے اس فیصلے پر کبھی نہیں پچھتائے گی۔

☆☆☆

ساجدہ بیگم کو بیٹی کی ضد کے آگے مجبور ہو کر اگلے ہی دن دیورانی کو فون پر عامر کے رشتے کے لیے اقرار کرنا پڑا۔ انہوں نے یہی کہہ کر اپنا بھرم رکھا تھا کہ انہوں نے فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔ لیکن بعد میں سوچا تو انہیں عامر کے رشتے کے حوالے سے اپنی سوچ بدلنی پڑی۔ آخر کو وہ ان کے شوہر کے سگے بھائی کی اولاد ہے۔ اور عامر سے شادی کی صورت میں فاریہ بیاہ کر ان سے دور جانے کے بجائے ان کی نظروں کے قریب ہی رہے گی۔ اور آسیہ بیگم کی طرح عامر نے بھی اس بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا کہ ساجدہ بیگم نے پہلے اس رشتے سے صاف انکار کردیا تھا اور اب اقرار...... البتہ سلیم احمد اب بھی ناراض تھے لیکن جب بڑے بھائی نے بیوی کے ناکردہ رویے کی چھوٹے بھائی، بھاوج سے معذرت کی تو سلیم احمد کو بھی بڑے بھائی کا مان رکھتے ہوئے اپنا اعتراض رد کرنا پڑا تھا۔ دوسرے یہ بیٹے کی خواہش تھی۔ آسیہ بیگم کے بعد وہ ہی گھر کا کماؤ فرد تھا۔ لہٰذا وہ زیادہ مزاحمت نہیں کرسکتے تھے۔ ویسے بھی بیٹے جب جوان ہو کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں تو وہ کمزور باپ سے زیادہ مضبوط ہوجاتے ہیں۔

یوں ایک ہفتے کے بعد گھر میں چھوٹی سی منگنی کی تقریب رکھ کر فاریہ اور عامر کا رشتہ پکا کردیا گیا۔ شادی کی تاریخ فاریہ کے ایگزامز کے بعد رکھی گئی تھی۔ بہر حال یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے نبٹ گیا تھا۔ وہ دونوں من کی مراد پانے پر بہت خوش تھے۔ عاصم اور ثانیہ کو بھی خوشی تھی کہ بچپن سے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہونے والی کزن ان کی بھابی بن رہی تھی۔ وہیں آسیہ بیگم نے بھی اطمینان کی سانس لی تھی۔ اب انہیں ثانیہ

کی فکر تھی۔ وہ جلد از جلد اس کا رشتہ بھی طے کرنا چاہتی تھیں۔ جو سب سے زیادہ اہم فریضہ تھا۔

دوسری جانب اسد نے بھی فاریہ کی جرأت و حوصلے کے اظہار کا نتیجہ دیکھ کر اپنا مقدمہ ساجدہ بیگم کی عدالت میں پورے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس بار ساجدہ بیگم کو اپنی خواہش و مرضی کے خلاف جا کر فیصلہ کرنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس کے لیے ان کے دل میں بہت ارمان تھے۔ اس لیے وہ بھی ماں کی امیدوں پر پانی پھیرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ کیا کرتا۔ ثانیہ کو پانے کی خواہش دل میں پالنے کے بعد وہ دل کے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اور پھر ان کی خواہش ایسی جائز بھی نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں پر بس دولت کی چکا چوند اور لالچ وحرص کی پٹی بندھی تھی۔ جس کا اترنا بہت ضروری تھا کیونکہ رشتے خلوص اور محبت سے جوڑے جاتے ہیں، نفع ونقصان کو ترازو میں تول کر نہیں...... اور وہ بیٹے کی خواہش اور خوشی سے بے خبر تھیں۔ لہٰذا اسد کو ہی ماں کی انمول محبت کو آزما کر اپنی خوشی کے لیے ماں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھنا تھا۔ تاکہ وہ انہیں احساس دلا سکے کہ روپے، پیسے اور رشتوں کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے۔ سونے، چاندی کے بے جان سکے جیتے جاگتے جان دار رشتوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتے ہیں، اب فیصلہ انہوں نے کرنا تھا کہ انہیں اپنی خواہش عزیز ہے یا بیٹے کے دل کی خوشی...... مگر اس سے پہلے اسے ثانیہ سے اس بارے میں ضرور بات کرنی تھی۔ اس کی مرضی جانے بغیر وہ اکیلے اتنا بڑا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا موقع اسے جلد ہی مل گیا تھا۔

ثانیہ اور فاریہ کے فائنل ایگزامز کی ڈیٹ آچکی تھی اور وہ دونوں آج کل کمبائن اسٹڈی کر رہی تھیں۔ ثانیہ آج فاریہ کی طرف اسی مقصد سے آئی تھی۔ دونوں کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھیں، کافی دیر نوٹس وغیرہ بنانے کے بعد وہ کافی تھک گئی تھیں، اب فاریہ اپنے اور ثانیہ کے لیے چائے بنانے کی غرض سے کچن میں گئی تھی تاکہ دونوں فریش ہو کر دوبارہ پڑھائی کریں۔

اتفاق سے اس روز اسد بھی گھر پر موجود تھا۔ لہٰذا ثانیہ سے اکیلے میں بات کرنے کے جس موقع کی تلاش میں وہ تھا وہ اس وقت اسے مل گیا تھا۔ کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے ذرا سی دستک دے کر اندر چلا آیا تھا۔ ثانیہ اسے اس طرح وہاں موجود دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکی۔

''ارے اسد بھائی ......آپ وہ فاریہ چائے بنانے گئی ہے۔ آپ کو، کوئی کام ہے تو میں اسے بلاتی ہوں۔'' ثانیہ بیڈ سے اٹھنے لگی تھی جب اسد نے اسے روکا تھا۔

''ارے نہیں، فاریہ کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ مجھے فاریہ سے نہیں تم سے کام ہے۔ تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اسد چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے ثانیہ کے عین سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اور ثانیہ اچانک اسد کے اس بدلے ہوئے انداز پر ٹھٹک کر رہ گئی۔

''میں کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھنا چاہتا ثانیہ...... سوائے اس کہ میں نے کزن ہونے کے ناتے تمہارے بارے میں پہلے کبھی اس طرح نہیں سوچا جیسا کہ اب...... شاید اس لیے بھی کہ تم شاہ زیب سے منسوب تھیں۔''

شاہ زیب کے ذکر پر اس نے ناپسندیدگی سے پہلو بدلا۔ مگر ثانیہ کے اس ردِعمل کو نظر انداز کرتے ہوئے اسد نے اپنی بات جاری رکھی تاکہ وہ اس کا مدعا سمجھ سکے۔

''لیکن میرا ماننا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں لہٰذا تمہارا جوڑا شاہ زیب کے ساتھ لکھا ہوتا تو یہ سب حالات پیش نہیں آتے۔ اور اب جبکہ ایسا کوئی امکان باقی نہیں رہا تو میں تمہارے لیے اپنے امی، ابو کو اپنے پروپوزل کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ایک، ایک لفظ پر زور دے کر جملے مکمل کیے۔

ثانیہ نے چونک کر اسد کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنے پروپوزل کے لیے..... تمہارے لیے؟" وہ اس کے الفاظ کے چناؤ میں الجھی ہوئی تھی جبکہ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اس سے پہلے کہ میں امی، ابو کو کچھ بتاؤں میں اس بارے میں تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔ تمہیں اس پروپوزل کے حوالے سے کوئی اعتراض ہو تو تم مجھ سے بات کرسکتی ہو۔ مجھے بالکل برا نہیں لگے گا۔"

ثانیہ کے لیے اسد کی یہ بات غیر متوقع تھی۔ اس لیے وہ اب بھی خاموش تھی۔ تب ہی اسد نے وہ بات کہی تھی جو شاید کہنا بہت ضروری تھا کیونکہ اگر جذبوں کو اظہار کا راستہ نہ ملے تو دل کی باتیں ان کہی بن کر عمر بھر کے لیے دل کی کسک بن جاتی ہیں۔ لہٰذا اسد نے اظہار کردینا ہی اہم سمجھا تھا۔

"کیونکہ پہلے میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب سے میں تمہارے بارے میں سوچنے لگا ہوں، تم مجھے اچھی لگنے لگی ہو اور میں اپنے دل کی پوری سچائی کے ساتھ تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔" اظہار کا لمحہ تمام ہوا تو ثانیہ کے انہماک کی کیفیت بھی ٹوٹی۔ اسد نے اپنے دل کی خواہش کا اظہار بہت مناسب لفظوں میں کردیا تھا۔ اب وہ ثانیہ کی طرف اس کے جواب کے لیے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر ثانیہ کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اسد کو اس کی بات کا کیا جواب دے۔ شاید اس لیے کہ اس کے لیے اتنی جلدی پھر سے محبت کے جذبے پر اعتبار کرنا آسان نہیں تھا۔ شاہ زیب نے اپنی والدین کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ ثانیہ کی ذات کی یا اس کے دل ٹوٹنے کی پروا نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس نے ثانیہ کے لیے کوئی اسٹینڈ لیا تھا۔ اگر وہ ثانیہ سے محبت کرتا ہوتا تو ایک بار ضرور ثانیہ کی ذات کے بارے میں سوچتا کہ اس رشتے کے ٹوٹنے کے بعد اس کی ذات پر کتنی انگلیاں اٹھ سکتی ہیں، وہ بے قصور ہو کر بھی لوگوں کی نظروں میں معتوب ٹھہرائی جاسکتی ہے۔ اور اب اسد کا اظہارِ محبت یا پسندیدگی بھی اس کے لیے اتنا معتبر نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ لمحوں میں کوئی فیصلہ کرلیتی..... اس لیے اس نے وہی کہا۔ جو اس وقت اسے ٹھیک لگا تھا۔

"آئی ایم سوری اسد بھائی..... مجھے سمجھ نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کی بات کا کیا جواب دوں کیونکہ میں نے کبھی آپ کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا..... اور فی الحال ابھی میں صرف پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی آگے کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔"

"میں جانتا ہوں ثانیہ..... اعتبار کا رشتہ شیشے کی طرح نازک ہوتا ہے۔ ایک بار ٹوٹ جائے تو آسانی سے نہیں جڑ پاتا۔ اس لیے میں تمہارے سامنے کوئی دعویٰ نہیں کروں گا۔ لیکن اتنا یقین ضرور دلانا چاہوں گا کہ میں نے اپنے دل کی خواہش کا اظہار پوری سچائی کے ساتھ تمہارے سامنے کردیا ہے۔ اور میرے ان لفظوں اور جذبوں میں کتنی سچائی ہے۔ اس کا جواب وقت ہی دے سکے گا۔ لیکن میری خواہش ہے کہ تم اس بارے میں سکون سے سوچنے کے بعد مجھے اپنی مرضی سے آگاہ کرو کیونکہ تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا میں اس کا خوش دلی سے احترام کروں گا۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے چند لمحے کھڑا ثانیہ کی طرف دیکھتا رہا۔ جو خاموش گم صم بیٹھی تھی۔ جیسے اسے اسد سے اس قسم کی توقع نہیں ہو۔ اگلے لمحے اسد پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور ثانیہ کو تو سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک اسد کو کیا ہوگیا۔ وہ جو کچھ کہہ کر گیا ہے ثانیہ نے وہی سنا ہے؟ تب فاریہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو ثانیہ کو گم صم بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے، اس طرح گم صم کیوں بیٹھی ہو؟" فاریہ نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا تو ثانیہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیا اسے اسد کی کہی بات کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں..... وہ شش و پنج میں تھی پھر کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''نہیں، کچھ نہیں...... میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔ باقی تیاری گھر جا کے کرلوں گی۔ شام ہوگئی ہے۔'' ثانیہ نے اپنی بکس نوٹس، فائل وغیرہ بیڈ سے سمیٹتے ہوئے کہا تو فاریہ چائے کی ٹرے اس کے سامنے بیڈ پر رکھ کر دھپ سے بیٹھ گئی۔ ٹرے میں چائے کے ساتھ فرنچ فرائز اور کباب موجود تھے۔ اسی لیے فاریہ کو کچھ زیادہ وقت کچن میں لگ گیا تھا۔

''ہرگز نہیں...... یہ چائے پیے بغیر تو میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ اتنی محنت سے یہ سب بنائے ہیں تمہارے لیے۔'' فاریہ نے دھونس جماتے ہوئے کہا تو ثانیہ نے بھی مسکراتے ہوئے جلدی سے پلیٹ میں فرائز ڈالے دونوں نے مل کر چائے اور لوازمات سے لطف اٹھایا پھر ثانیہ نے چیزیں سمیٹیں اور گھر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب فاریہ نے بھی بخوشی اسے رخصت کیا تھا۔

ثانیہ رات کو اپنے بیڈ پر سونے کے لیے لیٹی تو اسد کی کہی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ پڑھا لکھا اور کافی سلجھے ہوئے مزاج کا لڑکا تھا۔ لڑکیوں کے آئیڈیل جیسا ہینڈسم بھی تھا۔ لیکن شاہ زیب بھی ان ہی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس کا کزن بھی تھا۔ پھر بھی اس نے ثانیہ کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے بعد تو ثانیہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں اس طرح سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ صرف اپنی اسٹڈیز پر فوکس کرنا چاہتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونا چاہتی تھی۔ خاص طور پر منگنی جیسے رشتے کو وہ ایک ناپائیدار رشتہ سمجھتی تھی۔ جس کی کوئی شرعی حیثیت نہ تھی۔ لیکن یہ بھی سچائی تھی کہ اسے ایک لمحہ ایک دن شادی کے لیے ہاں تو بھرنی تھی۔ چاہیے وہ کوئی بھی شخص ہوتا...... اور اب اسد نے اس سے اپنے سوال کا جواب مانگا تھا۔ اسے جواب تو دینا ہی تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے اسد کو کیا جواب دینا چاہیے، اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اسد اس کا کزن تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا مگر اسد کے لیے اس کے دل میں ایسی کوئی خاص فیلنگز نہیں تھیں۔ وہ ایک ہی محلے میں رہتے ہوئے ایک ساتھ پل کر بڑے ہوئے تھے لیکن ثانیہ نے کبھی اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ مگر اب اسد کو کیا جواب دینا ہے، بالآخر اس نے طویل ذہنی کشمکش کے بعد سوچ لیا تھا۔ اور مطمئن ہو کر سونے کے لیے لیٹ گئی...... ذہن پر بوجھ نہیں رہا تھا۔ اس لیے جلد ہی نیند نے اسے اپنی مہربانی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح سب کو ناشتا دینے کے بعد کچن کا پھیلاوا سمیٹ کر آسیہ بیگم اپنی چائے لے کر برآمدے میں آگئی تھیں۔ جہاں صحن میں رکھے تخت پر سلیم احمد پہلے سے براجمان اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ ناشتا وہ تھوڑی دیر سے کرتے تھے۔ البتہ چائے پی لیتے تھے۔ عاصم اور ثانیہ کالج اور عامر اپنے آفس جا چکا تھا۔ آسیہ بیگم گھر کے ملگجے حلیے میں چائے کا کپ پکڑے صحن میں آئیں تو سلیم احمد نے انہیں دیکھا۔ اس وقت تک تو وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہو چکی ہوتی تھیں۔ انہیں اس طرح گھریلو حلیے میں دیکھ کر استفسار کرنے لگے۔

''کیا ہوا...... تم اب تک تیار نہیں ہوئی...... کیا اسپتال جانے کا ارادہ نہیں ہے۔'' آسیہ جو صحن میں تخت کے پاس رکھی چیئر پر بیٹھ چکی تھیں۔ پژمردگی سے شوہر کی طرف دیکھنے لگیں۔

''نہیں...... میری کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اسپتال فون کر دیا ہے۔'' آسیہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ان کے پورے وجود پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی مگر سلیم احمد نے اخبار سے نظریں ہٹا کر بیوی کو سرسری نگاہ سے دیکھا۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت کو...... اچھی بھلی تو لگ رہی ہو۔'' گھرداری اور نوکری کی دُہری مشقت کی تھکن سے آسیہ کا وجود ٹوٹنے لگا تھا مگر سلیم احمد کو لگ رہا تھا کہ وہ اچھی بھلی ہیں، انہیں یک دم ہی شوہر کی.... بے حسی اور اپنی ذات کی بے وقعتی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اپنی مضمحل طبیعت اور سر درد کی وجہ سے شوہر سے کوئی بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ لیکن آج

انہیں احساس ہورہا تھا کہ ساجدہ بھابی نے سلیم احمد کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ ہاں تلخ ضرور تھا مگر سچ تھا۔ اور ایک عمر گزارنے کے بعد آسیہ کو خیال ستانے لگا تھا کہ کیا واقعی سلیم احمد نے ان سے محبت کی خاطر شادی کی تھی۔ محبت کرنے والے تو ایک دوسرے کے اندر تک کا احوال دل کی آنکھوں سے پڑھ لیتے ہیں، ایک دوسرے کے سکھ دکھ اور تھکن بھی آپس میں بانٹ لیتے ہیں، زندگی کی تھکا دینے والی مسافت کو مل کر کاٹتے ہیں تو سفر سہل ہو جاتا ہے۔ مگر انہیں لگ رہا تھا کہ سفر کی مسافت تو شاید آسیہ نے اکیلے ہی طے کی ہے۔ سلیم احمد تو جیسے ان کے ساتھ ہو کر بھی ان کے ساتھ نہیں تھے۔ آج بھی وہ اکیلی منزل کی جانب محوِ سفر تھیں۔ وہ اب تینوں بچوں کی تعلیم و پرورش کے بعد اب ان کی شادیوں کے بارے میں سوچ کر ہلکان ہونے لگتی تھیں کہ وہ سب کچھ اکیلے کیسے کریں گی۔ اپنی محدود آمدنی میں وہ تینوں بچوں کو بہ مشکل پال سکی تھیں۔ اپنا گھر جو ہر عورت کا خواب ہوتا ہے، آسیہ کا یہ خواب بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ اس خواب کی تعبیر دینا تو سلیم احمد کی ذمے داری تھی۔ جنہوں نے اپنی ذمے داری کا بوجھ اتار کے ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا تھا۔ اور اس خواب کو پورا کرنا شاید آسیہ کے بھی اختیار میں نہیں تھا۔

وہ اپنی سوچوں کے سفر پر اتنی دور نکل گئیں کہ ہاتھ میں پکڑے کپ میں چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور دروازے پر مسلسل دستک نے انہیں اپنے خیالوں سے چونکا دیا تھا۔ جبکہ سلیم احمد پھر سے پورے انہماک سے اخبار پڑھنے میں مگن ہو چکے تھے۔ آسیہ نے کپ میں موجود ٹھنڈی چائے کو سرد آہ بھر کے دیکھا تھا۔ پھر کپ وہیں ٹیبل پر رکھ کر سست سے قدموں سے گھر کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گئیں۔ شاید آرام تو آسیہ جیسی عورتوں کے نصیب میں بیماری کی حالت میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

اسد جو آسٹریلیا جانے کے لیے اپنے ویزے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا اچانک ہی شہر کی اچھی فرم سے اس کا اپائنمنٹ لیٹر آ گیا تھا۔ چند ہفتے پہلے اس نے عامر کے کہنے پر اس کی فرم کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں نکلنے والی ویکینسز سے متعلق جاننے پر عامر کے ہی اصرار پر انٹرویو دینے کے لیے ہامی بھری تھی۔ اس کا انٹرویو بھی بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اور اب دو ہفتوں بعد اس کا نتیجہ سامنے تھا۔ اسد کا سلیکشن ہو گیا تھا۔ گھر میں سب خوش تھے۔ اور اسے فوری طور پر جاب جوائن کرنے کے لیے زور دے رہے تھے...... ساجدہ بیگم تو پہلے بھی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ملک سے باہر جائے۔

اب تو وہ خود بھی ثانیہ سے دور جا کر دیارِ غیر میں بسنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ اس نے اب تک اس کے پروپوزل کا جواب نہیں دیا تھا۔ لہٰذا اسد نے سب گھر والوں کی بات مان کر سب سے پہلے اپنی جاب کی خوش خبری ثانیہ کو فون پر سنائی تھی۔ ثانیہ کو خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ اسد نے اپنی خوشی اس سے شیئر کی۔ اس نے اسد کو مبارک باد دی تھی۔ اور اس نے موقع مناسب جان کر ثانیہ سے اپنے سوال کا جواب مانگ لیا۔

''مجھے امید ہے، تم نے اب تک میرے سوال کا جواب سوچ لیا ہوگا۔ کیونکہ تمہارے جواب پر ہی میرے یہاں ٹھہرنے کا جواز مضبوط ہو سکے گا۔''

اور ثانیہ اس کی بات میں چھپے مفہوم کی تہ تک... بہ آسانی پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا جواباً چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

''آپ جانتے ہیں اسد بھائی، میں نے آپ کے بارے پہلے تو کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا۔ لیکن آپ کے سوال پر آپ کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اور میں نے سوچ بھی لیا ہے۔'' ثانیہ چند لمحوں کے لیے رکی تو دوسری جانب اسد کی سماعتیں بھی تھم گئیں جانے وہ کیا جواب دے گی۔ اسد کا اضطراب بڑھنے لگا تھا۔

تب وہ مزید بولی۔

”کزن ہونے کے ناتے......میں نے آپ کو ایک اچھا دوست پایا ہے لیکن اس نئے رشتے کے بارے میں سوچنے کے لیے مجھے ابھی کچھ وقت درکار ہوگا۔ دراصل ابھی میں اپنی اسٹڈیز فوکس کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی اسٹڈیز کمپلیٹ کرکے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ رہی بات شادی کی تو اس کا فیصلہ امی، ابو ہی کریں گے۔اور ان کا ہر فیصلہ مجھے قبول ہوگا۔“ اور اسد نے پُرسکون سانس خارج کی تھی۔ ثانیہ کے جواب نے اسے اپنی پسندیدگی کی خوشی نہ سہی مگر تسلی ضرور دے دی تھی۔اسے ثانیہ کے جواب سے پتا چلا گیا تھا کہ اب اسے اپنا سوال کس کے سامنے رکھنا ہے۔

”ٹھیک ہے ثانیہ...... میں تمہاری خواہش کا احترام کرتا ہوں کیونکہ میں تمہیں پُراعتماد اور خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔اور اپنا یہ سوال اب میں امی، ابو کے سامنے رکھوں گا۔ جو چچی جان اور چچا جان سے جلد ہی سوال کا جواب مانگنے تمہارے گھر آئیں گے۔شکریہ ثانیہ......خدا حافظ۔“

اسد نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔ دوسری جانب ثانیہ سیل فون پکڑے سوچ رہی تھی کہ محض چند دنوں کی منگنی کے بعد وہ شاہ زیب کی محبت میں اس شدت سے مبتلا نہیں ہوئی تھی کہ اس کے تعلق کو بھلانا اور اس کے خیال کو دل سے نکالنا مشکل ہوجائے۔ایک رشتہ بڑوں کی مرضی سے ان کے درمیان طے ہوا تھا۔جس کے بعد اس سے فطری لگاؤ ہونا لازمی امر تھا۔اب اگر شاہ زیب اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکا ہے تو وہ بھی زندگی کو روگ نہیں لگائے گی۔اس کے ماں باپ جس رشتے میں باندھیں گے، اس رشتے کو وہ دل سے قبول کرے گی۔پھر چاہے وہ اسد ہو یا کوئی اور......مگر اس بار رشتہ مضبوط اور پائدار ہوگا۔منگنی جیسا کمزور اور کچا بندھن نہیں ہوگا۔اور ماں، باپ اس کے لیے بہتر ہی سوچیں گے۔اور اِدھر اسد کی خواہش جان کر ساجدہ بیگم تو ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں۔پہلے فاریہ نے اپنی مرضی منوا کے ان کی امیدوں پر پانی پھیرا تھا۔

انسانیت سے نیچے

زندگی میں بہت سی خواہشیں بہت سے ارمان ہوتے ہیں لیکن یہ زندگی اللہ کی امانت ہے، یہ خواہشیں پوری کرنے کے لیے نہیں ملی......لیکن اگر انسان ان خواہشوں کے پیچھے بھاگنے لگے......اسے پورا کرنے لگے تو پیچھے بہت کچھ چھوٹ جاتا ہے......جس میں سب سے اہم فکرِ آخرت ہے اور جب فکر آخرت نہ رہے تو سمجھو انسان، انسانیت کے عہدے سے نیچے گرنے لگا ہے......اور جب انسان، انسانیت سے نیچے گرجائے تو معاشرے کی خرابی کا سبب بن جاتا ہے اور آج یہ خرابی ہم ہر گلی، کوچے میں دیکھ رہے ہیں، اللہ ہم سب کو نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

ضرورتِ رشتہ

ایک ماں کو اپنے بیٹے کے لیے سگھڑ، خوب صورت اور ایسی بہو چاہیے جو اس کے گھر کو جوڑ کر رکھے جو اس کی بات کو بلا چون و چرا......مانے......جو اس کی شادی شدہ بیٹیوں کی خوب خدمتیں کرے......اور جب اس کی اپنی بیٹی کہتی ہے کہ ہر سنڈے کو اس کی نندیں آتی ہیں تو ان کے لیے کھانا وغیرہ بنانا ہوتا ہے......تو یہی ماں سینے پر دو ہتڑ مار کر کہتی ہے۔

”آئے ہائے تم ان کی نوکرانی ہو کیا، یہ تو ظلم ہے، زیادتی ہے۔“

مرسلہ: راحیلہ بنت مہر علی شاہ، گاؤں آما خیل، ضلع ٹانک

☆☆☆

اور اب اسد ان کے خوابوں کو حسرت بنا کر ان کی راکھ اڑانا چاہتا تھا۔ لیکن اس بار وہ اپنی خواہش سے دستبردار ہونے کو ہرگز تیار نہیں تھیں۔ ان کے بیٹے میں کس بات کی کمی تھی۔ اب تو اچھی نوکری بھی مل چکی تھی۔ لہٰذا ایک کھاتے پیتے گھرانے کی اچھی لڑکی تو کوشش کر کے مل ہی سکتی تھی۔ اور وہ ہر صورت اسد کی شادی اپنی حیثیت سے اونچے گھرانے میں کرنے کے لیے اڑ گئیں تو مجبوراً اسد کو بھی انہیں اپنا فیصلہ سنانا پڑا۔ کیونکہ وہ باہر جا کر نوکری ڈھونڈنے کا فیصلہ کر رہا تھا۔ جسے سن کر ساجدہ بیگم کے ہاتھوں کے طوطے، چڑیا سب کچھ اُڑ گئے۔ کیونکہ اب وہ بھی اپنی ضد پر اُڑ گیا تھا۔ اور وہ جانتی تھیں ضد میں وہ اپنی ماں پر ہی گیا ہے۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اسد...... میں تمہیں کبھی ایسا کرنے نہیں دوں گی۔'' وہ مضطرب ہو کر بولیں۔ ''میں تمہیں کسی قیمت پر بھی ملک سے باہر جا کر نوکری کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ تم ایک ہی بیٹے ہو میرے...... میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔ میں تمہیں خود سے دور جانے نہیں دے سکتی۔ تمہیں اپنا ارادہ بدلنا ہوگا۔'' ساجدہ بیگم نے دلگیر لہجے میں کہا تھا۔

''تو پھر آپ کو بھی اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا۔'' اسد نے بھی برجستہ کہا تھا۔ ماں کو اپنی محبت میں کمزور پڑتے دیکھ کر اسد نے ان کے ہاتھوں کو تھام لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں امی...... لیکن آپ کو بھی میری بات ماننی ہوگی۔ کیونکہ میرا ماننا ہے کہ انسانی خوشی کو دولت کے ترازو میں تولا جائے تو انسانی رشتے ناتوں کی اہمیت کا وزن زیادہ بھاری پڑتا ہے۔ ہم اپنے خونی رشتوں کو ٹھکرا کے بہت سی دولت پا کر بھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔ جو ان رشتوں کے ساتھ رہنے سے ملتی ہے۔''

''اسد ٹھیک کہہ رہا ہے ساجدہ بیگم...... بہت سی دولت پا کر بھی اگر انسان تنہا اور اکیلا ہو تو وہ دنیا کا سب سے بڑا کنگال کہلاتا ہے۔ کیا تم اپنے بیٹے سے الگ رہ کر خوش رہ سکو گی یا اسد اپنی خوشی کھو کر کبھی خوش رہ سکے گا؟'' وسیم صاحب جانے کب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اسد کی ساری بات سن لی تھی۔ پھر بیٹے کی تائید کرتے ہوئے بیوی کو سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی...... ساجدہ بیگم نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا...... بھلا وہ بیٹے سے الگ رہ کر خوش کب رہ سکتی تھیں۔ نہ ہی بیٹے کی خوشی چھین کر سکھ پانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اسد کی طرف دیکھا۔ جو بڑی امید بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''پلیز امی...... مان جائیں ناں......'' اسد نے ماں کے ہاتھوں کو تھام کر لجاجت سے کہا تو ساجدہ بیگم کا دل بھی پسیج گیا۔ انہوں نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں میں بیٹے کا چہرہ تھام کر اس کی کشادہ پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔

''میں اپنے بیٹے کو کبھی مایوس نہیں کروں گی۔ کیونکہ میں اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں، اس کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔''

اور ماں کے جواب پر اس کے ساتھ وسیم صاحب بھی طمانیت سے مسکرا دیے تھے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی ساجدہ بیگم کے اس جواز کو مسترد کر چکے تھے کہ عامر اور فاریہ کے رشتے کے بعد اب ثانیہ اور اسد کا رشتہ وٹے سٹے کی صورت میں آسیہ اور سلیم احمد کے لیے اعتراض کا باعث ہو سکتا ہے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ جب رشتے خلوصِ نیت سے جوڑے جائیں تو کسی بدمزگی کا امکان باقی نہیں رہتا۔

☆☆☆

اسد کی جاب لگنے کے بعد وسیم صاحب جو اپنے میڈیکل اسٹور کی بڑھتی ضرورت کے لیے کسی ہیلپر کو رکھنے کا سوچ رہے تھے انہیں چھوٹے بھائی کا خیال آیا تھا۔ جو کافی عرصے سے بیکار بیٹھے تھے۔ وسیم صاحب نے اگرچہ پہلے بھی چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ میڈیکل اسٹور پر بیٹھنے کے لیے کئی بار کہا تھا۔ مگر سلیم احمد اپنی سہل پسندی اور اپنے بیکار دوستوں کے ساتھ شطرنج اور تاش

کی بازیوں کے پروگرام کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ہر بار بڑے بھائی کو ٹالتے رہے تھے۔

مگر اس بار انہوں نے بھی سنجیدگی بلکہ سختی سے سلیم احمد سے اپنی بات منوانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تاکہ وہ سارا دن گھر میں بیکار بیٹھ کر اخبار اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ دوستوں کے ساتھ فضول وقت گزاری کے بجائے میڈیکل اسٹور پر بڑے بھائی کا ہاتھ بٹائیں۔ تاکہ آسیہ کے کاندھوں پر رکھی ذمے داری کے بوجھ کا وزن کچھ ہلکا ہوسکے۔ اسی سلسلے میں وہ آج عشا کی نماز کے بعد سلیم احمد کو لے کر قریبی پارک میں چہل قدمی کے لیے لے آئے تھے۔

یہ بھی اچھا تھا کہ ماں، باپ کی اچھی تربیت کے باعث سلیم احمد میں چاہے جتنی بھی خامیاں سہی مگر وہ بڑے بھائی کی طرح باقاعدگی سے مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ اس لیے وسیم احمد نے گھر کے بجائے بھائی کو گھر سے باہر کہیں معقول جگہ پر بیٹھ کر سمجھانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس وقت وہ گھر کے قریبی پارک میں موجود بینچ پر بیٹھے سلیم احمد کو وہ باتیں پہلی بار سمجھا رہے تھے جو اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں کی تھیں۔

''تم تو خوش نصیب ہو سلیم...... تمہارے حصے میں ایک بے لوث محبت کرنے والی سلجھے ہوئے مزاج کی...... پُرخلوص وایثار پرست عورت آئی ہے۔ جس نے تمہارے حصے کی بھاری ذمے داریوں کا بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھایا ہوا ہے، تمہارے گھر کو سنوارا، تمہاری اور تمہارے بچوں کی دن رات خدمت کی...... ان کو پروان چڑھا کے اس قابل بنادیا کہ آج وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئے ہیں...... لیکن تم نے اس کی قربانیوں کا کیا صلہ دیا ہے۔ کبھی تم نے سوچا ہے سلیم...... جو عورت تمہاری محبت کی انگلی تھام کر تمہارے ساتھ تمہاری ذمے داری بن کر اس گھر میں آئی تھی۔ کیا تم نے واقعی اس کی ذمے داری نبھائی ہے۔'' آج وسیم احمد کا لہجہ و انداز بالکل الگ تھا۔ پند ونصائح اگر طعنوں تشنوں کے ساتھ کی جائے تو اکثر بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ اور وسیم احمد چھوٹے بھائی کو سمجھا نہیں رہے تھے بلکہ نرمی سے یہ احساس دلا رہے تھے کہ گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے فرائض کو نظرانداز کر کے انہوں نے اپنے بچوں کے ساتھ، ساتھ آسیہ کے ساتھ بھی بڑی ناانصافی کی ہے۔ اور پہلی بار سلیم احمد کو واقعی اپنی کوتاہیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر بڑے بھائی کے اگلے سوال نے سلیم احمد کو گنگ کر دیا تھا۔

''کیا تم نے واقعی آسیہ بھابی سے محبت میں شادی کی تھی۔ کیا تم واقعی ان سے محبت کرتے تھے یا اب بھی کرتے ہو؟''

اور سلیم احمد کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات کے ساتھ عرقِ ندامت بھی پھوٹ پڑا تھا۔ وہ بڑے بھائی کو جواب دینے کے بجائے سر جھکائے سوچ رہے تھے کہ آسیہ تو انہیں پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھی۔ پھر چند دنوں میں جس طرح اس نے اسپتال میں ان کی ماں کا خیال رکھا تھا وہ اس کے بے لوث خلوص کے جذبے سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور انہیں لگا تھا کہ محض چند دنوں میں ہی وہ آسیہ سے محبت کرنے لگے ہیں، کسی کی چاہ دل میں پیدا ہوجائے تو وہ جذبہ محبت ہی کہلاتا ہے۔ تب ہی تو اس سے شادی کا فیصلہ لمحوں میں انہوں نے کرلیا تھا۔ کوئی اور پوچھتا تو شاید وہ کبھی اس سوال کا جواب نہیں دے پاتے۔ لیکن بڑے بھائی کے سامنے وہ اعتراف کرتے ہوئے جھجکے نہیں تھے۔

''وہ محبت کرنے کے ہی قابل تھی بھائی۔ تب ہی تو اس سے شادی کرنے کا اتنا بڑا فیصلہ لمحوں میں کرلیا تھا میں نے۔ لیکن شاید میں اس کی بے لوث محبت کا حق آج تک ادا نہیں کرسکا۔ میں بہت شرمندہ ہوں بھائی جان...... مگر مجھے ساری زندگی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ آسیہ میری زندگی کی عمارت کا وہ مضبوط ستون ہے، جس نے اپنے اور میرے درمیان رشتے کے بوجھ کو اکیلے اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ آسانیاں فراہم کرتی گئی اور میں سہل پسندی کا عادی ہوتا گیا۔ لیکن آج آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میرے

مردہ احساس کو جھنجوڑ کے زندہ کر دیا ہے۔ مجھے معاف کردیں بھائی جان۔'' سلیم احمد کے لہجے میں ندامت و پچھتاوا بول رہا تھا۔

''تمہیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوگیا۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ لیکن معذرت تمہیں مجھ سے نہیں آسیہ بھابی سے کرنی چاہیے۔ ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی دلانا چاہیے کہ زندگی کے باقی ماندہ سفر میں تم اس کی آدھی تھکن ہی نہیں آدھی ذمے داریاں بھی بانٹ لوگے۔ مگر پوری محبت وخلوص کے ساتھ۔'' وسیم احمد نے مسکراتے ہوئے چھوٹے بھائی کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''کیونکہ میاں، بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ جسے ان دونوں کو مل کر چلانا ہوتا ہے۔ اور مرد کو تو عورت کا کفیل بنایا گیا ہے۔ اسی لیے مرد کا رتبہ بھی بلند رکھا گیا ہے۔ لہٰذا کسی بہت بڑی مجبوری کے بغیر اسے اپنی ذمے داری سے کوتاہی برتنی نہیں چاہیے۔ بس کل سے تم میرے ساتھ اسٹور پر آ کر میرا ہاتھ بٹانے میں میری مدد کروگے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سلیم احمد نے بھی سعادت مندی کا اظہار کیا۔

''جی بھائی جان...... اب آپ کو بھی میری طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ میں سب کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اور وسیم احمد نے مسکراتے ہوئے چھوٹے بھائی کو گلے سے لگالیا تھا۔ پھر اٹھ کر وہ دونوں پارک سے باہر نکل گئے تھے۔

اور سچ ہے، ہدایت کے لیے بھی، کبھی ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔ سلیم احمد کو بھی ہدایت نصیب ہوئی تو وہ خود کو خوش نصیبوں میں شمار کر رہے تھے۔ کیونکہ ان کے حصے میں واقعی نیک، صالح اور محبت کرنے والی عورت کا ساتھ آیا تھا۔ لہٰذا اب اپنے پچھلی کوتاہیوں کا احساس ہوا تو اس کی معافی مانگنے میں دیر نہیں کی۔

آسیہ کچن سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو سلیم احمد پہلے سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ آسیہ بیڈ کے دوسری جانب آ کر بیٹھیں تو سلیم احمد نے بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو عقیدت سے تھام لیا۔ آسیہ تو ان کے اس اچانک انداز پر حیران ہی رہ گئیں۔ اس سے پہلے وہ ان سے کچھ کہتیں۔ سلیم احمد نم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''مجھے معاف کردو آسیہ...... میں تم سے بہت شرمندہ ہوں، میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اپنی محبت کو تمہارے لیے آزمائش بنادوں گا۔ بہت دیر سے سہی مگر مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوگیا ہے۔ کیا تم مجھے معاف کر کے ازالے کا موقع دوگی۔ یقین مانو...... میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔'' سلیم احمد بیڈ پر اپنے پاس بیٹھی بیوی کے ہاتھوں کو تھامے اس کے چہرے کو نرمی سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ اور آسیہ اب بھی حیرت سے گنگ بیٹھی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ سلیم احمد کی آنکھوں کے سامنے چھائی بے حسی و بے پروائی کی دھند چھٹ چکی ہے۔ وہ ان سے اپنی عمر گزشتہ کے رویّوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ شرمندہ و نادم تھے اور آسیہ کو شوہر کا یہ ملتجی انداز برداشت نہیں ہوا تو بے ساختہ اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

''ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں سلیم صاحب...... آپ کو مجھ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ کو احساس ہوگیا۔ میرے لیے یہی کافی ہے، آپ کو میری بے لوث محبتوں کا اعتراف ہے۔ میرے لیے یہ بہت قیمتی احساس ہے۔ زندگی کے تھکا دینے والے سفر میں بس آپ کی محبت اور ساتھ درکار تھا۔ وہ آج مجھے مل گیا ہے۔ اب اگر مسافت طویل بھی ہے تو آسانی سے کٹ جائے گی۔''

اور سلیم احمد کی آنکھوں میں بیوی کے لیے عقیدت و محبت تھی اور آسیہ کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی وتشکر کے آنسو تھے۔ زیست کی ریاضت رائگاں ہونے سے بچ گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مسکرا رہے تھے۔ زندگی کی باقی ماندہ مسافت خوش اسلوبی سے ساتھ طے کرنے کے لیے۔

''میری بات مانو، اچھے بچوں کی طرح اس رشتے کے لیے ہاں کردو۔ یوں بھی ساری بات تو طے ہو ہی چکی ہے۔'' زویا نے ناصحانہ انداز اپناتے ہوئے کہا تو دُرّی کو تو جیسے پتنگے ہی لگ گئے۔

''ارے وہی تو..... ساری بات تو طے کر کرا لی۔ اب میری ہاں یا نہ کی کیا وقعت؟'' دُرّشہوار نروٹھے پن سے بولی تھی۔

''دیکھو دُرّی جو بھی ہم سب کریں گے تمہاری

محبت میں رتجگے

قرۃ العین سکندر



بہتری کو مدِ نظر رکھ کر ہی کریں گے۔ اب تایا جان' جان بوجھ کر تم کو کنویں میں تو نہیں ناں دھکیلیں گے۔'' زویا نے اس کی تسلی کے لیے سوالیہ انداز اپنایا تھا مگر درشہوار کی تو تشفی ہی نہ ہو رہی تھی۔

''باقی سب تو جانے دو...... میں اس گنوار کے ساتھ ساری زندگی کیسے گاؤں میں گزاروں گی۔ میرا تو سوچ ،سوچ کر ہی برا حال ہے۔'' درشہوار نے خیالی سوچ پر جھرجھری لیتے ہوئے پُرجلال لہجے میں کہا تو زویا نے اپنا سر پکڑ دیا۔

''تم احمق لڑکی...... کس کو گنوار کہہ رہی ہو...... وہ پی ایچ ڈی اور تم نری گریجویشن فیل......'' زویا نے بھی اب لگی لپٹی کو چھوڑ کر صاف اور سیدھی بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ یوں بھی درشہوار محبت کی کم اور غصے کی زبان زیادہ سمجھتی تھی۔

''ہاں سب جانتی ہوں' اسی کی تو سزا مل رہی ہے مجھے... تمہارا رشتہ کیوں نہیں کردیا وہاں چچا جان نے بلکہ تمہارے لیے تو یہیں کا شہر کے شہر میں ہی رشتہ تلاش کیا۔ اور مجھے اتنے دور وہاں پینڈو لوگوں میں بھیج رہے ہیں...... انجان جگہ، انجان لوگ۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ مگر زویا نے تو اس کی بات ہی اچک لی تھی۔

''انجان کون ہے محترمہ......؟ وہ ہماری اکلوتی پھپھو کے بیٹے ہیں، شاہ میر بھائی اور وہ لوگ بھی تو یہیں آنے والے ہیں، وقتی طور پر تم کو گاؤں میں رہنا بھی ہوگا تو اس میں کیا قباحت ہے، میاں جی کے ساتھ تو انسان کہیں بھی گزارہ کرلیتا ہے، بس میاں کا ساتھ ہو اور شاہ میر بھائی تو اتنے سلجھے ہوئے ہیں پھر اُن کی نگاہوں میں تمہارے لیے میں نے سچی والی محبت دیکھی ہے۔'' زویا نے نشاندہی کی تو وہ بری طرح چونکی تھی۔

''اب ذرا یہ بھی بتادو کہ یہ سچی والی محبت کیا ہوتی ہے؟ اور جھوٹی والی محبت کیا ہوتی ہے بھلا۔'' دری نے ناک بھوں چڑھائی۔

''شاہ میر کی محبت کا بھلا میں نے اچار ڈالنا ہے۔'' وہ بگڑے تیور لیے بولی۔

''مائی ڈیئر کزن اب اچار ڈالو یا نہ ڈالو، تمہارے نصیب میں تو اب شاہ میر ہی رقم ہے۔''

زویا نے ہنس کر کہا تو وہ وہاں سے واک آؤٹ کرگئی...... اپنا غصہ تو دکھانا ہی تھا ناں......

☆☆☆

فرقان، لقمان اور عدنان تین بھائی اور ان کی اکلوتی بہن ہاجرہ آپا...... عدنان تو تعلیم کی غرض سے لندن گئے تو وہیں گھر بار آباد کرلیا۔ فرقان اور لقمان دونوں بھائی اکٹھے ہی لاہور شہر میں رہائش پزیر تھے۔

ان کی آپا ہاجرہ کا نصیب تھا کہ وہ شہر سے بیاہ کر دیہات چلی گئیں۔ اگرچہ سب بے حد سلجھے ہوئے لوگ تھے مگر اس کی بنیادی وجہ بڑوں کا وہ فیصلہ بنا کہ شادی اپنوں میں کی جائے۔ اس لیے ہاجرہ آپا کو دیہات میں اپنی زیست کے ماہ و سال بسر کرنا پڑے۔ اگرچہ اب وہ بھی بے حد تیز رفتاری سے وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید ہو چکا تھا اور شہر کی وسعت نے گویا فاصلے بھی مٹا دیے تھے۔ اچھی خاصی زمینداری تھی ان کی سو... گاؤں میں.... بھی تمام سہولیات میسر تھیں۔ زویا اور درشہوار ایک آدھ مرتبہ بہت بچپن میں ہاجرہ پھپو کی طرف گئی تھیں مگر اس کے بعد گاؤں جانا نہیں ہوا بلکہ ہر سال موسم کی تبدیلی کے ساتھ مختلف پھلوں، سبزیوں کے ٹوکرے لیے شاہ میر ہی کی آمد ہوجایا کرتی تھی۔ شاہ میر یہیں اسی شہر میں زیرِ تعلیم تھا۔ مگر اس کی خاندانی انا نے گوارا ہی نہیں کیا کہ وہ یہاں ان کے ساتھ چل کر رہے۔ بلکہ اس کے بجائے وہ ہاسٹل میں لڑھکتا رہا۔

اب چند ماہ پہلے ہی بہت اصرار کے بعد وہ یہیں ولا ہاؤس کی انیکسی میں رہائش پزیر ہوگیا تھا شاہ میر کی جدی پشتی جائداد زمینیں چلی آرہی تھیں...... باپ کا انتقال ہوچکا تھا اور وہ ٹھہرا اکلوتا دونوں، ماں بیٹے نے فیصلہ کیا کہ کچھ زمینیں بیچ کر لاہور شہر میں کوٹھی خرید لی جائے۔ ہاں گاؤں میں ان کے قابلِ اعتبار بندے تھے جو زمینوں کی دیکھ بھال کرسکتے تھے۔

درشہوار یہ سب سن کر بھی اس رشتے کے حق میں

نہیں تھی۔ اس نے جوابا رونا دھونا مچا رکھا تھا۔ اس کا یہ اعتراض بھی ناقابلِ قبول ٹھہرا کہ وہ دیہات میں نہیں رہنا چاہتی۔

''بیٹا بہت جلد آپا جان اور شاہ میر یہیں شہر میں آباد ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہاں گھر بھی خرید لیا ہے۔ اتنا وسیع و عریض بنگلا ہے ان کا میرے ساتھ ہی اس نے ڈیل فائنل کی ہے بیٹا وہ ہر لحاظ سے بہترین ہے، تم تو عیش کرو گی۔ وہاں عیش......'' لقمان صاحب کے لہجے میں خوش دیدنی تھی۔ مگر بابا کے سامنے چپ کر جانے والی دری تنہائی میں خاموش نہ رہی تھی بلکہ خوب بولی تھی، چیخی تھی۔

☆☆☆

''کل ہاجرہ آپا آ رہی ہیں، باقاعدہ منگنی کی رسم کرنے۔'' شازیہ بیگم نے متانت سے اسے خبر دی تھی۔

''ارے یہ تو بے حد خوشی کی بات ہے۔ چلیں، آج شام ہی شاپنگ کرا آتے ہیں۔'' عابدہ بیگم نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

''شاہ میر شام میں آ رہا ہے، وہ خود اسے شاپنگ کرائے گا۔'' شازیہ نے بے حد خوشی سے اطلاع دی تھی۔ یہ اطلاع خود دُرِّ شہوار کے لیے کسی بم سے کم نہ تھی۔ اس نے لب کشائی کرنا چاہی تھی مگر آواز گلے میں کہیں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے دل میں پختہ عزت کر لیا تھا کہ وہ شاہ میر سے گن، گن کر بدلے لے گی۔ اور ہاجرہ پھپھو کو ایک ظالم بہو کا رول پلے کر کے دکھائے گی۔ سرِ شام شازیہ بیگم کے اصرار پر اسے چاروناچار تیار ہونا پڑا۔ نہا کر بال سلجھائے اور کھلے ہی چھوڑ دیے، ہونٹوں پر لب گلوز لگا کر وہ باہر نکل آئی تھی۔ اتنی سی تیاری ہی کافی ثابت ہوئی تھی۔ اتنی ہی تیاری کے بعد اس کا حسن غضب ڈھا رہا تھا۔ شاہ میر میرون شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس کار سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے اسی کو منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے آتے ہی اس نے سہارا چھوڑ دیا تھا اور بغور دری کو دیکھ رہا تھا۔

دُرِّ شہوار لانگ فراک اور پاجامہ میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ میدے جیسی سفید رنگت میں حیا کی لالی اور کانوں میں ڈالی خوب صورت بالیاں اسے بے حد حسین بنا رہی تھیں۔ اس نے ایک تیکھی نظر شاہ میر پر ڈالی اور زوردار سلام کرنے کے بعد فرنٹ ڈور کھول کر سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ شاہ میر ی اس کے حاکمانہ انداز پر زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔

''انداز تو ابھی سے تمہارے بیگم جیسے ہیں۔ بعد میں نہ جانے کیا سلوک کرو گی۔'' شاہ میر نے سادگی سے ہنس کر کہا تھا۔ مگر وہ بری طرح تپ گئی۔

''ایسا کیا کر دیا میں نے......؟'' وہ دوبدو بولی۔

''کچھ بھی نہیں......'' شاہ میر اس کے تند و تیز لہجے کو محسوس کر کے بات پلٹ گیا۔ اور غیر محسوس سی خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہو گئی جو تمام راستے میں ہی نہیں شاپنگ کے دوران بھی جاری رہی۔ بالآخر شاہ میر کو اس کے ہر شے کو اٹھا کر واپس رکھ دینے کی سرگرمی پر اس کو ٹوکنا پڑا۔

''کیا بات ہے کچھ خریدنے کا ارادہ بھی ہے یا صرف ونڈو شاپنگ کرنی ہے؟ ایسا ہو تو سکتا تھا۔ مگر اب وقت ہی باقی نہیں رہا۔ اماں جان جو کچھ لائیں گی وہ سب تو ہو گا ہی مگر ان کی خاص تاکید تھی کہ تمہیں، تمہاری من پسند شاپنگ کروا دی جائے مگر تم تو کسی شے سے مطمئن ہی نہیں ہو رہی ہو۔ بولو، تو میں مدد کروا دوں؟'' آخری جملہ اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا تو وہ سٹپٹا سی گئی۔ مجبوراً جلدی سے جو ہاتھ لگا منتخب کرتی چلی گئی۔ جیولری شاپ پر وہ شش و پنج کا شکار تھی۔ بالکل خاموش سی تھی آج تک جب بھی جیولری کی بات ہوتی تو ہی جان یا پھر ماما ہی جایا کرتی تھیں۔ اس نے کبھی خود سے شاپنگ نہیں کی تھی۔ اور کبھی تو ڈیزائننگ بک گھر آ جایا کرتی تھی پھر وہ اور زویا مل کر کسی بھی جدید ڈیزائن پر حامی بھر دیتی تھیں...... اور یوں مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ اب اتنے سارے نفیس تراش والے سیٹ دیکھ کر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ تبھی شاہ میر

لے ایک بے حد نفیس نگینوں والے سیٹ کو اس کے سامنے رکھا تھا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ میر کے انتخاب کو سراہنے پر مجبور ہوگئی۔

''ہوں...... بہت ہی لاجواب انتخاب ہے آپ کا۔'' اتنی شاپنگ کے بعد درشہوار کا موڈ از خود ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے دوستانہ انداز میں صاف گوئی سے توفیقی انداز میں کہا۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میرا ہر انتخاب ہی لاجواب ہے۔'' شاہ میر کے ذو معنی انداز پر وہ بوکھلا کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ شاہ میر کی نگاہوں کی تپش سے اس کا وجود سلگنے لگا تھا۔ وہ بھی اس کے چہرے پر مقناطیسی نگاہوں کو فٹ کیے مسلسل تکے جا رہا تھا۔ واپسی کے سفر میں شاہ میر اسے آئس کریم پارلر لے آیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔

وہ یوں پبلک پلیس پر کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے اس کے قدموں کے تعاقب میں اس کے پیچھے آ گئی تھی۔

شاہ میر کے لیے یہ لمحات بے حد فسوں خیزی لیے تھے۔ بہت عرصہ قبل اس نے دل میں درشہوار کی چاہت کی کونپل کھلتی محسوس کر لی تھی۔ اتنے ماہ و سال میں وہ اپنی چاہت کو دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ رکھے ہوئے تھا...... مگر جب ماں نے اس سے شادی کی بابت اس کی رائے جاننا چاہی تو اس نے واشگاف لفظوں میں درشہوار کا نام لے لیا تھا۔ پھر باقی کے مراحل خود بخود طے ہوتے چلے گئے۔ کسی نے بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ مگر سب سے بڑی رکاوٹ تو خود درشہوار بن گئی تھی یہ تو شاہ میر نے سوچا بھی نہیں تھا کہ درشہوار اس سے اس طرح پرائیوں کی طرح بات کرے گی۔ وہ ایک خاص فاصلہ رکھ کر ہی اس سے بات کیا کرتی تھی۔ درشہوار کے کسی انداز سے بھی الفت کی جھلک نہ تھی۔

بلکہ اس کے انداز میں محبت کے سائے ناپید تھے۔ وہ محسوس تو بے حد کرتا تھا مگر اس نے یہ بھی اس کی شرم پر محمول کر کے اپنے دل کو تسلی دے ڈالی تھی.....

درشہوار نے اگر اس کی محبت میں کوئی جملہ نہیں کہا تھا تو عجب نہ تھا آخر کو وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔

اگرچہ اعترافِ محبت تو اس نے بھی نہ کیا تھا۔ وہ خود بھی تو محبت کو کسی گانٹھ کے مانند جوڑے بیٹھا تھا۔ پرت در پرت گرہوں میں لپٹی محبت درشہوار کو کیسے متاثر کرتی۔ وہ تو شاہ میر کو... سنجیدگی کے لبادے میں دیکھتی آئی تھی۔ جہاں کوئی اظہار نہ تھا، واپسی پر درشہوار بے پناہ تھکن کا شکار ہوگئی تھی۔ اس پر سامنے سے آتی زویا کی معنی خیز مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

''تمہارے شہر کا موسم بڑا سہانا لگے
میں ایک شام چرا لوں اگر برا نہ لگے''

زویا نے گنگناتے ہوئے اسے جتایا تھا۔

''زویا کی بچی مجھ سے پٹو گی تم؟'' وہ غصیلے انداز میں ناخنوں سے اسے نوچنے کو آگے لپکی تھی مگر زویا کسی جن کے مانند بھاگ کر جان بچا گئی تھی۔

☆☆☆

لان کے عقبی جانب چہار سو پھیلی روشنیوں کی زد میں جھلملاتے مسکراتے ماہتاب چہرے محوِ گفتگو تھے۔ پھولوں سے لان کو آرائشی انداز میں سنوارا گیا تھا۔ اسٹیج پر درشہوار اور شاہ میر کے دائیں اور بائیں جانب بیٹھی نند اور بھاوج ہاجرہ اور شازیہ سرشار انداز میں بیٹھی دل ہی دل میں اپنے بچوں کی بلائیں لے رہی تھیں۔

شاہ میر پُر وجاہت، خوبرو وجود لیے اس محفل میں رنگ بھر رہا تھا۔ جبکہ کسمساتی ہوئی درشہوار ریڈ کامدار لہنگے میں کسی اپسرا کے مانند لگ رہی تھی۔ محبت نے اس کے حسن کو ملکوتی بنا ڈالا تھا۔ شاہ میر کی پڑتی محبت کی نگاہ نے اس کو انمول بنا ڈالا تھا۔

انگوٹھی کے تبادلے کے ساتھ ہی مبارک بادیں وصول ہونے لگیں۔ مٹھائی سے منہ میٹھا کروایا جانے لگا۔

درشہوار اپنے دل میں اِک نامعلوم سی اداسی کو جاگزیں محسوس کر رہی تھی۔ سب تو اتنے خوش اور شاد

تھے نہ جانے کیوں وہ اتنی مضطرب سی تھی۔
شاید اس کی وجہ اس کی وہ ضد تھی جو بظاہر تو اسے بھی اس سارے رشتے میں کوئی عیب کوئی خامی نظر نہ آرہی تھی مگر وہ بچپن سے ہی ضدی واقع ہوئی تھی۔ ہر بات میں اپنی رائے کو فوقیت دینا اس کی شخصیت کا خاصہ رہا تھا۔ اور پھر جب اس نے ساری زندگی اسی مخصوص ڈگر پر چل کر بسر کی تھی اور اب زیست کا سب سے اہم معاملہ تھا تو اسے ہی یکسر فراموش کر دیا گیا تھا۔
یہ بھی سچ تھا کہ شاہ میر جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ، ویل سیٹلڈ، خوبرو اور وجیہہ جوان کی سنگت کے خواب تو ہر آنکھ دیکھ سکتی تھی۔ اور وہ خود بخود اس کا ہم سفر بن گیا تھا۔ یہ بھی اس کی قسمت کے بلند ستارہ ہونے کی بدولت تھا مگر وہ اپنی انا کی جنگ میں انا کا بت بنے سرد جذبات لیے بیٹھی تھی۔
کئی مرتبہ زویا کے ٹوکنے پر بھی وہ ذرا سا بھی مسکرا کر نہ دی تھی۔ بلکہ عجب نروٹھے پن کو چہرے پر طاری کیے تھی۔
''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' شاہ میر نے اس کے کان کے پاس آکر سرگوشی کی تھی۔
پھر اسی تقریب میں عین ایک مہینے بعد ان کی شادی کا اعلان کر دیا گیا۔ اور وہ ہونق بنی بیٹھی یہ ساری کارروائی ملاحظہ کر رہی تھی۔
''امی اتنی جلدی کس بات کی ہے؟'' تقریب کے بعد وہ سیدھی ماں کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔
''جلدی، کیوں کیا تم دودھ پیتی بچی ہو...... اور پھر ہم نے درست سوچا ہے، تم اور زویا دونوں کو اچھے وقت پر رخصت کر دیں گے تو ہماری فکریں بھی کم ہوں گی۔'' شازیہ بیگم نے اس کو الٹا ڈانٹ دیا تھا۔
پھر شادی کی تیاریوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اسے تو لحظہ بھر کے لیے بھی اختلافِ رائے کا حق نہ ملا تھا نہ ہی فرصت...... لگاتار مصروفیت کی بدولت اس نے کبھی آرام سے بیٹھ کر شاہ میر کے

لیے بھی نہ سوچا تھا۔ کئی مرتبہ ہاجرہ پھپھو کا چکر لگا تھا۔ وہ شاپنگ کے سلسلے میں اپنے بنگلے میں ہی رہائش پزیر تھیں۔ ہر مرتبہ جاتے وقت اسے خوب زور سے گلے لگاتی تھیں اور ڈھیروں ڈھیر دعائیں دے کر جاتیں......اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے ہاجرہ پھپھو کا چہرہ چمک رہا ہوتا تھا۔

☆☆☆

پھر ایک گلابی شام میں وہ رخصت ہو کر شاہ میر کی زندگی سجانے آ گئی تھی۔ اسے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا سارا عرصہ گزر بھی گیا تھا۔ اور آج وہ دن تھا جس کے خوف کے سائے تلے اس نے ہر رات بسر کی تھی۔

وہ رخصت ہو کر گاؤں ہی گئی تھی۔

سہاگ رات کے سپنے سجانے والی آنکھیں شاہ میر کی تھیں۔ اپنے عین سامنے سہاگن بنی درشہوار کو اس نے اِک گہری نگاہ ڈال کر دیکھا تھا......اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ از خود تو درشہوار کو دیوانہ وار چاہتا ہے۔ مگر درشہوار۔ وہ جس دن دل کے سچے جذبے سے اس کو پکارے گی، اسی دن وہ بھی اسے اپنائے گا۔

اسے اتنے عرصے میں اس کی سرد روی کا احساس ہو گیا تھا۔ جبکہ درشہوار اس کے ایک دم چلے جانے کے بعد تھوڑا سا پریشان اور حیران ہوئی تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ شاہ میر اس کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے دے رہا تھا۔ مگر یہاں تو الٹ ہی معاملہ ہوا تھا۔ اس نے نخوت سے اطراف کا جائزہ لیا۔

بے حد سادہ سا کمرا تھا۔ اور یہ کمرا جس میں اسے بٹھایا گیا تھا قدرے تنگ سا لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر اطراف کا جائزہ لیا۔

''اُف تو کیا اب یہاں رہنا ہوگا۔'' وہ کافی دیر شاہ میر کا انتظار کرتی رہی اور پھر تھک کر سو گئی تھی۔ اسے شاہ میر کے اس رویّے پر دکھ بھی ہو رہا تھا۔ نہ جانے اب وہ کس بات کا رعب جما رہا تھا۔ وہ دیر تک جاگتی رہی تھی۔ صبح اس کی آنکھ ہی نہیں کھل رہی تھی۔ ہاجرہ پھپھو نے اسے باقاعدہ جھنجوڑ کر جگایا تھا۔

''معاف کرنا بیٹا' یہ دیہات ہے یہاں یوں دھوپ چڑھے تک سوتے رہنا خاصا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر یہاں سب اہل محلہ اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سب نئی نویلی بہو کا دیدار کرنے کو بے تاب ہیں جبکہ تم تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہو۔''

وہ خاصی خجل ہوئی تھی۔ ایک تو نئی جگہ تھی پھر اتنا لمبا سفر طے کرنے کے بعد اسے شدید تھکان تھی۔ اب اسے آہستہ، آہستہ سب یاد آنے لگا تھا کہ وہ کہاں تھی اور کیوں تھی۔ اگر اسے یوں اپنے گھر میں کوئی بے وقت جگا دیتا تو وہ خوب واویلا کرتی مگر یہاں تو یہ سب بیکار تھا۔ وہ برا سا منہ بنا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''آؤ باہر کی جانب ہے غسل خانہ......تم کو میں کمرے کے پچھلی طرف سے لے جاتی ہوں۔ اس طرف تو خواتین جمع ہیں۔'' وہ ساس کے قدموں کی پیروی میں پیچھے چل دی تھی۔

پکی زمین پر شفافیت تھی۔ ہر شے صاف ستھری تھی۔ وہ صحن عبور کر کے آگے بڑھی تھی، ایک جانب کونے میں تھا غسل خانہ۔ وہ اندر آئی تو اسے بے تحاشا خوشی محسوس ہوئی تھی۔ سارے گھر کے برعکس غسل خانہ خاصا بڑا اور جدید تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ اس نے اسے سراہا اور خوشی محسوس کی تھی......نہا کر اس کی ساری سفری تھکان اتر گئی تھی۔ ہاجرہ بیگم نے اسے ایک خاصا وزنی کامدار سوٹ زیب تن کرنے کے لیے دیا تھا۔ جو اس نے نروٹھے پن سے لے لیا تھا۔ اسے اتنے بھاری بھرکم لباس کہاں پسند آتے تھے۔ مگر یہاں تو سسرال کی مجبوری کو دڑی تھی۔ اس نے خاموشی سے لباس پہن لیا تھا۔ پھر ہاجرہ کی معیت میں دو شوخ سی لڑکیاں آ گئی تھیں۔ اس کے نہ...... نہ کے باوجود ان دونوں لڑکیوں نے اسے باقاعدہ دلہن کا روپ دے ڈالا تھا۔ گہرا میک اپ، کانوں میں جھمکے، دونوں ہاتھوں میں بھر، بھر کے چوڑیاں لاد دی تھیں۔ اسے تو سانس لینا بھی دشوار ترین امر لگنے لگا تھا۔ پاؤں میں

جھانجریں بھی ڈالی تھیں۔ اس کے تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ مگر یہاں کسے پروا تھی۔ اور وہ جو اس کا مجازی خدا تھا جس کے نام کے ساتھ اس کا نام جڑا تھا۔ رات سے ہی غائب تھا۔ اس نے دل میں دکھ اور کرب کی لہریں بیدار ہوتی محسوس کی تھیں۔

''تو کیا اتنی سی محبت تھی شاہ میر، بس مجھ سے نکاح کرنا تھا۔'' ایک شکوہ تھا جو اس کے دل سے نکلا تھا۔

اسے سجا سنوار کر باہر لا کر خواتین کے سامنے بٹھا دیا گیا تھا۔ ساری خواتین... آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ان کی عقابی نظریں درشہوار کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ہر جانب سے ستائشی جملے اس کے کانوں میں اتر رہے تھے۔

''ماشاءاللہ، بڑی سوہنی بہولائی ہو۔''

''ارے کیا خوب جوڑی ہے شاہ میر اور دھی رانی کی۔ واہ کمال بہو ہے۔'' وہ گھنٹا بھر یوں ہی بت بنی بیٹھی رہی تھی۔ خواتین نے جب جی بھر کر اس پر تبصرے کر ڈالے، اس کا نقشہ پیار کر کے بگاڑ دیا تو پھر یہ ہجوم چھٹنے لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوب پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ یہ اچھا طریقہ تھا، نئی دلہن کے سواگت کا۔ اس نے دل میں سوچا، جب یہاں سے فراغت ہوئی تو اسے وہ دشمنِ جان نظر آ گیا۔ خوب صورت کڑھائی والے کرتے شلوار میں ملبوس وہ بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس سے نظریں ٹکرائیں تو وہ خفگی کے اظہار کے طور پر نظریں چرا گئی تھی۔ وہ اس کے اس انداز پر زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔

''ہونہہ، تو دلہن صاحبہ کا موڈ خراب ہے۔'' کمرے میں آتے ہی اس نے پہلا سوال داغا تھا۔

''ارے میرا کیوں موڈ خراب ہونے لگا، میں تو بے حد خوش ہوں، میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔'' وہ اسے محض یہ جتانے کے لیے کہ وہ اس کے رات کو یوں غائب ہو جانے پر اور سرے سے فراموش کر دینے سے ہرگز بھی خفا نہیں ہے، نہ ہی وہ دل گرفتگی کا شکار ہو رہی ہے۔ مگر اس کی خوشی کے اظہار کو شاہ میر نے دوسرے ہی معنوں میں لیا تھا۔ تبھی ہنس دیا تھا۔

''اچھا واقعی، تم بھی مجھ سے شادی کر کے خوشی سے بے قابو ہو رہی ہو...... واقعی......؟''

شاہ میر نے اس کو قدرے قریب کر کے کہا تو وہ بری طرح گھبرا گئی...... شاہ میر سے اسے اس قدر جسارت کی توقع نہ تھی۔ دل میں خاصی مطمئن تھی مگر شاہ میر کوئی غیر تو نہیں تھا۔ اس کا مجازی خدا تھا۔ اس کا استحقاق جتانا جائز تھا۔

''دیکھیں مجھ سے زیادہ بے تکلفی کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ ڈوب رہا تھا اور شاہ میر کا دل اس کے انداز پر اس کی نگاہوں میں ڈوبنے لگا تھا۔

''مائی سوئٹ ہارٹ پہلے ناشتا کر لیتے ہیں اور تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے ہمارا شاندار ولیمہ آج نہیں بلکہ کل ہوگا اور وہ بھی شہر میں......'' شاہ میر کی بات پر اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ اس کا دل واقعی یہاں نہیں لگ رہا تھا۔

''ویسے دلہن بنے اس روپ میں تم غضب ڈھا رہی ہو۔'' شاہ میر نے اس کے پاس آ کر سرگوشی کی تو اس کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔

''تم جانتی ہو جب تم بہت چھوٹی سی تھیں اور پہلی مرتبہ ہمارے اس آنگن میں آئی تھی۔ تبھی میں نے دل میں ٹھان لی تھی۔ اس سنہرے بالوں والی گڑیا کو اس گھر میں لا کر رہوں گا۔ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم چند دن یہاں بھی آ کر رہا کریں گے۔ یہاں میری جڑیں ہیں، ویسے تو تم مالکن ہو اس گھر کی بھی اور وہاں شہر میں بھی۔ ویسے اصل مالکن تو میرے دل کی ہو۔'' شاہ میر کا لہجہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر بھاری ہو رہا تھا۔ شرگیں مسکان سجائے درشہوار نظریں جھکا گئی تھی۔ اس کے شرمانے کا یہ روپ اس بات کا غماز تھا کہ دل میں وہ بھی شاہ میر کی چاہت پر لبیک کہہ گئی ہے۔ تبھی تو اس نے ہولے سے شاہ میر کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔

امرت

شیریں حیدر

قسط 8

تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک . . . کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی . . . اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ . . . یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ و خم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......





کے۔جی کلاس میں، اپنے پہلے دن میں باقاعدہ مونٹیسوری کے بچوں کو مس کر رہی تھی، سات آٹھ ماہ ان بچوں کے ساتھ گزار چکی تھی اور اب نئے سرے سے اس نئی کلاس کے بچوں کے نام یاد کرنا، خود کو ان کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا...... مشکل کام لگ رہا تھا۔ میرے اس نئی پوزیشن کو قبول کرتے ہی مجھے اس کلاس کا سلیبس اور کتابوں کا ایک سیٹ دے دیا گیا تھا تاکہ میں تین چار ہفتوں میں نئی کلاس کے لیے تیار ہو جاؤں۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے سلیبس تو ایسا مشکل نہ تھا، اصل مشکل یہ تھی کہ ان ننھے، ننھے بچوں کو ایسی چھوٹی، چھوٹی باتیں کیسے سکھائی جائیں...... آسان سہی مگر تعلیمی برس کے آخر پر ہونے والے ان کی زندگی کے پہلے امتحان کے لیے انہیں تیار کرنا تھا، ان کی کارگردگی کو جانچ کر اُن کی سالانہ رپورٹیں بنانا تھیں، اگرچہ پرانی ٹیچر نے اس سلسلے میں ان کی رپورٹوں کا اسکیچ بنا دیا تھا اور مجھے ان کو ہی اپنے طریقے اور الفاظ سے مرتب کرنا تھا۔

''پریشان تو نہیں ہو؟'' اس صبح کی اسمبلی کے بعد پرنسپل نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں!'' اپنی ہتھیلیوں پر پسینے کے باوجود میں نے لہجے کو ٹوٹنے نہ دیا تھا۔

''کوئی مسئلہ؟'' انہوں نے اگلا سوال کیا۔

''اور تو کچھ نہیں...... بس دو دن کے بعد والدین' بچوں کے امتحانات کا سلیبس لینے کے لیے آئیں گے...... ان نئے والدین کو فیس کرنا!''

''تم اس کی فکر نہ کرو...... ان معاملات کی اسکول کو تم سے زیادہ فکر ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ابھی تم بچوں کو یہ نہ بتانا کہ تم ان کی نئی ٹیچر ہو...... یہ میٹنگ گزرنے دو، اس روز کمیلا خود اردو کی ٹیچر کے ساتھ کے۔جی کلاس میں ہوں گی اور تم اپنی پرانی کلاس میں......'' وہ رکیں، میں انہیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ ''والدین کو ہم اس میٹنگ میں، اس تبدیلی سے بے خبر رکھیں گے ورنہ وہ بہت شور مچاتے ہیں اور اسکول کا نام خراب ہوگا کہ عین امتحانات سے قبل ٹیچر تبدیل کر دی۔''

''لیکن انہیں علم تو ہو جائے گا ناں ایک دو روز کے بعد سہی۔''

''یہیں تو تمہارا کمال نظر آئے گا پیاری کہ تم چند دن میں، کس طرح ان بچوں کو اپنے ساتھ اتنا مانوس کر لو گی کہ وہ گھر جا کر بخوشی اپنے والدین کو بتائیں کہ ان کی نئی ٹیچر آئی ہے اور وہ پہلی ٹیچر سے بھی اچھی ہے...... صرف اسی صورت میں والدین تبدیلی کو قبول کرتے ہیں۔''

''میں اتنی جلدی ان کی پرانی ٹیچر سے بہتر کیسے ہو سکتی ہوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کسی حد تک تو تم ہو...... اسی لیے میری نظرِ انتخاب نے تمہارا چناؤ کیا، شکل صورت میں اور لباس میں۔'' انہوں نے کہا۔ کیا یہی وجہ تھی ان کے میرے انتخاب کی، کیا صورت اور لباس ہی انسان کی شخصیت کی اچھائی کے عکاس ہیں؟ انہیں علم بھی نہ تھا کہ شکل تو بے شک اللہ کی عطا کردہ تھی مگر وہ سارے لباس میرے اپنے نہ تھے، کسی نہ کسی کے بخشش شدہ یا اترن تھے، جو رقم میرے شوہر کو اپنی تنخواہ کے طور پر ملتی تھی وہ اس کی اپنی عیاشیوں کے لیے بھی ناکافی تھی۔ اس کی ماں تو چوری چھپے اس کی جیبیں بھرتی رہتی مگر میرے پاس یہی آمدن تھی جو اسکول سے ہوتی تھی، لگ بھگ اتنی ہی تنخواہ اس گھر کے ملازمین کی تھی جہاں میری حیثیت دنیا کی نظر میں مالکن کی تھی۔'' والدین' اسکول اور ٹیچرز کی مجبوریوں کی کہاں پروا کرتے ہیں، وہ تو شاید انہیں نارمل انسان بھی نہیں سمجھتے جن کی اپنی مشکلات اور مجبوریاں بھی ہو سکتی ہیں!''

''جی!'' میں نے مختصراً کہا۔ ''میں جا سکتی ہوں اب؟'' انہوں نے اثبات میں سر ہلایا کیونکہ ان کے فون پر

کوئی کال آگئی تھی۔ کلاس کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ صرف والدین ہی نہیں، دنیا میں اور بھی بہت لوگ ہیں جو دوسروں کو نارمل انسان نہیں سمجھتے کہ ان کے بھی کوئی جذبات ہوتے ہیں، احساسات ہوتے ہیں، ضروریات اور خواہشات ہوتی ہیں اور مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

''تم کیا چیز ہو......'' وہ سن کر چیخی تھی۔ ''اتنا کچھ ہوگیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟''

''کیا بتاتی تمہیں؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا، دن بھر فرصت ہی نہ ملی تھی اب چھٹی کے بعد وہ مجھے لیے ہوئے کیفے ٹیریا میں آگئی تھی۔ ''اور تمہیں علم ہو بھی جاتا تو کیا تم مجھے ملنے کو آجاتیں؟''

''شاید آ بھی جاتی۔'' اس نے میرا سرد ہاتھ پکڑا۔ ''دوست ہوں تمہاری۔''

''اسی لیے تو بتایا نہیں......تم آ جاتیں!'' میں نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ مما کو ہر اس چیز سے کتنی چڑ ہے، جو میری ہے۔''

''ان کا بیٹا بھی تو تمہارا ہی ہے ناں؟'' اس نے مذاقاً کہا۔

''وہ......میرا؟'' میں نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میں تو اس کی ہوگئی سارہ مگر وہ میرا نہ ہوسکا۔'' میرے دل کا کرب ہونٹوں تک آیا مگر ادا نہ ہوسکا۔

''اچھا چلو بتاؤ اس کے بعد کیا ہوگا، کب جاؤ گی اپنی مما کے ساتھ گائنا کالوجسٹ کے پاس؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ خود ہی اپائنٹمنٹ لیں گی۔''

''اس بارے میں سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، میں اندازہ کرسکتی ہوں کہ تمہاری کیا کیفیت ہوگی۔''

''میں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے سارہ...... میں ان معاملات کی فکر نہیں کرتی جو صرف اللہ تعالیٰ حل کرسکتا ہے، ہمیں ان پر کوئی اختیار نہیں ہے۔''

''اللہ نے ہمیں دماغ اور عقل نام کی چیزیں اسی لیے دی ہیں پیاری......ان کا استعمال کیا کرو ورنہ ان کو زنگ لگ جاتا ہے۔''

''مجھے زنگ لگی ہوئی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔'' میں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

''تم ہر بات کو یونہی مذاق میں ٹال دیا کرو۔'' اس نے منہ بسورا۔

''تو اور کیا کروں؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''تم کوئی بہانہ کرکے چند دن کے لیے گاؤں چلی جاؤ......کم از کم یہ بلا تو سر سے ٹلے گی۔''

''سر سے یہ بلا کسی طرح ٹلنے والی نہیں ہے پیاری!'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''کل نہیں تو پرسوں مجھے اس کا سامنا کرنا ہے اور وہ جتنی جلد ہوسکے اتنا ہی اچھا ہے۔'' جانتی تھی کہ گاؤں جانے کے اس کے مشورے پر عمل کرتی تو انہی قدموں پر لوٹا دی جاتی۔

''انہیں کوئی ذہنی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''انہیں خود تو کوئی ذہنی مسئلہ نہیں ہے مگر وہ دوسروں کو ذہنی مریض بنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔''

''ویسے انہیں کوئی میرے جیسی لڑکی بہو کے طور پر ملتی ناں تو اُن کی طبیعت صاف ہوجاتی۔'' اس نے کہا تو میری ہنسی نکل گئی۔

''انہیں معلوم تھا کہ ان کے بیٹے کے ساتھ کس طرح کی لڑکی چل سکتی تھی۔''

''ان کا بیٹا اس قابل تو نہ تھا مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے تم مل گئیں......''

''اور وہ سوچتا ہے کہ میں خوش قسمت ہوں جسے وہ مل گیا ہے۔''
''ہائے رے خوش فہمی!'' اس نے ہنس کر کہا۔
''تمہیں کیا لگتا ہے..... وہ تمہیں اس سے چھٹکارا پانے کو کہیں گی؟''
''وہ اتنی unpredictable ہیں کہ مجھے علم ہی نہیں، اگلے لمحے وہ کیا کہہ دیں گی۔ ان کے مزاج کی سب تبدیلیاں میرے لیے ہیں، باقی سب کے ساتھ وہ بالکل نارمل ہوتی ہیں اور ان سب کے سامنے بھی وہ مجھ سے ایسا برتاؤ کرتی ہیں کہ کسی کو شک ہی نہیں ہوتا کہ ان کا میرے ساتھ اصل سلوک کیا ہے..... اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھار وہ مجھ سے بھی اتنے اچھے طریقے سے بات کرتی ہیں کہ مجھے اُن کی ذہنی کیفیت پر شک ہونے لگتا ہے۔'' میں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

''اندر کی خبریں، ہر خبر پر نظر!'' تمنا کا تجسس پیدا کرنے کا مخصوص انداز۔
''اب سنا بھی دو.....'' میں اس کی اس طرح کی باتوں سے بے چین ہو جاتی تھی۔
''پہلی خبر.....'' اس نے خبریں شروع کیں۔ ''امو جان اور ابو جان کے مابین اس بات پر مذاکرہ چل رہا ہے کہ شامیر کے لیے وہ رشتے کی بات کہاں چلائیں، امو جان کو تحریم پسند ہے اور ابو جان کو ثنا جبکہ کسی ذریعے سے انہیں علم ہوا ہے کہ حسنہ کے لیے چاچو شامیر میں دلچسپی رکھتے ہیں۔''
''کیا؟ وہ نک چڑھی حسنہ..... اسے ہم شامیر کے لیے پسند کریں گے؟ اور اس سے بڑھ کر اہم یہ کہ کہاں جمال چاچو کے بچے، ان کے معیار اور ان کا گھر اور کہاں ہم سادہ دل دیہاتی لوگ.....'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''ہرگز نہیں..... اور یہ امو جان کو کیا ہو گیا ہے، پہلے ایک گھر سے بیٹی لی اور وہاں پر اپنی ایک بیٹی کا رشتہ دیا، اب دوسری بیٹی کے لیے بھی یہی چاہتی ہیں؟''
''کون سی دوسری بیٹی کے لیے کون سا رشتہ؟'' اس نے جان بوجھ کر سوال کیا تھا۔
''تم جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' میں لجا گئی۔
''میں کچھ نہیں جانتی.....'' اس نے جان بوجھ کر مجھے چڑانے کو کہا۔ ''تم اپنے منہ سے بتاؤ۔'' وہ اینٹھ گئی۔
''میرا مطلب ہے کہ تحریم، کامل کی بہن ہے۔'' میں نے جی کڑا کر کہا۔
''تو تمہارا رشتہ کامل کے ساتھ طے ہو گیا کیا؟'' وہ ہنسی۔
''ہو جائے گا!'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔
''ویسے تمہیں علم تو ہوگا کہ گل پھپو نے کامل کے رشتے کی بات کی ہے ابو جان سے۔'' اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''سرمد بھائی کے لیے ابو جان نے بڑی پھپو سے کہا ہے کہ رانی کا رشتہ لیں لیکن رانی سے زیادہ پھپو ثنا کے لیے دلچسپی رکھتی ہیں، شاید سرمد بھائی ایسا چاہتے ہوں مگر پھپو ایک شرط پر اس بات پر راضی ہوں گی۔''
''کس شرط پر؟'' میں نے فوراً پوچھا، خیال یہی آیا کہ رانی کے گھر سے تو وٹے سٹے کا بھی کوئی امکان نہ تھا اور پھر طوبیٰ تو ابھی چھوٹی تھی، اس کے لیے پھپو نے ابھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ ''بتاؤ ناں..... کس شرط پر۔'' میں نے اس کے چہرے پر جانے کیا دیکھا تھا کہ میں بے چین ہو گئی۔
''اتنی زیادہ اون لے آئیں تم امرت..... اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے گلابی رنگ بھی لے لیا حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ نیوٹرل سے رنگ لانا۔'' امو جان نے اس وقت انٹری دی جب میں تمنا کی طرف سے کسی اہم خبر کا انتظار کر رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں اموجان......'' میں نے کہا۔ ''گلابی اون مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں رہ نہ سکی۔''

''دیکھو میں نے تمہارے لوٹنے تک سلائیاں بھی ڈھونڈ کر نکال لی ہیں۔'' وہ وہیں بیٹھ گئیں۔ ''چلو میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ٹوپی کس طرح شروع کرتے ہیں...... تمنا تم چائے تو بنا لاؤ میرے لیے۔'' تمنا ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی اور میں توجہ سے انہیں سلائی پر پھندے چڑھاتے ہوئے دیکھنے اور سیکھنے لگی۔ ''گلابی رنگ سے میں چھوٹا سا سویٹر بنا لیتی ہوں، تم یہ انگوری رنگ والا شروع کرلو۔''

''گویا آپ کو لگتا ہے کہ بیٹی ہوگی؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جو بھی ہو، اللہ کے فضل سے صحت مند اور نارمل ہو، سب سے اہم بات یہی ہے۔'' مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اس بارے میں مثبت رائے رکھتی تھیں اور اون سلائیوں میں مصروف ہو کر وہ اس اداسی سے چھٹکارا پالیں گی جو شامیر کے جانے سے ان پر طاری ہو گئی تھی۔



شامیر کے کاکول جانے کے دو ماہ کے بعد پہلی بار اموجان اور ابوجان اس سے ملاقات کرنے کے لیے گئے۔ اموجان نے بتایا کہ پہلی نظر میں اپنے بیٹے کو پہچان بھی نہ سکی تھیں، اسے انہوں نے جنم دیا تھا، پروان چڑھایا تھا، کئی سال تک دن رات اس کا چہرہ دیکھا تھا، پھر بھی وہ چند ہفتوں میں اتنا تبدیل ہو گیا تھا......

وسط دسمبر کے اس سرد دن میں، ایبٹ آباد کا آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا جو کسی بھی وقت برسنے کو بے تاب تھا۔ اکیڈمی کے کیفے ٹیریا کے سامنے وسیع لان میں ایک میلے کا سا سماں تھا۔ تمام گاڑیوں کو پریڈ گراؤنڈ کے قریب پارک کروایا گیا تھا۔ اس لیے وہ اس لان کے قریب گاڑی سے اتر گئے اور ڈرائیور کو گاڑی پارکنگ میں لے جانے کو کہا۔ وہ تو سوچے ہوئے تھیں کہ وہ گاڑی سے نکلیں گی تو وہ ان کی طرف کا دروازہ کھولے گا اور ان کے باہر نکلتے ہی ان سے لپٹ جائے گا۔ گاڑی سے نکل کر اس وسیع میدان تک آتے آتے ان کی نظریں شامیر کو ہی تلاش کر رہی تھیں۔ پاس سے گزرنے والے سیکڑوں لڑکے انہیں ایک جیسے لگے تھے' وہ اس کے انتظار میں کھڑی تھیں اور پاس سے گزرنے والے لڑکوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں کہ وہ کس طرح کے لڑکے تھے۔ اس دوران ان کا اپنا شامیر بھی ان سے آ کر لپٹ گیا تو وہ اسے خود سے علیحدہ کر کے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ اسے وہ پہچان ہی نہ سکی تھیں، کتنا مختلف لگ تھا وہ ان کو، وہ ان سے مل کر باپ سے ملا، انہوں نے پھر اسے ساتھ لپٹا لیا، اس کا ماتھا چوما، اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

اس کے ساتھ بیٹھ کر وہاں انہوں نے کھانا کھایا تھا، جہاں کھلے سے میدان میں ٹینٹ لگا کر چھوٹے چھوٹے انکلوژر بنا کر ان میں کرسیاں اور میز رکھ کر انتظام کیا گیا تھا۔ وہ اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے دوسرے کیڈٹوں کو بھی دیکھ رہی تھیں اور حیران ہو رہی تھیں کہ سب رنگروٹ ایک جیسی شکلوں کے لگ رہے تھے۔ والدین کو وہ حیرت سے دیکھ رہی تھیں، بہت سی مائیں ایسی بھی تھیں جو اپنے بیٹوں کے ساتھ ہنس، ہنس کر باتیں کر رہی تھیں، کچھ ملاقاتی باپ اور بھائی اپنے حلیوں سے ہی فوجی لگ رہے تھے، یعنی ان کے خاندان میں ان سے پہلے ہی کچھ فوج میں تھے۔ ان کے ہاں سے تو شامیر پہلا فوجی بنا تھا، خاکی وردی اس کے جسم کا حصہ بنی تھی۔ اس وقت تو سارے رنگروٹ گرے رنگ کی پینٹوں اور گہرے نیلے کوٹوں میں ملبوس تھے مگر شامیر نے انہیں اپنی ایک تصویر دی تھی جو کہ خاکی وردی میں تھی۔ اس تصویر میں وہ بہت دبلا لگ رہا تھا، کمزور تو وہ انہیں اس وقت بھی لگا تھا مگر اچھی تراش کے نیلے کوٹ نے اس کی شخصیت کو ایک روپ عطا کر دیا تھا۔

ابوجان تو نہ صرف شامیر سے ہنس، ہنس کر باتیں کر رہے تھے بلکہ پاس سے گزرنے والے اس کے ساتھ کے نوجوان جب رک کر انہیں سلام کرتے، شامیر ان کا تعارف اپنے دوستوں کی حیثیت سے کرواتا تو وہ اٹھ کر ان سے

معانقہ کرتے، اپنے بیٹے کے دوست بھی انہیں اپنے بیٹے جیسے ہی لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد شامیر بھی اٹھ کر گیا اور اپنے دوستوں کے والدین کو سلام دعا کر کے واپس آ گیا۔ اموجان کو اس کی صرف وضع قطع ہی نہیں بلکہ اس کی چال ڈھال بھی مختلف لگ رہی تھی، وہ جیسے اپنی عمر سے کئی سال بڑا ہو گیا تھا۔

کھانے کے دوران شامیر سے باتیں کرتے ہوئے ان کی آنکھیں بار، بارڈبڈبا جاتیں اور وہ اپنا رخ پھیر کر انہیں چھپاتیں، مبادا کہ وہ دیکھ لے جو اس وقت کتنا خوش تھا، ragging کے قصے سناتے ہوئے اس کے چہرے پر کہیں دکھ تھا نہ درد...... اس نے ایک بار بھی ماں سے نہ کہا تھا کہ وہ انہیں مس کرتا ہے، انہوں نے خود ہی پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا۔ ''سچ میں امو، اس کا وقت ہی نہیں ملتا، تھکے ہارے بستر پر پڑتے ہیں تو خواب دیکھنے کا وقت بھی نہیں ملتا اور نیند اس خوف سے فوراً آ جاتی ہے کہ جانے کب نصف شب میں رگڑے کے لیے اٹھا دیا جائے گا۔'' اس کے ایسے جواب سے انہوں نے آنکھوں میں اتر آنے والے اپنے آنسوؤں کو حلق سے گھونٹ بھر کر اندر ہی اندر اتار لیا۔ اس سے کہا بھی نہیں کہ وہ تو دن رات اس کی یاد کی مالا جپتی ہیں، اس کی یاد میں ہاتھ کا نوالہ بھی بسا اوقات منہ تک نہیں جا پاتا کہ جانے وہ کیا کھا رہا ہوگا، کھا بھی رہا ہوگا کہ نہیں۔

''آپ مس کرتی ہیں مجھے؟'' اس نے ان کے کندھوں کے گرد بازو حمائل کر کے سوال کیا۔ اتنی شدید سردی کے باوجود انہوں نے اس کے لمس کو اپنے وجود میں حرارت کی طرح اترتا محسوس کیا۔ ''آپ کے پاس تو ہیں ناں سب، ابوجان، کبیر بھائی، بھابی، تمنا اور امرت! کیا حال ہے سب کا؟'' اس نے ایک فقرے میں انہیں اپنے متبادل بھی بتا دیے اور ان کی خیریت بھی دریافت کی۔

''ٹھیک ہیں سب......'' انہوں نے ہولے سے کہا۔ ''سب کچھ ہے میرے پیارے مگر کوئی چیز تمہاری کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔''

''جانتا ہوں امو...... میں بھی بہت مس کرتا ہوں آپ کے ہاتھ کے کھانوں کو جب میس میں بدمزہ کھانے ملتے ہیں اور کئی دفعہ تو وہ بدمزہ کھانا بھی نہیں ملتا۔'' اس نے کہا تو ان کی آنکھیں اس کے سامنے ہی لبریز ہو گئیں۔ گویا وہ انہیں صرف کھانے کے وقت مس کرتا تھا، اس سوچ نے انہیں اور بھی پژمردہ کر دیا۔ ''روئیں تو نہیں اموجان! بہادر بنیں، فوجیوں کی مائیں بزدل نہیں ہوتیں، جو مائیں اپنے پلے پلائے بیٹے مادرِ وطن کے تحفظ کے لیے دے دیتی ہیں ان سے بڑا جگر کسی کا نہیں ہوتا۔'' کیسی بڑی، بڑی باتیں کر رہا تھا وہ۔

اس سے پہلی ملاقات کر کے وہ واپس لوٹیں تو کئی دن ڈسٹرب رہی تھیں۔ اس ملاقات کا احوال سناتے ہوئے کئی بار اُن کی آنکھیں سمندر بہانے لگیں، ہم نے بھی انہیں تسلی دی۔ فاطمہ کی حالت کے باعث ہم گھر پر ہی رکے تھے اور اموجان اور ابوجان ہی اس سے ملنے کے لیے گئے تھے۔ کبیر بھائی تو جانا چاہتے تھے مگر اموجان کا خیال تھا کہ اس وقت فاطمہ کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا کہ کسی بھی وقت کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ اس سے اگلے ہفتے ہی تو اسے لاہور چلے جانا تھا، اس دن اس کا ڈاکٹر سے آخری بار چیک اپ ہوتا اور پھر کسی بھی وقت خبر آ سکتی تھی۔

☆☆☆

بڑی پھپھو نے سرمد بھائی کے لیے رانیہ کا رشتہ مانگا تھا...... یہ بالکل ویسا ہی ہوا تھا جیسا کہ ابوجان نے ان سے کہا تھا۔ حالانکہ سنا تھا کہ وہ ثنا کے لیے زیادہ خواہش مند تھیں اور ہم تو یہی سمجھے کہ ایسی خواہش سرمد بھائی ہی کی ہوگی مگر معلوم ہوا کہ سرمد بھائی نے ہی پھپھو سے رانیہ کے لیے کہا تھا۔

رانیہ عمر میں ثنا سے بڑی بھی تھی اور پھر اس میں گاؤں کے ماحول میں رہتے ہوئے ایک بڑے خاندان کے نظام کو چلانے کی اہلیت بھی ہم سب سے زیادہ تھی۔ ہم بھی گاؤں سے تھے مگر شہر کی تعلیم اور ماحول نے ہم پر گہرے

اثرات مرتب کیے تھے کہ ہم گاؤں کے رسوم و رواج کو بعینہ تسلیم نہ کرتے تھے، بہت سی ایسی رسمیں تھیں جن پر ہمیں اعتراض ہوتا اور ہم اموجان سے بحث کرتے تھے۔ ایسا کیوں ہے ویسا کیوں...... یوں ہونا چاہیے اور دوں نہیں۔

گاؤں میں یہ رواج بھی نہیں ہوتا کہ کوئی کسی کے گھر میں اطلاع دے کر یا یہ چیک کر کے جائے کہ کوئی گھر پر ہے بھی کہ نہیں، اگر ہے تو اس کی اپنی کوئی مصروفیت تو نہیں۔ گاؤں کے ہر گھر کا گیٹ صبح سویرے وا کر دیا جاتا تھا، اس کا مطلب یہ ہوتا...... کہ جو چاہے اس دروازے سے اندر آ سکتا ہے۔ بند دروازے غرور کی نشانی سمجھے جاتے تھے اور تو اور گداگر عورتیں بھی گیٹ سے داخل ہو کر برآمدوں کو عبور کر کے اندرونی دالان تک بے دھڑک چلی آتی تھیں البتہ گداگر مردوں کو چوکیدار گیٹ پر روک کر اندر ان کے لیے بھیک لینے آتے تھے۔ دور نزدیک کے رشتے دار تو یوں ہی جس وقت جی چاہتا منہ اٹھائے، بغیر اطلاع اور مناسب یا نامناسب وقت دیکھے، سیدھے اندرونی دالان تک آ جاتے تھے۔ اموجان کم پڑھی لکھی سہی مگر انہوں نے اپنے لیے زندگی گزارنے کے جو اصول وضع کر رکھے تھے اور ان کا اطلاق خود اور اپنی اولادوں پر کر رکھا تھا کہ کہیں بغیر اطلاع کے نہ جاتیں، گیٹ کھلا بھی ہوتا تو ہمیشہ باہر رک کر اس وقت تک انتظار کرتیں کہ جب تک اندر سے کوئی باہر آ کر انہیں اندر آنے کو نہ کہے۔

جب ہم اموجان سے یہ کہتے کہ انہیں بھی لوگوں سے کہنا چاہیے کہ وہ اسی طرح ان کے گھر میں اجازت لے کر اور اطلاع دے کر آیا کریں تو وہ کہتیں۔ ''عمل کر کے سکھانا بہتر ہے نہ کہ منہ سے بول کر، جو لوگ دوسرے کے عمل سے نہیں سیکھتے کہ اس کا برتاؤ کیسا ہے اور اس کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ کرنا چاہیے انہیں آپ کسی اور زبان میں نہیں سکھا سکتے۔''

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اموجان!'' ہم چڑ کر کہتیں تو وہ ہنس دیتیں۔ ''گیٹ ہی بند کروا دیا کریں کم از کم! تھوڑا سا تو مارجن مل جاتا ہے......''

''ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ بند دروازوں کی وجہ سے گھروں میں بے برکتی ہوتی ہے...... اور بند دروازوں سے فرشتے بھی واپس لوٹ جاتے ہیں جو ہمارے گھر کا رزق لے کر آتے ہیں۔''

''رئیلی اموجان!'' میں ہنسی۔ ''آپ یقین رکھتی ہیں اس بات پر کہ فرشتوں کو گھروں میں آنے کے لیے دروازے اور گیٹ کھلے چاہئیں...کیونکہ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ہمارے رزق کے ٹرے اٹھا رکھے ہوتے ہیں؟'' تمنا کا ہنس، ہنس کر برا حال تھا۔

''ایسی بھی جاہل نہیں ہوں میں، بس ایک بات بتا رہی تھی جیسا کہ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے......'' انہوں نے ناراضی سے کہا۔ ''اصل میں یہ سب باتیں علامتی ہوتی ہیں...... کھلے اور بند دروازے، کھلے دروازے کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں کو اپنے گھر میں خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔'' ان کی ناراضی جس مقام پر شروع ہوتی تھی اس سے آگے ہم ان سے بحث نہ کرتے مگر انہیں یہ فکر ضرور ستاتی تھی کہ جانے ہم کل کلاں کو لوگوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کریں گے کہ ہم سے بن بلائے مہمان تک تو برداشت نہ ہوتے تھے۔



گھر میں اتنی سویرے غیر معمولی حرکت اور دبے، دبے شور کی آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ تمنا اپنے پلنگ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے کوئی چیز اس کے خوابوں سے بیدار نہ کرتی تھی، تمنا اقبال چچا کے ہاں منتقل ہو چکی تھی کیونکہ اب وہی اس کا گھر تھا۔ وہ کل ہی ہمارے پاس آئی تھی اور ہم رات دیر تک جاگ کر باتیں کرتی رہی تھیں، شاید اسی لیے اس کی آنکھ نہ کھلی تھی جبکہ میری نیند بہت ہلکی تھی۔ میں نے اسے ہولے سے پکارا، میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، جانے کیا ہوا تھا، مجھے دادی جان کی وفات کا دن یاد آ گیا...... ایسا ہی دبا، دبا شور تھا، میں نے بستر چھوڑا، غسل خانے میں جا کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور لباس کی شکنیں درست کرتی ہوئی باہر نکلی۔ آوازیں کبیر

بھائی کے کمرے کی طرف سے آ رہی تھیں، ملازمائیں تیزی سے وہاں جا اور آ رہی تھیں۔ میری ٹانگیں لرزنے لگیں، مشکل سے میں اس کمرے کے دروازے تک پہنچی۔

''آپ باہر ہی رکیں بیٹا!'' ایک ملازمہ نے مجھ سے کہا۔

''خیریت ہے ناں ماسی جی؟'' میں نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''سب خیریت ہے...... بہو کی طبیعت ناساز ہے۔'' انہوں نے جلدی سے جواب دیا۔

''کبیر بھائی کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ایمبولینس کا پتا کرنے گئے ہیں، شاید بہو کو شہر لے کر جانا پڑے۔'' انہوں نے جواب دیا اور اندر غائب ہوگئیں۔

''یا اللہ...... کرم کرنا، فاطمہ اور اس کے بچے کو خیر و عافیت سے رکھنا!'' دل سے دعائیں کرتے ہوئے میں نے واپس کمرے میں آ کر تمنا کو جگایا اور خود ناشتے کے لیے چل دی۔ بہ مشکل چائے کا ایک کپ زہر مار کیا اور اس تمام وقت میں پریشانی میں مبتلا رہی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے واپس کمرے میں آ کر مصلیٰ بچھا کر نوافل پڑھنا شروع کر دیے، تمنا نے مشکل سے بستر چھوڑا اور غسل خانے میں گھس گئی۔

باہر ایمبولینس کی آواز آئی تو میں نے رکعت پوری کر کے سلام پھیرا، فاطمہ اور اس کے بچے کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کی اور مصلیٰ سمیٹ کر باہر نکلی۔ فاطمہ کے کمرے کے باہر نقل و حرکت تیزی سے جاری و ساری تھی، کبیر بھائی بھی وہیں کھڑے نظر آئے تو میں ان کے پاس جا کھڑی ہوئی...... فاطمہ کی خیریت دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ فجر کے وقت وہ جاگی تو اس کا پاؤں فرش پر بچھے قالین سے الجھ گیا اور وہ لڑکھڑا کر گر گئی جس کے باعث اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی، میں نے دل میں ایک درد کی لہر کو اٹھتے ہوئے محسوس کیا۔ کبیر بھائی کے چہرے سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی، وہ بہادر بننے کی کوشش میں اپنے جذبات پر ضبط کا بند باندھے ہوئے تھے...... نیم بے ہوش سی فاطمہ کو چار لوگوں نے اسٹریچر پر ڈال کر اٹھا رکھا تھا، اسے ایمبولینس میں ڈالا گیا اور ساتھ ہی امو جان اور کبیر بھائی ایمبولینس میں سوار ہوئے......

''گھر کا دھیان رکھنا بیٹا!'' کہہ کر امو جان بیٹھیں تو ایمبولینس روانہ ہوگئی۔ جس وقت تمنا شاور لے کر باہر نکلی اس وقت تک ایمبولینس کی گرد بھی بیٹھ چکی تھی مگر میں برآمدے کے ستون کے سہارے جوں کی توں کھڑی تھی۔

''سب خیریت ہے ناں امرت؟'' تمنا نے سوال کیا۔

''شاید نہیں میری پیاری......'' میں نے مختصراً کہا، میری نظر کے سامنے فاطمہ کا پیلا پھٹک چہرہ اور اس کے لہو سے لال ہوتی ہوئی چادر ہی نہ ہٹ رہی تھی، میں پھر نوافل پڑھنے چل دی۔ ''اپنا ناشتا کر لو تمنا اور فاطمہ اور کبیر بھائی کا کمرا صاف کروا کے لاک کر دو۔''



امو جان اندر ہی اندر گھل رہی تھیں، کتنے چاؤ سے انہوں نے وہ ننھے ننھے سے سویٹر، ٹوپیاں اور موزے بُنے تھے۔ چشمِ تصور میں وہ ایک گل تھوتھنے سے بچے کو وہ سب پہنے ہوئے دیکھتی تھیں۔ ان کے خاندان کی اگلی نسل کا پہلا چراغ جو تاریک راہوں کا مسافر بن گیا...... ہماری کچھ دعائیں مستجاب ہوئیں اور کچھ نہیں۔ فاطمہ نے زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی جو اس نے اپنے لیے تو جیت لی مگر جو متاع تھی وہ کھو بیٹھی، ایک مقام اس طرح کی جنگ میں وہ آتا ہے جب یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اہم کون ہے......

دنیا میں کئی رشتوں کی ڈور سے بندھا ہوا ایک انسان بہر حال اہم ہوتا ہے اور جس کو ابھی کسی نے دیکھا یا چھوا نہیں ہوتا وہ غیر اہم۔ جہاں دو میں سے ایک زندگی بچانے کا سوال پیدا ہو جاتا ہے ہم انسان اسی کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں جو پہلے سے جی رہا ہے۔ یہ فیصلے تو ازل سے رب کائنات نے کر رکھے ہیں، ہم کہیں بھی کہ بچے کو بچا کر

ماں کو مرنے دیا جائے تو ہوگا وہی جو اس پیدا کرنے والے کی رضا ہے......ہم تقدیر کے ہاتھوں اتنے ہی بے بس ہیں جتنا کوئی حقیر تنکا ہوتا ہے۔

اس بڑے مرحلے کو طے کر کے تہی دست فاطمہ کو کئی دن تک اسپتال میں رکھا گیا تھا اور ابھی ڈاکٹر نے اسے واپس گاؤں کے سفر کی اجازت نہیں دی تھی۔ دی بھی ہوتی تو امو جان اسے فی الحال نہ لاتیں کہ ان کے خیال میں اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ لوٹتی تو وہ سب کچھ دیکھ، دیکھ کر پریشان ہوتی جو اس نے آنے والے کے لیے سجا سجا کر رکھا تھا......وہ سب کچھ ہٹانا اور سنبھالنا تھا۔ گاؤں میں تو لوگ باقاعدہ پرسے کے لیے آتے تھے اور امو جان نہیں چاہتی تھیں کہ وہ یہ سب سن، سن کر پریشان ہو اور اس کے لیے اس حادثے کو بھلانا مشکل ہو جائے۔ اس نے تو اس وجود کو اپنے اندر سینچا تھا، اس کے حوالے سے خواب دیکھے تھے، اسے اپنے خوابوں اور خیالوں میں اپنی بانہوں میں جھلایا ہوگا، کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ سب بھول پاتی، میں اور تمنا اس آنے والے بچے کی چیزوں کو پیک کرتے ہوئے جانے کتنی بار ضبط کے بند توڑ چکی تھیں، اس کے تو وجود کا حصہ تھا وہ۔

کبیر بھائی بھی چپ سے تھے، مردوں کو تو اپنے دکھ اور تکلیف کا اظہار کرنا بھی مشکل لگتا ہے، ان کے بھی تو کئی خواب اپنے آنے والے بچے کے حوالے سے تھے مگر وہ کس سے شیئر کرتے، خود پر ہی ضبط کر رہے تھے۔ اس روز ان کا لاہور جانے کا ارادہ تھا تو انہوں نے مجھے اور تمنا کو بھی ساتھ چلنے اور چند دن کے لیے فاطمہ کے پاس رکنے کو کہا۔ ہم نے امو جان سے بات کی تو انہوں نے بخوشی اجازت دے دی، جلدی سے اپنی تیاری کر کے ہم کبیر بھائی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ تمنا کے دل میں تو اس لیے بھی لڈو پھوٹ رہے تھے کہ اسے میثاق کے ساتھ وقت گزارنے کا بلا روک ٹوک موقع ملنے والا تھا۔ لاہور پہنچ کر تو علم ہوا کہ میثاق کسی سیمینار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ تمنا کا اس سے رابطہ تو رہتا تھا مگر شاید اس پریشانی میں اسے موقع نہ ملا تھا اور پھر اپنا پلان بنا تو وہ شاید میثاق کو سرپرائز دینے کے چکروں میں تھی، خود ہی سرپرائز کا شکار ہوگئی۔

اپنی کیفیت کو کسی اور سے تو چھپا سکتی تھی مگر مجھ سے نہیں، میں نے مذاق میں اس سے اظہارِ ہمدردی کیا۔ ''اللہ کرے کہ کامل بھی ملک سے باہر گیا ہوا ہو۔'' اس نے مجھے اپنے تئیں بد دعا دی تو میری ہنسی نکل گئی۔

''میں یہاں کامل سے ملنے قطعی نہیں آئی ہوں تمنا......تم فکر نہ کرنا، وہ ملک میں ہوا بھی تو میں اس سے ملنے نہیں جاؤں گی۔''

''تم جا کر تو دیکھو......'' اس نے دانت چبا کر کہا، میری ہنسی ہی نہ رک رہی تھی۔

''اچھا اب اس موضوع کو بند کرو، ہماری ہنسی کی آوازیں نیچے جائیں گی تو پھپو کیا سوچیں گی۔'' ہم دونوں کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ ہم وہاں اس لیے رہنے آئے تھے کہ فاطمہ اس صدمے کے اثر سے نکلے۔ پھپو، پھوپا اور فاطمہ سے مل کر ہم اوپر اپنے کمرے میں سامان رکھنے کے لیے آئے تھے۔ کبیر بھائی اور فاطمہ اپنے کمرے میں تھے، سامان رکھ کر ہم واپس نیچے گئیں تو پھپو نے ہمیں لاؤنج میں بلا لیا۔

''کوشش کرنا کہ فاطمہ کے سامنے اس کے بچے کا ذکر نہ ہو......کوئی ایسی بات جو اس کے دل کو دکھ دے اور میں سمجھتی ہوں کہ اب اسے واپس گاؤں چلے جانا چاہیے، تم دونوں اس کے ساتھ وقت گزارو اور اسے بتاؤ کہ تم سب لوگ اسے مس کرتے ہو۔''

''وہ تو ہم کرتے ہی ہیں پھپو، اس میں کوئی شک نہیں۔''

''عائشہ بھابی مجھے کہتی ہیں کہ ابھی اسے اپنے پاس رکھوں جب تک وہ مکمل سنبھل نہیں جاتی تو فاطمہ کے دل میں وسوسے آنا شروع ہو جاتے ہیں، وہ سمجھتی ہے کہ عائشہ بھابی اسے خدانخواستہ واپس نہیں بلانا چاہتیں۔'' انہوں

نے ہولے سے کہا۔
''ایسا کیوں ہوگا بھلا پھپو...... وہ فاطمہ کا اپنا گھر ہے، اموجان تو شاید اس کی پریشانی کے خیال سے کہتی ہوں گی۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''انہوں نے تو مجھے اور تمنا کو کہا کہ ہم فاطمہ کے کمرے سے بچے کی ہر ایک چیز کو احتیاط سے سمیٹ کر پیک کر کے رکھیں، ایک تو وہ فاطمہ کو نظر نہ آئیں اور وہ پریشان نہ ہو اور دوسرے وہ سب چیزیں ان شاء اللہ اس کے دوسرے بچے کے لیے کام آئیں گی۔''
''اللہ خیر رکھے بیٹا...... اس طرح کے معاملات میں جانے کس، کس طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں، میں تو خود سوچ سوچ کر پریشان ہوتی ہوں، یہی سوچتی تھی کہ شاید عائشہ بھابی بھی ایسا سوچ کر فاطمہ کو واپس آنے سے منع کرتی ہوں گی۔''
''اللہ نہ کرے پھپو......'' تمنا نے فوراً کہا۔
''ہم انسان کتنے بے بس ہیں مگر پھر بھی اللہ کے فیصلوں کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اس بچے کا نہ بچ سکنا ہی شاید ہمارے حق میں بہتر تھا، کبیر بھائی بتا رہے تھے کہ فاطمہ کے گرنے سے بچے کے سر پر چوٹ لگی تھی اور اگر وہ زندہ بچ جاتا تو شاید کسی ذہنی معذوری کے ساتھ ہوتا، اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو عمر بھر کی آزمائش سے بچایا ہے۔''
''اللہ ہم سب کو معاف کرے بیٹا...... ہم تو ایسے کمزور اور جلد بدگمان ہو جانے والے لوگ ہیں۔''
''آپ فکر نہ کریں پھپو، فاطمہ ہماری بھابی ہی نہیں ہماری بہن بھی ہے، کبیر بھائی کی پسند اور ہم سب کی پیاری!'' میں نے پھپو کے کندھوں کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنایا۔ ہماری باتوں کے دوران ہی کبیر بھائی اور فاطمہ آ گئے تھے، مسکراتے ہوئے۔ ''آؤ پیاری، ابھی ہم تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔''
''اچھا کس سلسلے میں یاد کر رہے تھے آپ لوگ؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا، حزن میں ڈوبی ہوئی وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔
''بھئی ہم پھپو سے کہہ رہے تھے کہ ہم فاطمہ کو ساتھ لے کر جائیں گے......''
''پہلے کچھ دن یہاں رہو تو پھر اکٹھی چلی جانا!'' پھپو نے فوراً کہا۔
''وہ تو ظاہر ہے پھپو!'' تمنا نے کہا۔
''میثاق کب واپس آ رہا ہے پھپو؟'' میں نے سوال کیا۔
''ایک مہینے کے لیے گیا ہے بیٹا!''
''ہم م م م...... اتنا عرصہ تو ہم یہاں رک کر اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔'' میرے کہنے پر تمنا نے مجھے چٹکی کاٹی، فاطمہ نے بھی سنا اور زیرِ لب مسکرائی، کبیر بھائی متوجہ ہی نہ تھے اور پھپو سن نہ سکی تھیں۔
''کچھ کہا تم نے امرت بیٹا؟''
''میں کہہ رہی تھی کہ میثاق ہوتا تو یہاں رک کر ہم مل کر کتنا انجوائے کرتے!'' میں نے بات بنائی۔
''چلو میثاق نہ سہی، میں کامل اور تحریم سے کہہ دیتی ہوں وہ لوگ آ جایا کریں گے اور تم لوگ مل کر انجوائے کرو۔''
''ارے نہیں پھپو...... یہ تو ایسے ہی فضول مارتی رہتی ہے......'' تمنا نے فوراً کہا تو میری اور فاطمہ کی ہنسی نکل گئی، فاطمہ کو ہنستے دیکھ کر کبیر بھائی بھی مسکرا اٹھے تھے۔ ان کی فاطمہ زندگی کی طرف لوٹنے لگی تھی۔ کھانا کھا کر کبیر بھائی تو واپسی کے لیے روانہ ہوئے اور ہمیں کہہ گئے کہ جو بھی پلان بنے ہم انہیں بتا دیں تا کہ وہ ہمیں لینے کے لیے آ جائیں۔



''مس گل......'' میرا نام پکارا گیا تو میں خیالات سے چونکی۔ ''آپ میرے ساتھ تشریف لائیں!'' میں نے

اٹھ کر اپنا بیگ اٹھایا اور اس کی تقلید میں چل دی، یہ تک نہ دیکھا کہ مجھے ساتھ لانے والی میرے ساتھ تھیں بھی کہ نہیں۔ ''آپ یہاں تشریف رکھیں، ڈاکٹر صاحبہ ابھی آنے والی ہیں!'' ایک یخ بستہ کمرے میں مجھے چھوڑ کر گلابی لباس پر سفید گاؤن میں ملبوس وہ نرس باہر نکل گئی۔ میں نے ہاتھ سینے پر باندھے، سردی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے یا شاید خوف سے، آنے والے وقت کا خوف۔ میں نے اے سی کے ریموٹ کنٹرول کے لیے دائیں بائیں دیکھا۔ میز پر فائلوں کے درمیان مجھے ڈاکٹر کے نام کی تختی نظر آئی۔ ''ڈاکٹر یاسمین سدوزئی''

''ارے بیٹھیے ناں......'' کمرے میں یک لخت خوشبو سی پھیل گئی، میں نے چونک کر دیکھا، وہ جانے کس سمت سے کمرے میں آئی تھیں کیونکہ کمرے کے جس دروازے سے میں آئی تھی وہ میری نظر کے سامنے تھا اور بند تھا۔

''جی!'' میں نے اتنا ہی کہہ کر ان کے سامنے کی نشست سنبھالی۔

''آپ نے خود گھر پر ابتدائی طور پر ٹسٹ کر کے نہیں دیکھا کہ آپ؟'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں!'' میں نے چھوٹا سا جھوٹ بولا۔

''اچھا...... کیوں نہیں کیا؟'' انہوں نے مسکرا کر سوال کیا۔ ''آج کل کی بچیاں تو ان معاملات میں کافی سمجھدار ہیں، ہمارے پاس اس وقت آتی ہیں جب خود گھر پر تصدیق کر چکی ہوتی ہیں۔''

''اصل میں......'' میرے عقب میں بغیر آواز کے دروازہ کھلا تھا اور وہ میرے ساتھ والی کرسی پر آ کر براجمان ہو گئی تھیں۔ ''اس کا تعلق گاؤں سے ہے......اور آپ کو تو علم ہے کہ گاؤں اور شہروں کے ماحول میں کتنا فرق ہے۔''

''اوہ اچھا......'' انہوں نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''مجھے ایسا لگا نہیں اور میں تو حسبِ عادت اس کے ساتھ انگریزی میں بات کرتی رہی، شاید اسی لیے اس نے بہت مختصر جواب دیے ہیں۔'' ڈاکٹر یاسمین نے شرمندگی سے کہا۔

''ایسی بات ہرگز نہیں ہے......'' میں نے انہیں انگریزی میں ہی جواب دیا۔ ''مجھے آپ کی پوری بات کی سمجھ آ گئی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے......'' ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ''تو گویا تم کچھ پڑھی لکھی ہو؟''

''جی، میں نے بزنس مینجمنٹ میں ماسٹرز کیا ہے......'' میں نے انہیں اپنی تعلیم اور یونیورسٹی کا نام بتایا تو وہ کچھ متاثر نظر آئیں۔

''سوری بھئی، میں تو کچھ اور ہی سمجھی تھی کہ شاید ہمارے شہر کی اتنی مشہور اور اپنے حسنِ انتخاب کے لیے معروف خاتون نے گاؤں کی کسی سیدھی سادی بچی سے اپنے بیٹے کی شادی کی ہے۔'' اس پر مما کھسیانی سی ہنسی ہنسیں۔

''اپنے خاندان سے ہے......بعض رشتے خاندانوں میں...... آپ سمجھتی ہیں ناں!'' انہوں نے وضاحت دینا چاہی۔

''اگر آپ برا نہ منائیں تو میں اس سے تنہائی میں کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں؟'' اس نے ان الفاظ کی آڑ میں انہیں باہر جانے کو کہا تھا۔

''میرے یہاں ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے...... میری بہو ہے یہ!''

''میرے لیے یہ ایک مریضہ ہے...... آپ بھی میری کلائنٹ ہیں اور سمجھتی ہوں گی کہ اپنے مسائل کے لیے آپ اپنی بہو یا بیٹی کے سامنے کھل کر بات نہیں کر سکتی ہوں گی۔'' ان کے کہنے پر مما بادلِ ناخواستہ اٹھیں اور باہر چلی گئیں۔

''میڈم اپنا سیمپل ذرا باتھ روم میں چھوڑ دیں!'' اسی نرس نے آ کر مجھے ایک بوتل پکڑائی، میں اٹھی اور باتھ روم سے ہو کر چند منٹوں میں واپس آ گئی۔

''اس کے لیے صبح سویرے کا سیمپل نہیں چاہیے؟'' میں نے باتھ روم سے نکل کر نرس سے پوچھا۔

''ایسا ضروری نہیں ہے..... شاید وہ شرط صرف گھر پر ٹسٹ کے لیے ہوتی ہے، لیبارٹری میں دن کے کسی بھی حصے کے نمونے سے ٹسٹ کیا جاسکتا ہے.....'' کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ ''میں تھوڑی دیر میں رپورٹ لے کر آتی ہوں۔''

اس کے جاتے ہی میں واپس اپنی نشست پر بیٹھ گئی، جب باتوں، باتوں میں، میں نے انہیں بتایا کہ میں ملازمت کرتی ہوں تو ڈاکٹر یاسمین مجھ سے میری ملازمت کے بارے میں سوال کرنے لگیں، میں نے انہیں اپنے اسکول کا نام بتایا۔

''ارے وہاں تو میری بہن کی بیٹی پڑھتی ہے..... کے۔جی کلاس میں، نتاشا سدوزئی!'' انہوں نے کہا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اتنی دیر سے مجھے ایسا کیوں محسوس ہورہا تھا کہ میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ ان سے اظہار اس لیے نہیں کیا کہ یہ تعارف کا بہت بودا سا اور فرسودہ طریقہ ہے۔ ان کی شکل نتاشا کی ماں سے بہت ملتی تھی۔

''آپ کے بچے کہاں پڑھتے ہیں؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''کہیں بھی نہیں.....'' انہوں نے مسکرا کر کہا، میں نے سوالیہ نظر سے انہیں دیکھا۔ ''میرے بچے نہیں ہیں!'' انہوں نے میرے سوال کا بغیر پوچھے جواب دے دیا۔

''اوہ.....'' میں نے تاسف سے کہا۔ 'ڈاکٹر ہو کر اپنا علاج بھی نہیں کرسکتیں.....' دل میں سوچا۔

''اصل میں.....'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکیں، میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''میری شادی ہی نہیں ہوئی!'' کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنسیں تو میں شرمندہ ہوگئی۔ پہلے پوچھا جانے والا سوال چھوڑ کر میں نے ان کے بچوں کی بابت پوچھا تھا۔

''کیوں؟'' ایک اور بے عقلوں والا سوال میرے منہ سے چھوٹ گیا۔

''well، یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے.....'' انہوں نے اپنے فقرے سے لطف اٹھایا۔ میری خاموشی کو انہوں نے میری ہمہ تن گوشی پر محمول کیا۔ ''میں اور پریشے دونوں جڑواں بہنیں ہیں، ہم میں شکلوں کے ساتھ بہت سی عادتیں اور قدریں مشترک ہیں، پڑھائی میں ایک جیسی پوزیشنیں لیتیں، اپنی ایک جیسی شکلوں سے لوگوں کو مذاق بناتے بناتے ہم دونوں اپنی کالج کی پڑھائی کے آخری سال میں ایک ہی شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئیں..... ہم دونوں خود ایک ایسا مذاق بن گئیں جس کا فیصلہ ہمیں نتاشا کے باپ کے ہاتھ میں دینا پڑا اور اس نے پریشے کے حق میں فیصلہ دیا۔ بی اے کر کے اس کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے بچے پال رہی ہے، میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور اسپیشلائیزیشن کے لیے باہر چلی گئی، آج میں ملک کی ایک نامور ڈاکٹر ہوں پھر شادی کے لیے وقت ہی نہیں ملا اور نہ ہی کوئی ایسا شخص..... یوں بھی شادی بھلا زندگی کی معراج تو نہیں.....''

ان کی باتوں کے دوران میری رپورٹ آگئی تھی، جو میں پہلے سے جانتی تھی اسی لیے ان کے مبارک باد کہنے پر میرے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا تو وہ حیران ہوئیں۔ ''تھینک یو.....!'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''تم خوش نہیں ہوئیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی!'' میں نے تھوک نگلا۔

''کیا بات ہے پیاری؟'' ان کے کہنا تھا کہ میں اپنے آنسو نہ سنبھال سکی۔

''کتنا عرصہ ہوا ہے تمہاری شادی کو؟'' انہوں نے سوال کیا۔ ''کیا یہ خوشی کے آنسو ہیں؟''

''میں اس.....'' میں کچھ کہتے، کہتے رک گئی، ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں اس بات کو کس طرح کہوں؟''

''چار ماہ گزر چکے ہیں۔'' انہوں نے میرے پوچھے بغیر بتایا۔

''کیا میرے پاس اسے ضائع کروانے کا موقع ہے؟'' میں نے ان کے سر پر اپنے سوال سے بم پھینکا۔

☆☆☆

شامیر اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوا اور اس کا تبادلہ اس کی یونٹ میں ہوا جو کہ اس وقت سرحد پر تھی، اموجان کو

ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ اپنی یونٹ میں جانے سے پہلے بیس دن کی رخصت پر گھر آیا تھا اور اسی دوران سرمد بھائی اور رانی کی شادی کی تاریخ مقرر کی گئی تھی...... اس کی پوری چھٹی کس طرح گزر گئی کچھ علم ہی نہ ہوا، شادی کے ہنگامے تقریباً چار دن لے گئے، کچھ دن شادی سے قبل کی تیاریوں اور کچھ بعد کے سنبھالے کی نذر ہو گئے۔ قریبی شادی تھی، رانی کا اپنا کوئی بھائی تو تھا نہیں، کبیر بھائی اور شامیر پر ہی تمام تر انتظامات کی ذمے داری تھی کیونکہ ہمارے گھر میں ہر موقع پر انتظامی امور کو یہ بہنیں بڑے احسن طریقے سے سنبھالتی تھیں...... مجھے تو لگتا تھا کہ اگر فاطمہ، کبیر بھائی کی پسند نہ ہوتی تو شاید اموجان اور ابوجان ان کی شادی رانیہ سے کرتے۔

رانیہ اپنی نوعیت کی ایک انوکھی ہی شخصیت تھی، اتنی سمجھدار اور اتنی مدبر کہ جب بزرگوں میں بیٹھی ہوتی تو بزرگ لگتی اور جب ہمارے ساتھ گپ شپ لگاتی تو بہت دلچسپ گفتگو کرتی، شرارتوں میں بھی شامل ہوتی اور اس کے ساتھ ہماری بچپن سے ہی بہت یادیں تھیں۔ میں اور تمنا بھی اس کی شادی میں ہر کام میں آگے، آگے تھیں۔ دودھ پلائی کی رسم تھی یا جوتا چھپائی کی، ہم اس کی بہنوں کے ساتھ مل کر سالیاں بن گئیں اور اس بات پر بڑی پھپو سے ڈانٹ بھی کھائی کہ ہم تو سرمد بھائی کی بہنیں تھیں۔

''شکر ہے کہ بڑی پھپو نے تمہیں سرمد کی بہن کہہ دیا ہے......'' رخصتی سے پہلے وہ میرے ساتھ واش روم گئی، میں اس کا دوپٹا ڈریسر میں کھڑے ہو کر سیٹ کر رہی تھی۔ رانیہ نے ہی رانی کو تیار کیا تھا اور اس ہلکے نظر آنے والے میک اپ میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔

''وہ تو میں ہوں...... پھپو نہ بھی کہیں تو!'' میں نے اس کے بالوں میں پن لگائی۔ ''وہ تو میرے سالی بن جانے پر ڈانٹ رہی تھیں۔'' میرے لہجے میں سادگی تھی۔

''اونہہ......'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''سالی نہ بننا، بہن بننا سرمد کی!'' میں حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ''میں جانتی ہوں گل اور تم بھی کہ تم سرمد کی پہلی چاہت ہو اور میں دوسری!''

''کیا...... دماغ درست ہے تمہارا رانی؟'' میں نے ناراضی سے کہا۔ ''پھپو نے میرے والدین سے رشتہ ضرور مانگا مگر اس سے میں سرمد کی اولین چاہت کہاں سے بن گئی؟''

''مجھے سرمد نے خود بتایا ہے گل......'' اس کے لہجے میں شکستگی تھی۔ ''اس نے خود مجھے بتایا ہے کہ وہ سب سے پہلے تمہارا ساتھ چاہتے تھے اور تمہارے والدین کی طرف سے انکار کے ساتھ جب ان کے لیے میرے رشتے کی تجویز دی گئی تو وہ میری طرف مائل ہوئے...... اس سے قبل انہوں نے کبھی میرے بارے میں اس انداز سے سوچا تک نہ تھا۔ بڑی پھپو تو ثنا کا رشتہ لینا چاہتی تھیں مگر سرمد نے خود ان سے کہا کہ وہ میرے لیے بات کریں...... وہ کہتے ہیں کہ وہ تمہیں بھلانے کی کوشش کریں گے مگر یہ تبھی ممکن ہے کہ جب تم ان کے سامنے نہ آؤ۔''

''کیسی عجیب سی بے وقوفوں والی باتیں کر رہی ہو تم رانی!'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔ ''سرمد بھائی نے چاہے جو کچھ بھی سوچا یا چاہا ہوگا، میں نے کبھی انہیں اس نظر سے نہیں دیکھا بلکہ یقین کرو کئی سال تک دیکھا ہی نہ تھا...... اور جب مجھ سے ان کے بارے میں رائے مانگی گئی تو میں نے صاف انکار کر دیا تھا......''

''سب جانتی ہوں پیاری مگر مرد کے دل کا کیا کریں۔'' اس نے دوپٹا سیٹ کر کے اپنا جائزہ لیا۔ ''میرے سر پر تو ہمیشہ تمہارے وجود کی تلوار لٹکتی رہے گی، کم از کم جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے گی۔''

میں اس کی اس بات کے جواب میں کیا کہتی، میری خاموشی سے جانے وہ کیا اخذ کر کے بولی۔ ''ویسے سرمد کو انکار کرنے کے پس منظر میں کوئی اور؟''

''پاگل ہوئی ہو......'' میں نے اسے گھرکا۔

''سرمد جیسے خوبرو مرد کو کوئی لڑکی اسی بات پر رد کر سکتی ہے ناں کہ اس کے من کے سنگھاسن پر کوئی اور براجمان ہو؟'' اس نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

''پاگل ہو تم تو رانی......'' میں نے اس کی بات ہنسی میں اڑائی۔

''پاگل تو نہیں ہوں، کچھ، کچھ صلاحیت مجھ میں اڑتی چڑیا کے پر گننے کی بھی ہے۔'' اس نے مجھے گدگدایا، میرے منہ سے کامل کا نام تو کبھی نہیں نکل سکتا تھا، وہ تو ایک ایسا راز تھا جسے میں نے اپنے وجود کی گہرائیوں میں سمیٹ رکھا تھا۔ ''چلو نہ بتاؤ، جلد ہی معلوم ہو جائے گا، اب اس کے بعد تمہاری ہی تو باری بنتی ہے۔'' اس کے کہنے پر میرے دل کی کئی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئیں۔

''چلو اب رخصتی میں دیر ہو رہی ہے......'' میں نے موضوع بدلا۔

''تم میری بات کو تو سمجھ گئی ہو ناں؟'' اس نے چلتے، چلتے مڑ کر مجھ سے سوال کیا۔

''تم فکر نہ کرو پیاری......'' میں نے اس سے کہا اور اس بات پر اس طرح قائم رہی کہ جب تمنا نے رخصتی کے وقت اصرار کیا کہ سب لوگ بڑی پھپو کی طرف جا رہے ہیں کہ ان کے گھر میں ان کی بہو کا استقبال کیا جائے تو میں نے سر درد کا بہانہ کر دیا، ہر ممکن کوشش کروں گی کہ سرمد بھائی کو میری شکل نظر نہ آئے...... میں نے خود سے کہا۔

☆☆☆

''آپ سو رہی ہیں؟'' میں منہ پر اپنا دوپٹا ڈال کر صوفے پر ہی ٹیک لگا کر دراز تھی جب زین کی آواز سے چونک کر جاگی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''نہیں زین بھائی...... یونہی ذرا تھکاوٹ سے سر درد ہو رہا تھا!''

''آج میں آپ کو کافی بنا دوں؟'' وہ لاؤنج میں نئی بار کی طرف بڑھے۔

''آپ گئے نہیں بڑی پھپو کی طرف؟'' میں نے اس کی آفر کو نظر انداز کیا۔

''چائے لیں گی یا کافی؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''سب لوگ وہیں گئے ہیں تو آپ؟''

''کافی میں دودھ اور شکر لیں گی آپ؟''

''آپ میرے سوال کا جواب نہیں دے رہے......'' میں نے چڑ کر کہا، ان کے ساتھ اپنے گھر میں اکیلے ہونے کا خیال مجھے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

''آپ بھی میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہیں۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کیا سوال کیا ہے آپ نے؟'' میں نے آہستگی سے کہا، گھر آئے مہمان سے تلخ کلامی کا سوچ کر مجھے شرمندگی ہوئی۔

''سر درد کی دوا لی آپ نے؟''

''نہیں......'' میں نے کہا۔ ''اب آپ بتائیں کہ آپ وہاں کیوں نہیں گئے؟''

''کافی لیں!'' اس نے بغیر پوچھے دودھ اور شکر ڈال کر کافی کا مگ مجھے پکڑایا۔ ''گیا تھا میں وہاں!''

''تو پھر لوٹ کیوں آئے؟''

''معلوم ہوا کہ آپ کے سر میں درد ہے اور یہ بھی کہ آپ گھر میں تنہا ہیں...... پاپا نے کہا کہ میں گھر چلا جاؤں اور آپ چونکہ تنہا ہوں گی تو آپ سے بات بھی کر لوں۔''

''آپ کو ایسی کون سی بات کرنی ہے مجھ سے؟'' میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی، اسے مجھ سے کیا

بات کرنا تھی، وہ بھی ایسی جو چاچو نے اس سے کہی ہو کہ وہ مجھ سے کہے؟ میں نے ایک دفعہ چاچو سے کہا تھا کہ میں گاؤں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں، ممکن ہے کہ اسی سلسلے میں انہوں نے کچھ سوچا ہو۔

''آپ کہیں جو بات چاچو نے آپ سے مجھ سے پوچھنے کو کہی ہے۔''

''اس کے لیے آپ کا بالکل تندرست ہونا ضروری ہے...... میں ابھی یہیں ہوں، دو ایک دن میں جب دوبارہ ایسا موقع ملا تو بات کرلیں گے...... ابھی آپ آرام کریں۔'' کہہ کر وہ باہر کا دروازہ بھیڑ کر چلا گیا۔ گھر پر ملازمین بھی تھے اس لیے میں بے فکری سے اپنے کمرے میں چلی گئی...... 'کاش ایسا سنہری موقع کامل نہ گنواتا...... اسے بھی تو علم ہوا ہوگا کہ میرے سر میں درد ہے، میرے دل میں بدگمانی آئی۔ مگر اس کے تو تایا کے بیٹے کی شادی ہے، اسے کہاں موقع ملے گا......' میں نے اس بدگمانی کو جھٹکا۔

☆☆☆

ولیمے پر نہ جانا ممکن ہی نہ تھا نہ کوئی بہانہ چل سکتا تھا مگر شکر ہے کہ زنانہ اور مردانہ تقریب کا علیحدہ، علیحدہ اہتمام تھا، میں باقی سب لوگوں کے ساتھ بھرپور تیاری کے ساتھ شریک ہوئی، مجھے سرمد بھائی کا سامنا ہونے کے خوف سے زیادہ کامل کا سامنا ہونے کا خیال تھا، اسی خیال سے میرے عارض ہلکے گلال کے باوصف گہرے لال ہو رہے تھے اور چہرے پر ایک عجیب سی چمک اور دمک تھی۔ تمنا کی تیاری بھی اپنے انداز میں خوب تھی، شکل میں تمنا مجھ سے ذرا دبتی تھی مگر اسے حسن میں نکھار کے سب حربے آتے تھے اور اس میں ناز و ادا بھی مجھ سے کہیں بڑھ کر تھی۔ ایسا صرف تمنا کے ساتھ ہی نہ تھا بلکہ باقی کزنز کا بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ اکثر مجھ سے کہتیں کہ ذرا سی محنت سے میرے حسن پر وہ نکھار آجاتا ہے جس کے لیے وہ گھنٹوں کے حساب سے جانے کیا، کیا تھوپتی رہتی ہیں۔ مجھے میک اپ کرنے کا شوق بھی نہ تھا اور حقیقت ہے کہ کرنا بھی نہ آتا تھا۔ جتنا وقت آج کل کی لڑکیاں میک اپ اور ملبوسات کے ڈیزائن دیکھنے کے لیے انٹرنیٹ پر صرف کرتی ہیں اتنا وقت...... اتنی فرصت مجھے عمر کے کسی دور میں ملی ہی نہیں۔

''ماشاء اللہ......'' تیار ہو کر نکلی تو سب سے پہلے امو جان کے منہ سے توصیفی کلمات سنے...... اس کے بعد دن بھر جانے کتنی ہی بار ایسے الفاظ سنے مگر جو نہ سنا تو ایک لفظ کامل کے منہ سے نہ سنا۔ کیونکہ اس سے ملاقات ہی نہ ہو پائی تھی۔ جس کی ایک نظر کی دید کی خاطر میں نے اتنے جتن کیے تھے وہ جانے کس وجہ سے ولیمے کی تقریب کو ادھورا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مجھے بھی وہاں رکنے میں کوئی کشش نظر نہ آرہی تھی مگر جب تک مہمان تھے، رسم دنیا نبھانے کو تو رکنا ہی تھا۔

''امو جان گھر چلیں اب؟'' کھانا ختم ہوا تو میں نے امو جان کو پکڑا۔

''ہاں، ہاں چلتے ہیں......'' انہوں نے کہا۔ ''بلکہ یوں کرو کہ تم اور تمنا چلو...... فاطمہ اور کبیر تو پہلے ہی جا چکے ہیں، میں تھوڑی دیر میں تمہارے ابو جان اور شامیر کے ساتھ آجاتی ہوں۔''

''میں آپ کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی امو جان!''

''جمال اور زیبا گھر چلے گئے ہیں، تم بھی چلی جاتیں......'' ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''کیا بات ہے امو جان...... سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''ہاں شاید سب ٹھیک ہی ہے......'' انہوں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

''اچھا میں چلی جاتی ہوں۔'' مجھے لگا کہ وہ مجھے کسی وجہ سے گھر بھیجنا چاہ رہی ہیں۔ میں واپسی کے سفر میں بھی اس معمے کو حل نہ کر پائی کہ وہ کیوں ایسا چاہ رہی تھیں۔

☆☆☆

''تمہارا دماغ ٹھیک کام کر رہا ہے پیاری؟'' ڈاکٹر یاسمین نے غصے سے سوال کیا۔

''دراصل میرا شوہر اور میری ساس ایسا چاہتے ہیں۔'' میں نے بے بسی سے اپنے ہونٹ کا داہنا کونہ چبایا۔

''ان کی ساس کو باہر سے بلا لائیں......'' ڈاکٹر یاسمین نے بیل کر کے نرس کو بلا کر حکم دیا۔

''پہلے آپ میری بات تو سنیں......'' میں ہکلائی۔

''کیا تم بھی اس بچے کو ضائع کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بس تو پھر تم خاموش رہنا۔''

''میں اندر آ جاؤں ڈاکٹر یاسمین؟'' مما اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھیں۔

''جی جی...... آیئے، آیئے!'' ڈاکٹر یاسمین نے خوش دلی سے کہا۔ ''بیٹھیے!''

''جی بہت شکریہ......'' مما نے سیٹ سنبھالی۔

''مبارک ہو آپ کو...... آپ ماشاء اللہ دادی بننے والی ہیں...... اور کمال کی بات یہ ہے کہ اتنی جوان دادی اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزریں۔''

''جی شکریہ......!'' مما کو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آنے دیا تھا ڈاکٹر یاسمین نے۔

''لگ بھگ پانچ ماہ کے بعد بچے کی ولادت متوقع ہے...... آپ کی بہو بہت کمزور ہے، اس کی صحت کا خیال رکھیں اور کوشش کریں کہ اس کو کوئی ٹینشن نہ ہو......'' وہ یوں ہدایات جاری کر رہی تھیں جیسے سننے والی کو بہت خوشی ہو رہی ہو گی...... ''اب آپ کے پاس وقت کم ہے، بس آپ اپنے ہونے والے پوتے یا پوتی کا نام سوچیں!''

''مگر ابھی تو ان بچوں کی پلاننگ میں ایسا کچھ نہیں تھا......'' مما نے ڈرے، ڈرے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو انہیں اپنی زندگیوں کو انجوائے کرنا ہے......''

''دنیا کا نظام ہی ایسا ہے...... انسان زندگی کے ہر لمحے کو انجوائے کرتا ہے، بچوں کی پیدائش اللہ کا فیصلہ ہے اور اس پر ہمیں خوش ہونا چاہیے، بچہ تو زندگی کے رنگ مکمل کر دیتا ہے۔''

''مگر ابھی ہمیں یہ بچہ نہیں چاہیے......'' انہوں نے ہکلا کر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

''ہمیں کون؟'' ان کے سوال میں کاٹ تھی۔ ''کس کو یہ بچہ نہیں چاہیے؟''

''میرا مطلب ہے کہ ان دونوں کو...... دونوں میاں بیوی کو......''

''تو اس کے لیے پلاننگ کرتے...... اب جب اللہ کی طرف سے ایسا ہو گیا ہے تو اس کا کیا، کیا جا سکتا ہے؟''

''پلاننگ ہی تو کر رہے تھے...... یہ شروع دن سے گولیاں لے رہی تھی، جانے کیا گڑبڑ ہوئی ہے؟'' مما نے کہا۔

''آپ یہ بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتیں؟ اس کی کیا وجہ ہے...... کیا پلاننگ ہے آپ کی جس کی راہ میں یہ بچہ حائل ہو گا؟'' ڈاکٹر یاسمین نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''مم...... میری تو کوئی پلاننگ نہیں ہے...... اپنے شوہر کی کسی پلاننگ کا مجھے کوئی علم نہیں...... میرا خیال ہے کہ ان کو بچے ویسے ہی اچھے نہیں لگتے۔'' میں نے مشکل سے جواب مکمل کیا۔

''آپ کو میں کچھ دوائیں دے رہی ہوں...... آپ اپنی ہر طرح سے احتیاط کریں، اپنے شوہر کو اپنے ساتھ لے کر آئیں تو میں ان کو سمجھاؤں گی کہ کسی بھی ایسی کوشش میں ہم صرف بچے کی ہی نہیں بلکہ آپ کی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے...... اللہ کا شکر ادا کریں کہ اتنے عرصے سے گولیاں کھا، کھا کر بھی آپ کا جسمانی نظام درست رہا اور اللہ تعالیٰ آپ کو نواز رہا ہے! دعا کریں کہ بچہ بالکل نارمل اور صحت مند ہو......''

''میں وہ گولیاں جاری رکھوں یا......؟'' میں نے جان بوجھ کر اس سے سوال کیا۔

''تم واقعی اتنی ہی پینیڈو ہو جتنی تمہاری ساس نے مجھے شروع میں بتایا تھا......'' ڈاکٹر نے ہنس کر کہا، مما نے بھی ان کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی، ان کا مقصد صرف میرا استہزا تھا ورنہ اس وقت تو ان کو سمجھ میں ہی نہ آرہا ہوگا کہ وہ اس ڈاکٹر کو کیا کہیں۔

''میرا خیال ہے کہ جتنا وقت گزر چکا ہے اس پر کوئی بے وقوف سے بے وقوف ڈاکٹر بھی اس بچے کو ضائع کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ ہی آپ کو اصرار کرنا چاہیے......'' انہوں نے نکلتے، نکلتے مما سے پھر کہا، انہیں اندازہ تھا کہ ان کی بات کو مما نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

''یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں کہ تمہیں اپنے شوہر کے کسی پلان کا کوئی علم نہیں؟'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی انہوں نے میری کلاس لی۔

''تو اور کیا کہتی مما......'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''جب تمہیں اپنے شوہر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو اس کے کسی پلان سے کیا ہوگی۔''

''مجھے اپنے شوہر سے پوری دلچسپی ہے، ان کی رائے سے پورا اتفاق ہے مما اور ان کی پسند کو میں اپنی پسند سمجھتی ہوں مگر اس میں معاملہ میری اپنی زندگی کا ہے...... اگر آپ کو لگتا ہے کہ ایسا کوئی چانس لیا جا سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''سب سمجھتی ہوں آج کل کی لڑکیوں کے چلتر......'' انہوں نے دانت چبا کر کہا۔ ''ضرور تم نے تنہائی میں ڈاکٹر یاسمین کے ساتھ مل کر کوئی ساز باز کی ہوگی!؟''

''وہ آپ کی پرانی ڈاکٹر ہیں مما...... میں ان سے مل کر کوئی ساز باز کیا کروں گی، آپ انہی سے پوچھ لیں۔''

''اپنے شوہر کو دنیا کی ہر چیز پر فوقیت دینا سیکھو...... ایسا نہ ہو کہ وہ اس بچے کی ولدیت ہی ماننے سے انکار کر دے......'' انہوں نے میرے سر پر جیسے ہتھوڑے سے وار کیا۔ ''جو عورت گھر سے باہر نکلتی ہے اس کا واسطہ دن بھر میں سو لوگوں سے پڑتا ہے، ملازمت کرنے والی بیوی کا کوئی پہرہ تو نہیں دے سکتا۔'' میں یوں گنگ تھی کہ انہیں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ دنیا کی کوئی طاقت اس بچے کی ولدیت کو چیلنج نہیں کر سکتی...... اور تو اور ڈی این اے ٹسٹ سے سب کچھ واضح ہو سکتا ہے۔ مگر مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا وہ مجھے ڈرا رہی تھیں یا اس قدر بے وقوف سمجھ رہی تھیں کہ میں ایسی کسی دھمکی میں آکر ان کی اور ان کے بیٹے کی بات ماننے کو تیار ہو جاؤں گی۔

☆☆☆

''یہ بات تو مجھے ہضم ہی نہیں ہو رہی ہے پیاری کہ تم ایسی بہادری کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں طنز نہیں بلکہ بے یقینی تھی۔ ''یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں اتنی بہادر نہیں ہوں سارہ اور نہ ہی تمہارے مجبور کرنے پر بھی میں کبھی مما سے منہ ماری کر سکتی تھی...... اور اس سے تو بحث کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ بات بعد میں سنتا ہے، کوئی نہ کوئی دفعہ پہلے لگا دیتا ہے۔''

''اب کیا دفعہ لگائی ہے اس نے؟'' اس نے فوراً پوچھا تھا۔

''ویسے تم ایک بات کا یقین نہیں کرو گی، مما کا خیال تھا کہ وہ اس بچے کو اپنا تسلیم کرنے سے انکار بھی کر سکتا ہے......''

''کیا...... کیا انہوں نے ایسا کہا؟''

''ہاں! انہوں نے بالکل واضح کہا کہ میں ملازمت کرتی ہوں اور ممکن ہے کہ میں......'' میں رکی۔ ''اچھا چھوڑو ایسی باتوں کو، ان سے میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مجھے تو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر یاسمین نے تمہاری مما کی خوب کلاس لی......'' وہ ہنسی۔

''تمہیں کیوں خوشی ہو رہی ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔
''جو عورتیں......عورت کے نام پر دھبا ہیں، اپنے ہی جیسی عورتوں کو انسان نہیں سمجھتیں، ان سے مجھے بہت چڑ ہے۔''
''ہونہہ......'' میں نے ہنکارا ابھرا۔ ''تمہیں بتانا بھول گئی ہوں کہ ڈاکٹر یاسمین، ہماری کے۔ جی کی اسٹوڈنٹ نتاشا کی سگی خالہ ہیں بلکہ اس کی ماں کی جڑواں بہن ہیں...... میں سارا وقت سوچتی رہی کہ انہیں دیکھا کہاں ہے۔''
''اوہ...... نتاشا کی ماں......وہ بہت گپی عورت ہے، اسے علم ہوگیا تو سمجھو ٹیلی وژن کے تمام چینلو پر خبر لیک ہو جائے گی......ایک لحاظ سے اچھا بھی ہے۔''
''اسے اس بات کو پھیلانے یا گپ لگانے سے کیا دلچسپی ہوگی جس سے اس کا کوئی concern بھی نہیں ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''gossip کا تو کمال ہی یہ ہے کہ اس سے ان لوگوں کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جو اسے پھیلاتے ہیں۔''
''اس کے بات کرنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''
''تم ان باتوں کو چھوڑو اور بتاؤ کہ اپنے فیصلے پر قائم ہو؟''
''سارہ......میری دادی جان کہاں کرتی تھیں کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے بھی پر نکل آتے ہیں......اور عورت اس چیونٹی سے بہت بڑھ کر ہے، اس کے لیے سب سے اہم اس کی اولاد ہے، جہاں بات اس کی اولاد کی آتی ہے وہ طوفانوں سے بھی ٹکرا جاتی ہے......مجھ میں بھی ایسی ہمت آگئی ہے کہ میں اس بچے کی خاطر سب سے بھڑ جاؤں گی!''
''اس کے ہر قسم کے انجام سے آگاہ ہو؟'' اس نے مجھے خبردار کرنے کی کوشش کی۔
''کیا ہو جائے گا زیادہ سے زیادہ سارہ؟'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مجھے تو مرنے سے بھی ڈر نہیں لگتا کیونکہ جو زندگی میں گزار رہی ہوں اس میں، میں ہر روز جیتی اور مرتی ہوں......''
''تم پھر بھی بہت سوں سے بہتر زندگی گزار رہی ہو پیاری......تمہارے سر پر اپنی چھت ہے، جہاں رہتی ہو اسے دعوے سے اپنا گھر کہہ سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں خالی پن تھا، میں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''کامل کیوں واپس چلا گیا ہے تمنا؟'' میں نے گھر پہنچ کر تمنا سے سوال کیا۔
''کامل بھائی واپس چلے گئے ہیں؟ مجھے تو نہیں معلوم!'' اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔
''ہاں...... فاطمہ بتا رہی تھی کہ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور اچانک چلا گیا ہے......تحریم، گل پھپو اور ہاشم پھوپا ابھی تک اِدھر ہی ہیں، صرف وہ ہی گیا ہے۔''
''اوہ، اچھا......میں چیک کروں گی کسی سے کہ وہ کیوں گیا ہے......'' تمنا نے مجھے تسلی دی۔
''جمال چاچو کی فیملی آج چلی جائے گی کیا؟'' میں نے سوال کیا۔
''میرا خیال ہے کہ رکیں گے آج!'' تمنا نے نظر چرا کر دھیمے سے لہجے میں کہا۔ ''میں چلتی ہوں، رات کے کھانے کا کچھ چیک کرنا ہے!''
''میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں کچن میں'' میں نے ایسے ہی کہا۔
''تم بیٹھو......'' اس نے زبردستی مجھے بٹھایا، میں لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئی۔ جمال چاچو کی فیملی کے ساتھ امو جان اور ابو جان بیٹھے تھے، ٹیلی وژن آن تھا، امو جان اور زیبا چچی آپس میں کوئی بات کر رہی تھیں اور ابو جان اور چاچو دونوں بھائی جانے کس زمانے کے قصے چھیڑے بیٹھے تھے، زین اور حسنہ بور ہو رہے تھے۔

''جاؤ بچو......آپ لوگ جا کر کہیں اور محفل لگاؤ!'' جمال چاچو نے کہا تو ہم سب اٹھ گئے۔
''چھت پر چلیں؟'' زین بھائی نے پوچھا۔
''آپ نے سگریٹ پینا ہوگی!'' حسنہ نے چڑ کر کہا۔ ''مجھے چھت پر جانا اچھا نہیں لگتا۔''
''یوسف اور عارب کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔
''وہ لوگ تو جب سے آئے ہیں، سو رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ میں بھی سو جاؤں......آپ دونوں جاؤ چھت پر!''
''چلیں گل؟'' زین بھائی نے میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔
''اگر واقعی آپ نے سگریٹ نہ پینی ہو تو!'' اس پر وہ ہنس پڑے، جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اسے کوڑے دان میں پھینک دیا......''ارے میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا، آپ اگر سگریٹ پینا چاہتے تھے تو میں نیچے چلی جاتی۔''
''چلیں کچھ وقت ہم اکٹھے گزارتے ہیں......سگریٹ تو میں پیتا ہی رہتا ہوں، اپنے پیاروں کے ساتھ گزارنے کو وقت کم کم ملتا ہے۔'' اس کے لہجے میں کیا تھا......مجھے تو اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہ لگی تھی، شاید صرف چھت پر وقت گزارنے کا شوق کہ جس میں وہ تنہا بور ہوتے تھے۔
''چلیں......'' میں ان کے تعاقب میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

☆☆☆

''تم نے کبھی سگریٹ پی ہے گل؟'' ان کا سوال کتنا عجیب تھا۔
''میں نے؟'' میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے یا مذاق میں کہہ رہے ہیں؟''
''نہیں، میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں......''
''نہیں......کبھی نہیں!'' میں نے پورے وثوق سے جواب دیا۔
''ایک کش بھی نہیں؟'' سوال میں حیرت ہی حیرت تھی۔
''اوں ہونہہ......ایک کش بھی نہیں۔''
''حیرت ہے......تم نے یونیورسٹی میں کوئی ایسا دوست نہیں بنایا جو سگریٹ پیتا ہو اور اس کا ساتھ دینے کو کبھی ایک آدھا کش......''
''ہم یونیورسٹی پڑھنے کے لیے گئے تھے، دوست بنانے کے لیے نہیں اور ایسا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم لڑکوں سے دوستیاں کرتے اور ان کے ساتھ مل کر کش لگاتے۔'' کہتے ہوئے میرے لہجے میں سختی اتر آئی۔
''ضروری نہیں کہ لڑکے ہی سگریٹ پیتے ہوں، میرے دوستوں میں تو لڑکیاں بھی سگریٹ پیتی ہیں۔''
''جہاں رہ کر آپ نے پڑھا ہے وہاں شاید ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں......''
''میں وہاں کی نہیں، اسی ملک کی بات کر رہا ہوں، اسلام آباد کی بات کر رہا ہوں، ہم شاموں میں اپنی پارٹیوں میں سگریٹ پیتے ہیں تو ان میں لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی تفریق نہیں......''
''ہوتا ہوگا آپ کی ہائی سوسائٹی میں ایسا......ہمارے ہاں تو ایسی باتیں معیوب سمجھی جاتی ہیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔
''تمہارے خیال میں کیا یہ کوئی بہت بری عادت ہے یا کردار کا کوئی سقم؟''
''میں دوسروں کو ایسی باتوں پر جج نہیں کرتی زین بھائی......آپ کون ہیں، کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں......اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، بھلا مجھے اس سے کوئی فرق کیوں پڑے گا۔''
''تمہیں واقعی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟''

''مجھے کیوں فرق پڑے گا، آپ، آپ ہیں، جو آپ کرتے ہیں وہ آپ کی مرضی...... کیونکہ آپ اسے اپنے لیے مناسب سمجھتے ہیں، آپ کو برا نہیں لگتا تو آپ جو چاہے کریں......''

''تو کیا یہ سننے کے بعد بھی میں تمہیں برا نہیں لگا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''آپ مجھے کیوں برے لگیں گے...... آپ نے جب میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا تو!'' لاکھ مجھے یہ سن کر برا لگا تھا کہ وہ نہ صرف تنہا سگریٹ پیتے ہیں بلکہ ان کی صحبت ایسی ہے کہ جہاں مخلوط محفلیں ہوتی ہیں مگر مجھے اس سے کیا۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی ان کے منہ پر انہیں صاف، صاف کہہ دینے کی کہ ایسے لوگوں کو ہم اچھے کردار والے نہیں سمجھتے......بس مجھ سے ان کا دل نہیں توڑا گیا۔ میں نے سوچا آج یہ یہاں ہیں، کل نہیں ہوں گے پھر جانے کب کس کی شادی پر آئیں گے......شامیر کی، تمنا کی یا شاید میری۔ یہ سوچ آتے ہی میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں، شاید انہیں علم ہو کہ کامل کیوں اچانک چلا گیا ہے۔ ان کے خاندان سے تو ان کا ہمیشہ رابطہ رہا ہے مگر میں صرف سوچ کر ہی رہ گئی کہ ان کا اگلا سوال آیا۔

''تمہاری کبھی کسی سے دوستی ہوئی گل...... میرا مطلب ہے کہ پسندیدگی؟ کوئی ایسا جس سے عہد و پیمان ہوئے ہوں؟'' میں نے نظر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا، کہیں ان کو شک تو نہیں ہو گیا کہ میں اور کامل...... بھلا ان کو کیسے شک ہو گا، میں نے اپنی سوچ کو جھٹلایا، کیا مجھے ان کو بتا دینا چاہیے؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ 'اونہوں!' خود ہی جواب دیا، میں بھلا ان کو جانتی ہی کتنا ہوں کہ یہ کس قدر قابلِ بھروسا ہیں۔

''نہیں...... کسی سے بھی نہیں!'' میں نے کہا۔ ''آپ کو بتایا ہے کہ ہمارا مقصد تعلیم کا حصول تھا اور کچھ نہیں۔''

''تمنا کا تو میثاق سے سلسلہ تھا، کیسے ممکن ہے کہ یونیورسٹی کے اتنے سالوں میں کوئی تم پر فدا نہ ہوا ہو؟'' ان کے لہجے میں شرارت تھی۔ ''اتنے پیارے چہرے پر کوئی نہ کوئی تو عاشق ہوا ہو گا۔''

''اگر کوئی فدا ہوا بھی ہو گا تو یک طرفہ سلسلہ رہا ہو گا...... میں نے کبھی کسی میں دلچسپی نہیں لی۔'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلتی ہوں زین بھائی، تمنا کے ساتھ کھانا پکوانے میں مدد بھی کرنی ہے۔'' میں کیوں خواہ مخواہ وہاں بیٹھ کر اپنی صفائیاں دے رہی تھی۔

''میں ایک سگریٹ پی لوں؟'' انہوں نے جیب سے ایک اور پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی، میں خاموشی سے نیچے اتر آئی' میری طرف سے ایک سگریٹ چھوڑ دس پئیں...... پورا پیکٹ پئیں!'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

☆☆☆

بات' بات پر امو کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں، اسی روز تو شامیر واپس گیا تھا، جانتی تھی کہ اس کا جانا انہیں ہر بار اداس کر دیتا تھا۔ تمنا شاید مجھ سے کترا رہی تھی، مجھے نظر انداز کر رہی تھی یا مجھے ہی ایسا لگ رہا تھا۔ وہ زیادہ وقت حسنہ کے ساتھ پائی جا رہی تھی، وہی حسنہ جو اسے نک چڑھی اور مغرور لگتی تھی۔ یوسف اور عارب کے ساتھ مل کر وہ دونوں کوئی کھیل کھیل رہی تھیں۔ مجھے کوئی موقع نہیں مل رہا تھا کہ میں اس سے پوچھوں کامل کیوں یوں اچانک چلا گیا تھا۔ پھر علم ہوا کہ گل پھپو کی فیملی بھی واپس چلی گئی تھی، ہمیں ملے بغیر......خدا حافظ کہے بغیر......مگر کیوں؟ اسی سوال کا تو جواب نہیں مل پا رہا تھا۔

چلو رات کو تمنا سے پوچھوں گی......تمنا اور حسنہ مہمان خانے میں سوئی تھیں، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ اپنے گھر میں میری عمر کی وہ پہلی رات تھی جس رات تمنا ہمارے ہاں ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں سوئی تھی۔ مجھے کیسا عجیب لگ رہا تھا اس کے بغیر۔ شاید اس لیے کہ میں اپنے کمرے میں تنہا تھی، اسے تو اکیلا پن محسوس نہیں ہوا ہو گا ناں۔ اچانک کیا انقلاب آ گیا تھا کہ اس کی حسنہ کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ابو جان نے شامیر

سے حسنہ کے بارے میں رائے لی ہو اور اس نے ہاں کہہ دی ہو...... اسی لیے تو تک چڑھی حسنہ اب تمنا کی ایسی سہیلی بن گئی تھی کہ وہ میری اور اپنی سالوں کی رفاقت بھول کر اس کے ساتھ چپک گئی تھی۔ یہی وجہ ہوگی ورنہ تو چاچو کی فیملی ولیمہ ہوتے ہی اسی گھر سے رخصت ہو جاتی، جیسے گل پھپو چلی گئی تھیں ہمیں ملے بغیر۔

ان کا یوں چلے جانا مجھے ہضم ہی نہ ہو رہا تھا...... کچھ نہ کچھ تو دال میں کالا تھا۔

''کیا بات ہے تمنا...... کوئی زیادہ ہی گہری دوستی ہوگئی ہے تمہاری حسنہ کے ساتھ؟'' میں نے اسے اس وقت آڑے ہاتھوں لیا جب وہ اپنے کمرے میں دیر سے جاگ کر دانتوں کو برش کرنے کے لیے آئی تھی۔

''کرنا پڑتا ہے پیاری......'' اس نے شرارت سے آنکھ میچی۔ ''آخر کو ان سے ہمارا دُہرا رشتہ بننے جا رہا ہے۔'' کہہ کر وہ چھپاک سے غسل خانے میں چلی گئی اور میں نے اپنے اندازے کی درستی پر خود کو شاباش دی۔

☆☆☆

''ڈاکٹر یاسمین نے کہا ہے کہ میں تمہیں ساتھ لے کر ان کے پاس جاؤں۔'' میں نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر کہا۔

''مجھے نہیں جانا کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے۔

''مما سے پوچھ لو...... انہوں نے کہا تھا کہ......''

''سن لیا ہے ایک بار!'' اس نے میری بات درمیان سے اچکی۔ ''مما بتا چکی ہیں مجھے اور یہ بھی بتا چکی ہیں کہ وہ کیا کہے گی، بہت دیر ہو چکی ہے وغیرہ، وغیرہ!''

''انہوں نے کہا ہے کہ ایسی کسی کوشش میں میری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے......'' میں نے گھگیا کر کہا۔

''ایک تو یہ عورتوں کے ڈھکوسلے......'' وہ چڑ کر بولا تھا۔ ''میں کسی اور ڈاکٹر کا پتا کرتا ہوں۔''

''اگر میں اس بچے کو پیدا کرنا چاہوں تو؟''

''تو تم کر لو...... تمہارا بچہ ہے، جو مرضی کرو۔''

''تو کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ یہ تمہارا بچہ نہیں ہے؟'' میں نے تذلیل کے احساس سے مغلوب ہو کر سوال کیا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا...... اپنے الفاظ میرے منہ میں ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔'' اس نے دہاڑ کر کہا، میں سہم گئی۔

''تو پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ میرا بچہ...... ایسا کیوں نہیں کہا کہ ہمارا بچہ؟'' میں نے مان سے شکایت کی۔

''کیونکہ یہ صرف تمہارا بچہ ہے...... تم نے اسے پیدا کرنے کا سوچا ہے، میری زندگی میں ابھی بچے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ابھی تو میں خود بچوں کی طرح سوچتا ہوں...... ابھی میرے کئی نامکمل پلان ہیں......''

''کون سے ہیں تمہارے نامکمل پلان؟'' میں جھنجلائی۔ ''مجھے بھی تو علم ہو...... اگر تمہاری زندگی میں بچے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر شادی کیوں کی تھی؟ یوں ہی رہتے ماں باپ کے بچے بن کر، شادی کا منطقی انجام تو بچہ ہے ہی!''

''شادی کیوں کی تھی؟'' اس نے میری طرف گھور کر دیکھا اور گویا ہوا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ شادی کیوں کی تھی میں نے تم سے؟''

''نہیں، مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی...... کیونکہ نہ میں تمہارے معیار پر پوری اترتی ہوں، نہ تمہارے گھر میں کسی اور کے۔ تو پھر کیوں کیا ایسا مجبوری کا سودا، کیوں اتنی زندگیوں کو عذاب کیا؟''

''محبت...... مائی ڈیئر محبت...... تمہارے سب سوالوں کا جواب ایک لفظ محبت ہے۔'' اس کے لہجے میں وہ گرمی، وہ جذبہ اور وہ لطافت نہ تھی جو کوئی شخص محبت کا اظہار کرتے وقت اپنے لہجے میں سموتا ہے۔

''کب تھی تمہیں مجھ سے اتنی محبت؟ اگر تھی تو وہ محبت اب کہاں گئی؟'' میں نے سوال کیا۔
''میں نے کب کہا کہ مجھے تم سے اتنی محبت ہے؟'' وہ ہنسا۔
''ابھی تو تم نے کہا کہ محبت......'' میں اس کے جواب سے سٹپٹا گئی۔
''میں نے قطعی نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے!'' وہ ہنسے جا رہا تھا۔

☆☆☆

''آپ کو مبارک ہو مس گل...... میری بہن نے بتایا کہ آپ پریگننٹ ہیں۔'' نتاشا کی مما اس روز نتاشا کو اسکول چھوڑنے آئیں تو انہوں نے موقع دیکھ کر مجھے پکڑا۔

''اوہو...... تو انہوں نے آپ کو بھی بتا دیا۔'' میرے لہجے میں تشویش تھی، میں ابھی اس کی تشہیر نہیں چاہتی تھی، جانے مجھے کیا فیصلہ کرنا پڑے اور پھر اسکول انتظامیہ کو علم ہوگا تو وہ کیا سوچیں گے...... میں نے تو ان سے کہا تھا کہ ابھی ہمارا بچہ پیدا کرنے کا کوئی پلان نہیں۔ میں خود کو مجرم جیسا محسوس کر رہی تھی جیسے مجھ سے کوئی ناجائز کام سرزد ہو گیا ہو۔

''آپ پلیز اس بات کو ابھی اپنے تک ہی رکھیے گا......'' میں نے اس سے درخواست کی۔
''مگر یہ تو خوشی کی خبر ہے، ایسی خبر تو سب کے ساتھ شیئر کرنا چاہیے۔'' وہ مصر تھیں۔
''آپ پلیز چند دن تک اس خبر کو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔'' میں نے پھر کہا تو وہ مان گئیں۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' ہاتھ ہلاتی ہوئی وہ چلی گئیں اور میں اپنی کلاس میں آ گئی۔ آرٹ ٹیچر بورڈ پر اسکیچ بنا رہی تھی جو بچوں نے کاپی کرنا تھا اور میں بچوں میں ڈرائنگ پیپر اور پنسلیں تقسیم کر رہی تھی۔ سب بچے بورڈ سے دیکھ کر اسکیچ بنا رہے تھے جبکہ نتاشا کا اسکیچ بورڈ کے سکیچ سے بہت مختلف تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے گزر گئی، جانے وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔

''نتاشا آپ کیا بنا رہی ہیں...... بورڈ پر تو کچھ اور بنایا ہے میں نے؟'' آرٹ ٹیچر کی آواز آئی۔

''میم میں میڈم گل کا بے بی بنا رہی ہوں جو پانچ مہینے کے بعد اسپتال میں آئے گا۔'' اس کا یہ کہنا تھا کہ مجھے کوئی جگہ نہ مل رہی تھی کہ جہاں میں فرار ہو کر جاتی یا زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں اتر جاتی...... اس بات کا کوئی اور نقصان نہیں تھا سوائے اس کے کہ گھنٹی بجتے ہی، آرٹ ٹیچر کے باہر نکلتے ہی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی۔

''میں ذرا واش روم سے ہو آؤں......'' میں نے آرٹ ٹیچر سے کہا اور تیز، تیز قدموں سے پرنسپل کے دفتر کا رخ کیا، جیسے ذرا سی دیر ہو گئی تو بات مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

''یہ آپ نے کیا، کیا مس گل؟'' ان کا کہنا تھا کہ میں شرمسار ہو کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ''آپ ایسا نہیں کر سکتیں!'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔ ''ہم...... میرا مطلب ہے کہ اسکول اس وقت ایسا کوئی سلسلہ افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔'' میں حیرت سے سوچ رہی تھی کہ اسکول کا اس سلسلے سے کیا تعلق ہے۔ ''آپ کو کچھ کرنا ہوگا اس کا مس گل! ہم اس وقت آپ کا پریگننٹ ہونا افورڈ نہیں کر سکتے...... you may see a doctor to get rid of it''

وہ کون ہوتی تھیں مجھ سے ایسی بات کرنے والی؟ میری کنپٹیوں میں خون ابلنے لگا، میں انہیں کوئی سخت جواب دینا چاہ رہی تھی، کم از کم میں اس نوکری پر لات مارنا چاہ رہی تھی مگر مجھے لگا کہ میری زبان اور ٹانگیں مفلوج ہو گئی ہیں...... ''اب تم جا سکتی ہو!'' انہوں نے کہا تو میں مرے، مرے قدموں سے ان کے آفس کے بیرونی دروازے کی طرف چلی، دروازہ کھولا، مڑ کر انہیں دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی، اس دفتر سے نکلتے ہی آنسو، آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلے۔

(جاری ہے)

عید، محبت اور تم

زندگی تنویر خلیل

گرمی نے ماحول پر بہت کثافت سی طاری کردی تھی۔ مارے گرمی کے سب کا برا حال تھا۔ پسینے، پسینے اور بس پسینے..... اب ایسے موسم میں رمضان کی آمد ..... سب کے لیے امتحان تھی۔ دن گرم اور رات ... لوڈشیڈنگ کی نذر..... ایسے میں حیات ہاؤس پر مکمل خاموشی کا بسیرا تھا۔ لاؤنج میں عالیہ بی بی ابھی تک ٹیلی فون کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ گرمی کے مارے ان کا بھی برا حال تھا مگر صبر سب سے عظیم تھا۔



داخلی دروازہ عبور کر کے وہ بہت کوفت زدہ انداز میں اندر داخل ہوئی۔ چڑچڑی سی...... لاؤنج میں داخل ہوکے اس کا دماغ بھک سے اڑا۔

''امی!'' وہ ان کے پاس آکے چلائی۔ ''آپ کو کب یقین آئے گا کہ ان کے دل اب پگھلیں گے تو ہرگز نہیں۔ پھر آپ خود کو اتنا تھکاتی کیوں ہیں؟''

''کیا پتا پگھل ہی جائے۔ انزلہ تم اتنی ناامیدی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟'' عالیہ بی بی ہلکی سی اداسی سے مسکرائیں۔ اس نے بیگ صوفے پر اچھال دیا اور خود صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ کے جوتے اتارنے لگی۔

''یہ آپ کی خوش فہمیاں ہیں اور کچھ نہیں۔''

''ایک دن دیکھنا، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ ہنس دی اور ایسے ہنسی جیسے کوئی لطیفہ سن لیا ہو۔

''اچھا اب یہ دانت نکالنا بند کردو اور یہ بتاؤ کہ کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔'' عالیہ بی بی نے فکرمندی سے پوچھا۔

''آپ نے اپنے صبر کے پھل جو کھلا دیے آتے ہی۔'' انزلہ نے صوفے پر آلتی پالتی مارلی۔ ٹیلی فون رکھ کے عالیہ بی بی نے کچن کا رخ کیا جو لاؤنج کے ایک طرف تھا۔

''اسکول میں کچھ کھایا تھا؟''

''اسکول میں کیا ہوتا ہے ماں...... ایک پیالی چائے اور ایک عدد سموسہ...... اب بندہ مسلسل پانچ پیریڈ لے اور پھر یہ اکرام...... پیٹ تو بھرتا ہے، واللہ دل بھر گیا۔'' اس نے سارے دن کی بپتا سنا ڈالی۔

''چائے بنادوں؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''چائے رہنے دیں، بوا کے ہاتھ کی پٹرول نما چائے پی چکی ہوں اسکول میں۔ آپ یہ بتادیں کل والے لوگ کیا کہہ کر گئے ہیں۔ اب تو ان لوگوں سے میں تنگ آگئی ہوں۔ آدھی تنخواہ تو ان کی خاطر مدارات میں چلی جاتی ہے، میں کیا سارا دن اسکول میں جھک مارتی ہوں اور یہاں......'' اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

عالیہ نے بریانی گرم کر کے انزلہ کے سامنے رکھی، سلاد اور رائتہ اور پانی کا بھرا گلاس بھی لاکر رکھا۔

''بس...... اب اچھے رشتوں کی کمی آگئی ہے بیٹا۔'' وہ کھانا کھا چکی تھی۔ ماں کی بات پر اسے غصہ آیا۔ اور حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''اچھے رشتے نہیں امی، اچھے لوگ محض اپنے لیے ''اچھے'' ڈھونڈتے ہیں، اب بھلا ایک بیوہ عورت جو دس ہزار پنشن لیتی ہو اور ایک جوان لڑکی جو ایک پرائیویٹ اسکول میں استانی ہے، بھلا کوئی کیوں رشتہ کرنے آئے گا۔ ہم تو اچھے نہیں ہیں ناں، اچھے تو بینک بیلنس والے ہوتے ہیں ناں۔'' وہ تلخی سے بولی، عالیہ بی بی بس مسکرا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

یوٹیلیٹی اسٹور پر کافی رش تھا، وہ کب سے قطار میں کھڑی تھی۔ پسینے سے اس کا برا حال تھا۔ ابھی رمضان میں دو دن رہتے تھے سو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج ہی سب کام نپٹا دے۔ امی کی دوائیاں، سبزی، دالیں الغرض گھر کا سب راشن...... صبح اس نے اسکول سے چھٹی کرلی تھی۔ وہ کھوسٹ پرنسپل بڑی مشکل سے راضی ہوا تھا۔

☆☆☆

فیروز صاحب اور رقیہ بیگم کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ علی فیروز اور حیات فیروز...... حیات فیروز نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ جس کی بنا پر باپ نے اس سے سارے رشتے ناتے توڑ لیے تھے۔ حیات فیروز کی شادی جب عالیہ سے ہوئی تھی تو اس نے چند ہی مہینوں میں سارے گھر کو جنت بنا دیا تھا۔ ایک سال بعد ان کے گھر میں انزلہ چاندنی بن کر اتری تو ان کی زندگی میں گویا اجالے بکھر گئے۔ دن رات بہت اچھے گزر رہے تھے۔ اچانک ان کی زندگی کو گویا کسی کی نظر کھا گئی تھی ابھی انزلہ صرف آٹھ سال کی تھی تب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں حیات فیروز کی جان چلی گئی۔ شکر

یہ تھا کہ پنشن کی سہولت فراہم تھی ورنہ یہ دنیا یقیناً دوزخ بن جاتی...... عالیہ بی بی نے کفایت شعاری اور سلیقے سے دو کمروں کا گھر بھی بنا لیا تھا۔

انزلہ جب جوان ہوئی تب سے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی آس پہ ٹیلی فون کے ساتھ چپکی ہوتی ہیں، ہر گھنٹی پر لگتا کہ شاید حیات فیروز واپس آجائیں گے۔ ماں سے پوچھا مگر انہوں نے کبھی نہ بتایا مگر پھر اس کا اصرار اتنا بڑھ گیا کہ انہیں مجبوراً بتانا پڑا۔

”تمہارے ابو نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے دادا کے ساتھ رابطے میں رہوں، کیا پتا وہ تمہارا ذرا سا مان رکھ لیں۔“ اسے یہ لفظ ”ذرا سا“ جان کے بہت برا لگا۔ انزلہ نے کبھی دادا، دادی یا اور کسی ددھیالی رشتے کو نہیں دیکھا تھا۔ ہاں البتہ علی چچا کو کئی بار دیکھا تھا۔ اب عالیہ کو انزلہ کی شادی کی فکر لاحق تھی۔ اور یہ سچ ہے کہ جب بیٹی جوان ہو جائے تو ہر ماں کو فکر سی لگ جایا کرتی ہے۔

اس نے یوٹیلٹی سے سودا سلف لیا، امی کی دوائیں لیں اور بینک سے ابو کی پنشن وصول کر کے اور بجلی اور گیس کے بل بھی جمع کروائے۔ اب وہ فٹ پاتھ پر آہستہ، آہستہ چل رہی تھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ فٹ پاتھ پر چند اوباش نوجوان کھڑے ہیں۔ وہ فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ خدا، خدا کر کے وہ ان نوجوانوں سے آگے نکل آئی تھی۔ وہ اب دور سے ہی آوازے کس رہے تھے، انزلہ درود پاک کا ورد کرتی ہوئی، ہاتھوں میں سامان کے بھاری تھیلے تھامے چلتی چلی آرہی تھی۔ تبھی ایک گاڑی کے بریک اس کے بہت قریب ہی چرچرائے تھے کہ اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ٹک، ٹک، ٹک ساری سبزیاں دائیں ہاتھ سے گر گئیں اور چند ٹماٹر ٹائر کے نیچے آکر کچومر ہو گئے۔

اس کا دماغ ساتویں آسمان سے باتیں کرنے لگا، آنکھوں میں تپش اُگل آئی۔ ”یہ امیر زادے......“ وہ نہایت غصے اور تاسف کے عالم میں بکھرے ٹماٹر دیکھ رہی تھی۔ جبھی ایک سوٹڈ بوٹڈ، نہایت خوبرو جوان عینک چڑھائے شرمندگی کے تاثرات کے ساتھ گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”آئی ایم سوری...... وہ معذرت کرتا، نیچے کو جھک گیا۔

”تو خیال سے گاڑی چلاتے ناں...... نشے میں کیوں چلاتے ہو۔“ اس نے مشتعل انداز میں کہا۔

نوجوان کا حیرت سے برا حال تھا۔ اس نے ایک بار پھر سے معذرت کی۔

”اب معافی سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ یہ سارے ٹماٹر اٹھائیں انہیں اپنی گاڑی میں رکھیں اور مجھے دو کلو ٹماٹر وہ سامنے والی دکان سے جلدی سے لا کر دیں۔“ اس نے خالص دکاندارانہ لہجے میں کہا۔

باقی کے تھیلے وہ فٹ پاتھ پر رکھ چکی تھی۔

”سوری مس! یہ پیسے رکھ لیجیے۔ مجھے ایک ضروری میٹنگ کے لیے جانا ہے۔“ اس نے والٹ تک نکال لیا تھا۔

”میں نے ابھی مارکیٹ میں اتنی مغز ماری کی ہے اور اب آپ ایک بار پھر سے مجھے کوفت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ شرافت سے دو کلو ٹماٹر خرید کر لائیں ورنہ اگر میں......“

”دیکھیے مس......“ وہ نوجوان واقعی میں کوئی شریف تھا۔ کم از کم انزلہ کو تو یہی لگا۔ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ایک دفعہ پھر اس نے معافی مانگی۔

”بس میں نے کہا ناں شرافت سے دو کلو ٹماٹر خرید لاؤ۔ ایک تو ساری پالک کا بھی ستیاناس کر دیا اور اوپر سے کہہ رہے ہیں کہ پیسے لے لیں اور خرید لیں۔“ اب کی بار، ذرا سا دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

اس نے چار و ناچار دکان کی راہ لی۔

”میں آپ کو ڈراپ کر دوں؟“ دو کلو ٹماٹر اس سے وصول کر کے جب وہ جانے لگی تو اس نے کہا۔

”آپ کو میٹنگ سے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ رکی

اور طنزیہ کہا۔
وہ بس مسکرا کر رہ گیا تھا۔
''مس دکاندار! پھر ملیں گے۔'' چلتے، چلتے وہ۔۔ بڑبڑایا تھا۔

☆☆☆

آج پہلا روزہ تھا۔
سحری اس نے بنائی، امی کے جوڑوں میں آج کل بہت درد رہنے لگا تھا۔ سو اس نے امی کو چارپائی پر بٹھا کر گھر کے سارے کام اپنے ذمّے لے لیے تھے۔ ویسے بھی آج کل چھٹیاں تھیں۔
سحری کے بعد نماز پڑھی۔ ایک پارہ تلاوت کیا اور آکر سوگئی۔ گیارہ بجے اُٹھی اور پھر سے کام کرنے میں جت گئی۔
وہ چاہتی تھی کہ آج محلے کے گھروں میں کچھ افطاری بھیج دے۔ کچن میں تو جیسے گرمی بلا کی تھی۔ اس نے افطاری اور کھانا بنانے کی تیاری شروع کردی۔ گھر میں دو افراد کے علاوہ کوئی تھا نہیں اس لیے روز صفائی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پھر بھی امی سے جتنا ہوسکا گھر کے کام نمٹاتی رہیں، عصر کے بعد اس نے برتن وغیرہ نکالے، پکوڑوں اور فروٹ چاٹ کی تیاری کی اور اب محلے میں بانٹنے کی غرض سے پلیٹوں اور ڈونگوں میں چیزیں نکالنے لگی۔ وہ چاہتی تھی مغرب کی اذان سے کافی پہلے ہی افطاری سب جگہ پہنچا دے۔ ابھی وہ آخری پڑوس میں دے کر آئی تھی کہ امی کی آواز آئی۔
''انزلہ، اب جلدی سے آؤ اذان ہونے والی ہے۔''
''جی امی......'' امی نے دسترخوان سجایا ہوا تھا۔
چند لمحوں بعد وہ دسترخوان پر آبیٹھی تھی۔ عالیہ خشوع و خضوع سے دعا کررہی تھیں۔ اور انزلہ کی آنکھوں میں جانے کیوں دعا کرتے ہوئے وہ نوجوان گھوم رہا تھا۔
اذان شروع ہوئی اور دونوں نے کلمہ اور دعائے افطار پڑھ کر روزہ کھول لیا تھا۔ آج اسے شدید پیاس لگ رہی تھی جبھی اس نے شربت کا گلاس غٹاغٹ پی لیا۔

☆☆☆

وہ دسواں روزہ تھا جب وہ ایک کتاب خریدنے بک اسٹال پر موجود تھی۔ عموماً وہ اسکول کی چھٹیوں میں دوسری کتابیں خریدتی تھی۔ اسکول کے دنوں میں فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اب وہ جلدی، جلدی اپنی مطلوبہ کتابیں دیکھ رہی تھی کہ گھر میں کافی کام تھے۔ صفائی، روزے کے لیے اہتمام اور تو اور کل اسے دیکھنے کے لیے کچھ لوگ بھی آرہے تھے۔ سو آج سے ہی انتظام کرنا تھے۔ بتول خالہ کے توسط سے آنے والے لوگ ہمیشہ پیٹ پوجا کر کے چلے جاتے اور پانچ سو کا نوٹ بتول خالہ ہمیشہ پلو میں باندھ کے کہتیں۔ ''بس اللہ بچی کا نصیب اچھا کرے۔''
نصیب تو کیا خاک اچھا ہونا تھا گھر کی اچھی خاصی جمع پونجی اس ''نصیب مارے'' پہ لگ جاتی تھی۔
اس نے شفیق الرحمٰن کی حماقتیں اور چند اور کتابیں خرید کے دکاندار کو جلدی سے پیسے پکڑائے اور جیسے ہی مڑنے والی تھی۔ اس کی نظر اس نوجوان پہ پڑ گئی۔ وہ گاڑی سے اتر رہا تھا۔ غالباً وہ بھی انزلہ کو دیکھ چکا تھا۔ جبھی اسی کی طرف آنے لگا، وہ کھسکنے لگی مگر نوجوان نے جا ہی لیا۔
''ہیلو مس دکاندار......'' وہ خوش دلی سے بولا۔
''ہائے......'' وہ مسکرائی۔
''کیسی ہیں آپ؟''
''جیسی تھی ویسی ہی۔'' اس نے کندھے اچکانے والے انداز میں کہا۔
''ہاں! صحیح کہا، بدلی تو بالکل نہیں۔'' اس کا انداز بھی سادہ سا تھا۔ انزلہ کو اچھا لگا تھا۔
''ویسے آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟''
''میرا نام احزار ہے، اپنا بزنس کرتا ہوں، صرف امی ہیں اور ابو کو فوت ہوئے ابھی ایک سال ہوا ہے۔''
''اوہ......سن کے افسوس ہوا۔ ہائے داوے...... میرا نام انزلہ حیات ہے، بی اے کیا ہے میں نے، میرے ابو کا انتقال تب ہوا تھا جب میں آٹھ سال کی

تھی۔ میری بھی صرف امی ہیں کوئی بہن، بھائی نہیں اور میں ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی ہوں۔“ اس نے خاصی تفصیل سے بتایا۔

”آپ کا گھر کہاں ہے؟ چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر آفر کی تھی۔

”اوہ نو تھینکس، میں رکشا کرلوں گی......“ اس نے ایک بار پھر سے اس کی آفر قبول نہیں کی۔

”اچھا چلیے، جب بھی کوئی کام ہو تو یہ کارڈ رکھ لیجیے۔ آپ مجھے بلاناغہ بھی کال کرسکتی ہیں۔“

”شکریہ۔“ اس نے پھر اس کی شرافت سے متاثر ہو کر اپنا نمبر بھی اسے دے دیا...... حالانکہ ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا مگر وہ بھی انزلہ تھی بولڈ۔

وہ مسکرایا۔

☆☆☆

سارا گھر اس نے چمکا دیا تھا۔ امی کہہ رہی تھیں کہ دیکھنے والے لوگ افطاری کے بعد آئیں گے۔ اس نے سب ضروری کام نبٹا دیے تھے۔ افطاری کے بعد، سارے برتن سمیٹ لیے پھر نماز سے فارغ ہو کر مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ سب کام کر کے جب وہ کمرے میں آئی تو موبائل پر میسج جگمگا رہا تھا۔

”میرے ساتھی......

مری یہ روح میرے جسم سے پرواز کر جائے
تو لوٹ آنا

میری بے خواب راتوں کے عذابوں پر
سسکتے شہر میں تم بھی
ذرا سی دیر کو رکنا

مرے بے نور ہونٹوں کی دعاؤں پر
تم اپنی سرد پیشانی کا پتھر رکھ کے رو دینا
بس اتنی بات کہہ دینا

مجھے تم سے محبت ہے......“ (کلام! نوشی گیلانی)

کوئی انجان نمبر تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کون ہوگا...... اس نے فون پاورڈ آف کر دیا تھا اور تیار ہونے لگی۔

''انزلہ!''امی آواز دیتی اس کے کمرے میں آگئی تھیں۔

''جی امی......!''وہ چوٹی بنانے میں مگن تھی۔

''بتول کے ساتھ وہ لوگ آگئے ہیں، تم ذرا صحیح سے تیار ہو کر آنا اور ہاں پچھلی دفعہ کی طرح تیل کی شیشی میں غوطے لگا کے مت آنا سمجھ گئیں۔'' وہ قطعیت کے ساتھ کہہ گئیں اور انزلہ منمنا کے رہ گئی تھی۔

وہ جب لاؤنج میں گئی تو بتول خالہ اس کی تعریفوں میں زمین، آسمان ایک کر رہی تھیں۔ وہ بتول خالہ کی اس چاپلوسی پر مسکرا کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بتول خالہ جیسی عورتوں کا یہی شیوا ہے۔ وہ مسکراتی ہوئی امی کے ساتھ جا بیٹھی۔

جب چائے وغیرہ سے وہ فارغ ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ امی کچھ بجھی بجھی سی ہیں حالانکہ یہ تو ہر دفعہ ہی ہوتا تھا دیکھنے والے لوگ دو دن کی مہلت لے کر چلے جاتے اور پھر ایک مہینہ نکل جاتا، یہ لوگ بھی چلے گئے تھے۔

''بس اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔'' بتول خالہ نے پانچ سو کا کڑک... نوٹ لے کر کہا۔

''برائے مہربانی خالہ، آئندہ کسی کو بھی یہاں نہ لایئے گا۔'' وہ اندر تک سلگ گئی تھی۔

''آئے ہائے بیٹی، کیا آفت آگئی؟'' بتول خالہ کو انزلہ کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔

''بس...... میں نے کہہ دیا ہے۔'' قطعیت بھرا لہجہ......

''میں تو اچھی خاصی بھلائی کرنے آئی تھی عالیہ......مگر مجھے کیا پتا تھا کہ نصیبوں کی کالی کی زبان بھی اتنی ہی کالی ہوگی۔'' بتول خالہ نے ہاتھ بھی باقاعدگی سے نچائے۔

انزلہ کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔ ''تو پھر یہ بھلائی ''پانچ سو'' میں کیوں بیچ دیتی ہو، یہ کالی زبان اور کالی نصیب کس کو کہا؟ ہاں اپنی بیٹیوں کے رشتے کرلو خالہ......تیس سال کراس کر گئی ہیں اور میں کون سی بوڑھی ہو گئی ہوں......'' اکیس سالہ انزلہ نے اچھی خاصی ان کی طبیعت صاف کر دی تھی۔

بتول خالہ پیر پٹختے ہوئے چلی گئیں عالیہ مغموم
بیٹھی تھیں۔ وہ لوگ بھی دو دن کا کہہ کر گئے تھے

''نہیں'' وہ عالیہ کے پاس بیٹھ گئی۔

''امی......'' آہستگی سے ہاتھ پکڑا۔ ''چھو
دیں یہ سب کچھ، کیوں خود کو اور مجھے بلاوجہ ہلکا
کرتی ہیں۔''

''ہلکان نہیں کرتی، فرض نبھا رہی ہوں۔''

''تو کیا میں اب صرف فرض بن گئی ہوں۔''

''نہیں پگلی......'' وہ جبراً مسکرائی تھیں۔ ''می
تمہیں اپنے گھر میں آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''تو آباد تو ہوں یہاں۔''

''کملی......! یہ آباد ہونے والی جگہ نہیں، آبا
سسرال میں ہوا کرتے ہیں۔''

''امی آپ بھی ناں۔'' وہ اٹھی۔ عالیہ بس مسکرا کر
گئی تھیں۔

☆☆☆

رات کو وہ جب سونے کے لیے لیٹی تو اسی نم
سے کال آئی جس نے نوشی گیلانی کی نظم بھیجی تھی۔ یہ
سے ایک ہفتہ قبل کا ذکر تھا۔

''ہیلو! جی کون؟''

''میں ہوں، مس دکاندار......'' اس نے پہچان
وہ وہی نوجوان احزار تھا۔

''کیسے ہیں آپ......؟'' وہ مسکرائی۔

''کیسا ہو سکتا ہوں؟'' اس نے بھی برجستگی سے پوچھا۔

''مجھے تو کوئی نشے باز لگتے ہیں جو مست اند
میں گاڑی چلاتے ہیں۔ اور ایک غریب بیچاری لڑ
سے ٹکرا جاتے ہیں۔'' اس نے ہونٹ دانتوں
دباتے ہوئے کہا۔

''تو دو کلو ٹماٹر نقصان تھا؟'' اس نے جیسے حیر
سے چیخ مارنے کے سے انداز میں پوچھا۔

''آپ بزنس مین صاحبان کو کیا پتا؟ کہ یہ ک
مہنگے ہیں جو کبھی دکان پر نہ گئے ہوں وہ اس عظیم نقصا

کو کیا جانیں۔'' اس کا موڈ آج بہت خوشگوار تھا۔ احزار نے اندازہ لگالیا تھا۔

''امی بلا رہی ہیں، انشاء اللہ پھر بات کریں گے۔'' اس نے کال ڈراپ کرنا چاہی۔

''رکیے..... رکیے انزلہ، ایک بات آپ سے کہنی تھی۔''

''کیا؟'' انزلہ کا دل حلق تک آ گیا۔

''وہ ..... میں امی کو بھیجنا چاہتا ہوں، آپ کی طرف۔'' اور انزلہ کو لگا کہ گرمی میں بہار رُت آ گئی ہو، پھول جیسے کھلنے لگے ہوں، ہاں یہی تو افسانوں میں بھی ہوتا ہے تو کیا حقیقی زندگی میں بھی یہ.....

''جی.....'' کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

اور پھر واقعی وہی ہوا جو ڈراموں اور افسانوں میں ہوتا ہے پھر جیسے آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔ احزار کی امی نے انگوٹھی پہنائی اور اس کا ماتھا چوم کر کہا تھا۔

''بہت پیاری ہے بہن آپ کی بیٹی بالکل آپ جیسی۔''

احزار کی امی بہت نائس خاتون تھیں، عالیہ مارے خوشی کے ہواؤں میں اُڑ رہی تھیں مزید یہ کہ احزار نے جہیز کے نام پہ کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا اور عید کے روز وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

عالیہ اب پھر سے ٹیلی فون کے ساتھ لگ گئی تھیں۔ علی فیروز آج کل سعودی عرب میں تھے سو صرف ایک امید تھی اور وہ فیروز صاحب تھے۔ جو ابھی حیات تھے۔

''امی! آپ دیں مجھے فون۔'' انزلہ نے فون ان کے ہاتھ سے لے کر کہا۔ ''اب آپ مجھ پر سب کچھ چھوڑ دیں۔'' عالیہ آنسو پونچھتی اٹھ کر چلی گئیں۔

بیل جا رہی تھی..... بیل جا رہی تھی..... اس کا دل دھک، دھک دھڑک رہا تھا۔ معاً کسی نے فون اٹھایا۔

''ہیلو.....!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''جی کون.....؟'' کسی خاتون نے فون اٹھایا۔

''جی..... میں فیروز صاحب کی پوتی ہوں، حیات فیروز اور عالیہ بی بی کی اکلوتی بیٹی۔''

چند لمحے سناٹا چھایا رہا۔ ''تم حیات..... کی اولاد.....'' آگے سے خاتون رو دی تھیں۔ یقیناً وہ اس کی دادی تھیں۔

''دادو.....'' اس نے ہلکی سی سسکاری بھری۔

''دادو مجھے دادا سے بات کرنی ہے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''اچھا ایک منٹ ٹھہرو.....'' یہ کہہ کر دادو نے شاید انہی کو فون دیا۔

''کون.....؟'' بھاری مردانہ آواز ابھری۔ بالکل ابو جیسی..... اس نے وہی الفاظ دُہرائے۔

چند منٹ خاموشی چھائی رہی۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''کیا چاہیے تمہیں؟''

وہ رو دی تھی۔ ''عید کے روز میری شادی ہے دادا..... ابو اب اس دنیا میں نہیں ہیں، مجھے رخصت کرنے کے لیے آپ کا سایہ چاہیے۔ کیا یہ حق مجھے نہیں ملے گا؟'' اس نے روتے، روتے پوچھا۔ کھٹاک سے فون بند ہو گیا تھا۔ اور اس نے ڈھیر سارا رو لیا تھا۔

''ابو.....''

☆☆☆

آج چاند رات تھی۔

سب لوگ بہت خوش تھے، بازار میں آج کل بہت رش تھا۔ احزار کے گھر سے آج عیدی آئی تھی اور اس کا برائیڈل سوٹ بھی..... سوٹ دیکھ کر تو اس نے انگلیاں دانتوں تلے داب لی تھیں..... ایسا خوب صورت سوٹ.....

''بتول کیسے کہہ کر گئی تھیں۔ کالی نصیب والی، دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ ہماری سمدھن تو واللہ ایسی نفیس ہیں کہ جوڑ نہیں.....'' عالیہ نے ماتھا چوم کر کہا۔ وہ دلکشی سے مسکرائی تھی۔ احزار کا فون آیا تھا۔

''جوڑا پسند آیا؟''
''جی، جی شکریہ......'' وہ اتنا ہی کہہ پائی۔
''کل بات کریں گے۔'' انزلہ نے موبائل آف کیا۔
وہ سمجھی تھی کہ اس کی عید عام لڑکیوں کی طرح نہیں گزرے گی مگر اسے کیا پتا تھا کہ یہ عید واقعی بہت انوکھی ہوگی۔

☆☆☆

پھر وہ انوکھی عید آہی گئی۔
وہ سرخ کامدار برائیڈل سوٹ میں بڑی جاذب نظر دکھ رہی تھی۔ احزار نے خود سے بیوٹیشن بھیجی تھی۔ بیوٹیشن کے فن نے اسے مزید فن پارہ بنا دیا۔
عید کی نماز کے بعد اس کی رخصتی تھی۔ وہ بہت خوش تھی مگر اداس بھی بہت تھی۔ جب بارات آگئی اور اسے احزار کے ساتھ بٹھا دیا تو دل بہت بوجھل ہونے لگا۔ امی نے ماتھا چوم کے ماشاء اللہ کہا تو اس نے پوچھا۔
''امی! کیا ابو......'' اور لفظ ابو کے ساتھ وہ رو دی تھی۔ ''دادا نہیں آئیں گے؟ کیا میں پا کر بھی تہی داماں رہوں گی۔''
اس کے جواب میں عالیہ نے ایک بار پھر سے ماتھا چوم لیا۔ ''صبر کرو......'' کہہ کر جلدی سے مڑ گئی تھیں۔
احزار مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنی پہلی نظر والی محبت پالی تھی۔ محبت پانا، کائنات مسخر کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ فوٹو سیشن شروع ہوگیا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا لیکن جب پلکیں اٹھائیں تو نظریں اٹھنا محال ہوئیں۔
سفید شلوار قمیص پر سیاہ واسکٹ پہنے وہ....... فیروز صاحب ان کے ساتھ نفیس سی ساڑی پہنے ایک بوڑھی سی خاتون تھیں۔ وہ یقیناً اس کی دادی تھیں، اس نے پہچان لیا تھا۔
''دادا، دادی......'' وہ لپک کے اٹھی۔ اٹھ کر دادا کے ساتھ لپٹ گئی۔
''دادا......'' وہ اس کے سر پر دھیرے، دھیرے ہاتھ رکھ رہے تھے۔

''میرے حیات کی بیٹی۔'' عالیہ نے انہیں صوفے پر بٹھایا۔ وہ کہہ رہے تھے۔
''میں نے اپنی فضول ضد اور انا سے اپنا بیٹا گنوا دیا۔ میں نے مزید غفلت برتی کہ اپنے بیٹے کی اکلوتی نشانی سے بھی غافل رہا۔ مگر اب مزید غفلت نہیں ہوگی۔ عالیہ بیٹا انزلہ کے بعد تم اب ہمارے ساتھ رہوگی۔''
عالیہ نے حیرت سے دیکھا۔ یہ فراخ دلی اور یہ صبر کا پھل...... کتنا میٹھا ہوتا ہے۔
''عالیہ تم دل سے ہمیں معاف کردو......'' رقیہ بیگم نے عاجزی سے کہا تو عالیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ...... میں تو اس آس پر زندہ تھی کہ کب آپ مجھے معاف کردیں گی۔''
گلے شکوے جب دور ہوئے تو سب کے دل صاف شفاف ہوگئے، کھانے کا دور چلا۔ ان کے ہاں بارات پہ عموماً چائے دی جاتی تھی مگر عالیہ نے کھانا دیا۔ یہ انزلہ کی شادی کی کوخوشی میں نہیں بلکہ فیروز صاحب کی وجہ سے......
جب فیروز صاحب کے زیرِ سایہ وہ احزار کے سنگ رخصت ہوئی تو عید ایک بار پھر سے بہار ہوئی تھی۔
کمرا اچھی طرح بلکہ بہت خوب صورتی کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آیا اور بس اس کے پاس بیٹھ گیا۔
''زوجہ دکان دار۔'' شرارت سے اس نے کہا۔
''نشے باز...... آپ بھی ناں......'' اس کے انگلے پر وہ ہنس دیا۔
''اب ٹماٹر کا حساب تو نہیں مانگوں گی ناں؟'' اس نے ایسی معصومیت سے کہا کہ وہ ہنس دی تھی۔
''ہاں...... یہ تو بڑی عید پر پتا چلے گا۔'' اا کمرے میں دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔



خدا جانے

فرحین اظفر

شادی کے دن نزدیک تھے۔ کزنز کا جوش و خروش اور خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ سب ہی اس کی شادی کے لیے شدت سے منتظر تھے۔ مہینوں پہلے سے تیاریاں، گانوں کی پریکٹس، کپڑوں کی ڈیزائنگ، میچنگ ،جیولری، حال ہی میں بیوٹیشن کا کورس کرنے والی بشریٰ بھی بڑی بہن کی شادی کی خوشی میں سب کا ملت فیشل کررہی تھی۔

ہر روز شام میں گھر میں رش لگ جاتا۔ ڈھولک گیت گائے جاتے۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی اور وہ ایک جانب بیٹھی مسکراتی رہتی۔

''اوہو کیا بات ہے، چپکے، چپکے مسکرایا جارہا ہے۔'' نائلہ نے دھپ سے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اسے چھیڑا، وہ جھینپ سی گئی۔

''جی نہیں......''

''اچھا جی، ہم سے بھی چھپایا جارہا ہے۔'' اس نے اپنی بڑی، بڑی آنکھیں گھمائیں۔ لبنیٰ نے اس کی کمر پر ایک ہاتھ مارا۔

''اوئی اللہ مارڈالا ظالم، پتا ہے میں کیا کہنے کے لیے آئی تھی۔''

''کیا...... ؟'' اس نے ہنستے ہوئے اپنے سلکی بال سمیٹے۔

''کتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہارے جانے میں۔ پھر تو ملاقات ہونی مشکل ہوجائے گی۔ کیوں نہ ایک گیٹ ٹوگیدر رکھ لیں۔''

''اچھا'' اسے اور ہنسی آئی۔

''تو یہ روز جو ہنگامہ ہوتا ہے یہاں، یہ کیا ہے۔''

''بھئی یہ تو ہنگامہ ہے' میں اس کی بات نہیں کررہی۔ تم نے ہمیں ٹریٹ نہیں دی۔''

''اور نہیں تو کیا...... ایسی کنجوسی بھی ٹھیک نہیں۔'' سعدیہ بھی نائلہ کی بات سن کر نزدیک آبیٹھی تھی۔

''اوہو کنجوسی کی کیا بات ہے، جب چاہو لے لو۔''

''لیکن ایک شرط ہے، کھانا تم خود بناؤ گی۔''

''ہیں......؟'' اسے چکر سا آگیا۔

''اتنے سارے لوگوں کا کھانا میں کیسے؟ تمہیں پتا ہے میں اتنی ایکسپرٹ نہیں...... چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''نہیں بالکل نہیں، کیوں بھئی تم لوگ کیا کہتی ہو۔'' سعدیہ نے لاؤنج میں موجود باقی لڑکیوں سے پوچھا۔

لبنیٰ خاموشی سے انہیں شور مچاتا دیکھنے لگی...... وہ سب بضد تھیں کہ لبنیٰ کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا ہی کھائیں گی۔ کھیر اور بریانی پر اتفاق ہوا۔ لبنیٰ کی شکل دیکھنے والی تھی۔

''منہ ٹھیک کرلو مسکینیت برسنے لگی ہے۔'' لائبہ نے اپنی پٹاخے دار آواز میں اسے ٹوکا۔

''اور کیا...... یہ شکل لے جاؤ گی تو پہلے ہی دن پہچانی جاؤ گی کہ......''

''یہ وہ بیچاری دلہن ہے جسے کھانا پکانا نہیں آتا۔'' سعدیہ کی بات بشریٰ نے اچک لی تھی۔

لاؤنج میں ہنسی بکھر گئی جبکہ لاؤنج میں قدم رکھتی قدسیہ بیگم کا انداز ایک لمحے کے لیے سست سا پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

لبنیٰ اور بشریٰ...... قدسیہ بیگم کی دو ہی بیٹیاں تھیں...... انہوں نے اپنے طور پر دونوں ہی کی بہترین انداز میں تربیت کی تھی اور حسبِ توفیق تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا تھا۔

لبنیٰ گریجویشن کرچکی تھی اور بشریٰ بی ایس سی کے پہلے سال میں تھی۔ دونوں بہنوں میں بے انتہا پیار و محبت کے باوجود عادتیں یکسر مختلف تھیں۔ لبنیٰ دھیمے مزاج کی ٹھہراؤ والی طبیعت کی لڑکی تھی، ہر کام آرام و سہولت کے ساتھ نفاست سے کرنے والی۔

جبکہ بشریٰ کی طبیعت اس سے یکسر الٹ تھی۔ وہ شوخ اور باتونی تھی۔ زبان اور ہاتھ ایک جیسی رفتار سے چلتے اور وہ خود کو بیک وقت کئی کاموں میں الجھا کے رکھتی۔

قدسیہ بیگم کو دونوں کے مزاج سے مکمل آگاہی تھی۔ مگر وہ لبنیٰ کی طرف سے اکثر غیر مطمئن سی نظر آتی تھیں۔ انہوں نے اسے ہوم اکنامکس میں بی ایس سی اس لیے کروایا تھا کہ وہ گھریلو کام کاج میں بھی بالکل طاق ہوجائے۔ بشریٰ تو یوں بھی اپنے خالہ زاد سے منسوب تھی۔ اس لیے بھی انہیں اس کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔

اصل فکر تو انہیں لبنیٰ کی تھی۔ ہزار دھیان اور کوشش کے باوجود کام میں نقص رہ جاتا اور وہ معمولی سی کمی بیشی پر گھنٹوں پشیماں رہتی۔ حالانکہ قدسیہ بیگم نے اپنے رویّے سے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی ہی کی تھی۔

کالج ختم ہونے کے بعد سے رات کے کھانے کی ذمّے داری اس کی تھی اور چونکہ رات کو ابّو بھی کھانے پر موجود ہوتے اس لیے کھانے پر اس کی توجہ اور دلجمعی خاص الخاص ہوتی۔ ایسے میں ذرا سی بھول چوک سے اس کے ہاتھ پیر پھول جاتے گوکہ ابو اتنے حلیم الطبع شخص تھے کہ اس کے کھانے میں کبھی عیب نہ نکالا اور ڈانٹنے کا تو سوال ہی نہیں...... پھر بھی......

''اللہ یہ پلاؤ کے چاول چپکے، چپکے کیوں لگ

رہے ہیں بشریٰ؟'' وہ ایک پل میں روہانسی ہوجاتی۔

''دیکھو روٹی جلی، جلی تو نہیں ہے۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' بشریٰ تسلی دیتی۔

جب سے اس کا رشتہ ہوا تھا، قدسیہ بیگم اس کی حساس طبیعت کا سوچ، سوچ کر پریشان تھیں۔ اپنے خدشے کا اظہار انہوں نے رحمان صاحب سے بھی کردیا۔

''سسرال میں تو ہزاروں باتیں نظر انداز کرنی پڑتی ہیں اور لبنیٰ کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔''

''ارے بیگم، فضول واہموں کو دل میں جگہ مت دیں اور آپ نے دیکھ تو رکھا ہے عادل کو...... انشاء اللہ اپنے نام کی طرح عدل اور توازن رکھنے والی شخصیت کا مالک ہوگا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' انہوں نے صدقِ دل سے دعا کی اور اٹھ کر کچن کی سمت آگئیں۔ جہاں لبنیٰ تمام کزنز کے اصرار پر بریانی اور کھیر تیار کررہی تھی۔

پسینے سے شرابور وہ پریشان حال سی بریانی کے مسالے کے دیگچے پر جھکی ہوئی تھی۔ قدسیہ بیگم کو آتا دیکھ کر ان کی طرف آئی۔

''اُف اللہ امی دیکھیں...... سالن بھنا نہیں...... اور بوٹیاں بالکل گل گئیں اور اب بھوننے میں تو یہ ریشہ، ریشہ ہوجائیں گی۔''

قدسیہ بیگم نے رسان سے چمچہ اس کے ہاتھ سے لیا۔

''ہاتھ منہ دھو کر آؤ اور یہ مجھے دو، میں دیکھتی ہوں۔''

وہ ان کو دیکھتی گہری سانس لے کر باہر نکل گئی اور جب ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلی تو قدسیہ بیگم تمام گوشت کی بوٹیاں الگ نکال کر مسالا بھون رہی تھیں۔

''ارے ہاں......'' اس نے ہنس کر سر پر ہاتھ مارا۔

''میں تو بھول ہی گئی کہ اس طرح بھی کرسکتے ہیں۔''

''اتنی جلدی ہاتھ پیر چھوڑ دوگی تو یہی ہوگا ناں......''

وہ لاڈ سے ان کے کندھے پر جھول گئی۔

تقریباً ڈھائی گھنٹے میں دونوں چیزیں تیار تھیں۔ رائتہ اور سلاد وغیرہ بشریٰ اور لائبہ نے مل کر بنایا۔

بابر جو کہ بشریٰ کا منگیتر اور خالہ زاد تھا۔ عین کھانے کے ٹائم پر کولڈ ڈرنکس لے کر نازل ہوا تو تمام لڑکیوں نے خوب شور مچایا۔ اور بشریٰ کا ریکارڈ لگایا۔ وہ جھینپی، جھینپی سی خود ہی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنکس لے کر کچن میں چلی گئی۔

''اگر بشریٰ کی جگہ میں اور بابر کی جگہ عادل ہوتے تو کیا اتنے کانفیڈنس سے میں ان سے کولڈ ڈرنکس لے لیتی اور وہ بھی سب کے سامنے......'' لبنیٰ بہت دیر تک یہی بات سوچتی رہی۔ بریانی کے چاولوں میں کسر تھی اور کھیر کی مٹھاس بھی کسی، کسی کو بہت زیادہ لگی۔ مگر ہنسی، مذاق اور باتوں میں کھانا یوں چٹ پٹ ہوا کہ پتا بھی نہیں چلا۔ لبنیٰ کی آنکھیں البتہ ان کی محبت پر بار، بار نم ہوتی رہیں۔

☆☆☆

دن جیسے پر لگا کر اڑ گئے۔ اور وہ ماں باپ کی ڈھیروں دعائیں اپنے آنچل میں سمیٹے پیا گھر کو سدھار گئی۔

عادل ایک بہت محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا۔ اوائل دنوں میں تو اس کی ہر، ہر بات پر نثار ہو، ہوجاتا تھا۔ اس نے کب حقیقت میں محبتوں کی یہ شدتیں دیکھی تھیں۔ اسے تو یہ سب فلموں اور ڈراموں کا حصہ لگتا۔ اب جو سچ مچ میں عادل کو خود پر محبتیں لٹاتے دیکھتی تو شرم سے لال ہوتی رہتی۔ عادل ہمیشہ سے کو ایجوکیشن میں پڑھا تھا۔ اور لبنیٰ نے گریجویشن تک گرلز کالج سے کیا تھا۔ اس کے اندر فطری شرم اور جھجک تھی جبکہ عادل نے ہمیشہ لڑکیوں کو بے خوفی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ اس کے لیے یہ شرم اور گریز بہت دلچسپ چیزیں تھیں۔

ابتدائی دن گزرے تو اس کی آفس کی چھٹیاں ختم ہوگئیں۔

جس دن صبح اسے آفس جانا تھا۔ لبنیٰ کی آنکھ الارم پر نہ کھل سکی۔

وہ سوتی رہ گئی اور عادل چپ چاپ آفس کے لیے نکل گیا۔

دن کے گیارہ بجے جب وہ ہاتھ منہ دھو کر شرمندہ

سی لاؤنج میں آئی تو اس کی بڑی نند وہیں بیٹھی تھیں۔ ”سو اٹھیں بہو رانی۔“ بظاہر تو انہوں نے محبت سے ہی کہا تھا۔ مگر وہ شرمندگی کی وجہ سے مزید بوکھلا گئی۔

”جی وہ میں...... بس......“ ہتھیلیاں رگڑتی وہ کچھ بول نہ سکی۔

”ارے کوئی بات نہیں پہلا، پہلا دن تھا ناں......“

انہوں نے پرے کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی اور وہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ان کے برابر میں بیٹھی ہی تھی کہ انہوں نے جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں مشورہ دیا۔

”میری مانو تو رات کو جلدی سونے کی کیا کرو۔“

”جی......“ اس نے ہونق ہو کے پہلے ان کا منہ دیکھا۔ پھر اس کا اپنا منہ سرخ پڑ گیا۔

”ہاں اور نہیں تو کیا، یہ آج کل کے لڑکے تو موئے ہیں ہی کھیل کود کے شوقین...... اصل میں تو لڑکیوں کو ہی احساس دلانا پڑتا ہے۔“

وہ پہلے ہی ان کی نکتہ چیں طبیعت سے خائف تھی۔ جو شادی سے پہلے ہی سامنے آچکی تھی۔ اب اس بات پر تو سر ہی نہیں اٹھایا گیا۔

”خیر اماں پہلے سے سکھا، بتا دیتیں تو یوں تو نہ ہوتا۔“ انہوں نے لمحہ بھر میں لہجہ بھی بدل لیا اور پہلو بھی۔

آپا تینوں بہن، بھائی میں بڑی تھیں، عادل نے پہلی ہی رات ان کی اہمیت واضح کر دی تھی۔ اب بھی وہ جز بز ہونے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

”چلو اب کب تک یونہی بیٹھی رہو گی۔ جا کے اماں کو سلام کرو، دعائیں لو۔ نئی دلہنوں کے ساتھ شروع میں اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے۔ پیار سے سمجھا دیں تو کیا برا ہے۔“ انہوں نے ایک نیا رنگ دکھایا۔

وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی جان بچنے پر شکر ادا کرتی اٹھ گئی۔

☆☆☆

”ہائے اللہ، مرچیں تیز لگ رہی ہیں۔“ حسب عادت اس کی رنگت اُڑ چکی تھی۔

اسے کھیر میں ہاتھ ڈال کر سب کا منہ میٹھا کرانا تھا۔ کل سے کچن کی ذمے داری اس کے سر پر ہوتی۔ کھیر کے ساتھ ہی آپا اور اس کی چھوٹی نند جو کہ ابھی کنواری تھی نے نمکین کی فرمائش کر دی۔

اس کے دل کو تو تب ہی سے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ چاولوں کی کوئی ڈش تو اس نے خود ہی مسترد کر دی کہ اس کے بگڑنے کے امکانات زیادہ ہوتے تھے۔ قرعۂ فال قورمے کے نام نکلا تھا۔

اس نے امی کو فون کر کے پوری ترکیب تمام اشیا اور ان کی مقدار سمیت اچھی طرح پوچھ کر لکھ کر رکھ لی تھی۔ حالانکہ وہ خود متعدد بار قورمہ پکا چکی تھی مگر کسی طرح تشفی نہیں ہو پاتی تھی۔

بالآخر وہ ترکیب لکھے ہوئے کاغذ کو لے کر کچن میں آئی۔

”ہائے اللہ بھابی، آپ کو قورمہ پکانا نہیں آتا ترکیب دیکھ کر پکائیں گی۔“ ثانیہ کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ کچن سے لے کر لاؤنج کے دوسرے سرے تک سن لی گئی۔

”نن...... نہیں...... وہ اصل میں مجھے گھبراہٹ ...... ورنہ تو میں کتنی بار پکا چکی ہوں۔“ وہ گڑبڑا گئی۔ بڑی آپا کا بھاری وجود کچن کاؤنٹر کے نزدیک چلا آیا۔

”گھبرانے کی کیا بات ہے بھئی...... کسی مقابلے کے لیے تھوڑا ہی پکار ہی ہو، اپنا گھر سمجھ کر پکاؤ تب بات ہے ناں......“ وہ بے نیازی سے بولتی مڑ گئیں۔

”تو کیا میں اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی۔“ اس نے ثانیہ کو کچن سے باہر جاتے اور عادل کو بے نیازی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے چھپانے کے لیے منہ پھیرا تو جان نکل گئی۔

تلنے کے لیے چڑھائی گئی پیاز تقریباً جلنے کے قریب تھی۔ اس نے جلدی سے پلیٹ میں نکالی۔ مگر کچھ لچھے پھر بھی کوئلہ بن چکے تھے۔ اس نے وہ ہٹا کر

ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔

کھانا تیار ہوا تو سکون کی سانس لی۔ ثانیہ ٹیبل لگانے کے لیے اس مدد کرنے آ پہنچی تھی۔

''بالآخر اسے خیال آ ہی گیا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سوچا پھر جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگی۔ آپا ٹیبل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''لگتا ہے پیاز جل گئی ہے، مہک سی آ رہی ہے اور رنگت بھی تیز ہے۔'' کھانے کی میز پر سب سے پہلا اعتراض ثانیہ کی طرف سے آیا۔

کہنے کو تو وہ عادل سے چھوٹی تھی مگر چونکہ عمر میں لبنیٰ کے برابر تھی اس لیے پہلے دن سے ہی اسے بڑی بھابی کا درجہ دینے کے بجائے اپنے برابر ہی سمجھتی تھی۔

''بھئی قورمے کی پیاز اور بریانی کے چاول تو بہت دھیان سے پکانے والی چیزیں ہیں۔ ذرا دھیان ہٹا اور ہوا کھانے کا بیڑا غرق۔'' اس نے حد درجہ حیرت سے آپا کو دیکھا۔

حالانکہ یہ بیڑا غرق ہوا کھانا نہیں تھا۔ اچھا خاصا لذیذ تھا۔ پھر پتا نہیں کیوں ان کے معیار پر پورا نہیں اترا۔

''مگر آج کل کی لڑکیاں خود پر سے دھیان ہٹائیں گی تو کہیں اور لگائیں گی ناں...... ہاں بھئی سجنے سنورنے کے دن جو ہیں۔'' ان کے طنزیہ لہجے سے لبنیٰ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے چپکے سے ایک نظر شوہر پر ڈالی کیا تھا جو وہ ایک لفظ تعریف میں کہہ دیتا۔ مگر وہ تو کھانے میں یوں مگن تھا گویا اس سے ضروری کام دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔

کھیر کے لیے بھی آپا سے ''ثابت چاول، نامناسب چینی'' اور ''کھوپرے کی بھرمار'' جیسے الفاظ سننے کو ملے۔ وہ آنسو پیتی اٹھ گئی۔ پہلا کھانا بنانے کی خوشی غارت ہو چکی تھی۔

''سنیں، آج کھانا کیسا بنا تھا؟'' رات کو لیٹنے سے پہلے اس نے پوچھ ہی لیا۔

''بہت مزیدار......''

''تو آپ بولے کیوں نہیں ؟''

''بول تو رہا ہوں۔'' عادل بے نیازی سے بولا۔

''میں ابھی کی بات نہیں کر رہی۔'' وہ اس کی معصومیت پر جل سی گئی۔

''جب آپا اتنے نقص نکال رہی تھیں تب......''

''آپا کب...... ہاں، ارے وہ۔'' اس نے ہنس کر کان پر سے مکھی اڑائی۔

''جی وہ...... میں نے کتنی محنت سے کھانا بنایا تھا۔ اور وہ بجائے تعریف کرنے کے......'' اس کا گلا رندھ گیا...... تو بات ادھوری رہ گئی۔

''ارے...... ارے۔'' عادل ایک دم گھبرا گیا۔

''ان کی باتوں کو دل پر مت لو، پتا ہے ناں کیا ٹریجڈی ہوئی ہے ان کے ساتھ...... شادی کے دو سال بعد ہی بیوگی اور پھر بیٹے کے پردیسی ہو جانے کے غم نے انہیں کچھ تلخ کر دیا ہے۔ ورنہ وہ دل کی بہت اچھی ہیں۔''

وہ چپ چاپ آنسو صاف کرنے لگی۔

''ویسے بھی ان کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہوتا، وہ تو بس چھوٹا سمجھ کر محبت میں کہہ دیتی ہیں۔''

عادل دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بڑی آپا اور عادل کی عمروں میں کم و بیش نو سے دس سال کا فرق تھا۔ ثانیہ، لبنیٰ کی ہم عمر اور عادل سے چھ ساڑھے چھ سال چھوٹی تھی۔

آپا عرصہ دراز سے میکے میں مقیم تھیں۔ تقریباً تبھی سے جب ان کے شوہر عین جوانی میں خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔

گھر میں سب سے بے ضرر وجود اس کی ساس کا تھا۔ ضعیف العمری اور ناتوانی کی وجہ سے گھریلو معاملات میں ان کی دخل اندازی تقریباً صفر تھی اور گھر کا تمام کنٹرول بڑی آپا کے ہاتھ میں ہی تھا۔ بہن، بھائی سے عمروں میں اتنے زیادہ تفاوت کی وجہ سے انہیں ان دونوں ہی کو اپنے بچوں کی طرح سمجھنے اور گھر کے سب افراد پر حکم چلانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اب ان افراد میں لبنیٰ کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

ان کا اپنا اکلوتا بیٹا تعلیم کی غرض سے جو بیرونِ

ملک گیا تو دو تین بار کے بعد جھلک نہ دکھائی یہاں تک کہ شہریت کے چکر میں وہیں شادی کر کے سیٹل ہو گیا۔

آپا نے بھی اپنا دل یہیں لگالیا اور بقول لبنیٰ کے دوسروں کا دل جلانے کا ٹھیکا لے لیا۔

کچن کی ذمے داریوں کی صورت میں بھی آپا کے ہاتھ ایک آسان ہدف لگ چکا تھا...... گو کہ وہ براہِ راست بھی اسے برا بھلا نہ کہتیں۔ مگر بہت ساری باتوں اور کاموں میں بالواسطہ آج کل کی لڑکیاں کہہ کر تنقید کر جاتیں۔

انہیں عادل کی واپسی کے وقت لبنیٰ کی تیاریوں پر اعتراض ہوتا تھا۔ گھر کی کسی چیز کو سیٹنگ بدلنے کے خیال سے ہاتھ لگانے کا گناہ تو خیر وہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ کچن میں بھی ان کی اجارہ داری کا یہ عالم تھا کہ کپ اور پلیٹوں کے اسٹینڈ میں ان کی پسند اور مرضی کی ترتیب چلتی۔

اگر ایک ماچس کی تیلی بھی لبنیٰ کو اضافی جلانی پڑتی تو وہ دل ہی دل میں کم از کم ایک بار تو ضرور خائف ہوتی۔ اس کا پکایا کھانا تو خیر انہیں اول روز سے آج تک سمجھ ہی نہیں آیا تھا۔

''کہاں کی سواری ہے خیریت؟ ابھی تو آفس سے آئے، دم بھی نہ لیا اور نکل پڑے سیر سپاٹے کے لیے۔'' اس دن ٹیلر کے ہاں کپڑے دینے جانا تھا۔

عادل آئے تو آپا گھر پر نہیں تھیں۔ اس نے موقع غنیمت جان کر جلدی، جلدی کا شور مچایا۔ شکر تھا کہ عادل نخرے باز نہیں تھا مگر برا ہوا کہ دروازے پر آپا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ لبنیٰ اس وقت جتنا بھی اپنی قسمت کو کوستی کم تھا۔

پہلے تو انہوں نے عادل کو تھکا ہارا واپس آتے ہی لے کر بھاگنے پر اچھے خاصے افسوس کا اظہار کیا۔ پھر عادل کے بتانے پر ان کا ٹریک فوراً ہی بدل گیا۔

''نرا وقت اور پیسے کا زیاں ہے یہ اور بتاؤ ذرا نامحرم مرد، عورتوں کے ناپ لیتے پھریں۔ اس سے بڑھ کر برائی اور کیا ہو گی۔''

عادل سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ البتہ لبنیٰ کا منہ کھل گیا۔ ان کی اپنی بہن بھی ہمیشہ باہر سے کپڑے سلواتی تھی مگر اس وقت شاید وہ یہ بات بھول چکی تھیں۔

''اسی لیے لڑکیوں کو سلائی کڑھائی پہلے ہی سکھادی جاتی ہے تاکہ بعد میں کسی کی محتاجی نہ دیکھنی پڑے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح لیکچر دیتی ہوئی چلی گئیں۔ انداز میں سختی نہ لہجے میں بے مروتی...... مگر بات......

لبنیٰ کا جی چاہا یہیں سے پلٹ جائے مگر عادل باہر منتظر تھا۔

☆☆☆

سارا راستہ اور پھر واپسی میں بھی اس کا موڈ خراب ہی رہا۔ حالانکہ عادل نے منانے کی بہت کوشش کی مگر وہ چپ چاپ نظرانداز کر کے کام میں لگی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہر کام جو وہ خوشی کررہی ہوتی اس میں بھنگ ڈالنے کا آخر مقصد کیا تھا۔

اس کی ساس بھی تو تھیں، وہ تو کبھی کسی معاملے میں ایک لفظ تک نہیں بولی تھیں۔ سچ تھا کہ اگر گھر میں اس کی نند کا وجود نہ ہوتا تو یہ گھر ایک مثالی سسرال ہوتا مگر اب...... وہ رات گئے تک تکیہ بھگوتی رہی۔

عادل اس کے موڈ سے تنگ آکر خود بھی خفگی کی لپیٹ میں آگیا مگر لبنیٰ کو اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

صبح آنکھ کھل جانے کے باوجود اس کا بستر سے اٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا یونہی آنکھیں موندی پڑی رہے۔

رات دیر تک جاگنے اور آنسو بہانے سے آنکھیں سرخ اور چہرہ سوجا ہوا تھا۔ سر الگ بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے ایک روتی پڑتی نگاہ عادل پر ڈالی، وہ اسے بستر سے نکلنے کی ہدایت کرتا باتھ روم میں بند ہو گیا۔ اس نے لبنیٰ کا چہرہ نہیں دیکھا یا شاید دیکھ کر نظرانداز کر گیا۔

''اور اگر میں امی کے یہاں ہوتی تو امی اور بشریٰ کتنی فکرمند ہوتیں۔'' اس کا دل پھر بھر آیا۔ جی میں آئی کہ اسے تیاری کرتا چھوڑ کر منہ سر لپیٹ کر

پڑ جائے۔مگر آگے آپا یقیناً اس کی منتظر تھیں۔
عادل تو شاید یوں ناراضی جتانے پر کچھ نہ کہتا مگر ثانیہ اور آپا ضرور اس کی جان کو آجاتیں اگر ناشتا ثانیہ کو دینا پڑ جاتا۔
دل پر چاہے لاکھ بوجھ سہی مگر اسے بستر چھوڑنا ہی تھا۔
کچن میں ناشتا بنانے کے دوران ہی اسے نئی خبر ملی۔ثانیہ کی ہونے والی سسرال سے کچھ لوگ شام کی چائے پر آرہے تھے۔اس نے سنا تو دل تھام لیا۔
یعنی شام کی چائے پر ایک اور امتحان اس کا منتظر تھا۔اس نے گہری بوجھل سانس بھر کر ٹرے سجائی اور سیڑھیاں چڑھ گئی۔
آپا کے نزدیک یوں کمرے میں گھس کر ناشتا کرنا ہی بے حیائی کے زمرے میں آتا تھا۔مگر جب عادل نے وقت کی کمی کی باعث ڈائننگ ٹیبل تک آنے سے منع کردیا تو انہیں عقل آگئی۔لبنیٰ تو بس حیران ہوتی رہتی تھی۔
”جب اپنی مرضی منوا سکتے ہیں تو میری بات کیوں نہیں؟“ دو مرتبہ آپا نے اسے امی کے یہاں جانے سے صاف منع کردیا تھا اور اسے عادل کی خاموشی پر سخت غصہ آیا تھا۔
”ابھی شام کے لیے جانے کیا بنانا ہوگا اور پھر جانے کیا کچھ سننا پڑے گا۔“
سخت بے بسی کے عالم میں گھر کر اس نے ٹرے عادل کے سامنے پٹخ دی تھی۔اور اس کی حیران سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتی واش روم میں گھس گئی۔اس کے علاوہ پورے گھر میں شاید کوئی اور گوشۂ عافیت نہیں تھا۔
شکر گزری کہ ثانیہ نے گھر پر صرف میٹھے دہی بھلے بنانے کو کہہ دیا خود اس کا شام میں چند ریڈی میڈ چیزیں لانے کا ارادہ تھا۔شکر کا کلمہ پڑھتی وہ شام ہونے سے پہلے تیاری میں جت گئی۔

☆☆☆

”ارے، یہ کیا کررہی ہو؟“
آپا کی آواز پر گرم تیل سے بھیگا چمچ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔اس نے درود شریف پڑھ کر رخ پھیرا تو وہ پانی میں بھیگی بوندیوں کی طرف اشارہ کررہی تھیں۔
”یہ بھگوتے ہیں ناں تاکہ نرم رہیں اور گٹھلی نہ بنے۔“
”ہائیں یہ کس نے کہہ دیا تم سے...... وہ تو بازاری بوندیاں ہوتی ہیں، نری پتھر...... انہیں بھلا کون بھگوتا ہے، دہی میں ڈالتے ہی بُھر کر بُھر، بُھر ہوجائیں گی۔“
”نہیں، نہیں میں تو ہمیشہ......“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔وہ بے بسی سے انہیں پھلکیاں پانی سے نکال کر پانی پھینکتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
”ارے رہنے دو، نہیں آتے تو بول دیتیں بیٹا، ہم کوئی برا تھوڑی مان جاتے۔“ وہ اسی طرح نرمی سے بولتی باہر نکل گئیں جو اُن کا خاصہ تھی۔پیچھے کلسنے کے لیے لبنیٰ رہ گئی۔

☆☆☆

خیر گزری کہ اسے یہ نرالی ترکیب سوجھ گئی۔اس نے بالکل ایک جیسی دو ڈشیں تیار کیں۔اور بھیگے ہوئے بھلوں والی ڈش مہمانوں کے آگے سرو کردی۔
سب نے بہت تعریف کی۔ثانیہ کے سسرال والے بہت معقول اور کھلے دل والے لوگ تھے۔آج تو اور بھی لگ رہے تھے وہ ڈیپ ریڈ کلر کا پونچو پہنے جس کے کنارے پر بلیک ویلوٹ کی فال لگی تھی۔پہن کر بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔میچنگ جیولری اور سرخ شوخ لپ اسٹک نے اس کے چہرے کو چار چاند لگا دیے تھے۔
اس نے شکر کیا کہ آپا زیادہ وقت ثانیہ کے سسرال والوں کے ساتھ مصروف تھیں۔وہ ان کے واپس جانے تک بہت خوش تھی۔کیونکہ عادل بھی آفس سے لوٹ آئے تھے۔
”یہ تم کیا پہن کر چلی آئی تھیں ان کے سامنے۔“
ابھی وہ عادل کی گرم نگاہوں سے محظوظ بھی نہ ہو پائی تھی کہ آپا کی نظرِ کرم گرم ہوگئی۔
”جی، یہ تو آج کل......؟“ وہ خواہش کے باوجود بات مکمل نہیں کرسکی۔

''ہاں، ہاں پتا ہے یہ آج کل کے فیشن کے حساب سے کوئی عجوبہ ہے۔ مگر آنے جانے والوں کے حساب سے ذرا خیال کیا کرو...... اکلوتی بہو اور یہ دھجیاں...... سر پر دوپٹا لینے کا بھی خیال نہیں رہتا تمہیں۔''

''جی......'' اس نے حیرت سے ثانیہ کو دیکھا جو گلے میں دوپٹا ڈالے مزے سے ریفریشمنٹ کے ساتھ انصاف کررہی تھی۔

اول تو گھر کا ماحول اتنا روایتی نہیں تھا۔ اور بالفرض اگر تھا بھی تو اس سے پہلے ثانیہ کے سر پر دوپٹا ہونا چاہیے تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ آپا نے یہ بات اس کا دل دکھانے کی لیے کی تھی۔

''چل رہنے دے۔ اتنی پیاری تو لگ رہی ہے۔'' اس کی ساس نے اس کا دل بڑھانے کی کوشش کی۔

''اماں آپ کو کیا پتا......'' آپا ابھی مزید کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

''اُفوہ آپا چھوڑیں ناں یہ پرانے زمانے کی باتیں...... ویسے بھائی آپ کا سوٹ بہت زبردست اور اسٹائلش ہے۔ مجھے بھی سلوا دیں۔ ایک ایسا پونچو......''

ثانیہ اس گھر کی بہو نہیں بیٹی تھی اور مزاجاً بھی آپا پر ہی پڑی تھی۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گئیں۔ اور لبنیٰ خود مسکرا بھی نہیں سکی۔

''نئی نسل اپنے آگے کسی کی نہیں سنتی۔ ہاں بھئی جو دل چاہے سلواؤ اور پہنو ہم تو تمہاری بھلائی اور محبت میں ہی کہتے ہیں۔'' اس نے سن کر طنز سے سر جھٹک دیا۔ عادل کی ایک تعریفی نگاہ تک وصول کرنے کی خواہش نہیں بچی تھی۔

☆☆☆

دو دن پہلے وہ پورے ہفتے بھر کی اجازت لے کر امی کے یہاں آئی تھی۔ آج تیسرے ہی دن عادل اسے لینے آگیا تھا۔

''کیا امی ابھی تو دل بھی نہیں بھرا...... میں نے ٹھیک طرح سے باتیں بھی نہیں کیں۔'' اس نے منہ بسورا۔

''ہم سے تو باتیں کرنے کے لیے عمر پڑی ہے میری جان...... مگر لگتا ہے اُدھر بھی دل نہیں بھرا۔'' بشریٰ نے شوخی سے اسے چھیڑا۔

''اُدھر تو خدا کرے کبھی دل نہ بھرے عادل کی محبتیں اور بے تابیاں ہمیشہ یونہی رہیں، آمین۔'' امی نے صدقِ دل سے دعا دی تو اس کی آنکھیں بلاوجہ بھر آئیں۔

دو دن تو ایسے پر لگا کر گزرے تھے مانو دو لمحے...... اب اسی ماحول میں واپس جانے کا خیال اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔

پورا راستہ وہ خفا، خفا سی منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ عادل بھی اس کے مزاج کی برہمی کو سمجھ رہا تھا.... جبھی زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کی گھر پہنچتے پہنچتے بوندا باندی شروع ہوگئی۔ موسم تو صبح سے ہی ابر آلود تھا۔

''کیا تھا جو یہ بادل امی کے یہاں برس جاتے۔ میں انجوائے بھی کرلیتی اور عادل آ بھی نہیں پاتے۔'' رات گئے تک عادل کا التفات، توجہ اور محبت بھی اس کے دل میں اٹھتے ملال کو دھو نہ سکی تھی۔

☆☆☆

صبح چھٹی تھی۔ آنکھ دیر سے کھلی۔ ابھی وہ کسلمندی سے بستر میں ہی پڑی تھی جب عادل کمرے میں آیا۔

''ارے، آج آپ جلدی اٹھ گئے۔'' اس نے حیرت سے عادل کو دیکھا۔

''ہاں آنکھ کھل گئی۔ تم بھی جلدی نکل آؤ بستر سے۔ امی ایسے موسم میں خاص طور پر حلوا پوری کا ناشتا بنواتی ہیں۔''

''ہیں واقعی......؟'' کون بنا رہا ہے۔''

''تم......''

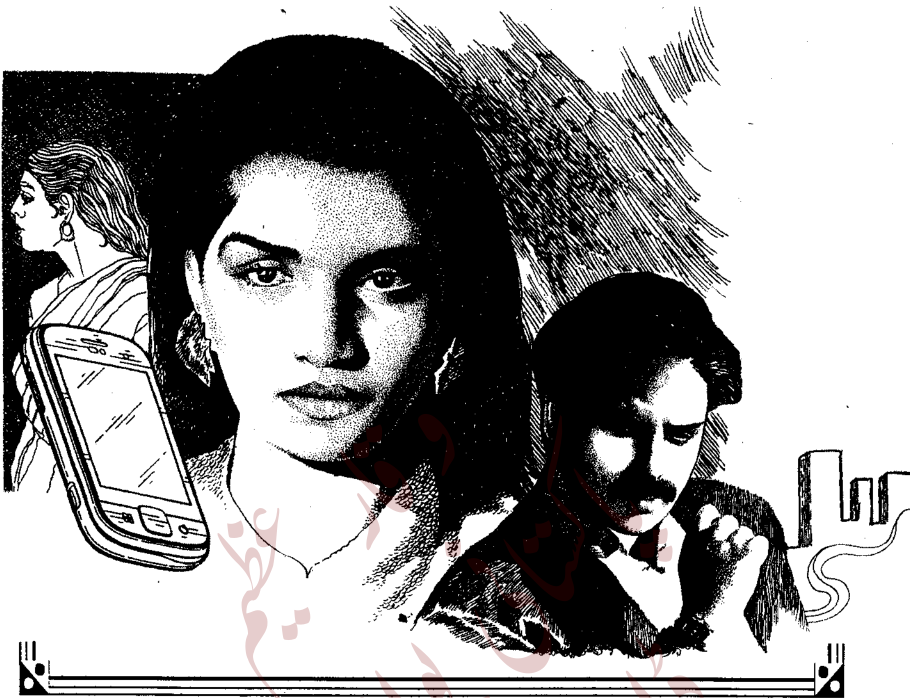
''کیوں......؟'' وہ بدک سی گئی۔ ''مجھے نہیں آتی بنانی اور مجھ سے پہلے کون بناتا تھا۔ اسی سے بنوائیں۔'' ناگواری اس کے چہرے سے ہی جھلکنے لگی۔

''پہلے ثانیہ بناتی تھی مگر وہ کہہ رہی ہے اسے تمہارے ہاتھ کا کھانا ہے۔'' لبنیٰ سچ مچ جلبلا سی گئی اسے پتا تھا بالفاظ دیگر ثانیہ نے شامت کا پیغام بھجوایا تھا۔

''عادل...... عادل پلیز مجھ سے نہیں بنے گا۔ آپ، آپ بازار سے لادیں، پلیز آپ کو پتا ہے، کتنی

باتیں بنائیں گی۔'' وہ یکایک بستر سے نکل کر منتوں پر اتر آئی۔ عادل بھی سمجھتا تھا جبھی چپ چاپ چلا گیا۔
اور جب تک واپس نہیں آیا وہ کمرے میں ہی دبکی رہی۔ چاہتی تو تھی کہ آپا اور ثانیہ کے حواسوں پر عادل کو بازار جاتے دیکھ کر بجلی گری ہوگی۔ اب جب تک اس بجلی کی ساری گرمی وہ اس پر نہ اتار لیتیں، انہیں چین نہیں آنا تھا۔
''جاؤ، کچن میں رکھ دیا ہے سامان۔'' عادل نے واپس آکر کمرے میں اسے اطلاع دی۔ وہ درود شریف پڑھتی ہوئی نیچے آئی۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اسے ہمہ وقت بلائے ناگہانی کو ٹالنے کے لیے درود شریف کے ورد کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ شاید اپنی پچھلی زندگی میں اس نے اتنا ورد نہ کیا تھا۔ جتنا شادی کے بعد چند دنوں میں ہی کر ڈالا تھا۔
ثانیہ کچن میں اور اماں لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ اس نے جا کے ان کے آگے سر جھکا دیا۔ ان کے لبوں سے دعاؤں کے چشمے جاری ہو گئے۔ سچ تھا کہ وہ اس قدر محبت اور دل کی گہرائیوں سے دعائیں دیتی تھیں کہ لبنیٰ کے دل سے آپا کی باتوں کا ملال دھلنے لگتا تھا۔
''آ گئیں بہو بیگم خیر سے کمرے سے باہر۔'' شیرینی میں گھلا طنزیہ لہجہ پشت پر گونجا۔
''میں تو اماں سے پہلے ہی کہہ رہی تھی۔'' آپا خوش دلی سے مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آکر تخت پر بیٹھیں اور بڑے دوستانہ انداز میں اماں سے بولیں۔
''بہو بیگم سے موسم کے پکوان کا کہہ دیا ہے۔ اب دیکھو آج بازاری کھانے کا منہ دیکھنا پڑے گا۔'' انہوں نے ہنس کر ہاتھ میں پکڑا دستر خوان اماں کے سامنے تخت پر بچھایا اور لبنیٰ کو دیکھا۔ وہ بے جان سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے کھڑی تھی۔ پھر دھیرے سے پلٹی اور کچن سے پلیٹیں اور ڈشیں وغیرہ لا کر رکھنے لگی۔
''ہمارے زمانے میں تو یادگار ہوتا تھا ساون...... ایسے، ایسے کھانے پکتے تھے موسم کی مناسبت سے کہ آدھے محلے تک خوشبو جاتی تھی۔''
''جی مگر...... وہ بڑی آپا...... میرے ہاتھ میں ایسا ذائقہ کہاں......'' اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
''خیر یہ بھی ٹھیک ہے۔'' انہوں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔
اخبار میں لپٹی پوریوں کی ٹرے اٹھا کر لاتی ثانیہ ہنس پڑی۔
''مگر ذائقہ نہ سہی...... محبت لازمی ہونی چاہیے۔ آج کل کے دور میں کوئی کسی کے کام یا کھانے کا بھوکا تھوڑا ہی ہے۔'' انہوں نے بے حد محبت سے کھسک کر ثانیہ کو برابر میں بٹھایا۔
''جی......!'' لبنیٰ نے بہ مشکل تھوک نگلا۔
''یہ تو ایک دوسرے کا پیار ہوتا ہے، تم جیسا بھی بناتیں ہم کھا ہی لیتے بھئی اب تک بھی تو کھا ہی رہے ہیں ناں......'' انہوں نے لگاوٹ سے اسے دیکھا۔
اس سے ایک لفظ تک نہیں بولا گیا۔
''آؤ بہو...... تم بھی یہیں آجاؤ......'' اماں کو بالآخر اس کا خیال آ ہی گیا۔
''جی، میں ذرا ان کو بلا لاؤں۔'' آنکھوں میں تیزی سے جمع ہوتے آنسوؤں کو چھلکنے سے روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔
وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے محبت اور محبت جتانے کے نرالے انداز پر غور کرتی رہی۔
جب گھر میں پکایا تو پسند نہیں آیا اور بازار سے منگوایا تو بھی پسند نہیں آیا۔
یہ کیسی محبت تھی۔ اور یہ کیسے محبت کرنے والے تھے۔ جو محبت بھی جتاتے تھے تو احسان کی طرح...... توجہ دیتے تھے تو خیرات میں ملی بھیک کے مانند...... یہ کیسی محبت تھی...... یہ کس رنگ کی محبت تھی۔
یہ کون سا انوکھا روپ تھا جو اتنے دن گزر جانے کے باوجود سمجھ میں نہیں آسکا تھا اور وہ کیوں خواہ مخواہ میں ہی محبت، محبت کی گردان کیے جا رہی تھی آپا کی طرح......
خدا جانے یہ محبت تھی بھی یا......

☆☆



ناولٹ

میں عورت ہوں

درداسنہ نوشین خان

گلی، گلی دیواروں پر فریال ہاشم آزاد امیدوار صوبائی اسمبلی کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ یہ لاہور، کراچی جیسے بڑے شہر نہیں جنوبی پنجاب کے چھوٹے سے ضلع کی بات تھی۔ لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں داب لیں۔ ہاشم کو کیا سوجھی اپنی نوجوان غیر شادی شدہ بیٹی کو الیکشن میں کھڑا کر دیا۔ مانا کہ فریال ہاشم پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کر کے لوٹی تھی۔ ایک بڑے نام کے فرنچائزڈ اسکول میں وائس پرنسپل کی



تعیناتی مل گئی تھی مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ عوام اس طرح کی امیدوار خاتون کو کب ووٹ دیتی ہے۔ الیکشن کی بھاگ دوڑ کا خرچہ ہی ایسے امیدواروں کے پاس نہیں ہوتا۔ ہر کوئی مذاق اڑا رہا تھا۔ کچھ لوگ توبہ، توبہ کر رہے تھے کہ لڑکی کی تصویر گھر، گھر پہنچی ہوئی ہے۔ (اگرچہ یہ اُن کی جہالت اور تنگ نظری ہی تھی) کچھ بھی ہو ہاشم سڈل نے بیٹی کو اعتماد اور آزادی دی تھی۔ چند احباب کے سوا کوئی حمایت نہ تھی۔ دیہات کا ووٹ تو سرے سے اس کے مخالف تھا۔ ہاشم بھی جانتا تھا کہ میری بیٹی فریال یہ نشست نہیں جیت سکتی۔ یہ تو بعد میں کھلا کہ وہ بیٹی کو پُراعتماد شناخت اور باشعور نیک نامی دینا چاہتا تھا۔

حالانکہ فریال کا بھائی علی ہاشم بھی تھا لیکن وہ بہن جتنا پڑھائی میں تیز تھا نہ ہی بااعتماد البتہ وہ ملک سے باہر جا کر ڈھیروں روپے کمانے اور اپنی زندگی جنت بنانے کے رستے ڈھونڈتا رہتا۔

''کیا فائدہ ہوا ہے ابو...... یہ جو پچاس، ساٹھ ہزار روپے آپ نے گنوا دیے، یہ مجھے دے دیتے میں کاروبار کر لیتا...... کبھی پچاس، ساٹھ ہزار سے بھی کسی نے الیکشن لڑا ہے؟''

اس کی بات پر ہاشم کو اتنی ہنسی آئی کہ چائے کا کپ میز پر رکھ دیا جس سے کچھ قطرے چھلک کر میز پر گرے۔

''اگر پچاس، ساٹھ ہزار سے الیکشن نہیں لڑا جا سکتا تو بیٹا جی...... پچاس، ساٹھ ہزار میں کاروبار کون سا ہو سکتا ہے...... ہاں برف کے گولے کی ریڑھی لگ جاتی جو کہ تم کبھی نہیں لگاؤ گے حالانکہ کام کوئی بھی کمتر نہیں ہوتا۔''

دہی بھلے کھاتی فریال مسکرا رہی تھی۔

''اور ہاں...... دوسری بات یہ ہے کہ میں نے پچاس، ساٹھ ہزار نہیں، ایک لاکھ روپیہ لگایا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے اب میرے ہنسنے کی باری ہے۔ یہی تو کہہ رہا ہوں آپ نے خون پسینے کی کمائی ضائع کر دی۔'' علی ہاشم بولا۔

''کبھی کبھی...... ہو جاتا ہے نقصان......'' ہاشم سڈل بولا۔

''مگر ہر نقصان کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے۔'' فریال نے پلیٹ رکھی۔

''فلسفہ نہ بولنا...... سر میں درد ہوتا ہے۔''

اکتاہٹ علی کے چہرے پر ظاہر ہونے میں دیر نہ لگاتی تھی۔ ہاشم کی بیوی ان سروس سولہ گریڈ ٹیچر تھی جو فوت ہو گئی تھی۔ یہ مکان مرحومہ کے پیسوں سے بنا تھا۔ فریال اپنی ماں کی کمی بہت محسوس کرتی تھی کیونکہ ماں کے بعد سب سے زیادہ تنہا وہی ہوئی تھی۔ تیکھے نین نقش، گندمی گلابی رنگت، پچیس سالہ اسمارٹ سی فریال، ماں کے بعد گھر کی اہم کفیل بن گئی۔ علی تو بی اے کر رہا تھا جبکہ ہاشم ایک متوسط درجے کی دکان چلاتا تھا۔

☆☆☆

''حضرات اور حضرات!'' فریال نے کمرے سے بھاگ کر لاؤنج میں آتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ویمن کرائسس سینٹر پر ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیٹر کی جاب آفر ہو گئی ہے۔''

''کس نے آفر کی ہے؟'' ہاشم نے پودوں کو پانی دیتے ہوئے پوچھا۔

''سیلری پوچھیں...... سیلری۔'' فریال چہکی۔

''سیلری بتاؤ...... سیلری۔'' علی نے بھی ہانک لگائی۔

''ساٹھ ہزار...... سکہ رائج الوقت۔''

''ار...... رے...... واہ بیٹا...... بڑی بات ہے۔'' ہاشم نے فوارہ رکھ دیا۔

علی چھلانگ مار کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ موبائل جیب میں ڈال کے سراپا شوق ہو گیا۔

''فریال...... تو جلدی سے جوائن کر لے...... موقع ہاتھ سے نہ نکلے۔''

''موقع ہاتھ سے کیوں نکلے گا بھائی۔''

''تری جان پہچان بن جائے تو مجھے بھی اِدھر کہیں کھپا لینا...... سچی کہہ رہا ہوں۔'' علی کی بے تابی عروج پر تھی۔

''اچھا علی...... پہلے خود تو کھپ لوں۔ پھر دیکھوں گی۔ ابو...... آپ کو ایک لاکھ ضائع کرنے کا یہ فائدہ ہوا ہے...... انہوں نے مجھے locate کر کے میرے اعتماد اور سماجی دباؤ سے بے نیاز ہونے کی base پر آفردی ہے۔''

''حالانکہ تم یہ ہو نہیں......'' علی ہنسنے لگا۔

''اچھا......'' فریال اسے مارنے لپکی اور وہ بھاگ گیا۔

فریال نے اسکول چھوڑ کر نئی جاب جوائن کر لی، ایک بار پھر طرح طرح کی باتیں ہوئیں۔ کسی نے کہا چلو اچھا ہو گیا شکست کا ازالہ ہو گیا۔ کسی نے باپ بیٹی کی ''چالاکی، ہوشیاری'' پر توبہ کی۔ یہ تو سب نے کہا کہ بیٹی کی کمائی کی لت لگ گئی ہے اب بیٹی کی شادی نہیں ہونے والی...... ہاشم کے بھائی بہنوں نے اپنی، اپنی اولادوں کی دھوم دھام سے شادیاں کی تھیں۔ ہاشم بیوی کی جمع پونجی مکان پر لگا چکا تھا، وہ اکثر اسی پریشانی میں مبتلا رہتا۔

فریال کے دفتر میں قاصد سے لے کر کلرک تک خواتین ملازم تھیں۔ بس سیکیورٹی گارڈ اور ڈرائیور مرد تھے۔ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر سے آنے والی چیکنگ ٹیم میں نبیل باجوہ جنرل منیجر تھا۔ فریال کی اسسٹنٹ مس شائلہ کی کجراری آنکھیں اسے شوق سے تکتی تھیں۔ لیکن ادارے کا ماحول بڑا پابند تھا۔ احترام اور فاصلے لازم تھے یہی وجہ تھی کہ یہاں دور دراز علاقوں کی ظلم وستم کی شکار خواتین یا عُسرت کے ہاتھوں مرنے پر مجبور عورتیں بلاجھجک آتیں۔ ویمن پولیس، تحفظ، رہائش، طبی امداد، مالی امداد برائے روزگار ہر قسم کے ذرائع سے ان کی مدد کی جاتی تھی۔

''فریال میم...... دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ روز ایک ایسی اسٹوری سامنے آتی ہے۔'' شائلہ لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر کے اپنی میز پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔

''اسٹوری جیسی بھی ہو۔ ان عورتوں کی ہمت کو سلام ہے جو یہاں تک آتی ہیں۔'' فریال نے اپنے گھنے بالوں کو کیچر میں سمیٹتے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ پانچ بج رہے تھے۔ شائلہ موبائل دیکھنے لگی۔

قاصد ریحانہ، مس شائلہ کے بھائی کے آنے کی اطلاع دے کر ہاتھ میں چابیاں لیے بے قراری سے ان کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

''اب کیا کرنے لگی ہو، ابھی تو کہہ رہی تھیں کہیں جانا ہے۔'' شائلہ کو موبائل پر مگن پا کر فریال بولی۔

فریال کی نظر نبیل باجوہ کی تصویروں پر پڑی جو لیپ ٹاپ کے ڈیٹا سے شائلہ نے اپنے موبائل میں ڈالی تھیں۔

فریال نے اسے تنبیہا گھورا۔ وہ موبائل بیگ میں ڈال کر 'اللہ حافظ' کہتی نکل گئی۔ فریال کو آج ہی احساس ہوا تھا کہ نبیل باجوہ کی آنکھیں اسے یعنی خود فریال کو دیکھ کر چمکتی ہیں، اس کے تاثرات کا آئینہ بولنے لگتا ہے اور یہ بھی انکشاف آج ہی ہوا کہ شائلہ......؟ مگر احتیاط کا، تدبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔

''فریال تم نے اپنے آفیسرز سے میرے لیے جاب کی بات کی؟'' رات کے کھانے پر علی یاد دلانے لگا۔

''کوئی جاب ہو تو بات کروں ناں۔ مجھے یاد ہے علی بھائی۔''

''بیٹا...... میں سوچتا ہوں تمہاری بہن کا فرض ادا کر دوں۔'' کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہوئے ہاشم نے بظاہر علی کو مخاطب کر کے کہا۔

''ابو...... ابھی تو اس کی جاب لگی ہے۔''

''تو کیا ہوا......'' پھر رک کر کہا۔ ''تمہارا بڑا چاچا قاسم رشتہ بتا رہا تھا۔''

''کس کا؟''

''سلیم شوکت کا۔''

''کون سلیم شوکت؟'' علی کو خاندان سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ فریال کے کان کھڑے ہو گئے۔ سوچ کے گھوڑے دوڑاتی وہ سلیم شوکت تک پہنچ گئی تھی۔

''قاسم بھائی کے داماد کا بھائی ہے۔ بی اے ایل ایل بی کیا ہوا ہے۔ ابھی کرتا کچھ نہیں مگر وکیل بن جائے گا۔''

''ساٹھ ہزار ماہانہ کمانے والی لڑکی ہو تو اسے کیا کرنا ہے.....آپ بھی ناں بس چھوڑیں ابو۔''

''بالکل ٹھیک کہا۔'' فریال کھل اٹھی۔

علی کے انکار سے وقتی طور پر ہاشم کے ذہن سے بات محو تو ہوگئی مگر بیٹی کی ذمے داری کو وہ کیسے بھلا سکتا تھا۔

WWCC کے زیرِ اہتمام ویمن ڈے کا اہتمام یادگار تقریب ہوتی تھی۔ ضلع بھر سے مختلف شعبۂ حیات کی کام میں نمایاں خواتین کے لیے ایوارڈز ہوتے اور ہر ایوارڈ یافتہ کو اپنے ہمراہ دو عدد مستحق غریب، باہمت عورتیں برائے مالی امداد لانے کی اجازت دی جاتی تھی۔ یعنی بہترین معلمہ، معالج، لیڈی پولیس، کسان عورت، مزدور عورت، مرغی مویشی پالنے والی، کاروباری، بوتیک و بیوٹی پارلر الغرض پندرہ ایوارڈ پانے والیوں کے ہمراہ تیس محنت کش غریب خواتین ہوتیں۔ شہر بھر کی عام خواتین کے لیے تقریب میں داخلہ مفت اور لنگر ہوتا۔ فریال ہاشم کے زیرِ انتظام یہ پروگرام ہمیشہ سے زیادہ پُرجوش اور شاندار تھا۔ اسٹیڈیم اور گراؤنڈز عورتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہلکے رنگوں کی حسین دھنک میں رنگی چاق و چوبند فریال ہاشم اسٹیڈیم کی وسیع و عریض اسکرین پر ہر لحہ متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ سب سے خوش دلی سے ملتی جیسے ہر عورت اس کی ذاتی مہمان ہو۔

پروگرام کی تقاریر، ٹیبلو، میوزک کے درمیان بار، بار تنظیم کا ترانہ بجتا تو جوش و خروش کی لہر دوڑ جاتی۔

میں عورت ہوں
میں انساں ہوں
میں سربلند ہوں
عظمت کا نشاں ہوں
رحمت بانٹتی ہوں
راحت بانٹتی ہوں
میں جنت ہوں
جنت کی ماں ہوں
میں عورت ہوں
میں انساں ہوں

تنظیم کے مرکزی عہدے دار بھی مدعو تھے اور باری، باری خطاب کررہے تھے۔ نبیل باجوہ روسٹرم پر آیا تو حاضرینِ محفل کا احاطہ کرتی اس کی نگاہ سیدھی فریال ہاشم پر گئی۔ پچھلی نشستوں کے پاس کھڑی کسی بدحال حلیہ عورت کی داستانِ غم سن رہی تھی۔ اس کا اندازہ اس کے ٹشو سے آنکھیں پونچھنے سے ہوا۔ نبیل کو غصہ آرہا تھا۔ ''یہ میڈم صاحبہ ہر کیس ہسٹری کے ساتھ یوں آہ و زاریاں کرنے بیٹھ جاتی ہوں گی۔'' وہ اس کی زود رنجی پر تلملا ہی تو گیا۔

تقریب کے بعد افسران کے لنچ کا اہتمام الگ کمرے میں تھا۔ فریال مدارات پر نظر ڈالنے آئی تو نبیل باجوہ نے کہا۔

''آپ بھی کھانا لیجیے۔''

''جی.....میں ابھی لیتی ہوں۔'' پھر اس کی پلیٹ پر نظر ڈال کر لوازمات کی طرف متوجہ کرنے لگی۔

''میں سب کچھ لے لوں گا.....آپ ایزی ہو جائیں۔ فریال! آپ پلیز مجھے ایک منٹ دیں گی۔''

''جی.....جی فرمائیں۔''

''آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ کی جاب ایسی ہے کہ دکھی نسائیت سے واسطہ رہتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر دکھ کو اپنی جان پر لے لیں۔ ہم رونے والے کے ساتھ مل کر رونے نہیں بلکہ اسے عملاً فائدہ دینے والوں میں سے ہیں.....ہمیں اسمائل دینی ہے۔ انہیں اسٹرانگ کرنا ہے۔''

''جی بالکل سر.....!'' جانے کب شائلہ پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی تائید کے باوجود نبیل نے اس پر توجہ نہ کی۔

''میں ایسا ہی کرتی ہوں۔'' فریال نے نوکری کے خطرے سے جھٹ کہہ دیا۔

''جی ہاں.....وہ تو میں دیکھ رہا تھا۔'' پھر زیرِ لب کہا۔ ''پگلی نہ ہو تو.....'' اور مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ فریال شکر کی سانس لیتے ہوئے شائلہ کو دیکھ کر مسکرائی

مگر شائلہ رسماً بھی نہ مسکرا سکی۔

☆☆☆

''ابو کہاں ہیں؟'' فریال خوشگوار موڈ میں گھر میں داخل ہوئی۔

''دکان پر...... خیر تو ہے بڑی خوش نظر آ رہی ہو؟'' علی نے موٹر بائیک پر جھاڑن رگڑتے ہوئے کہا۔ فریال نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ہزار کے تین نوٹ اسے پکڑائے۔

''یہ لو...... عیش کرو۔''

''ارے واہ...... سیلری ملی ہوگی۔'' وہ نوٹ جیب میں ڈال کر بولا۔ ''پانچ تو دو...... پیٹرول ڈلوانا ہے، بائیک کا کچھ کام بھی ہے۔''

''اچھا...... ٹھہرو...... کمیٹی والی آنٹی کو کمیٹی دیتے آنا...... بجلی کا بل لاتی ہوں، یہ بھی بھر دینا۔''

''اتنے کام بتا دیے، انسان ہوں اونٹ نہیں ہوں۔''

''اونٹ کام نہیں کرتے، انسان کرتے ہیں۔ کام کرنے سے انسان، اونٹ بن جاتے تو میں بن چکی ہوتی۔''

''کچھ دے کر سنایا تو نہ کرو پلیز......'' وہ بائیک نکال کر بڑبڑاتا چلا گیا۔ کتنی عجیب بات تھی وہ کما کر محنت کر کے بھی قصوروار تھی۔

اگلے کئی دنوں بارہا یہ خیال آتا رہا کہ بھائی کی نوکری کے لیے نبیل باجوہ سے بات کروں یا کسی اور سے، جگہ خالی تو کوئی نہ تھی اور وہ اسی تردد میں تھی کہ نبیل باجوہ کا فون آ گیا۔

تقریب کی رپورٹ اور تصاویر مختلف اخبارات کو ارسال کرنے کی ہدایت کے ساتھ سالانہ میگزین کے لیے تفصیلی رپورٹ تیار کرنے کو کہا اور بتایا کہ نجی چینل پر اس کی کوریج آ رہی ہے، اس کی وڈیو کلپ بنائی جائے۔ وہ فون رکھنے والا تھا کہ فریال جلدی سے کہہ اٹھی۔

''سر...... وہ ایک ریکویسٹ ہے۔''

''ہاں......!''

''میرے بھائی کے لیے جاب کی پریشانی ہے۔''

''کیا تعلیم ہے؟''

''بی...... اے۔'' (اُف خدایا کیا کہیں گے)

''بی اے...... کس سبجیکٹ کے ساتھ؟''

''میتھس۔'' (شکر ہے کوئی تو پوزیٹو پوائنٹ ہے)

''کتنے بھائی ہیں آپ کے؟''

''ہم صرف دو بھائی بہن ہیں۔''

''تو جلدی کیا ہے، اسے آگے پڑھنے دیں۔''

''اصل میں چھوٹے بھائی کو پڑھنے کا شوق نہیں...... ابو چاہتے ہیں کہ اسے کام مل جائے، وہ خود بھی یہی چاہتا ہے۔''

''میں کرتا ہوں کچھ...... انشاء اللہ۔''

فریال کے دل میں تسلی اتر گئی۔ کتنے نیک انسان ہیں ورنہ یہ بھی کہہ سکتے تھے اس تعلیم سے کیا جاب مل سکتی ہے۔

کچھ ہی دنوں میں اس مسئلے کا حل نکل آیا۔ دراصل نبیل باجوہ کی ذاتی دلچسپی نے حل نکال لیا۔ پانچ لڑکوں کا گروپ ابوظہبی میں کسی کمپنی کے لیے مختلف کاموں اور تنخواہ پر چنا گیا۔ نبیل باجوہ نے اس میں علی کو شامل کرا دیا۔ تنخواہ فی الحال پاکستانی ستر ہزار تھے اس میں اپنا گزارہ تو کر ہی سکتا تھا۔

''یہ تو بہت اچھا ہو گیا، ابو خوش ہو جائیں گے۔ آپ کا بہت شکریہ سر!'' فریال خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی۔

''آپ علی کو لے کر آؤ اور اوریجنل ڈاکومنٹس لے کر کل میرے آفس آ جائیے گا۔''

''بالکل سر...... میں کل کی چھٹی اپلائی کر دیتی ہوں۔''

''ارے نہیں، چھٹی کی ضرورت نہیں۔ دو گھنٹے کا سفر ہے۔ آپ کو یہاں کسی آفیشل ورک میں حاضر کر دیں گے۔'' وہ ہنس پڑے۔

فون بند کرتے ہی فریال نے یہ خوش خبری ابو کو سنائی۔

''ابو کل ملتان جانا ہے۔ علی سے کہیے پاسپورٹ سائز فوٹو اور فوٹو کاپیاں کروا رکھے۔''

''میں ابھی جاتا ہوں۔'' ابو سن کر خوش ہو رہے تھے۔

اس کے بعد پاسپورٹ ویزا کے معاملات طے ہوئے اور مہینے کے اندر علی ابوظہبی پرواز کر گیا۔ خاندان والوں نے ہاشم کی قسمت پر رشک کیا۔ اب تو فریال کے رشتے میں اتنی چمک پیدا ہو چکی تھی کہ کسی دوسرے کے آنے سے پہلے چچا قاسم نے دہلیز پکڑ لی ان کے پسِ پشت سلیم شوکت کا اصرار تھا۔ والدین اس کے حیات نہ تھے۔ وہ بھائی بھابی کے ساتھ رہتا تھا۔ چچا قاسم کی بیٹی اس کی بھابی تھی۔ قاسم چچا کی بیٹی (یعنی فریال کی چچازاد) ہنس، ہنس کر بتایا کرتی تھی کہ دیور کی روٹیاں پکاتے، پکاتے تھک جاتی ہوں، اتنی روٹیاں کھاتا ہے۔ وہ اونچا لمبا موٹا تازہ اور وجیہہ تھا۔ مزید برآں اس احساسِ برتری میں مبتلا تھا کہ لڑکیاں اس کو دیکھتے ہی مرمٹتی ہیں۔ فریال کے ہاں رشتہ خود بھجوا کر کہتا رہتا سمجھو اس لڑکی کی لاٹری نکل آئی ہے۔ چچا قاسم نے بھی اپنے بھائی ہاشم کے آگے سلیم شوکت کی ایسی، ایسی تعریف باندھی کہ وہ خوش فہمی میں آگیا کہ یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین ہے رات کو باپ بیٹی چائے لے کر بیٹھے تھے۔

''میری پیاری بچی...... ہر باپ اپنی بچی کا فرض ادا کرنا چاہتا ہے۔ میں اب یہ فرض مزید ملتوی نہیں کرنا چاہتا۔'' ہاشم نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کیا جلدی ہے ابو، آپ اکیلے پڑ جائیں گے۔ علی بھی چلا گیا ہے۔''

''میں اکیلا بھی نہیں ہوں گا اور میری بیٹی بھی کہیں دور نہیں جائے گی اس لیے تو میں سلیم کا رشتہ پسند کرتا ہوں گڈ لکنگ ہے، تعلیم یافتہ ہے، داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے...... میں اس گھر کو کچھ تبدیلیوں کے ساتھ سیٹ کرا دوں گا۔''

''تو ابو نے تو سب کچھ سوچ لیا۔'' فریال کے ہاتھ میں کپ چھلک گیا۔ دل میں یقین اترا۔ ایک پل نبیل باجوہ کا نام ستارے کی طرح چمکا دوسرے پل شہابِ ثاقب کی طرح ٹوٹ کے گم ہو گیا۔ وہ ان دنوں ترکی کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ وہ ہوتا بھی تو اس سے یہ بات کب ہو سکتی تھی۔ اس نے کبھی کوئی واضح پیغام نہیں دیا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی یہ تک نہیں کہ وہ کسی بندھن میں بندھا ہوا تو نہیں۔

☆☆☆

شمائلہ تازہ اجرا ہونے والے میگزین کے لیے بذریعۂ ڈاک آنے والا مواد اٹھائے فریال کے آفس میں داخل ہوئی تو دیکھا وہ میز پر دونوں ہاتھ دھرے خاموش بیٹھی ہے۔ ایسا تو کبھی ہوتا نہ تھا کہ وہ مصروف نہ ہو۔

''میڈم...... آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہوں۔''

''آپ اپنے بھائی کو مس کر رہی ہیں؟'' کاغذات کا پلندا رکھتے ہوئے اس نے پھر پوچھا۔

''نہیں، اس سے بات ہوتی رہتی ہے۔''

''کیا میں یہاں کچھ دیر بیٹھ سکتی ہوں؟''

''شیور شمائلہ...... کیوں نہیں۔'' شمائلہ اسے دیکھتے، دیکھتے بیٹھ گئی۔

''ایسا ہے کہ...... ابو نے ایک پروپوزل کو فائنل کر دیا ہے۔'' فریال نے اس کا تجسس دور کر دیا۔

''آپ کے لیے؟''

''ہاں۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے...... کون ہے وہ؟ کرتا کیا ہے؟ کیسا دکھتا ہے؟'' شمائلہ خوشی سے پُرجوش ہو گئی۔ فریال حیرت سے سوچنے لگی کہ میں اتنی پُرجوش، خوش اور بے قرار کیوں نہیں ہوئی۔ وہ اپنی حیرت کا جواب کرید رہی تھی کہ ایک اور سوال آیا۔

''کیا آپ اس سے ملی ہیں؟ کبھی بات ہوئی ہے؟''

''ہماری فیملی کا بندہ ہے۔''

''آپ کے موبائل میں اس کا فوٹو تو ہو گا؟''

اس کا نفی میں ہلتا سر دیکھ کر وہ بولی۔

''کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اسے ابھی سرچ کر لیتی ہوں۔'' وہ لیپ ٹاپ پر جھک گئی۔ اسے بس چند سیکنڈ لگے کہ تصویر سامنے آگئی۔

''واؤ...... یہ تو بہت اچھا ہے۔''
فریال دھیما سا مسکرا دی۔ ''اچھا اب کام پر بات کرو۔''
ویسے شائلہ بھی عجیب چیز تھی۔ جہاں فریال کی زندگی کا قدم پڑتا وہاں اس کا عکس شامل ہو جاتا۔ ہوسکتا ہے اس نے سلیم شوکت کی تعریف نبیل باجوہ کی کسک کم کرنے کے لیے کی ہو۔

☆☆☆

فریال کی منگنی تھی۔ ان کا چھوٹا سا گھر خوشیوں سے جگمگا رہا تھا۔ علی نہیں تھا۔ مگر اسکائپ پر دو تین بار بات کر چکا تھا۔ قاسم چاچا والے لڑکے والے تھے تو احتشام چاچا اور پھولڑ کی والے بن کے ہلا گلا کر رہے تھے۔ فریال کا ننھیال تو ماں کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ دراز قامت سلیم اجلے سفید شلوار قمیص سوٹ اور گرے واسکٹ میں اتراتا ہوا چلتا داخل ہوا تو خواتین 'ماشاءاللہ... چاند سورج کی جوڑی' کہنے لگیں۔ گلابی گلاب جیسے شرارے میں گلابی، گلابی فریال بھی تو کم پیاری نہ تھی۔
منگنی کی تقریب سادہ مگر پُر رونق رہی۔ کھانا پُر تکلف دیا گیا۔ لین دین میں بھی ہاشم کا پلڑا بھاری تھا۔ سلیم کی طرف سے ہر کمی کو والدین نہ ہونے کے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔
شادی چار ماہ بعد ہونا تھی۔
منگنی کے بعد سلیم کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔
اس روز وہ صبح سویرے آ نکلا تھا۔ ہاشم کچن سے چائے کے دو کپ بنا کر لاتے ہوئے اسے صحن میں پا کر ٹھٹکا۔
''سلیم بیٹا...... آج سویرے، سویرے جاگ گئے۔''
قاسم نے فریال کی ڈریسنگ ٹیبل پر لا کر ایک چائے کا کپ رکھا، وہ کمرے سے نکلتی ہوئی دوپٹا کندھے پر پھیلانے لگی۔ ''تھینکس ابو۔'' چائے کا کپ اٹھایا۔ ہاشم نے دوسرا کپ سلیم کی طرف بڑھایا۔
''یہ تم لے لو بیٹا...... میں بسکٹ لے آتا ہوں۔''
''چاچا...... آپ بیٹھیں، یہ کام آپ کے کرنے کے نہیں...... فریال چائے بنا لائے گی۔''

''سلیم بیٹا...... تم سے کیا تکلف۔ تم اب اسی گھر کے فرد ہو...... فریال بیٹی کو ساڑھے سات بجے پہنچنا ہوتا ہے...... وقت کی بہت پابندی ہے۔ محنت اور کام بھی بہت ہے یونہی تو پیسہ نہیں ملتا ناں...... میں تو اپنی مرضی سے دکان کھولتا ہوں...... چائے ناشتا میں بنا لیتا ہوں۔''
''مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔'' وہ صوفے پر پھیلتے ہوئے بولا۔
''تمہیں کون کہتا ہے کہ کرو۔'' ہاشم ہنس پڑا۔
''اچھا چلتی ہوں۔'' فریال نے بیگ میں موبائل ڈالا۔
''یہ...... یونہی...... میرا مطلب ہے کیسے جاؤ گی؟'' نظروں میں اعتراض تھا جانے کس بات پر، اکیلے جانے پر یا صرف دوپٹے کے ساتھ جانے پر (کسی اضافی چادر کے سوا)
''گاڑی آئی ہوئی ہے...... خدا حافظ ابو...... خدا حافظ سلیم۔''
''گاڑی کس کی آتی ہے؟'' وہ چلی گئی تو ہاشم چاچا سے اس نے پوچھا۔
''دفتر کی گاڑی ہے۔ دوسری لڑکی کو بھی لیتی ہے۔''
''ہوں......'' وہ بسکٹ چائے میں ڈبونے لگا۔
کچھ دنوں بعد قاسم آیا تو اس نے عجیب بات کہی۔
وہ اپنے بھائی ہاشم کو سمجھانے لگا کہ مکان کے دو حصے کر دے۔ ایک حصہ فریال کے نام کر دے۔ دوسرا اپنا اور بیٹے کا رکھ لے بلکہ دکان کے اوپر ایک کمرا ڈلوا لے۔
''قاسم بھائی کیا میری موت کا وقت آ گیا ہے؟ خیر موت تو سب کو آنی ہے مگر آپ نے تو اپنے گھر کے حصے بخرے نہیں کیے۔''
''لاحول ولاقوۃ...... اللہ تمہیں پوتوں، نواسوں کے سہرے دکھائے...... میں تو سمجھا رہا ہوں کہ شادی کے بعد بیٹی ساتھ بھی ہو اور الگ بھی۔ انہیں اپنے گھر کی ملکیت کا احساس ہوگا خوشی ہوگی، آخر کو اولاد ہی مالک ہوتی ہے۔''
قاسم چاچا ہمیشہ دلائل کی جنگ جیت جاتا تھا۔

ہاشم رضامند ہوگیا مگر فریال کو دیواریں کھینچنے کا خیال بالکل پسند نہ آیا۔

''گھر چھوٹا اور تنگ ہو جائے گا۔''

''نہیں بیٹی، ایسا نہیں ہوگا۔ دکان اور اس کے پیچھے والا کمرا اور کچھ گز کا صحن میں رکھ لوں گا۔ دکان والے حصے کے اوپر بھی کمرا ڈلوا دیتا ہوں۔ علی کی شادی ہوگی تو میں اوپر رہ جاؤں گا۔ باقی دو کمرے لاؤنج باتھ کچن یہ تمہیں الگ کر دیتا ہوں۔ دیوار میں ایک راستہ رکھ لیں گے، کوئی مسئلہ نہیں...... بلکہ زیادہ آسانیاں ہوں گی۔''

''اچھا...... میں کل آپ کو رقم نکلوا دوں گی۔''

فریال جانتی تھی کہ ابو کے پاس مکان، جہیز، شادی جتنے پیسے نہیں ہیں۔ ہاشم خاموش ہوگیا۔

انہی دنوں خبر ملی کہ نبیل باجوہ اس کمپنی سے کہیں اور چلا گیا ہے یقیناً کوئی بہتر موقع ملا ہوگا۔ اس خبر سے شمائلہ کچھ بجھ سی گئی۔

''نبیل صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''بہتر چانس جسے ملے وہ avail کرتا ہے، آپ کو ملے آپ نہیں کرو گی؟''

''وہ مل کر تو جاتے۔''

''آئے ہوں گے آخر چارج تو دینا تھا۔''

''سب سے دعا سلام کر جاتے...... چھوڑیں فریال میم۔''

''شمائلہ...... کل تم اپنے کزن کا ذکر کر رہی تھیں۔''

''وہ تو...... بس یونہی......'' ایک پھیکی سی ہنسی۔

''کیا مطلب؟''

''وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔''

''یعنی ہر فرد اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں آزردہ ہے۔''

☆☆☆

نیا مکان اچھا لگنے لگا۔ بلکہ بالکل ہی نیا اور مختلف ہوگیا۔ اب اسے ہاشم سامان سے بھرنے لگا۔ ایک سیٹ سا سجا سجایا مکان اور کمانے والی دلہن، سلیم شوکت نے کیا خوب ہاتھ مارا تھا۔ ان دنوں اس کی خوشی دیدنی تھی۔ زمین پر پاؤں نہیں پڑتے تھے۔

اب شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ فریال کی ددھیال کو ڈھولکیاں بجانے ناچنے گانے کا موقع ملا۔ فریال ایک ماہ کی چھٹی اپلائی کرنے جا رہی تھی کہ سلیم کو خبر ملی اس نے فون پر روک دیا اور صرف ایک ہفتے کی چھٹی کو بھی ضرورت سے زیادہ قرار دیتے ہوئے مناسب سمجھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''دوطرفہ'' اخراجات کے سبب وہ جلد کہیں باہر گھومنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو چھٹی بیکار ہوگی۔ سلیم کی جانب سے اس کے بھائی نے ایک اچھے دعوتِ ولیمہ کے انتظام کے علاوہ کچھ نہ کیا تھا۔ دینے کے معاملے میں قاسم چاچا کی اسلامی رائے یہ تھی کہ قیمتی ملبوسات، زیور، فضول خرچی اور اصراف ہیں۔ دلہن والوں کا تحفہ سیاہ شیروانی اور میرون کلاہ میں سلیم جب دلہن کے پہلو میں اسٹیج پر بیٹھا تو دھیرے سے سرگوشی کی۔

''آج میری نظر اتروا دینا۔''

''اور میری بھی......'' فریال نے فٹ کہہ دیا۔

''غور کرو جانی...... ساری عورتیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔''

فریال کے تاثرات میں کوفت تھی۔

طے یہ تھا کہ رخصتی کرا کے قاسم چاچا اپنے گھر لے جائیں گے وہاں ایک کمرا حجلۂ عروسی کے طور پر مزین تھا۔ اگلے دن ولیمے کے بعد وہ اپنے گھر شفٹ ہو جائیں گے۔

دلہن اسی حجلۂ عروسی میں کزنز اور رشتے دار خواتین کے چلے جانے کے بعد دولہا کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ سلیم داخل ہوا۔ کھسا اتار کر بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔

''فریال یار میرے سر میں درد ہو رہا ہے، ذرا سر دبا دو۔''

فریال نے پہلو بدلا۔ دوپٹا سنبھالا، پاؤں نیچے اتارے۔ ''میں چینج کر کے آتی ہوں۔''

''اسی طرح بیٹھی رہو۔''

فریال چھنکتی کھنکتی بیٹھی رہی اور آہستہ آہستہ سر دبانے لگی۔

''لگتا ہے مجھے نظرِ بد لگ گئی ہے...... تم کچھ پڑھ کر پھونک دو۔''

حیرت کے مارے فریال کے ہاتھ رک گئے۔ وہ گنگ ہو کر آنکھیں پھاڑے تکنے لگی مگر وہ تو اس کی حیرت سے بے خبر آنکھیں موندے پڑا تھا ورنہ یوں دیدے پھاڑ کر تکنے سے نظرِ بد لگانے والوں میں اس کا بھی شمار ہو جاتا۔

''اچھا...... پانی پلا دو...... یہاں گھٹن ہو رہی ہے۔''

اب فریال چھنکتی کھنکتی ہوئی اٹھی لہنگا سنبھالتی پانی گلاس میں انڈیل کر لے آئی۔

''یہاں اے سی نہیں ہے، گھٹن ہے۔'' پانی پی کر کہا۔ (نومبر کا مہینہ تھا)

''اُدھر ہمارے گھر اے سی لگوایا ہے ناں؟''

''جی۔''

''چلو ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔''

فریال کو پھر حیرت کا دورہ پڑ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''سچ کہہ رہا ہوں۔''

''سب کیا سوچیں گے...... قاسم چاچا......''

''میں بتا دیتا ہوں کمرے میں حبس ہے۔''

''پنکھا چل تو رہا ہے......'' اسے اٹھتے دیکھ کر کہا۔ ''آپ اسی گھر میں کل تک رہتے تھے۔''

''مجھ پر طنز کر رہی ہو...... ان پھولوں سے فضا میں بوجھل پن ہو گیا ہے۔'' اس نے گلاب کی لڑیوں پر ہاتھ مارا۔ کئی پھول پتیاں ٹوٹ کر بکھر سی گئیں۔

''کہیں اسے پھولوں سے الرجی تو نہیں ہوتی...... بعض لوگوں کو ہوتی ہے۔'' فریال کو سوچ میں دیکھ کر وہ بولا۔

''اچھا ایسا کرو...... یہ اتار پھینکو...... باہر کہیں ڈال دو۔''

''کیا یہ بندہ مجھے تنگ کرنا چاہتا ہے؟'' مگر وہ سیج کی لڑیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ توڑ پھوڑ کہاں سے شروع کرے۔ پھر نظر پھیر کر فریال کو دیکھا جو اسے یوں گھور رہی تھی گویا دماغی حالت پر شک ہو اور الرٹ ہو کہ کب وہ بھاگ نکلے۔

''فریال بیوی...... دو میں سے ایک کام تو کرنا ہو گا...... یا تو یہ کپڑے شپڑے بدلو، سادہ کپڑے پہنو اپنے گھر چلتے ہیں...... یا یہ سب الم غلم اتار کر ایک طرف کر دو۔''

فریال اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی اور دوپٹے کو پنوں سے آزاد کرنے لگی۔

''آپ پھول اتار دیں۔'' اس نے فیصلہ سنا دیا۔

وہ چھلانگ مار کر اٹھا اور بے دردی سے پھولوں کی لڑیاں کھینچنے، نوچنے لگا۔ اس کا یہ وحشیانہ عمل اس خوب صورت رات کو مسخ کرنے کے لیے کافی تھا۔ قلبی فاصلے کی پہلی اینٹ لگ گئی۔

اگلے دن ولیمہ ہوا...... اور ولیمے سے فارغ ہو کر سلیم، فریال کو لیے سیدھا فریال کے گھر یوں پہنچا جیسے جنم، جنم سے یہی اس کا گھر تھا جہاں اسے سکون مل گیا ہو۔ بہت جلد زندگی نے روٹین پکڑ لی اور روٹین یہ تھی کہ آفس جانے سے کافی پہلے فریال مستعد ہو جاتی، گھر سمیٹتی، سلیم کو ناشتا بنا کر دیتی اور اپنی تیاری کرتی، پہلے پہل وہ ابو کے لیے بھی ناشتا بنا کر دیتی مگر ہاشم نے منع کر دیا کہ وہ اپنے کام خود کرنے کا عادی تھا۔

سلیم ٹانگیں پسار کر لیٹا ٹی وی چینل بدلتا رہتا۔ فریال کو مختلف احکامات دیتا رہتا، اس کے کپڑوں پر استہزائیہ نگاہ ڈالتا۔

''پیلا رنگ بہت مشکل رنگ ہے۔ کسی، کسی کو جچتا ہے۔''

''یہ لال رنگ کے ساتھ جامنی کا کیا جوڑ ہے اس کے ساتھ کالا لگا تیں۔''

''لگتا ہے آپ عورت رہے ہیں۔''

''کامن سینس کی بات ہے جو تم میں نہیں ہے...... ویسے یہ بتاؤ اتنی تیاری کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ وقت اور پیسہ برباد۔''

''یہ اتنی تیاری نہیں ہے، فریش ہو کر جانا پڑتا ہے پھر میں نئی شادی شدہ ہوں...... کولیگز دیکھتی ہیں۔''

''تم عورتوں کو شوق ہوتا ہے، ڈرائیور ستائشی

نظروں سے دیکھے، چوکیدار حسن کی داد دے۔''
''شٹ اپ سلیم...... مائنڈ یور لینگویج۔''
''کیا کہا شٹ اپ...... مجھے شٹ اپ کہا۔'' چھلانگ مار کر اٹھا اور اس کی کلائی کو دبوچ لیا۔ ''میں تمہارا خاوند ہوں...... مجازی خدا ہوں...... تم نے مجھے نوکر کا درجہ دے رکھا ہے۔'' بپھرا ہوا لہجہ، بدلے ہوئے تیور، وہ کلائی چھڑانے کی کوشش میں ہراساں تھی۔
''ہاتھ تو چھوڑیں میرا...... دماغ خراب ہوگیا ہے۔''
''آج میں تمہارے ساتھ جاؤں گا بلکہ اب میں خود روز چھوڑ کر آیا کروں گا۔'' کلائی کو جھٹکے سے چھوڑا۔
''خدا کے واسطے...... آفیشل گاڑی آتی ہے، اس میں خواتین ہوتی ہیں ایک کا مرد دوسری کے لیے غیر ہوتا ہے۔ کسی کو مرد ساتھ بٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ اپنے تئیں صبر کرکے اسے سمجھا رہی تھی۔ اس کے جاتے، جاتے پیچھے سے للکارا۔
''کان کھول کر سن لو...... میں کل موٹر سائیکل پر چھوڑ کر آؤں گا۔''
غصے کے مارے آنسو آئے تھے مگر مصیبت یہ تھی کہ جلد از جلد تاثرات کو کنٹرول کرکے گاڑی میں بیٹھنا تھا۔ اس نے سیاہ چشمہ لگا لیا اور سوچیں سفر کرتی رہیں۔ بائیک پر روزانہ جانے کا مطلب روزانہ اس شخص کی منت سماجت، نخرے اٹھانا، دھوپ اور گرمی لگنا، پیٹرول کا خرچہ الگ پھر دفتر میں کیا وجہ بتائے گی۔ پھر خود کو تسلی دی کہ اس نے غصے میں کہہ دیا ہوگا آرام پسند ہے خود پر کام کیوں لے گا۔
مگر نہیں، وہ اگلی صبح بائیک نکال کر تیار کھڑا تھا۔ اسے درشت مزاج میں دیکھ کر فریال چپ سادھ لیتی تھی۔ دفتر ہو یا گھر وہ شوہر کا رویہ موضوع سخن نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو فون کرکے منع کردیا۔ موٹر بائیک سے اتری تو وین بھی پہنچی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے سلام کیا۔ وہ جواب دیتی اندر داخل ہوگئی۔ وین پر نہ آنے کا جواز اس نے گھڑ لیا تھا سلیم صاحب کو کورٹ جانا تھا اسی راستے سے...... مگر یہ جواب خود کفیل نہ تھا اور قاصد ریحانہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔
شام کو تنقیدی سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔
''ڈرائیور نے سلام کیا تو جواب دینے کی کیا ضرورت تھی۔ تم اس کی افسر ہو۔''
اب ہر کام میں اصلاح کرے گا۔'' وہ جو دو ٹکے کا چوکیدار تھا۔ تمہیں دیکھ کر اس کے منہ پر مسکراہٹ تھی۔ ٹکے، ٹکے کے مردوں کو اہمیت دی ہوئی ہے۔''
''میں اس طرح کی ہوتی تو دو باپوں کے فیصلے پر شادی نہ کرتی۔''
''سیاست لڑی ہے تم نے، سیاست کرتی ہو۔''
فریال میں اتنی ہمت نہ تھی کہ دن بھر آفس میں سر کھپائے گھر میں آکر لڑائی کا بازار گرم کردے پھر اس کی طبیعت گری، گری رہنے لگی۔ ننھے مہمان کی خوش خبری پاکر سلیم میں مثبت تبدیلی آئی تھی۔ وہ کہتا رہتا تھا اسے بہت سے بچوں کا باپ بننا پسند ہے۔ اب وہ فریال کے لیے پھل، جوس لاتا اور موٹر بائیک کے بجائے سرکاری گاڑی میں آمدورفت بحال کردی تھی۔ ملازمہ جسے پہلے غیر ضروری گردانا تھا اب رکھ لی گئی تھی۔ محبت اور اعتماد کی فضا بحال ہوئی تو سلیم مکان کے فریال والے پورشن کو اپنے نام چڑھوانے کے قانونی دلائل دے کر آمادہ کرنے لگا۔ وکالت پڑھی ہوئی تھی ایسی الٹ پھیر سے بات کرتا کہ فریال لاجواب سی ہو جاتی۔ واضح انکار کا راستہ تو موجود تھا مگر فریال کو گھر کا سکون بگڑنے سے ڈر لگتا تھا۔ اس مکان پر لون لے کر گاڑی خریدنے کا سہانا خواب بھی دل کو لگ گیا تھا۔ وہ اس حالت میں کورٹ کچہری جانے سے گھبراتی تھی سلیم نے یہ بندوبست بھی گھر پر کردیا۔ یوں بالآخر مکان کا آدھا حصہ جو فریال کے نام تھا سلیم کے نام چڑھ گیا اور ہاشم کو خبر تک نہ ہوئی۔
فریال کے ہاں بیٹے نے جنم لیا۔ اس کا نام سالار رکھا گیا۔
''شکر ہے اللہ سائیں نے بیٹی سے بچا لیا۔'' سالار کو گود میں لے کر سلیم نے پہلی بات یہ کی۔

اس وقت ہاشم بھی اسپتال کے کمرے میں تھا۔ قاسم چاچا مٹھائی کا ڈبا لیے تھے۔

''بیٹی ہو یا بیٹا، بے عیب اولاد نعمت ہے۔ فریال بھی تو بیٹی ہے جس نے گھر بار سنبھال رکھا ہے۔'' ہاشم کی بات تو سولہ آنے سچ تھی مگر سلیم کو تیر کی طرح لگی۔

''عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ میں تمہاری کمائی نہیں کھاتا۔ مجھے اتنے کیس مل جاتے ہیں کہ اپنی روٹی کھا سکتا ہوں۔'' موقع پاتے ہی فریال سے کہا۔

گویا مرد کا فرض صرف اپنی روٹی کمانا تھا باقی تمام ذمے داریاں عورت کی تھیں۔ اپنی، اپنی روٹیاں کھاتا تھیں تو اولاد نہ لاتے۔ فریال جو عورتوں کے حقوق کی تنظیم کی باگ ڈور سنبھالتی تھی۔ اپنا گھر بچانے کے لیے متعدد باتوں پر ان سنی کر دیتی۔ طرفین میں سے جب ایک صبر کرتا چلا جاتا ہے تو دوسرے کے لیے جبر کی راہ ہموار ہوتی چلی جاتی ہے۔

اب بچہ گھر پر چھوڑنا پڑتا۔ ابھی تک بچے کے لیے کل وقتی ملازمہ نہیں مل رہی تھی' پیچھے سلیم یا ابو پر انحصار کرتے ہوئے فریال کا جی بچے میں اٹکا رہتا۔ ان خواتین کے مسائل کا اب اندازہ ہو رہا تھا جو مائیں ہوتی ہیں اور جاب کرتی ہیں، اپنی دیکھ ریکھ اور توجہ کا تو وقت ہی نہ ملتا۔ ڈلیوری کے بعد جسم کچھ پھیل گیا تھا۔ ماں ہوتی تو خوراک کا خیال رکھتی۔ شوہر تو پہلے ہی اس کو خوب صورت نہ گردانتا تھا اب تو بدصورتی کے طعنے دینے لگا مگر اس کے باوجود شک کرتا۔ فریال کا موبائل مکمل طور پر اس کی اپروچ میں رہتا مگر اپنا موبائل اپنی جیب سے دور نہ کرتا۔

☆☆☆

ایک صبح فریال گلابی لپ اسٹک لگا کر بیک کومبنگ میں اونچی پونی باندھے اچھی لگ رہی تھی۔ سلیم نے تیوری چڑھا کر حکم صادر کیا۔

''کل سے تم پردہ کرو گی۔''

فریال ہنس پڑی۔

''میں لطیفہ سنا رہا ہوں جو تم ہنس رہی ہو؟''

''ایک بدصورت، موٹی کو آج پردے کی ضرورت پڑ گئی۔''

''پردہ اللہ کا حکم ہے بدصورت، خوب صورت کی شرط نہیں۔''

''تو پھر گھر بیٹھ جاؤں۔'' پرفیوم چھڑکتے ہوئے آئینے کے پار اسے دیکھا۔ اسے پتا تھا یہ مولوی اپنا مالی نقصان قبول نہیں کرے گا۔

''جاب وہ بھی کرتی ہیں جو برقع لیتی ہیں۔ آج شام کو بازار چلیں گے۔ چھوٹے کے دودھ کا ڈبا لینا ہے تم برقع خرید لینا۔ کل سے تم برقع پہن کر جاؤ گی۔''

''میں برقع پہن کر یہ جاب نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟'' سینہ تان کر اس کے سامنے آ گیا۔

''آج تک سب کے سامنے رہی ہوں۔ اب اچانک برقع پہن لوں...... میں یہ تماشا نہیں بنا سکتی۔''

بچے کے لیے فیڈر بنا کر فریج میں رکھی۔ آج سے بچے کو سنبھالنے والی آیا جمیلہ باجی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ بات کر کے جانا تھا۔ دونوں ملازماؤں کو تنخواہ فریال دیتی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ بیگ میں ڈال کر سیدھی ہوئی تو سلیم نے اسے ٹھوڑی سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

''بات سمجھ لیا کرو۔ جواب سوال نہ کیا کرو۔ ورنہ کسی دن جوتے کھاؤ گی۔''

وہ نفرت اور غصے سے زبان بندی کیے گھورتی رہی۔

''یہ چیمہ، چیمہ کون ہے جس کی جیپ روز دفتر کے باہر کھڑی ہوتی ہے؟'' وہ اسے جھٹکے سے چھوڑ کے بولا۔

''ڈائریکٹر ہے ہمارا...... میں نے کبھی پوچھا کہ کورٹ میں کتنی وکیل عورتیں ہیں یا کتنی موکل عورتیں ہیں...... بیمار ذہن ہے تمہارا۔ اپنا علاج کراؤ۔''

وہ پھر وحشی پن سے لپکا۔ ایک ہاتھ سے اس کے داہنے شانے کو گرفت میں لیتے ہوئے دوسرے سے تضحیک آمیز انداز میں اس کی پونی اچھالتے، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتے، منہ قریب تر لا کر جیسے کاٹ کھائے گا کر یہہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''علاج تم کراؤ گی...... میرا ایک حکم رد کرو گی تو دس زخم بدن پر لگاؤں گا۔ بچہ چھین کر گھر سے نکال دوں گا۔ اس زعم میں نہ رہنا کہ تم غیر مردوں کے کندھوں پر سر رکھ کر خاوند کی شکایتوں کے ٹسوے بہاؤ گی۔ یہ جو باہر جا کے مظلوم عورت بنتی ہیں، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سارے مردوں آؤ میرے آنسو پونچھو، میرا منہ چومو...... خبردار یہ غلطی نہ کرنا...... ورنہ بچہ تمہیں زندہ نہیں ملے گا۔''

باہر سے ملازمہ کی آواز سن کر ایک جھٹکے سے اس کو چھوڑا اور بائیک کی چابی لے کر ہوا کی طرح نکل گیا۔ وہ حواس گم صم کھڑی تھی۔ ملازمہ کی آواز اسے متوجہ کر رہی تھی نہ بچے کا رونا......

''السلام علیکم باجی...... گئے نہیں ہو؟ گڈی (گاڑی) تو آئی ہوئی ہے۔''

کیا سلیم نے اس کے بال کھینچے تھے؟ بازو مسلا تھا؟ کان میں چیخا تھا؟ بچہ زندہ نہ ملے گا؟ وہ بے ساختہ ہاتھ پھیلا کر لپکی۔

''سالار...... میرے بچے۔''

''باجی فکر ہی نہ کرو جی...... اس کو تو ایک منٹ نہ رونے دوں گی۔ کام شمیم کرتی ہے میں تو اپنے پپو کے ساتھ کھیلوں گی۔ آپ دو دن میں دیکھ لینا آپ کے پاس نہیں آئے گا میری گود سے...... بے شک بڑے ابو مجھے چیک کرتے رہیں۔'' وہ سمجھی باجی، بچے کو چھوڑنے کی وجہ سے پریشان ہے۔

''اللہ تمہیں اجر دے۔'' فریال نے خود کو سنبھالا۔ ''یہ لو...... چھ کیلے لے لینا۔'' پرس میں سے نوٹ نکال کر دیا۔ ''ایک سالار کو صبح دینا ایک شام کو دینا...... ایک خود کھا لینا ایک شمیم کو دے دینا...... باہر جاؤ تو اسے ساتھ لیتی جایا کرو۔ چھاؤں میں چلا کرو، اسے تتی ہوا نہ لگے۔''

''جی باجی...... مجھے پتا ہے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں کہ مالکن کے سامنے تو اٹھائے رکھوں اور پیچھے رلائے رکھوں۔''

اس دن کے بعد سے سلیم اور فریال کے رشتے میں دراڑ پڑ گئی۔ اب فریال کو سلیم کا ہنسنا بولنا بھی بناوٹ لگتا تھا۔ ہر مسکراہٹ کے پیچھے مقصد مفاد نظر آنے لگا تھا۔ محبت، اعتبار تو فریال نے کیا تھا کہ مکان شوہر کے نام کر دیا باپ کو پتا نہ چلنے دیا۔ مکان، سامان، دسترخوان سب کچھ اس کی کمائی کا تھا پھر بھی وہی مجبور اور کمتر ہو گئی تھی۔ وہ مجبوری کے تحت برقع خرید لائی۔ برقع پہن کر آفس جانے لگی۔ مسکرا کر کہتی میرے شوہر کے اسلامی خیالات ہیں۔ (کاش شوہر اسلام کو بھی جانتا ہوتا)

قاسم چاچا نے اسے برقع میں دیکھا پہلے منہ پھاڑ قہقہہ لگایا پھر ٹھٹھہ بازی کی۔ ''جس کے پوسٹر سارے شہر میں لگے تھے آج وہ پردہ کرنے لگی۔''

ہاشم کسمسا کر رہ گیا۔

''انسان ارادہ کر لے تو کوئی نیکی مشکل نہیں۔'' سلیم نے گویا کافر کو کلمہ پڑھوا دیا تھا۔

''جی ہاں...... سوائے نماز کے۔'' فریال نے چائے رکھتے ہوئے دھیرج سے کہا۔ (سلیم نماز نہیں پڑھتا تھا) قاسم چاچا کا قہقہہ اب بھی بہت اونچا تھا۔

''حشر کے دن سب سے پہلا سوال نماز کا ہو گا۔'' ہاشم نے کپ سیدھے کیے۔

''نماز اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔'' وہ اب بھی جواز پیش کرنے سے باز نہ آیا۔

''حکم الٰہی...... تو حکم ہے سب ہی حکم اللہ کے بندے کو ہیں۔ نماز پڑھا کرو۔'' قاسم چاچا نے اب کے اسے لاجواب کر دیا۔ سلیم کو اپنی ذات پر کانٹا بھی چبھے تو نہ بھولتا تھا۔ وہ بعد میں اس کا بدلہ نکالتا رہتا تھا۔ فریال کو گیدڑ بھبکیوں سے کوئی خوف نہ تھا۔

برقع پہن لینے کے بعد ویمن ڈے کی سالانہ بڑی تقریب کا انعقاد آ گیا۔ ہر سال فریال، شائلہ حتیٰ کہ ریحانہ اس تقریب کے لیے نئے لباس بنواتی تھیں مگر اس بار فریال کے احساسات سپاٹ تھے البتہ کام کی زیادتی کے سبب اوقاتِ کار میں تاخیر ہونے لگی تھی۔

سلیم کو شک کے ناگ ڈسنے لگے تھے۔
"آج 7 بج گئے؟"
"آج آٹھ بج گئے؟"
"دفتر کے سامنے اتنی گاڑیاں کھڑی تھیں کون آیا تھا؟"
"چپڑاسی بوتلیں لے کر جارہا تھا...... خبیث ٹولہ کون سا تھا جو موزولین میں آیا تھا۔"

آتے جاتے وہ ٹوہ میں رہتا۔ بے قراری حد سے بڑھی تو سلیم آفس پہنچ گیا۔ سیکیورٹی گارڈ تو جانتا تھا مگر اندر روک کر ملاقاتی کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ فریال نے شہر کی معززین نمائندہ خواتین کی میٹنگ بلا رکھی تھی۔ قاصد ریحانہ کو سختی سے حکم تھا کہ مداخلت نہیں کرنی۔ سلیم شوکت نے اسے 'وڈے صاحب' بن کر کہا کہ جا کے بتاؤ سلیم شوکت صاحب آئے ہیں۔ ریحانہ نے پانی پیش کرتے بتایا کہ" انتظار کرلیں۔ میٹنگ ہورہی ہے۔" سلیم نے جاہلانہ طریق سے پوچھا۔
"مرد ہیں یا عورتیں؟"
"جی لیڈیز ہیں۔"
سلیم نے اپنا تعارفی کارڈ دیا۔"تم چلی جاؤ اندر...... یہ کارڈ دیکھ کر میڈیم تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔"

ریحانہ کارڈ لیے آفس کے دروازے سے جھانکی، فریال نے غصے سے دیکھا تو جلدی سے کارڈ سامنے رکھ دیا۔"یہ آئے ہیں۔"
"سلیم شوکت۔" کارڈ پر نظر پڑی تو رنگ اڑ گیا۔
"الٰہی خیر...... سالار ٹھیک ہو......" موبائل اٹھا کر دیکھا مبادا کوئی کال یا پیغام آیا رکھا ہو۔ کچھ نہ پا کر دل میں دعائیں مانگتی اٹھی۔"ایکسکیوز می...... جسٹ آ منٹ۔"
"خیریت؟ آپ کیسے آئے ہیں؟"
"دیر اتنی ہوگئی مجھے فکر ہورہی تھی۔" وہ کوئی بہانہ نہ گھڑ سکا۔
"دیر؟ ابھی تو پانچ بجے ہیں۔ آپ کو معلوم تو ہے آج کل کام زیادہ ہے۔"
"سالار بھی تنگ کررہا تھا۔ میں نے سوچا پتا کر لوں فارغ ہو تو لیتا آؤں...... ہاں یہ فلیش لایا ہوں جو تم نے کہی تھی۔"

فریال کو سمجھ نہ آرہی تھی کیا کہے، یہ پتا تو وہ فون پر بھی کرسکتا تھا۔ فلیش گھر پر دے سکتا تھا۔ رہی بات بچے کے رونے یا تنگ کرنے کی تو وہ اب یہ تو کر نہیں سکتی تھی کہ بچہ روئے تو گھر چلی جائے اسی لیے آیا رکھی تھی۔ آیا نے کبھی دیر سویر کی شکایت نہ کی تھی ابو بھی سالار کو اٹھا کر لے جاتے، یہ شخص کیا اس کی جاب کو مذاق سمجھتا ہے جس طرح وہ بیوی کو باندی سمجھتا ہے، اسے بیوی کا محکمہ، افسر سب اپنے ماتحت لگتے ہیں۔ مرد اپنی نوکری کو تو تھکا دینے والی، اہم، خاص کہتا ہے عورت کی نوکری بھی خاوندوں کے احکام پر چلے، جب حکم ہو چھٹی کرلے، دیر سے جائے جلدی آئے گھر آ کر ڈگنی تروتازہ مرد کی خدمت گاری میں جت جائے۔ مرد کے ہاتھ پر مہینے بھر کی کمائی رکھ کر آرتی اتارتی الٹے پیر پلٹ جائے۔ مرد کے تحت الشعور میں اپنے لیے جو فرعونی مقام دبا ہوا ہے اس پر علم، معاشرہ، ابلاغ جتنی مٹی بچھاتا رہے اس کے آثار نکل آتے ہیں۔

"آپ جائیں سلیم...... میں ابھی نہیں جاسکتی۔ جمیلہ باجی کو فون کردیتی ہوں۔ سالار کو سنبھال لیتی ہے...... اہم میٹنگ چل رہی ہے...... میں چلتی ہوں۔"
"اچھا چائے بجھوا دو...... میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج ایک کیس نے دماغ خراب کرکے رکھ دیا۔ ہاشمی صاحب نے بھی ہاتھ اٹھا لیے سارے ریفرنس مجھے سرچ کرنا پڑے۔" وہ یوں بے تکان شروع ہوگیا جیسے گھر میں ہو۔
"میں چائے بجھواتی ہوں۔"
"گرم سموسے دو منگوا لینا۔"

فریال کا جی چاہا سر پیٹ لے۔ ریحانہ کو چائے، سموسے کا کہہ کر میٹنگ سنبھالی۔ سات بجے فارغ ہوئی۔ ریحانہ الماری بند کررہی تھی فریال کو خیال آیا تو یونہی پوچھ لیا۔"سلیم صاحب کے چائے والے برتن اٹھا لیے؟"
"جی میڈم...... مجھے تو پتا نہ تھا کہ صاحب جی کون

ہیں۔ میں نے اندر آنے سے روک دیا، سوری میڈم!‘‘
’’ہاں، ہاں...... ظاہر ہے تمہیں روکنا تھا۔ اچھا یہ لیتی جاؤ۔‘‘ فریال نے میٹنگ کے دوران چائے کا بچا ہوا سامانِ خورونوش اس کے حوالے کیا۔
’’مزے کی بات ہوئی میڈم جی...... مس شمائلہ اتفاقاً ملاقاتی کمرے میں چلی گئیں۔ باہر آ کے مجھے کہنے لگی ریحانہ اندر کس ہیرو کو بٹھایا ہوا ہے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔‘‘ ریحانہ نے یہ لطیفہ میڈم کو خوش کرنے کے لیے سنایا یا مس شمائلہ کی شکایت کی مگر فریال کو بھلا نہ لگا۔
ویمن ڈے کی تقریب پر سلیم شوکت بھی موجود تھا جیسا کہ سب عملے کے اقارب مدعو ہوتے تھے۔ اگلی صفوں کے صوفوں پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے تھری پیس میں ملبوس سلیم شوکت اپنے دائیں بائیں مسلسل اپنا تعارف اپنی بیگم فریال کے حوالے سے کرا رہا تھا۔ حوصلہ افزا مصنوعی تبسم سے فریال کے خطاب کی داد دیتا۔ دیگر مقررین کے منہ سے فریال ہاشم کی تحسین سن کر فاضلانہ سر ہلاتا۔
فریال جو سرمئی عبایا جس کے بارڈر پر سیاہ اور سلور کڑھائی تھی (یہی اس نے واحد شاپنگ تقریب کے لیے کی تھی) پہنے ہوئی تھی اسکارف سے بال ڈھانپ رکھے تھے۔ اپنے تیکھے نقوش اور تازہ کرائے گے فیشل کی بدولت وہ اچھی لگ رہی تھی۔ اتنی جتنی کوئی خاتون اچھی لگنے کا حق رکھتی ہے۔ اس نے سلیم شوکت جتنا خود کو نمایاں نہیں کیا تھا۔ ویسے کا تھری پیس، ٹائی نک سک سے تیار بلا مبالغہ مردوں کی صف میں ماڈل جیسا لگ رہا تھا۔ بے وقوف لڑکیاں اسے بار، بار دیکھتیں اور موبائل سے تصویریں لیتی تھیں۔ ان میں ایک شمائلہ بھی تھی جو بے وقوف لڑکی نہ تھی۔ جو جانتی تھی کہ اس مرد کا ایک بچہ بھی ہے جسے پرام میں لیے لان میں آیا گھوم رہی ہے اور اس تقریب کی منتظم اس کی بیوی ہے سب کچھ جانتے ظاہری جمال اسے لٹو کر رہا تھا۔
شمائلہ تنظیم کے ورکرز کی تقسیم اسناد و شیلڈ کے دوران اپنی سند وصول کرنے کے لیے اسٹیج کی طرف جاتے ہوئے مردوں کی صف کے قریب سے گزری تو رک کر مسکرا کر سلیم کو سلام کیا۔ سلیم نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتے ہوئے گہری نظر ڈالی۔ کھلے ہوئے سیاہ سیدھے بال، بلیک، وائٹ اور پنک رنگوں میں ڈھلا جدید طرز کا اونچا فراک، سفید ٹائٹس، ہیل والا ہم رنگ جوتا آستینوں سے جھانکتی گوری شفاف کلائیاں، لمبے ناخن والے ہاتھ میں موبائل کندھے پر جھولتا سفید اسٹولر، دل دھڑک اٹھا دُہری خوشی سے یہ کہ ہر حسینہ اس پر مائل ہے اور یہ کہ...... یہ تو دو چار مسکراہٹوں کی مار ہے۔ تقریب کے اختتام پر خواص کے ڈنر کے دوران شمائلہ دانستہ سلیم کے بالمقابل آٹھہری۔ مہمانوں کو شرفِ میزبانی بخشتے ہوئے ڈشوں کی طرف متوجہ کرتی رہی حالانکہ یہ کام اسٹاف کا نہ تھا۔ اس بار بیرے لیے گئے تھے۔ فریال خواتین کی سائڈ پر رہی۔
فریال اور سلیم نے تقریب کے دن کے حوالے سے طے کیا تھا کہ سلیم فارغ ہوتے ہی سالار اور جمیلہ باجی (آیا) کو لے کر گھر آ جائے گا۔ فریال اپنی مناسبت سے فارغ ہو کر پہنچ جائے گی۔ (اگلے دن چھٹی تھی) لیکن ہوا یوں کہ مہمان رخصت ہو گئے پنڈال خالی ہو گیا۔ سلیم، بچے اور جمیلہ باجی کو روانہ کر کے خود اسٹیڈیم کے مہمان خانے والے کمرے میں بیٹھا رہا۔ شمائلہ کو اس کا بھائی لینے آیا وہ بھائی سے بات کرتی ہوئی اس کمرے کے سامنے سے گزری تو سلیم باہر نکل آیا۔ شمائلہ ٹھٹک گئی اسے امید نہ تھی کہ وہ یہاں موجود ہو گا۔ فرطِ حیرت و مسرت سے منہ سے نکلا۔
’’آپ گئے نہیں؟‘‘
’’لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔‘‘ پہلی بار بات اور شوخی، بے تکلفی کا یہ عالم۔ بھائی آگے جا کر موٹر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔
’’آج گاڑی فارغ نہیں ہے۔‘‘ اس نے بات بڑھائی۔
’’آپ جا رہی ہیں؟‘‘

''لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' نور جہاں نے کبوتر اڑا کر شہزادہ سلیم کو دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ نثار ہوتی مسکراہٹ سے دیکھتا رہا۔

ویمن ڈے کیا گزرا۔ ویمن کے حقوق کی علمبردار کٹہرے میں کھڑی کر دی گئی۔

''کب تک فریال ہاشم بنی رہو گی۔ شوہر کا نام لگانے سے سب کو معلوم ہو جائے گا کہ شادی شدہ ہو اس لیے نہیں لگاتیں۔''

بیٹھے بٹھائے اس کا لہجہ بدل گیا۔ فریال، سالار کو گود میں لیے چمچ سے کھلا رہی تھی اب وہ سلیم کا لہجہ زہریلا ہو جانے پر چونکتی نہیں تھی۔ سکون سے بولی۔

''اب کسی کے منہ پر نیا نام نہیں چڑھتا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ پردہ کر لیا...... چمکتا دمکتا برقع پہن لیا...... چہرہ تو سنگار کر کے سامنے ہوتا ہے۔ یہ مکمل اسلامی پردہ نہیں ہے۔''

فریال چمچ اور پیالہ ایک طرف کر کے کھلونا گاڑی چلاتے ہوئے بچے کو بہلانے لگی۔

''مرد بری نظروں سے تاڑتے رہتے ہیں۔ ایک، ایک کی نظر تم پر تھی...... اس لیے نہیں کہ حسینۂ عالم ہو...... بار، بار نام لیا جا رہا تھا...... تمہیں اندازہ ہے بظاہر یہ شریف مرد کیا سوچتے ہیں؟''

''آپ کو اندازہ ہو گا...... آپ بھی شریف ہیں۔'' اس کا سکون قائم تھا۔

''کیا بکواس کی؟''

''ابھی آپ نے فرمایا حسینۂ عالم نہیں ہوں، مجھ سے حسین کئی تھیں۔''

''ان کے مرد خبیث پردہ نہیں کراتے...... میں ان کا ذمے دار نہیں۔ میں (گالی) نہیں ہوں۔ آئندہ تم ایسے فنکشنوں پر نقاب لگاؤ گی۔''

وہ بچے کو کریڈل میں ڈال کر کھلونے سمیٹ کر ٹوکری میں لیے باہر جانے لگی۔ اس کے پاس سے گزری تو جھپٹ کر کلائی پکڑ کر کھینچا، بے ساختہ اس کے اوپر جا گری۔

''کیا بدتمیزی ہے؟''

''سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟ کیا کہہ رہا ہوں؟''

''یہی کہ میں بوری میں بند ہو کر جاؤں گی۔''

زوردار دھکے سے اچھال کے چلایا۔ ''حیاداری تمہیں بوری پہننا لگتی ہے۔ نقاب میں سانس بند ہوتی ہے؟ سانس بند کر کے دکھاؤں کہ کیسے بند ہوتی ہے۔ میرا حکم ہے کہ نقاب لگاؤ گی...... اور میں کسی وقت چھاپا مار کر چیک کر لوں گا۔''

وہ کمرے سے باہر لاؤنج میں آئی کتنی دیر سنسناتے دماغ کے ساتھ دیوار سے لگی کھڑی رہی...... قدم اٹھے کہ ابھی ابو کے پاس جاؤں...... ابھی چاچا قاسم کو بلوا کے فیصلہ کروا لوں۔ وہ میرا بچہ نہیں چھین سکتا۔ بچہ بہت چھوٹا ہے اور قانون سات سال کی عمر تک بچہ ماں کو دیتا ہے۔ قدم اٹھ گئے...... وہ ابو کی سائڈ تک جا پہنچی۔ دیوار کے پار ہاشم کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''الحمدللہ...... فریال کی طرف سے مطمئن ہوں...... وہ تو ایسی مگن ہوئی ہے اپنی زندگی میں کہ کئی دن اِدھر نہیں آتی...... بچہ میرا عادی ہے دن میں اکثر میری طرف ہوتا ہے...... دکان برائے نام چلتی ہے...... بیماری دوائیں...... فریال گھر بار والی ہو گئی...... مانگتے شرم آتی ہے...... اس پر فرض نہیں، تم بیٹے ہو...... تم پر فرض ہے۔ میں دمے اور شوگر کا مریض ہوں دوائیوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

پھر ایک لمبا سکوت جس میں وہ سنتے رہے۔

''اچھا بیٹا، خوش رہو...... ہر بار تم اپنی مشکلات کی خبریں دے کر میرا منہ بند کرا دیتے ہو۔''

فریال یہ سن کر شرمندہ سی ہو گئی کتنے مہینوں سے ابو سے بیٹھ کر احوال پرسی نہیں کی۔ بس دعا سلام ہو جاتی کھانے کو کچھ بناتی تو بھیج دیتی۔ اسی سوچ میں غلطاں داخل ہوئی۔ چھوٹے صحن میں لگے واش بیسن پر وہ وضو کر رہے تھے۔ ایک چارپائی جس پر ایک سرہانہ تھا اور سرہانے پر موبائل رکھا تھا۔ اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کر

خوش ہوگئے۔

”آؤ بیٹی...... اس ٹائم کیسے آئی ہو؟ سالار کو بھی لے آتیں۔“

بس وہ ایک پل تھا جس میں فریال نے رونا تھا یا ہنسنا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔

”آپ کی یاد آرہی تھی۔ جی چاہا ابھی جاؤں...... دن تو پھر مصروف ہو جاتا ہے۔“ وہ ابو کے سینے سے لگی اُن کا ہاتھ تھام کر اس میں ہزار کے کئی نوٹ تھما دیے۔ مسکرا کر چہرہ اٹھایا۔

”ابو آپ آئے نہیں تھے تقریب میں...... ہر سال تو آتے تھے۔“

”تو نے اتنا کھانا بھجوا دیا...... میں اکیلا کتنا کھاتا ہوں...... اب سانس چڑھ جاتی ہے کہیں آنا جانا دوبھر ہے۔ فری بچے...... یہ پیسے......؟“ ہاشم بیٹی کی پیشانی چوم کر بولا۔

”آپ کے ہیں ابو...... اچھا میں جاتی ہوں...... سالار رو نہ رہا ہو۔“

ایک دم سے سالار کا خیال آیا تو رکا نہ گیا، سلیم کے غصے کا کوئی اعتبار نہیں۔ فریال نے ایک بار پھر سمجھوتا کر لیا۔ اس نے اپنے آفس کے کمرے کے باہر ”فریال سلیم“ کی تختی لگوالی۔ مرد ملاقاتیوں کی آمد پر ہاف نقاب کرنے لگی۔ ہر تماشا اپنایا اور سوال کرنے والوں کو مدبرانہ جواب سے ٹالا۔ سلیم کی مدافعت اس کے تصور سے بڑھ کر کی۔

سالار دس ماہ کا ہوا ایک بار پھر اسے ماں بننے کی نوید ملی، وہ بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنا اور بچوں کی تعداد کم رکھنا چاہتی تھی مگر سلیم ایک طرف تو اسے نوکری سے ہٹانے کا مخالف تھا دوسری طرف اوپر تلے بچوں کا خواہشمند تھا۔ تابعداری کی زندہ مورت فریال...... ستم زدہ عورتوں کو انا اور اعتماد کا سبق پڑھاتے ہوئے بارہا خود کو منافق محسوس کرتی۔ پہلے وہ یہ تلقین دل سے کرتی تھی سچائی سے کرتی تھی اب وہ نوکری کی خاطر کرتی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ نصیحت ہم آسانی سے کر دیتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ عورت کے لیے شوہر کے مسائل کی دلدل سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ اس دلدل سے نکلنے کے لیے ایک تھامنے والا ہاتھ کافی نہیں ہوتا۔ یہ سب ادارے سرکاری، نجی تھامنے والا ہاتھ ہی تو ہیں۔ ہماری تنظیم کا مونوگرام بھی زخمی نسائی ہاتھ کو توانا نسائی ہاتھ کا تھام نکلنا ہے، مجھے کون سا نسائی ہاتھ ان دکھوں سے نکال سکتا ہے؟ آفس کی دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر ورلڈ ویمن کا ترانہ بار بار اس کی آنکھوں کا مرکز بنتا۔

میں عورت ہوں
میں انساں ہوں
میں سربلند ہوں
عظمت کا نشاں ہوں

وہ ذہنی غیر حاضر ہوتی جا رہی تھی۔ سوچوں میں گم رہتی۔ بھوک پیاس بھی یاد نہ آتی...... اس کے اندر خوف خوابیدہ رہتا۔ بیٹھے، بیٹھے چونک جاتی۔ اضطراری کیفیت میں اٹھ جانے کو ہوتی۔ لگتا اسے کچھ کرنا تھا جو بھول گئی۔ اس کی تازگی، اس کا حسن ماند پڑ رہا تھا۔ دھندلی رنگت، کھردرے ہاتھ پاؤں، بے تاثر چہرہ، پھیکی آنکھیں، پرانے کپڑے دل میں امنگ نہ رہی تھی۔ شوہر کی تعریف عورت کو آسمانوں تک پہنچا دیتی ہے، شوہر کی بے نیازی ٹوٹی پتنگ بنا دیتی ہے۔ اس کے شوہر کی آنکھ میں چمک اس کے پرس میں نوٹ دیکھ کر آتی تھی۔ ابو کو جو دس ہزار دے آئی تھی بار بار حساب کر کے اس نے کرید لیا کہ دس ہزار کی کمی ہے۔ یہ کئی بہانوں سے ٹال گئی۔ اگر سچ بتاتی تو پھر ہر بات پر یہی سنتی کہ یہ تم نے اپنے باپ کو دے دیا ہوگا۔ ظلم کا یہی دستور ہے کہ جتنا سہا جائے بڑھتا ہے۔ شمائلہ سے نظر بازی اب محبت کی کہانی بننے لگی تھی۔ سلیم نے اکثر دفتر آنا اور آ کر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے تنظیم کے قانونی مشیر کے لیے اعزازی طور پر کام کرنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ ملاقاتی کمرے میں ایک میز کرسی سیٹ کرالی،

.....وہ ایڈووکیٹ تو تھا فریال کا شوہر تھا۔ اسی بنیاد پر اس کو کام کرنے کی اجازت ملی تھی۔ اسے تو اپنی بیوی پر نظر رکھنے اور خود نظر بازی کرنے سے دلچسپی تھی مگر فریال اس کی موجودگی سے مزید کوفت کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ ہمہ وقت خاوند کی کنیز بن کر رہ گئی۔ وہ چاہتی تھی اس کا شوہر بار روم جا کر بیٹھے۔ اپنی الگ عزت اور پہچان بنائے اور کما کر لائے اگر وقت بچ رہے تو سالار کو وقت دے مگر جب سے جمیلہ باجی نے کہا تھا کہ سلیم بھائی گھر پر ہوں تو سالار زیادہ روتا ہے۔ وہ اسے ڈانٹتے بہت ہیں۔ وہ ٹی وی کے آگے بیٹھے رہتے ہیں، بچہ تو دوڑتا کھیلتا شور مچاتا ہے پھر مجھے بھی دوپٹے کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ ابو جی اسے گھمانے لے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے (ابو کتنا بڑا سائبان تھے) تب سے وہ نہیں چاہتی تھی کہ سلیم گھر جا کر اپنا بے سبب غصہ بچے پر نکالتا رہے۔

شائلہ جو بتیس سال کی ہو کے بیس اکیس سال کی لگتی تھی۔ جدید ترین تراش کے لباس پہنتی، ہر آنے والی عورت اسے پسند کرتی۔ وہ ان سے میٹھے لہجے میں بات کرتی۔ ہر کسی کے کھردرے کالے ہاتھ کو اپنے نازک ہاتھ میں لے کر زندگی آسان کرنے کے گر بتاتی اور سلیم کی کھڑکی کے پار نظر آنے والے زاویے پر موجود رہتی، بظاہر عقلمند درحقیقت بے وقوف...... سلیم کے جال میں پھنستی چلی گئی۔

موبائل نے سارا کام سہل کر دیا۔ اب تو گھر پر بھی سلیم کو موبائل کے سوا کوئی ہوش نہ ہوتا۔ اس کی حاملہ بیوی بڑے بچے کو لیے، لیے کام کرتی رہتی۔ اب وہ ابو کے پاس جا بیٹھتی تو بھی اسے گھنٹوں پروا نہ ہوتی بلکہ بلا سر سے ٹل جاتی۔ فریال کو بھی وال میں کالا نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ علی نے تو ان کی زندگیوں سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ وہیں شادی رچا لی اور اس کے آنے کی امید ختم ہو گئی۔ ہاشم نے جی کو لگا کر چارپائی پکڑ لی۔ ہاشم کی (متوقع) موت کی صورت سلیم سارے مکان اور دکان کا واحد قابض تھا۔ وہ فی الحال اس سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ اس کی منصوبہ بندی کے مطابق شائلہ اس کی سیٹ پر براجمان ہو جاتی تو پھر اس کو کوئی گھاٹا نہ تھا۔

فریال کو ایک دن قاصد ریحانہ نے سلیم اور شائلہ کے درمیان چلنے والی آنکھوں دیکھی فلم کہہ سنائی۔ اس نے تو اپنی بھڑاس ہی نکال دی۔ دونوں کی ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی تصویر چپکے سے کھینچ لائی اور دکھا کر کہنے لگی۔

''میڈم جی...... آپ سادہ اور معصوم ہیں۔ سب کو اپنے جیسا سمجھ لیتی ہیں۔ اس سلسلے کا تو اب سب کو پتا ہے۔ میں آپ کی ملازم ہوں، معافی چاہتی ہوں۔ اپنی حدود سے واقف ہوں...... برسوں سے آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ نیک اور غریب پرور افسر ہیں۔''

سب کہہ چکنے کے بعد یہ مشورہ بھی دے گئی کہ صاحب کا موبائل چیک کرتی رہا کریں میرا اور میرے خاوند کا ایک ہی موبائل ہے۔ میاں، بیوی کی چیزوں میں کیا تیرا میرا......

یہ کیا کہہ گئی، میاں بیوی کی چیزوں میں کیا تیرا میرا...... کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ چیزیں تو ہماری شروع سے الگ ہیں۔ آئینہ، کنگھی، تولیا، پلیٹ، کپ، گلاس...... اور موبائل کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

فریال تو اس حد تک دب چکی تھی کہ سلیم تو ایک طرف شائلہ کو بھی کھل کے کچھ نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

سلیم بیڈروم میں تھا۔ فریال کھانے کی ٹرے لیے اندر آئی۔ سلیم کی دروازے کی طرف پشت تھی وہ کسی سے وڈیو چیٹ کر رہا تھا۔ اسکرین پر شائلہ تھی۔ فریال کی نگاہ پڑ گئی۔ شائلہ نے بھی غالباً دروازے سے اسے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا کیونکہ اس کی طرف سے ایک دم اسکرین آف ہو گئی تھی۔

''شائلہ سے کیا بات کر رہے تھے؟'' اس نے ٹرے سامنے لا کر رکھی۔

"شمائلہ سے......؟" لمحہ بعد سنبھل کر کہا۔ "چک 26 والے کیس کی بات ہو رہی تھی۔"

"شمائلہ کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟ انفارمیشن میرے پاس ہے فائل میرے پاس ہے۔"

"تو کیا ہوا، کیوں خواہ مخواہ شور کر رہی ہو۔" وہ ٹرے آگے کھسکاتے ہوئے بولا۔

"شمائلہ کے ساتھ آپ کا کیا چل رہا ہے، سب کی زبان پر ہے۔" ہمت کر کے کہہ دیا حالانکہ لہجے میں مدافعت، کمزوری اور گلہ تھا مگر سلیم یوں چونک اٹھا جیسے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا ہو۔ وہ اسی طرح بات کو سر اٹھاتے ہی دبانے کا فن رکھتا تھا۔

"زبان دراز عورت...... تمہیں شوہر سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ کس کی زبان پر ہے؟ کسی کی زبان پر نہیں خود تمہاری زبان پر ہے۔ چوبیس گھنٹے تمہارا سوجا ہوا منہ دیکھتا رہوں کسی سے بات نہ کروں؟ کبھی خود کو غور سے دیکھا ہے؟ کیا رکھا ہے تم میں؟"

"خود کو غور سے تب دیکھوں جب مجھے تمہارے گھر کے اندر اور باہر کمانے سے فرصت ملے۔"

"مرد کو فریش عورت چاہیے ہوتی ہے ورنہ تو گدھی بھی کما لیتی ہے۔ دوسری شادی کرنا میرا حق ہے۔ یہ حق مجھے اللہ نے دیا ہے......" وہ نوالا چبا، چبا کے سکون سے بتا رہا تھا۔

"اللہ نے تمہیں فرائض بھی دیے ہیں۔"

"ہاں تو کون سے فرائض ادا نہیں کر رہا؟" ڈھٹائی کی انتہا تھی۔

"شمائلہ سے شادی کرو گے؟"

"ہاں...... پانی لاؤ۔"

"میں نے جو تمہارا بھرم بنا رکھا ہے اس کو توڑ دوں گی پھر دیکھنا کون سی شمائلہ تم سے شادی کرتی ہے۔" (بلی کو بھی دیوار سے لگاؤ آخر پنجہ نکال ہی لیتی ہے)

"کیا بھونک رہی ہو؟ بلیک میل کر رہی ہو مجھے؟ شمائلہ کو میرے خلاف ورغلاؤ گی؟ تم پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گا، تم پر تیزاب انڈیل دوں گا...... پانی لے آ بدصورت عورت۔" وہ اتنی زور سے دہاڑا کہ فریال لرز گئی۔ پانی کی بوتل لا کر اس کے سامنے پھینک دی اور تقریباً بھاگتی ہوئی باہر نکل کے چھت پر جا بیٹھی۔ اس کے اندر شعلے بھڑک رہے تھے۔ پیٹ میں کسمساتی ہوئی ننھی جان بے قرار ہو گئی تھی۔ پیٹ کو پکڑے وہ فرش پر ڈھے گئی، رونے کی بھڑاس نکلی تو سالار کا خیال آیا۔ اوپر کی دیوار سے ابو کے حصے میں جھانکا ان کے کمرے میں روشنی تھی سالار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں اکیلی سر پٹخ رہی تھی۔ اتنی دیر گزر گئی۔ سلیم اپنی جگہ سے اٹھا تک نہیں۔ اسے پروا تک نہ تھی وہ کہاں گئی...... پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔

سالار کو لے کر فریال اس رات دوسرے کمرے میں سوئی تھی۔ اسے کسی نے نہ روکا نہ بلایا۔ اسے اپنا مستقبل نظر آ گیا تھا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے، سوچتے جاگتے گزری۔ صبح اس نے فون پر اطلاع دے کر دو دن کی چھٹی لے لی۔ اس کے سر میں درد تھا اور بخار ہو رہا تھا۔ ہاشم کو بیٹی کی ناسازیٔ طبع کا پتا چلا تو کسی میڈیکل اسٹور سے دوا لے آیا۔ دوا دے کر ہاشم بغور بیٹی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"بیٹی...... تم خوش ہو؟"

فریال کی آنکھوں نے بغاوت کر دی۔ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ اور پلکوں کی نمی نے دھوپ چھاؤں کا سماں باندھا۔ ہاشم دھیرے سے سامنے والے پلنگ پر بیٹھ رہا باپ کا چہرہ بجھ گیا تھا۔

"تم اندر سے خوش نہیں ہو...... کیا بات ہے؟"

"ابو...... کوئی بات نہیں بخار ہو رہا ہے۔"

"میں بخار کی بات نہیں کر رہا۔ میں نے کافی عرصے سے سلیم کو تمہارے ساتھ ہنستے بولتے نہیں دیکھا...... سلیم اس مزاج کا تو نہ تھا۔"

"میرا جی خراب رہتا ہے ناں...... بس میرا جی ہی نہیں کرتا۔"

"میری چاندنی سی بیٹی...... میں نے تمہیں ماں بن

کر سنبھالنے کی کوشش کی ہے مگر ماں نہیں ہوں...... تم مرجھاتی جا رہی ہو...... کیا پریشانی ہے؟''
''میاں بیوی میں جھگڑے ہو جاتے ہیں...... سلیم پردے کا سخت ہے...... آپ فکر نہ کریں...... حالات ٹھیک ہو جائیں گے...... دو بچوں کا باپ ہے اب وہ کہاں جائے گا...... نہ میں جا سکتی ہوں۔''
رک، رک کر...... سوچ، سوچ کر فریال نے بات کو ایسا سمیٹا کہ ابو پریشان نہ ہوں۔ دوسرے دن فریال کی طبیعت بہتر تھی۔ سلیم نے اسے پلٹ کر نہ پوچھا۔ وہ حسب معمول تیار ہو کر چلا گیا۔ گھر میں دو دن سے کھانا نہیں پک رہا تھا۔ فریال اس قابل نہ تھی کہ کچن میں جاتی، جمیلہ باجی چائے بنا دیتی۔ اب جبکہ وہ بن سنور کر نکل چکا تھا فریال سوچ رہی تھی کہ فون کر کے مسز کوکب سے حالات کا پتا لے یا ریحانہ سے بات کرے۔ مسز کوکب ایک ماہ پیشتر اسٹاف میں شامل ہوئی تھیں۔ جمیلہ باجی نے فریال کی خوب خدمت کی۔ سر میں مالش کی، جسم دبایا۔ چھوٹی، چھوٹی باتیں سنا کر ہنسایا۔ پھر سالار کو نہلانے چلی گئی یہ مشورہ دیتے ہوئے کہ سامنے والے پارلر سے تھریڈنگ کروالیں۔
وہ پارلر چلی گئی نہا دھو کر بیٹھی ہی تھی کہ ڈویژنل ہیڈ کا فون آگیا۔
''فریال صاحبہ...... ہم آپ کے آفس آرہے ہیں۔''
''سر میں تو چھٹی پر ہوں۔ طبیعت خراب تھی۔''
''اللہ آپ کو صحت دے۔ میرا مقصد آپ کی چھٹی خراب کرنا نہیں...... مگر صرف آدھے گھنٹے کے لیے آجائیں...... نبیل باجوہ ہمارے ساتھ ہیں...... یاد ہیں ناں نبیل باجوہ صاحب جو میری سیٹ پر ہوتے تھے۔''
''جی بالکل یاد ہیں۔ انہیں میرا اسلام دیجیے۔''
''سلام آپ خود دیجیے گا۔ ہمیں آگے جھنگ جانا ہے۔ صرف پچیس منٹ رکیں گے۔''
''سر آپ کتنی دیر تک پہنچ رہے ہیں۔''

اے میرے پیارے وطن

کہتے ہیں جس جگہ انسان پیدا ہوا اور وہیں اس کی نسلیں ایک کے بعد ایک پروان چڑھتی جائیں تو وہ اس کا دیس ہوتا ہے...... وہ دھرتی اس کی ماں ہوتی ہے...... وہ گیتی اس کی مادر ہوتی ہے اور وہ اس سر زمین سے بے حد محبت کرتا ہے۔
مگر کبھی، کبھی ہجرتیں بھی کرنی پڑتی ہیں اور اگر یہ ہجرت ایک خاص مقصد کے تحت ایک الگ آزاد سر زمین کی خاطر ہو تو وہی زمین اس کا وطن کہلائی جاتی ہے اور جو وطن ہوتا اس سے صرف محبت کی جاتی، وفا کی جاتی ہے اسے خلوصِ دل سے چاہا جاتا ہے اور جسے چاہا جائے تو اسی کی بربادی، تباہی اور نقصان بھلا کوئی کیسے برداشت کر سکتا ہے...... کوئی کیسے اپنی چاہت کو برا بھلا کہہ سکتا ہے جبکہ اس چاہت نے اسے ہمیشہ عزت، وقار، بھروسا اور مان بخشا ہو...... سو ہمارا ملک، ہماری دھرتی ماں، ہماری خوشیوں کی سرزمین پاکستان، ہمارا وطن ہے اور یہ ہمیں اپنی جان سے بھی پیارا ہے اس لیے کہ اس سے ہی ہماری عزت و آبرو اور خوشیاں ہیں سو اپنے پیارے دیس کے باسیوں کو یوم آزادی مبارک ہو۔

از: نگہت حسین، بہارہ کہو

''بس گھنٹے تک۔'' وہ فون رکھ کر پکاری۔
''جمیلہ باجی...... مجھے آفس جانا ہے۔ بس ایک گھنٹے میں آجاؤں گی۔ میرے بڑے افسر آرہے ہیں۔''
''میں آپ کے کپڑے استری کر دوں؟''
''کپڑے میرے الماری میں لٹکے ہیں۔ سالار کے دادا قاسم آئیں گے۔ ابو بھی ساتھ جائیں گے۔ وہ سالار کو گھمانے لے جائیں گے۔ پھر تم لاک کر کے گھر چلی جانا۔''
''جی بہتر جی...... رکشا لا دوں؟''
''نہیں...... آفس کی گاڑی آتی ہو گی۔'' فریال

نے منٹوں میں تیاری کرلی۔ وہ گاڑی سے اتری، چوکیدار نے کھڑے ہوکر سلام کیا۔

''رحیم بخش..... ابھی چیمہ صاحب آرہے ہیں..... ریحانہ، مس شائلہ، مسز کوکب سب موجود ہیں ناں؟''

''جی باقی سب تو ہیں۔ مس شائلہ کہیں چلی گئی ہیں۔''

''کس کے ساتھ؟'' بے ساختہ منہ سے نکلا۔

''سلیم صاحب کے ساتھ۔'' چوکیدار نے نظریں چرالیں۔ وہ نظریں بچاتی اندر آگئی۔ قاصد ریحانہ حیران ہوکے بڑھی۔

''میڈم جی، آپ اس وقت؟''

''ریحانہ فٹافٹ آفس neat کرو..... منرل واٹر منگوا کے رکھو۔ چیمہ صاحب آرہے ہیں۔ مسز کوکب آپ اسٹاف روم دیکھ لیں۔ آج کے کوئی فریش کیس ہیں تو.....''

''نہیں میڈم..... کوئی نہیں ہیں۔''

''مس شائلہ شارٹ لیو دے گئی ہیں؟''

''نہیں میڈم..... وہ صرف بتا کر گئی ہیں۔'' مسز کوکب نے ناک بھوں چڑھائیں۔

''بتا کے جانا زبانی کوئی rule نہیں ہے۔ مسز کوکب! کیک منگوالیں؟ نبیل باجوہ صاحب ان کے ساتھ ہیں۔ وہ تو مہمان ہیں تین سال بعد آرہے ہیں۔'' چیمہ صاحب خاطر تواضع سے منع کرتے تھے۔

''ضرور..... میں چائے کا انتظام کرالوں گی..... آپ فکر نہ کریں۔''

سب کچھ درست ہوگیا۔ مہمان جیپ بھی ٹھیک ٹائم پر پہنچ گئی سامنے سے نبیل باجوہ آرہا تھا۔ ''فریال سلیم'' کی نیم پلیٹ والے کمرے میں اسی پرانی جگہ اسی پرانی کشن والی کرسی پر مگر اسی پرانی فریال ہاشم سے بالکل مختلف فریال بیٹھی تھی جسے اگر کسی اور نام سے تعارف کرایا جاتا تو یقین کیا جاسکتا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کا عبایا جس کی لمبی آستین اس کے آدھے ہاتھ تک کو چھپا رہی تھی۔ اسکارف سے آدھا ڈھانپا ہوا چہرہ۔ متورم خالی آنکھیں..... بلکہ بین کرتی نوحہ گر آنکھیں، کہاں گئی وہ زندگی سے بھرپور ایکٹیو لڑکی؟ کیا تین سال اتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے؟ نبیل باجوہ تو ویسے کا ویسا تھا۔ چیمہ تو نہیں جانتا تھا کہ اس خاتون نے کیسا سفرِ معکوس کیا ہے مگر باجوہ تو مجسمۂ حیرت بن کر رہ گیا۔ فریال کے شوہر وغیرہ کا تعارفی ذکر راستے میں سن چکا تھا۔ شادی اگر زوال گر شئے تھی تو وہ بھی اب شادی شدہ تھا۔ فریال نے سکوتِ حیرت کو توڑا۔

''آپ کہاں رہے سر؟ ملٹی نیشنل کمپنی کا جوائن کرنا اچھا تجربہ رہا ہوگا؟''

''تجربہ رہا ہے مگر مفید تجربہ یہاں تھا۔ یہ حقیقی معنوں میں انسانیت کی خدمت تھی جو تسکین یہاں تھی..... وہ نہ ملی۔'' وہ یہ کہہ کر چپ ہوگیا۔

''سڈنی میں ہوتے ہیں مگر وطن نہیں بھولے۔'' چیمہ صاحب نے ٹکڑا لگایا۔ وہ اسے بار بار دیکھتا پھر زبان پر کچھ آتے آتے رک جاتا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں مس فریال؟'' آخر پوچھ لیا۔

''الحمدللہ..... سلیم صاحب پردہ وغیرہ پسند کرتے ہیں۔'' بے تکا جواب تھا۔

''سلیم صاحب کدھر ہیں؟'' وہ چیمہ کی طرف مڑا۔

''جناب..... وہ مس شائلہ کے ساتھ باہر گئے ہیں۔'' چائے کی ٹرے لاتی ہوئی ریحانہ نے بھونڈا سچ اگل دیا۔

''پردہ پسند کرتے ہیں۔'' نبیل نے دُہرایا۔ چیمہ صاحب ہلکے سے ہنس دیے۔

''عموماً کٹر قسم کے لوگ ڈبل فیسڈ (double faced) ہوتے ہیں۔'' نبیل نے ہلکی آواز میں چیمہ سے بات کی۔

''فریال صاحبہ..... یہ چائے کیک تو آپ ہماری طرف سے پی لیجیے گا۔ میں نے کہا تھا ٹائم کم ہے۔ آگے رنگ پور، جھنگ جانا ہے۔'' نبیل باجوہ نے کوئی گفٹ پیک رکھا اور چیمہ نے وضاحت کی کہ ''یہ نبیل صاحب کی طرف سے آپ کے لیے ہے۔'' وہ اجازت لے کر نکلے گیٹ پر ہی شائلہ اور سلیم نظر آگئے۔

موٹر بائیک پر شائلہ، سلیم کے کندھے پر ہاتھ جمائے بیٹھی تھی۔ چیمہ صاحب نے نبیل باجوہ کو بتایا کہ یہی فریال کا شوہر ہے۔

''جو پردہ پسند کرتا ہے۔'' گاڑی کے اندر چیمہ کا قہقہہ گونج اٹھا۔

شائلہ گھبراہٹ سے بولی۔

''یہ چیمہ صاحب کی گاڑی تھی۔ ساتھ نبیل باجوہ تھا۔ میں تو حاضر بھی نہ تھی۔''

''نبیل باجوہ کون؟''

''تھا ایک...... فریال میڈم کا جانثار...... سابقہ ڈویژنل ہیڈ۔''

''کیا مطلب؟''

''چھوڑو یار...... مطلب صاف ظاہر ہے۔''

سلیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نوکری سے جانے کے باوجود تین سال بعد ملنے آنے کا عمل مطلب واضح کررہا تھا جب یہ پتا چلا کہ فریال بھی آئی ہوئی ہے تو دُہری آگ بھڑک اٹھی ورنہ یک گونہ خوشی تھی کہ اس کا محبوب آکر چلا گیا اور وہ چھٹی پر تھی مگر اب جل اٹھا کہ یوں تو گھر میں اونگھتی رینگتی پھر رہی تھی۔ فون پر بلاوا آیا تو کیسے اڑ کے پہنچی۔ شائلہ تو اسٹاف روم چلی گئی۔ سلیم دندناتا ہوا فریال کے کمرے میں داخل ہوا۔ عام طور پر وہ آفس میں لحاظ رکھتا تھا اور فریال کے آفس میں نہیں جاتا تھا۔ میز پر کیک رکھا ہوا تھا۔ گفٹ پیک پر نبیل باجوہ کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ (حالانکہ وہ گفٹ اصل میں دفتر میں رکھنے کی میوزیکل گھنٹی تھی) سلیم نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔ آہستہ مگر چبا، چبا کر بولا۔

''تم تو بہت زیادہ بیمار تھیں۔ کاجل سرخی کر کے یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے تمہارا سابقہ محبوب آیا تھا...... نبیل...... اسی نے بلایا تمہیں......''

''سلیم یہ ہمارا گھر نہیں ہے، آپ اپنے کمرے میں جائیں۔'' بہت کنٹرول کر کے خود کو فریال نے اتنا کہا۔

''یہ کیک...... یہ تحفے...... بہت پاکیزہ ماضی والی بنتی تھیں۔ ڈیٹ مارنے آگئیں چھٹی کے باوجود......'' سلیم نے نبیل کا کارڈ لے کر ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے چیمہ صاحب نے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ نبیل باجوہ ہمارا سابقہ ڈائریکٹر رہا ہے۔ وہ صرف میرے پاس نہیں آئے۔ مرکز ڈیرا غازی خان سے آرہے تھے۔ آگے رنگ پور، جھنگ گئے ہیں...... سن لیا؟ ڈیٹ تو تم مار رہے ہو۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...... یہاں سے چلے جاؤ پلیز۔'' وہ عزت بچانے کے خیال سے روہانسی ہوگئی۔

''تم مجھے اپنا نوکر سمجھ کر آرڈر دے رہی ہو...... نکل جاؤ تم اس آفس سے۔'' اس نے دبوچ کر فریال کی کلائی پکڑی اور کھینچ کر اسے نکالنے لگا۔ اس کا تو دماغ خراب ہو گیا تھا۔

''سلیم، اللہ کے واسطے...... ہاتھ چھوڑو...... میں چلی جاتی ہوں۔'' وہ گڑگڑاتی رہی اور یہ اس کے بازو کو بے دردی سے مروڑتا گیا۔ فریال کی آواز نیچی رکھنے کی حد ختم ہوگئی۔ اس نے ایک زوردار بھیانک چیخ لگائی، کڑک کی آواز کے ساتھ بازو کی ہڈی چٹخ گئی تھی۔ فریال کا بازو چھوٹا وہ تڑپ کر آڑی ترچھی صوفے پر گررہی تھی۔ شائلہ جو آفس کے کمرے کی پچھلی کھڑکی کے ساتھ چھپی موبائل سے وڈیو بنارہی تھی۔ دیوانہ وار چلاتی، آوازیں دیتی دفتر کے دروازے کی طرف بھاگی۔ وہ کہے جاتی تھی۔

''سلیم نے فریال کو مار دیا۔''

ریحانہ، مسز کوکب، شائلہ آگے پیچھے آفس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ سلیم دروازہ کھول کر جست لگا کر بھاگ نکلنا چاہتا تھا کہ شائلہ نے چیخ کے کہا۔ ''چوکیدار...... اسے پکڑو...... اسے نہ جانے دو۔''

سلیم سکتے میں آگیا، بے ساختہ رک کر شائلہ کو دیکھنے لگا۔ یہی وہ پل تھا کہ چوکیدار نے اسے دبوچ لیا۔

''اس نے بہت ظلم کیا ہے اسے بند کردو۔'' شائلہ چیخی، چوکیدار سمجھتے نہ سمجھتے ہوئے سلیم کو دھکم پیل کرتا اسٹاف روم میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر آیا۔

مسز کوکب نے ریسکیو کال کی پھر پولیس کو کال کی۔

فریال تڑپ رہی تھی پانسہ پلٹ چکا تھا۔ شائلہ کی آنکھوں پر

بندھی عشق کی پٹی کھل چکی تھی۔ وہ تو اس خیال سے چھپ کر وڈیو بنا رہی تھی کہ دیکھے سلیم غصہ نکالتا ہے یا بیوی کی مان لیتا ہے مگر سلیم کا یہ وحشی درندے والا روپ اسے نفرت کی انتہا پر لے گیا۔ وڈیو ایک اہم ثبوت بن گئی۔

یہ وقوعہ ورلڈ ویمن کرائسز سینٹر کے اندر ہوا تھا۔ سینٹر کی افسر پر ہوا تھا۔ یہ ادارے کی شہرت اور بقا کا سوال تھا۔ ادارے کی کارکردگی پر طمانچہ تھا۔ اسے چھپایا یا دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا بس ایک ہی حل تھا کہ مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ عورت کو بھرپور تحفظ دے کر ادارے کی ساکھ کو بحال کیا جائے۔ ریسکیو والے زخمی نیم بے ہوش فریال کو لے گئے۔ پولیس سلیم کو حراست میں لے گئی مگر حراست میں لینے کے لیے بھی کسی کے مدعی بننے اور بیان دینے کی ضرورت تھی اور یہ بیان شمائلہ نے دیا۔

''میں نے مسٹر سلیم کو میڈم فریال کو زدوکوب کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ وڈیو میرے موبائل میں محفوظ ہے۔ کوئی انسان اس حد تک بربریت کر سکتا ہے، میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''مگر آپ وڈیو کیوں بنا رہی تھیں؟'' شمائلہ اس سوال کے لیے تیار تھی۔

''میں کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ سلیم نے مجھ سے محبت کا ڈراما رچایا۔ میں بھی اس کی ظاہری وجاہت کے سبب جھانسے میں آ گئی۔ میں وڈیو حسد کے جذبے کے تحت بنا رہی تھی۔''

سلیم کی تو شمائلہ کی جرأت پر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آج تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ عورت بیچاری اپنی نیک نامی بنائے رکھنے کی خاطر ہر ظلم سہتی رہتی ہے۔

''یہ کس بات پر زدوکوب کر رہا تھا؟''

''آپ وڈیو دیکھ کر جان جائیں گے، یہ ایک شکی مزاج، تنگ نظر، خود غرض شخص ہے۔'' سلیم شوکت کو گرفتار کر لیا گیا۔

وڈیو اپنے موبائل میں منتقل کروا کے پولیس چلی گئی۔ پولیس کے جاتے ہی ریحانہ نے شمائلہ کو گلے سے لگا لیا۔

''خدا کی قسم آپ کی جرأت کو سلام۔ آج تو آپ نے ہمارے دل جیت لیے ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں...... حق کا ساتھ دیا...... پر...... شمائلہ باجی آپ کے گھر والے...... تو آپ پر ناراض ہوں گے۔''

''ریحانہ...... میں بھائی بھابی کے ساتھ زبردستی رہتی ہوں۔ ان کے پاس میرے بارے میں سوچنے کا فضول وقت نہیں ہوتا۔ یہاں سب ہی کی کہانیاں ہیں۔''

شمائلہ نے چیمہ صاحب کو فون کر کے وقوعہ کی رپورٹ دی۔ خبر نبیل باجوہ تک پہنچ چکی تھی۔

اگلی صبح بہت اہم تھی۔ فریال کو کلائی کا جوڑ الگ ہونے پر تو پلستر چڑھا کر اسپتال سے فارغ کر دیا جاتا مگر بدقسمتی سے اس کا چھ ماہ کا حمل اسقاط ہو گیا تھا اور حالت خطرے میں تھی۔

اسپتال میں ہاشم، ننھے سالار کے ہمراہ جمیلہ باجی قاسم چاچا، سلیم شوکت کا بھائی سب جمع تھے۔ فریال کا ہوش میں آنا اور بیان بہت اہم تھا۔ سب کو اس کی زبانی روداد سننے کا انتظار تو تھا ہی، ہاشم کو ازحد دکھ اور غصہ تھا جبکہ سلیم شوکت کا بھائی خود ساختہ تاویلات پیش کر رہا تھا۔

اِدھر اسپتال کے پلاٹ میں مس شمائلہ، ریحانہ، مسز کوکب، نبیل باجوہ کرسیوں پر نیم دائرہ بیٹھے تھے۔ چیمہ صاحب کراچی سے آرگنائزیشن کے بانی صاحب کو ائرپورٹ پر ریسیو کرنے گئے ہوئے تھے۔ اوپر تک اس واقعے سے کھلبلی مچ چکی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آتا فریال نے اتنا ظلم برداشت کیا...... مجھے سوچ کے کپکپی ہوتی ہے۔'' نبیل باجوہ کہہ رہا تھا۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' شمائلہ نے تائید کی۔

''میں کل انہیں پہلی نظر دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کچھ ہے...... دال میں کچھ کالا ہے...... آپ لوگوں نے اس کا حلیہ نہیں نوٹس کیا؟ what is that؟''

''حلیہ تو پرسنل معاملہ ہوتا ہے...... اس پر کوئی کیا بول سکتا ہے۔'' مسز کوکب نے پرس بند کرتے ہوئے سونف سپاری اپنی ہتھیلی پر نکالی اور چکھنے لگی۔

''یہ واقعہ...... آپ لوگ کیا سمجھ رہی ہیں معمولی

بات ہے...... یہ دفتر بھی بند ہو سکتا ہے۔ اور وہ فریال ہاشم جو اپنی تقریروں میں WWC کا منشور کی دفعہ فلاں دفعہ فلاں پارٹ اول پارٹ دوم پارٹ سوم زبانی کوٹ کرتی تھیں۔ کیا ان کو لگا کہ اس میں سے کچھ بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا...... پھر تو یہ سب تو تا کہانی ہوئی۔'' نبیل کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آرہا تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔

''آپ پانی پی لیں صاحب جی۔'' ریحانہ نے پانی کی بوتل اور گلاس بڑھایا۔ نفی میں سر ہلا دیا گیا۔

''مجھے خدشہ ہے کہ...... فریال کو نوکری سے الگ نہیں کر دیا جائے۔'' پھر سر اٹھا کر کہا۔

''اللہ نہ کرے...... وہ بے قصور ہے...... یہ تو ظلم پر ظلم ہے۔'' شمائلہ کہہ اٹھی۔

''ظلم سہنا قصور ہوتا ہے مس شمائلہ...... اور عدالت کی جگہ فائز ہو کر عدالت کو نہ بتا اور کمزور گردانا...... اس سے بھی بڑا قصور ہوتا ہے۔''

''اب ہوگا کیا؟'' مسز کوکب بے قراری سے اٹھ کر پھر بیٹھ رہیں۔

''میں اندر ایک چکر لگا آؤں...... ہو سکتا ہے میڈم ہوش میں آگئی ہوں۔'' ریحانہ نے جیسے مسز کوکب کا دماغ پڑھ لیا۔

''ہاں ریحانہ......'' وہ کچھ کہنے والی تھی کہ نبیل باجوہ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''بیٹھی رہیے...... ہمیں خبر کر دی جائے گی...... رحیم بخش وہیں موجود ہے۔''

''ہائے، ہائے میڈم کا بیٹا بیچارہ کیسے ماما، ماما کر کے رو رہا تھا۔'' ریحانہ نے خود کلامی کی۔

''فریال نے اپنی اور بچے کی زندگی پر ظلم کیا۔ اس گھٹیا شخص کو برداشت کرتی رہی۔'' نبیل بڑبڑایا۔

''انسان کتنا بڑا دھوکے باز ہے...... اُف میرے خدا۔'' شمائلہ نے دور دیکھتے ہوئے آہ بھری۔

''آہ...... عورت بیچاری۔'' مسز کوکب نے ہنکارا بھرا۔

اسپتال کی راہداری میں الگ بحث چل رہی تھی۔

''شادی شدہ زندگی میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے...... بیوی صبر کر لیتی ہے۔'' سلیم کے بھائی نے کہا۔

''صبر کے سوا میری بیٹی نے کیا ہی کیا ہے...... اللہ نہ کرے کل کو تمہاری بچیوں کو اتنا صبر کرنا پڑے۔''

بھائی کی دو بچیاں تھیں اس جواب پر وہ اندر سے کانپ کر چپ ہو گیا۔ سارے بے صورت لمحے گزرتے رہے...... لگتا تھا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے ہیں۔

''فریال ہوش میں آگئی ہے۔'' اس ندا نے سب کو جگا دیا۔

پولیس بیان، دفتری بیان، باپ اور بیٹی کے درمیان آنسوؤں کی داستان، ورق در ورق ساری کہانی کھل رہی تھی۔

''فریال ہاشم...... آپ کا شوہر اتنا ظالم تھا آپ نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو اتنے عرصے کیوں چھپایا؟''

''فریال ہاشم...... چھ برس تک آپ جس ادارے کی معرفت تقریباً پچاس ویمن کیسز کو حل کروا چکی تھیں۔ آپ کو ذاتی مسائل کے لیے اس پر اعتماد نہ تھا؟''

''فریال بیٹی...... میں تمہارا باپ دیوار پار تمہارے ساتھ موجود تھا۔ تم سے پوچھتا تھا۔ تم خوش نہیں ہو، تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟''

تکیے سے ٹیک لگائے اپنے بچے سالار کو گود میں لیے نقاہت زدہ چہرہ لیے سیاہ چادر اوڑھے فریال نے سب پر نظر ڈالی پھر بولنا شروع کیا۔

''مجھے دیکھیے میں سب کے سوالات کا جواب ہوں، جی ہاں میں نے پچاسوں کیس حل کروائے۔ عورت کا دکھ روز سنتی اور روز دیکھتی تھی مگر مجھے عذاب کے اس دریا کا عبور کرنا پتا نہ تھا جو عبور کر کے عورت ہماری دہلیز تک آتی تھی۔ مجھے لفظوں کا تیزاب، نفرت اگلتی آنکھوں کی دید، جسمانی اذیت کے وار چھو کر نہیں گزر رہے تھے۔ یہ واضح کر دوں کہ ہر عورت اپنی پرواز کے پر محبت کی قینچی سے کٹواتی ہے۔ اول، اول عورت محبت کے فریب میں سب کچھ لٹاتی ہے۔'' شمائلہ نے سر جھکا لیا۔ ''میں نے میرا امکان اسی فریب میں سلیم کے نام کیا۔ میں اپنی ساری تنخواہ اسی محبت کے

نشے میں لاکر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتی تھی تاکہ اس کی انا کو چوٹ نہ لگے۔ اپنی ہی تنخواہ مانگ، مانگ کر خرچ کرتی اور ڈانٹ سہتی...... ایک طرف تو میں یہ قربانیاں دے کر شوہر کی محبت جیت لینا چاہتی تھی۔ دوسری طرف اپنی نام نہاد عزت بنائے رکھنا چاہتی تھی۔ اپنے باپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی لیکن میں سچ سے بھاگ رہی تھی اور یہی میری اصل غلطی تھی۔ ہم کسی سانپ، بچھو یا باؤلے کتے کے ساتھ اسے خوب صورت نام دے کر کب تک گزار سکتے ہیں......

ہمارے معاشرے کی آدھی عورتیں سچ چھپاتی، چھپاتے مٹی میں مٹی ہو جاتی ہیں...... نبیل باجوہ صاحب...... آپ نے کہا ہمارے ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچا...... ایسا نہیں ہوا...... ہمارے مونوگرام میں ایک عورت دوسری عورت کے زخم پر مرہم لگا رہی ہے۔ میں بھی سوچا کرتی تھی لو بتاؤ کوئی عورت مجھے بچا سکتی ہے کیا...... مگر ہمارے ادارے کی مس شمائلہ نے یہ مونوگرام بن کر دکھا دیا۔'' فریال نے پلستر زدہ بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھ میں اب بھی سچ کو سامنے لانے کی ہمت نہ تھی...... کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ میں ہوش میں آکر بازو ٹوٹنے کا کیا بہانہ گھڑتی......'' شمائلہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ''میں نے عذاب کے گڑھے میں گرتے، گرتے آواز نیچے رکھنے کی کوشش کی تھی...... یہ بھی چاہتی تو وڈیو سمیت گونگی ہو جاتی...... اس سے کس نے گواہی مانگنا تھی؟ انگلیوں کا رخ اپنی جانب اٹھنے سے بچ رہتی۔ حق کی گواہی دینا آسان نہیں ہوتا یہ انگاروں پر چلنا ہوتا ہے۔ گواہی چٹان جیسی برداشت مانگتی ہے۔'' شمائلہ نے اپنے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگا کر فریال کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

''فریال تیری عظمت کو سلام۔'' فریال ...... نے ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''میری نحوست کا آغاز میری شادی کے ساتھ ہو گیا تھا مگر میں دیر تک یقین نہ کر پائی کہ میں تین عورتیں تین کہانیاں بن چکی ہوں۔ بھلا یقین کیونکر ہوتا میں نے ہمیشہ آنسو پونچھے تھے۔ اب بھی اپنے بہتے آنسو پونچھ کر خود کو حوصلہ دے لیتی تھی۔

''آپ اب کیا چاہتی ہیں؟''

نبیل آخری فیصلے کی مہر اس کی زبان سے لگوانا چاہتا تھا۔

''سلیم میرے بچے کا قاتل ہے۔ میں اسے سزا دلوانا چاہتی ہوں۔ میں سلیم سے علیحدگی چاہتی ہوں۔ دھوکا اور فریب میں دیا گیا اپنا مکان واپس لینا چاہتی ہوں۔ میں اپنی مددگار تنظیم کی اولین مدد لینا چاہتی ہوں۔''

بانیِ ادارہ نے چیمہ صاحب کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر اعلان کرتے ہوئے بولے۔

''فریال ہاشم کو ڈویژنل ہیڈ کے عہدے پر ترقی دی جاتی ہے۔ مس شمائلہ کو حق گوئی اور جرأت پر خصوصی شیلڈ اور انعام دیا جاتا ہے۔''

تالیوں سے استقبال ہوا۔ بانیِ ادارہ نے اٹھ کر کہا۔

''سلیم شوکت کو تمام جرائم کی قرار واقعی سزا ملنے تک ادارہ تمام وسائل کے ساتھ یہ جنگ لڑے گا۔ سلیم شوکت اس آفس کا اجازت شدہ ملازم تھا اسے برطرف کر دیا گیا تاہم ہمارے منشور کے مطابق اس کو اپنی سزا بھگتنی ہوگی۔ ورلڈ ویمن کرائسس آج تک حق کی جنگ نہیں ہارا ریکارڈ ہے اور اب بھی نہیں ہارے گا۔ سلیم جیسے ظالم سفاک کے سامنے اب اکیلی عورت نہیں اسلام، قانون، سماج اور مضبوط ادارہ ہے۔''

تالیوں کے ساتھ داد دی گئی۔

فریال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا۔

''میں فریال ہاشم ہوں۔ میں اُمِ سالار ہوں۔''

شمائلہ نے اٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اونچا کیا اور کہا۔

''میں عورت ہوں
میں انساں ہوں
میں سر بلند ہوں
عظمت کا نشاں ہوں''

مسز کوکب، ریحانہ کی آوازیں بھی ساتھ شامل ہو گئیں۔ پریس رپورٹر تصاویر اتارنے لگے...... ننھا سالار تالیاں بجا رہا تھا۔

انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے؟ جب بلند دعوے کرے کہ وہ یہ نہیں کرے گا وہ نہیں کرے گا تو وہی باتیں اور لہجے آگے کسی وقت زندگی میں آکر ایسے حاوی ہوتے ہیں کہ انسان بے بس ہوجاتا ہے۔ لیکن ان سے بچنے کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک جب انسان شرمندہ سا ہوکر دعا کرے کہ خدا معاف کردے یا دوسرا یہ کہ دعا و دوا کرے۔ صحیح کو جان کر پہچان کر بچنے کی تدابیر کرے اور دوسرا راستہ ہی ہمت والے اپناتے ہیں۔

ہوا کچھ یوں کہ جب کبھی دوستوں میں بات آتی کہ تمہیں اگر موقع ملے تو تم کس ملک میں رہائش اختیار کروگی؟ تو وہ ہمیشہ پاکستان کا نام لیتی، کچھ افسوس سے، کچھ طنزیہ مسکراتیں اور جملے کستیں لیکن وہ اپنی بات پہ ڈٹی رہتی اور فخریہ کہتی تھی۔

''یہ میرا ملک ہے پاکستان، میں کیوں کہیں اور جاؤں، میری شناخت ہے یہ کبھی کوئی اپنی شناخت سے بھی بھاگتا ہے!''

''پاکستان میں ہے کیا؟ یہاں کیا رکھا ہے؟'' ایک نے طنزاً کہا۔

''وہاں تو بہترین زندگی ہے، سسرال کا جھنجٹ نہ کچھ اور۔'' دوسری نے بھی کہا۔

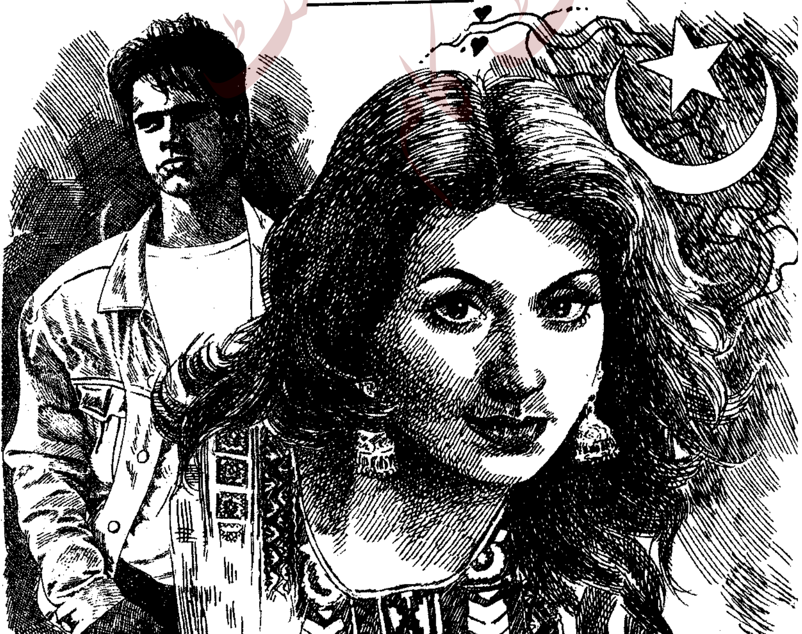
''زندگی پُرسکون اور حسین ہے وہاں تو۔'' تیسری نے بھی حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔

''زندگی تو یہاں بھی پُرسکون و اطمینان بخش ہے، حسین ہے اگر بنائی جائے سمجھی جائے تو۔'' اس نے سب کی باتیں تحمل سے سنیں اور کہا۔ ''وہاں سسرال نہیں ہوگی لیکن یہاں پہ سسرال ہی ہوگی جو شوہر کے کچھ ایسا ویسا کرنے پر آپ کو سپورٹ کرے گی۔ جیسے کہ دوسری شادی یا کسی بری لت کے لگنے پر دیکھو نہ جانے کیوں ہم ایسا سوچتے ہیں۔ دیکھو ہم مشرقی لڑکیوں کا سب بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم گھر سے باہر سروائیو نہیں کرسکتی جبکہ وہاں تو باہر کے سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں۔'' دھیمے پن سے تلخی اختیار کرتے اس نے سب پر اِک نظر ڈالی۔ سب کے تاثرات متضاد تھے بالکل سوچوں اور ماحول کی طرح۔

''کچھ چیزیں بہ آسانی اور کچھ مشکل سے سمجھ آتی ہیں جن میں سرِفہرست انسان کے اپنے مطلب کی ہوتی ہیں۔'' اس نے سب لڑکیوں کو دیکھا اور افسوس سے ہاتھ رگڑے۔ اکثر و بیشتر عورت اور عقل کے درمیاں دھند میں لپٹا شیشہ ہوتا

ضرورت ہے پاکستان

نرمین سرھیو



ہے جو صاف عیاں حقیقت ہوتی ہے وہ بھی انہیں دھندلی نظر آتی ہے اور وہ شیشہ ایک ٹھوکر سے ٹوٹ جاتا ہے لیکن ٹھوکر سے قبل وہ اسی دھند میں دیکھتی ہیں۔ اس پر عقل وفہم کے در نیم وا ہو چکے تھے اور اس کا فیصلہ اٹل تھا کہ وہ پاکستان میں ہی تمام عمر گزارے گی۔

بات کالج کے زمانے کی تھی...... عرصہ گزرا...... تب بھی جوش اس کے دل میں وہی تھا...... پھر شادی ہوئی...... دو نندیں، ایک دیور، ساس سسر اور ایک دادا سب محبت کرنے والے...... تین ماہ خیریت سے گزرے کہ اچانک وہ ہوا جو اس نے سوچا نہ تھا۔

اب ہوا یہ کہ وہ پاکستان میں مزید نہیں رہ سکتی تھی بلکہ باہر ملک جانا تھا...... اپنے شوہر کے ساتھ، شوہر غمِ روزگار کی بدولت اور وہ اس کے آرام کی وجہ سے۔ یہ غمِ روزگار بھی کیسے کیسے ستم ڈھاتا ہے۔ اس کے شوہر کی ایک فیکٹری میں سینئر پوسٹ تھی لیکن فیکٹری کے اچانک نقصان پر ورکرز کو نکال دیا گیا۔ اب اس کے شوہر کی نوکری گزارے لائق تھی لیکن اس کے ایک کولیگ جو اسی کے ساتھ فیکٹری سے نکالے گئے تھے۔ اب وہ بیرونِ ملک ایک قابلِ بھروسا کمپنی میں اپلائی کر رہے تھے۔ کمپنی کی وہاں نئی برانچ ابھی کھلی تھی اور کچھ ورکرز یہاں سے گئے تھے۔ اس کولیگ نے اس کے شوہر کو بھی اپلائی کرنے کی آفر کی تھی۔ وہاں رہائش بھی کمپنی کی طرف سے تھی۔ بیرونِ ملک برانچ میں ترقی کے چانس زیادہ تو ہیں۔

بقول شہروز کے پاکستان میں ہر طرح کی سہولت کی کمی تھی اوپر سے سارے گھر کی کفالت کی ذمے داری بھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد سب کو شہروز نے وہاں بلا لینا تھا لیکن دادا جی کے انکار پر سب چپکے رہے۔ انہوں نے تو پوتے کو بھی کہا تھا۔

''دیکھنا جس ملک کو تم اپنی جوانی نہیں دے رہے اس کے لیے تمہارا بڑھاپا روئے گا۔''

ان کی اس بات سے وہ سو فیصد متفق تھی لیکن شہروز کو کیسے سمجھاتی۔ تین دن کی سوچوں اور الجھن کو سلجھاتے، سلجھاتے اس نے شہروز کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہی جو سب پروگرام پکا کر کے اسلام آباد دوست سے ملنے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہکلاتے، ہکلاتے اس نے اچانک بہ آواز بلند کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ ہکلاتے، ہکلاتے اچانک فیصلہ کن ہو گیا تھا۔

''کہاں نہیں جاؤ گی؟'' وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکا۔

''کیا ہم یہاں نہیں رہ سکتے، اپنوں کے ساتھ؟'' وہ دھیمی ہوئی۔

''تو میں تمہارا اپنا نہیں؟'' اس نے شرٹ سلیکٹ کرنا ترک کر کے اسے گھورا۔

''م...... میرا...... مطلب ہے کیا یہاں ہم مستقل نہیں رہ سکتے؟'' وہ کچھ ہڑبڑائی کچھ گڑبڑائی۔

''مسئلہ کیا ہے آخر؟'' وہ سامان کھلا چھوڑ کر اس کے سامنے آیا۔ لہجہ الجھا سا تھا۔

''مطلب ہم وہاں کیوں جا رہے ہیں جب یہاں سب کچھ ہے تو......!'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''یہاں کیا ہے سب کو پتا ہے......! کیا تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتیں؟'' وہ تلخ ہوا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں جہاں آپ وہاں میں......'' وہ انگلیاں مروڑتے بولی۔

''پھر آخر اس بات کی وجہ؟''

''کیا ہم یہاں اپنوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے، وہاں اکیلے، الگ ماحول میں، انجان لوگوں میں رہنے سے تو یہاں رہنا اچھا ہے۔'' وہ چاہ کر بھی اپنا مدعا واضح بیان نہیں کر پا رہی تھی۔

''دیکھو یہاں ہے کیا؟ سکون نہ آرام، ہر وقت جانی و مالی خطرہ رہتا ہے۔ اچھی جاب ملتی نہیں بس سفارش چلتی ہے، حکومت لالچی ہے اور تو اور گیس، بجلی، پانی بھی غائب......'' وہ جھنجلایا۔

''لیکن یہاں اپنے ہیں اور آپ یہاں جاب ڈھونڈیں ناں، کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی......''

''کہاں سے ملے گی نوکری، یہاں کون میرا ماما، چاچا بیٹھا ہے جو دلوا دے گا۔'' وہ جھنجلایا۔

''کوشش تو کریں۔''

''دیکھو یہاں جاب نہیں ملتی تو اب میں کیا کروں۔'' وہ زچ ہو کر اس کے برابر آبیٹھا۔

''پر اپنے تو یہاں ہیں ناں!''

''دیکھو جب اپنوں سے انسان دور ہوتا ہے تب قدر ہوتی ہے۔'' کچھ دیر ٹھہر کر شہروز نے دھیمے سے کہا۔

''لیکن وقت کے ساتھ مزید دوری سے قدرا جنبیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔''

''مسئلہ جاب کا ہے، وہاں کم از کم ٹرائل کے بعد قابلیت پر پکی جاب تو مل جائے گی، یہاں تو بس سفارش ہے۔''

''وہاں کون سی جاب کریں گے؟''

''وہاں مینجمنٹ کی کسی فیلڈ میں ہی مل جائے گی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''لیکن وہاں سب کا رویّہ...... اور اپنوں سے دوری......؟'' وہ گم صم ہوگئی۔

''جب اچھے خاصے پیسے جمع ہو جائیں گے تو واپس آجائیں گے۔'' اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''مطلب آپ پیسوں کے لیے... ملک اور اپنوں کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' وہ ششدر رہ گئی اور سوچیں بے لگام گھوڑے کی طرح اس کے گرد ناچنے لگیں۔

''ہاں پیسہ ضرورت ہے بھئی!''

''مطلب آپ کو ابھی اپنے وطن کی ضرورت نہیں، لیکن جب پیسے آجائیں گے تو ضرورت ہوگی۔'' وہ تلخ ہوگئی۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' اپنی گھبراہٹ کو اس نے جھنجلاہٹ کا لباس پہنانا چاہا۔

''میری بات سنیں، یہ جو......''

''مجھے کوئی بات نہیں سننی۔''

''آپ کو سننی پڑے گی، اِدھر دیکھیں میری طرف......'' اس نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو آپ کو ابھی' پاکستان میں ہے کیا؟ یہاں کیا رکھا ہے؟'' اس نے طنزاً کہا۔

''پاکستان کی شناخت اور اس کے نام اور سائے کی ضرورت نہیں ہیں ناں کل کو اسی کے لیے بھاگے آئیں گے۔ تب اسے آپ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ابھی اس کو آپ کی ضرورت ہے کل کو اسے نہیں ہوگی، ابھی آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے، کل آپ کو اسی کی ضرورت لازماً ہوگی۔ لیکن تب آپ کا وجود اس مٹی کو گوارا نہیں ہوگا......!''

''کتابی باتیں کر رہی ہو۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا لیکن دل کے پتھریلے جذبوں کو تپش سی ملی بلکہ ان باتوں سے وہ پگھل رہا تھا۔

''میرے خیال میں ابھی آپ کو اس کی ابتر حالت سے نفرت ہوتی ہے تبھی آپ کو اس کی ضرورت نہیں، بالکل ایسے ہی آپ اپنوں کو، رشتوں کو تولتے ہوں گے لیکن کل... خدانخواستہ آپ کی ایسی حالت ہوئی تب نہ ہی یہ ملک... اس میں بسنے والے لوگ اور نہ ہی اپنے رشتے آپ کو قبول کریں گے، آپ نے کیا اچھا کیا تھا ان کے ساتھ، ملک کے ساتھ جو آپ کریں گے، آگے ملک کرے گا......!'' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا وہ اس کی ایسی باتیں سن کیوں رہا تھا لیکن کوئی ان دیکھا اثر تھا جس نے اسے منجمد کر رکھا تھا۔

''ابھی ملک کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں کل کو رشتوں کو بھی ایسے ہی تولیں گے؟'' وہ تلخ لہجے میں کہتی، ایک سرد نگاہ اس پر ڈالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کیا انسان کی سوچ کبھی ایسے بھی عیاں ہوئی ہے......وہ کیا کہہ گئی تھی تو وہ کل کو رشتوں کا تولنے کا ترازو بھی سکون و آرام دینے والے کو تولے گا؟ لیکن حقیقتیں بھی تو چھوٹی، چھوٹی باتوں سے عیاں ہوتی ہیں۔'' وہ اپنی ہی سوچوں سے گھبرا گیا۔

رات کا کھانا بناتے ہوئے جب اس نے شہروز کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھا تو ایک انجانے سے افسوس نے آگھیرا۔ اسے اتنی سخت باتیں نہیں کہنی چاہیے تھیں اگر شہروز برا مان گیا تو؟ کچھ بھی ہو وہ اس کا شوہر ہے۔ وہی مشرقی لڑکیوں والی سوچ کہ غلط کام سے بھی شوہر کو کیسے روکیں اگر برا مان گئے تو؟

☆☆☆

اس نے شام کی چائے ٹیبل پر رکھتے ہوئے شہروز کو ایک نظر دیکھا۔ شہروز دادا سے یہیں نوکری ڈھونڈنے کی بات کر رہا تھا۔ مانا کہ یہ مشکل تھا پر ناممکن تو نہیں جبکہ پاپا مصنوعی خفگی کا اظہار کر رہے تھے جبکہ اندر سے بیٹے کے دور نہ جانے پر خوش تھے۔

اس نے اپنے دل میں ایک اطمینان سا محسوس کیا۔ جو لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ محب وطن صرف وہ ہیں جو مختلف شعبوں میں جا کر پاکستان کا نام روشن کریں گے تو نہیں ایسا بالکل نہیں تھا، ایک طریقہ یہ بھی لوگوں کے دل میں پاکستان کے لیے احساس پیدا کرنا تھا کیوں کہ ایک طرح سے وہ بھی اس طریقے سے اپنے ملک کو بہتر بنانے میں کوشاں ہوتی ہیں۔

(ختم شد)



منی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا

سیما رضا ردا

گیارھواں حصہ

ڈاکٹر راحیل کے پاس جلد سے جلد پہنچنا تھا اور افتاد یہ پڑ گئی تھی......

''اوہ......'' گاڑی جھٹکے کھا کے ایک دم رک گئی...... تایا جی نے بہت کوشش کی کہ وہ اسٹارٹ ہو جائے...... مگر بے سود......

تایا جی آہستہ، آہستہ قدموں سے روڈ کراس کر رہے تھے ...... گاڑی سڑک کے دوسری طرف کھڑی تھی۔ گاڑی اچانک بند ہو گئی تھی...... یہ بھی



غنیمت تھا کہ اسپتال ذرا قریب ہی تھا...... انہیں روڈ کراس کر کے پھر فٹ پاتھ کے ساتھ، ساتھ بالکل سیدھے جانا تھا...... اب وہ روڈ کراس کر کے فٹ پاتھ پر قدم بڑھا رہے تھے۔ تب ہی سیاہ کرولا ان کے قریب آرکی۔

وہ چونک کر دیکھنے لگے...... شناسا چہرہ تھا، مسکراتا ہوا۔

''السلام علیکم......!''اس کے انداز میں بے تکلفی مگر احترام شامل تھا۔

''وعلیکم السلام......!'' تایا جی نے اپنی عینک کو دوبارہ سے ناک کی پھنگ پہ جماتے ہوئے کہا۔

''آپ جمیل صاحب ہیں ناں......''

''جی بالکل......'' تایا جی نے کہا۔''اور مجھے لگتا ہے میں نے آپ کو دیکھا ہے......''

''نہ صرف دیکھا ہے...... بلکہ ہماری اچھی خاصی ملاقات بھی ہوئی ہے ڈاکٹر راحیل کے کلینک میں......'' مسکراتے ہوئے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

''جی بالکل...... میں آپ کو پہچان گیا......'' تایا جی نے محبت سے اس جوان یعنی اعزاز شاہ کو دیکھا۔

''آیئے گاڑی میں بیٹھیے...... مجھے پتا ہے آپ اسپتال جا رہے ہیں...... مجھے بھی اسی راستے پر جانا ہے۔''

''ارے بیٹا تمہیں تکلیف ہوگی...... ذرا دیر کا راستہ ہے...... میری گاڑی بند ہوگئی تھی...... میں نے سوچا کہ چلو پیدل چلتے ہیں دور ہی کتنا ہے...... مگر مہربان فرشتہ مل گیا......''

''ارے انکل کیسی بات کرتے ہیں......؟ فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا...... میں تو بہت گناہگار بندہ ہوں......'' تایا جی نے اسے دیکھا جو گاڑی کو اسپتال کی طرف موڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ایسے نہیں کہتے بیٹا...... تم واقعی نیک اور اچھے انسان ہو...... میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں......'' تایا جی کے انداز میں اس کے لیے حوصلہ اور امید تھی اور اعزاز شاہ ہنسنے لگے گا۔

''اللہ آپ کا گمان سلامت رکھے...... اور لیجیے ہم اسپتال کے احاطے میں داخل ہوگئے......''

اعزاز نے یہ کہتے ہوئے گاڑی روکی اور تیزی سے اتر کے تایا جی کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

''بہت شکریہ بیٹا...... میں تمہارے اخلاق کی قیمت نہیں ادا کر سکتا...... لیکن میرا دل ہمیشہ دعا دیتا رہے گا...... اللہ تمہیں خوش رکھے......''

اور اعزاز شاہ مسکراتے ہوئے تایا جی کے ساتھ نیورولوجی شعبے کی طرف بڑھ گئے...... جہاں تشمیرہ زندگی کے انتظار میں ہوش و خرد سے بے نیاز تھی...... مگر ڈاکٹر پُرامید تھے...... اور تایا جی اس کی آواز سننے کو بے چین......!

☆☆☆

خالہ زینب کو کسی نئے پیر کا پتا بتایا تھا اس کی ہمسائی نے...... وہ ہانپتی کانپتی پہنچی تھی...... اور تعویزوں کے ہیر پھیر میں الجھی ہوئی بابا سے اصرار کر رہی تھی کہ بابا اللہ رسول کا واسطہ ہے ایسا عمل بتاؤ کہ بیٹا گھر واپس آجائے...... میری عروج کی شادی ہو جائے۔

''بابا جی حسد کیا ہے......؟'' تب ہی کسی نے بابا جی سے یہ سوال پوچھ لیا

کہنے لگے...... ''رب کی تقسیم سے اختلاف رکھنا۔''

''میں سمجھا نہیں بابا......''

''بہت آسان ہے بیٹا سمجھنا...... میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ تمہیں اچھی شکل عطا کی اللہ نے...... مگر تمہارے بھائی کا رنگ تم سے بہت دبتا ہوا ہے مگر اس کی قسمت اچھی ہے...... وہ پیسے والا ہے...... تم اس کے مقابلے میں غریب ہو...... وہ بڑے گھر میں رہتا ہے...... مگر تم دو کمرے کے گھر میں...... مطلب یہ کہ تم کو اس بات سے اختلاف ہے کہ وہ تم سے بہتر کیوں ہے...... اور یہ چیز تمہیں اندر سے بے چین رکھتی ہے...... اندر ہی اندر کھائے جاتی ہے کہ اس سے وہ سب چھین لو جو اس کے پاس ہے...... کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تم اس کے حقدار ہو مگر ایسا نہیں ہوتا ہے...... یہ اللہ کی دین ہے وہ جسے چاہے دیتا ہے اس

کی مرضی...... انسان کو صرف کوشش کرنی چاہیے اور محنت کرنی چاہیے...... اسے صلہ ضرور ملتا ہے...... حسد کرے گا یا کسی کا حق مارے گا تو اسی کا الٹا نقصان ہوگا...... وقتی طور پر تو اسے کامیابی ضرور مل جائے گی...... مگر وہ ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے گا جس کی آگ میں جل کر وہ خود ہی سلگتا رہے گا...... وہ ہمیشہ بے چین و مضطرب رہتا ہے...... اللہ سے ڈرنا چاہیے...... اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہیے...... اور شکر ادا کرتے رہنا چاہیے...... سمجھے بیٹا......!''

''جی بابا...... شکریہ بہت اچھی طرح سمجھ آ گیا......''

خالہ زینب نے بابا کی باتوں کو غور سے سننے کی کوشش کی...... انہیں لگا جیسے ماضی کا کوئی کواڑ کھل رہا ہو...... اماں کی آواز آتی ہے......

''اری زینب...... تو اللہ کے دیے ہوئے پہ خوش کیوں نہیں ہوتی...... تو میرو کا حق کیوں مارتی ہے...... بہت پچھتائے گی زینب......!''

''جی بی بی...... آپ کا کیا مسئلہ ہے......؟''

نورانی بزرگ ان سے پوچھ رہے تھے...... وہ انہیں اپنے حالات بتانے لگیں...... غربت، افلاس، بیٹے کی پریشانی...... بیٹی کا رشتہ......

''آپ نماز پڑھتی ہیں......؟'' نورانی بزرگ نے پوچھا۔

''نماز......'' وہ سوچنے لگیں کہ آخری بار کب پڑھی تھی۔

''اگر آپ نماز پڑھیں گی تو سارے مسئلے دور ہو جائیں گے...... یہ تعویز دراصل اللہ کا کلام ہے...... اسم اعظم ہے...... آپ اس کے ساتھ نماز کی پابندی کریں گی تو یہ تعویز اثر کرے گا...... مگر بی بی نماز شرط ہے......'' انہوں نے مسکراتے چہرے کے ساتھ پلاسٹک کے چھوٹے سے کور میں لپٹا تعویز ان کی طرف بڑھایا۔

''پیسے......؟'' انہوں نے ہزار، ہزار کے کئی نوٹ نکالے۔

''صرف پچاس روپے...... اس گلک میں ڈال دیجیے۔''

''پچاس روپے......؟'' ان کے ہونٹ بے یقینی سے یکدم کھل گئے......''

وہ تو اِدھر اُدھر سے مانگ کر اپنی دانست میں دس ہزار سے زائد لے کر آ گئی تھیں۔

''یہ ہمسائی نے کہاں بھیج دیا مجھے......!'' انہوں نے پچاس روپے کا نوٹ بہ مشکل نکال کر گلک میں ڈالا اور خود کو سنبھالتی اس حجرے سے باہر آ گئیں۔

لوگوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا...... قطاریں بندھی ہوئی تھیں۔

پوری زندگی مکاری کے ساتھ گزاری تھی...... غلط زبان کا استعمال کر کے، کردار کشی کر کے...... اپنی خواہشوں کے منہ زور گھوڑوں کو دوڑایا تھا...... مگر مکاری کب تک......؟ لالچ کی عمر کیا ہے......؟ حلال کو حرام اور حرام کو حلال آخر کب تک......؟

انسان کیوں نہیں تھکتا......

اللہ تعالیٰ کی رسی دراز ہوتی چلی جاتی ہے...... کبھی تو بندہ سنبھلے گا...... توبہ و استغفار کی راہ سے اسے کبھی تو آشنائی ہوگی......

انسان کتنا خود غرض ہے...... پہلے اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے صرف خود کو دیکھتا ہے...... اور پھر اولاد کے لیے بھی اس کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے...... وہ صرف اور صرف اولاد کی خوشیوں کے لیے دوسروں کی خوشیوں کو پامال کرتا جاتا ہے...... وہی اولاد جو منوں مٹی تلے دبا کر اس کی وارثت پر حق جمائے گی۔

''ارے اماں سنبھل کر...... کیا مرو گی......؟''

خالہ زینب سوچوں کے جال بنتی سڑک پہ چلی جا رہی تھیں تب بائیک پہ سوار لڑکے نے انہیں گرنے سے سنبھالا۔

''اکیلے کیوں نکلتی ہو اماں گھر سے...... اپنے ساتھ کسی کو لے کر نکلا کرو......''

''کس کو ساتھ لے کر نکلوں......؟'' وہ الٹا ان

سے سوال کرنے لگی۔
لڑکوں کو ان کی ذہنی حالت پہ شک ہوا اور وہ ان کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔
زندگی انسان کو کیا کچھ دکھاتی ہے...... انسان کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں...... اگر ابھی ان کے سامنے آئینہ ہوتا تو زینب خالہ کو پتا چلتا کہ وقت نے ان سے کتنا بڑا انتقام لیا ہے......

☆☆☆

اگست کا مہینہ گرمی اور بارشوں کی بہار دکھا رہا تھا...... باہر کے موسم سے بچ کر اندر آئے...... تو اسپتال کے کاریڈور میں مریضوں کے رشتے دار بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے...... تایا جی اور اعزاز شاہ ان سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر راحیل کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے...... امید اور یقین تایا جی کے چہرے پر رقم تھا۔

میں تو یکمشت اسے سونپ دوں سب کچھ لیکن
ایک مٹھی میں میرے خواب کہاں تک آتے

ڈاکٹر راحیل کے کمرے میں تایا جی اور اعزاز شاہ ان کے سامنے رکھی کرسیوں پر براجمان تھے...... ان کے ہاتھ میں براؤن رنگ کی فائل تھی......
جسے وہ دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے...... ''آپ افسردہ نہ ہوں انکل......! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہم نے آپ کی بیٹی کی وہ تمام رپورٹس، نیورولوجی ڈیپارٹمنٹ آف فلوریڈا اسپتال بھجوائی تھیں...... وہاں سے اس کیس ہسٹری کا بہت اچھا رسپانس ملا ہے...... بہت پُرامید اور حوصلہ افزا جواب آیا ہے......'' تایا جی کے چہرے پر خوشی کی کیفیت نمایاں ہوگئی۔
''دیکھیں آپ نے یہی بتایا تھا ناں کہ بہت چھوٹی عمر سے ہی اس نے محرومی کا زہر پیا...... اس کے والدین کا ایکسیڈنٹ میں مرجانا اور دنیا والوں کا اسے منحوس قرار دینا...... اور پھر عمر کے ساتھ کوئی بھی mishap ہوجائے تو اس کا ذمے دار اسے ہی ٹھہرا دینا...... سوچیے ذرا...... جب کسی کو بار، بار یہ احساس دلایا جائے تو اس کے لیے یہ سب کتنی تکلیف دہ بات ہے......''
تایا جی کی نظروں میں تائی جی کا چہرہ گھوم گیا...... ان کے چہرے پہ تکلیف کے آثار آگئے۔
''اگر تکلیف دہ باتیں انسان کے لاشعور میں ہیں تو وہ انسان کے لیے تکلیف دہ ہوجاتی ہیں...... تو اس طرح کے واقعات اور باتیں، سوچیں، بچپن کے تلخ تجربے unconscious میں چلے جاتے ہیں...... مگر یہ تمام چیزیں مرنہیں جاتی ہیں...... دبتی بھی نہیں ...... بار، بار پریشان کرتی رہتی ہیں...... اور عمر کے ساتھ جب وہ لڑکی یا لڑکا بڑا ہوتا ہے اور اس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہوا تو اس کی بچپن کی یادداشت revive ہوجاتی ہے...... اس سے پہلے کہ وہ conscious level پہ pain محسوس کرتی...... وہ کومہ میں چلی گئی...... ڈاکٹر کی رپورٹ یہ بتاتی ہے......'' ڈاکٹر راحیل تفصیل سے بتا رہے تھے۔
''اس کومہ کی وجہ نہ فزیکل ہے اور نہ ہی نیورولوجیکل...... اس کی وجہ صرف اور صرف سائیکالوجیکل ہے...... اوکے......'' ڈاکٹر راحیل نے خاموش اور ساکت بیٹھے تایا جی سے پوچھا۔
''مگر وہ تو کومہ میں ہے...... بیٹا وہ ہوش میں تو آجائے گی ناں......'' تایا جی نے بے قراری سے پوچھا۔
''بالکل انکل...... بالکل...... نیورولوجسٹ نے سب کچھ examine کرلیا...... سب فزیکل causes رول آؤٹ ہوگئی ہیں...... اب ڈاکٹر کی ٹیم نے جب یہ نتیجہ نکالا کہ سائیکالوجیکل ٹریٹمنٹ کے ذریعے کامیاب علاج ہوسکتا ہے...... تو امریکا میں مقیم کامیاب سائیکوتھراپسٹ کو ساری رپورٹس بھیجی تھیں...... انہوں نے جو علاج suggest کیا ہے...... اس کی روشنی میں مسٹر اے مائیکل کی یہ رپورٹ ہے......''
ڈاکٹر راحیل نے سبز رنگ کی ایک اور فائل کھولتے ہوئے رپورٹ دکھائی۔
''ڈاکٹر مائیکل assume کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس وجہ سے کومہ ہے کہ وہ painful

experiences کے زیر اثر ہے...... لہٰذا یہاں کسی ایک شخص کی ضرورت ہے...... جو سائیکو اینالسٹ بھی ہوسکتا ہے...... مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا انسان بھی مریضہ کی سائیکوتھراپی کرسکتا ہے جو خود سراپا محبت ہو...... جو مریضہ کے پس منظر سے بھی بخوبی واقف ہو...... جس کا دل محبت کے جذبے سے بھرا ہوا ہو...... وہ اپنی محبت لڑکی کے خالی پیمانے میں ڈال سکتا ہے...... اس سے اس لڑکی کو self assurance ملے گی...... لڑکی کے تحت الشعور سے شعور تک یہ احساس پیدا ہوگا کہ وہ lovable ہے...... وہ زندہ ہے...... منحوس نہیں ہے...... تب وہ لڑکی کومہ سے واپس آسکتی ہے۔''

ڈاکٹر راحیل کی بات ختم ہوچکی تھی...... وہ اوپر نیچے رکھی فائل کے بے ترتیب صفحے ترتیب سے رکھ رہے تھے۔

''کیا وہ سائیکالوجسٹ یہاں نہیں آسکتا......''

''جی ان کا آنا مشکل ہے...... مگر جیسا میں نے کہا اس آدمی کو train کرسکتے ہیں...... مگر ہمیں وہ آدمی تلاش کرنا ہے...... جو محبتوں کے گلاب تقسیم کرتا ہو...... جو خوشگوار باتیں کرسکتا ہو...... اپنا وقت اس کے ساتھ بتادے...... اور اسے ہوش کی دنیا میں لے آئے...... یہ کوئی مشکل کام نہیں میں بہت پرامید ہوں...... ڈاکٹرز کے ساتھ اللہ کی رحمتیں شاملِ حال ہوتی ہیں......، وہ ضرور بھیجے گا کوئی مسیحا، کوئی فرشتہ مجھے امید ہے......'' وہ مان سے کہنے لگے...... اور برجستہ شعر پڑھا......

''نہیں اس میں کوئی منطق' ہے یقیں کی بات ساری
جہاں رکھا ہے پاؤں وہاں راستہ تو ہوگا''

''انشاء اللہ...... راستہ ملے گا......'' اعزاز شاہ نے گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تھا۔

تایا جی کو ان کے گھر تک چھوڑتے ہوئے وہ مسلسل اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے تھے جس کی شکل تک اعزاز شاہ نے نہیں دیکھی تھی...... مگر جو اُن کے حواسوں پہ سوار ہوتی جارہی تھی کہ جس کی کیس ہسٹری سے وہ کافی حد تک واقف ہوچکے تھے...... تایا جی کا تو اس انجانی لڑکی کے ساتھ خون کا رشتہ تھا...... مگر اعزاز کا دل کیوں بے چین تھا...... یہ انہیں کون سی بے قراری ہے جو قرار نہ دے رہی تھی...... وہ بے قراری لیے گھر پہنچے تو لاؤنج میں دیوار پہ نصب ایل ای ڈی کی وسیع اسکرین پر مسلمانوں کی ایک اور فتح کے تحت ایک خصوصی رپورٹ ریبال کے انٹرویو پہ مشتمل نشر ہورہی تھی...... آج کل مختلف چینلو کی وجہ سے یہ آسانی ہوگئی کہ دنیا بھر کی خاص، خاص خبریں پل بھر میں مل جاتی ہیں۔ ریبال سے زیادہ وہ نومسلم لڑکی بتارہی تھی کہ کس طرح ریبال کی شخصیت نے اسے متاثر کیا...... اس نے اسلام کا مطالعہ کیا...... قرآن کو ختم کیا...... ترجمہ پڑھا اور دوسرے ادیان کا بھی مطالعہ و مشاہدہ کیا مگر اسلام کی سچی معلومات اسے ریبال سے حاصل ہوئیں...... وہ ریبال کا بار، بار شکریہ ادا کررہی تھی کہ اس نے اس کی شخصیت کو بدل کررکھ دیا۔

رپورٹر ریبال سے بھی سوال کررہا تھا کہ اسے ایک غیر مسلم لڑکی کو مسلمان کرکے کیا محسوس ہورہا ہے۔

''کس طرح کے سوالات کرتے ہیں...... یہ رپورٹرز اب بیچارہ ریبال کیا کہے گا......؟''

اعزاز سوچ رہے تھے مگر ریبال بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔

''بھلا میں کیا محسوس کروں گا......؟ اچھی بات تو یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دل میں ہدایت کی روشنی ڈالی ہے...... میں تو ایک عام مسلمان ہوں...... میرے اللہ نے اگر یہ سعادت میرے حصے میں لکھ دی ہے تو میں اس کا شکرادا کرتے نہ تھکوں گا......'' وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا...... اعزاز نے غور سے دیکھا کیمرا اب جینی کو دکھا رہا تھا۔

حجاب میں قید اس کا چمکتا چہرہ اس کی اندرونی خوشی سے لبریز تھا...... وہ ریبال کو بات کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی...... کسی احساس، کسی آہٹ کے بنا وہ سب سے بے نیاز اسی کو دیکھے گئی...... اور چینلو اس کے چہرے کو زوم کرکے ذومعنی سرخیوں کے ساتھ اپنے چینل کی 'ریٹنگ' کو بڑھا بھی رہے تھے۔

''خدایا......'' ردا بیگم نے کہا...... ''اس بچے کی نیکی کواب یہ لوگ کس قدر spoil کریں گے......''

''ہاں یہ تو ہے...... یہی تو گڑبڑ ہے ہمارے ملک میں...... اب سوشل میڈیا پہ دیکھ لو...... ایک نئی بحث شروع ہوگئی ہے...... کہ اس نومسلم لڑکی نے ریبال کو حاصل کرنے کے لیے یہ ڈراما رچایا ہے......'' فیضان نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا...... وہ اپنے اسمارٹ فون کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''یا میرے خدایا...... معاف فرما......'' ردا بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''ریبال انہی نیک خاتون کا بیٹا ہے ناں......'' انہوں نے مہران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی انکل......'' اعزاز نے فوراً کہا۔

''ویسے 'خلقِ خدا کہتی ہے غائبانہ کیا'...... والی بات درست ہے فیضان...... کچھ تو ہے......؟''

''آپ بھی انکل......'' فیضان زچ ہوا۔

''بھئی لڑکا بھی دیکھو کس قدر قابلِ رشک ہے...... خوب صورت ہے...... شرافت ہے، تعلیم یافتہ ہے...... لڑکی کا اس پہ مرنا شرط ہے...... کیا کہتے ہو!''

''افوہ...... انکل......'' وہ ہنسنے لگا...... ''آپ تو اس طرح تعریف کے پل باندھ رہے ہیں جیسے مسٹر ریبال کو جانتے ہیں......''

''بالکل جانتا ہوں...... بلکہ اعزاز کا تو بہترین دوست ہے وہ...... پوچھ لو اعزاز سے...... کیوں اعزاز؟''

''ہاں میرا بہت اچھا دوست ہے...... انسان بھی بہت اچھا ہے...... بالکل میرے بھائیوں کی طرح ہے۔''

''واہ بھائی، آپ تو میرا حق مار رہے ہیں...... اصل بھائی تو میں ہوں آپ کا......'' وہ پوزیٹو ہو کے کہنے لگا...... انداز میں شکایت تھی...... رونے والا چہرہ بنایا۔

''بالکل شک نہیں ہے کہ تم میرے بھائی ہو...... میری جان ہو......'' اعزاز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر خود سے لگاتے ہوئے کہا...... ''مگر جب تم ریبال سے ملو گے تو اس کے گرویدہ ہو جاؤ گے......'' اعزاز نے اسے یقین دلایا۔

''اوکے، اچھا ہمیں انتظار ہے...... ریبال صاحب کا کہ کب ان کے دیدار ہوتے ہیں......'' اس کے اس طرح کہنے پہ ہلکے پھلکے قہقہوں سے ماحول میں رونق پیدا ہوگئی۔

اس خوشگوار فضا میں زوار شاہ کی کمی محسوس ہو رہی تھی...... وہ کہاں تھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

''آپ کو پتا ہے بھائی آپ کے دوست کے ہاتھوں جس لڑکی نے اسلام قبول کیا ہے اس کا نام ہے جہاں نور......'' فیضان کہہ رہا تھا...... ''یہ دیکھیں اسکرین پہ اس کا نام...... بلکہ اصلی نام جینی ہے...... واقعی آپ کے دوست نے کمال کر دیا ہے...... ڈنکا بج رہا ہے اس کا پورے سوشل میڈیا پر...... یہ دیکھیں ہزاروں لوگوں نے like کیا ہے...... اب یہ دیکھیں جہاں نور کی خوب صورتی پہ کمنٹس کیے جا رہے ہیں...... اُف کیا لوگ ہیں ہم......'' فیضان نے موبائل پر فیس بک، انسٹاگرام، واٹس ایپ آن کیا ہوا تھا...... جبکہ سامنے اسکرین پہ بار، بار جہاں نور اور ریبال کا نام ان کی تصویر کے ساتھ نمایاں کر کر کے دکھایا جا رہا تھا۔

''بہت خوش نصیب بچی ہے...... اس کی صورت دیکھو کس قدر نور ہے...... اس کے چہرے پر......'' ردا بیگم نے ریبال کو پسندیدگی سے دیکھا......

''والد کا تو نہیں پتا...... ہاں اس کی والدہ شاندار خاتون ہیں...... بے حد نفیس، خوددار اور سادگی کا پیکر......'' وہ ان کی تعریف میں بولے۔

''تم کیسے جانتے ہو......؟'' ردا بیگم چونک کر کہنے لگیں...... ''اس قدر تعریفیں......؟''

''میرے دوست کی امی ہیں...... اور میں بھی انہیں امی ہی کہتا ہوں...... انہوں نے مجھے بیٹا بنایا ہوا ہے۔''

جب ہی تو۔'' ردا بیگم کا لہجہ بدلا...... ''ورنہ تمہاری زبان پہلے کبھی اتنی نہ کھلی...... ایک غیر عورت کے لیے اتنی باتیں...... اور میرے لیے......؟''

''پلیز ممی...... وہ میرے لیے بہت قابلِ احترام

ہیں...... میں ایک لفظ اور نہیں سنوں گا......''

اعزاز نے بہت سختی کے ساتھ کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے...... اور اوپر سیڑھیاں طے کرتے ہوئے کمرے میں چلے گئے...... انہوں نے نظر اٹھا کر محبّ اللہ کو دیکھا۔

''بتائیں بھائی صاحب میں نے ایسا کیا کہا ہے...... آپ نے دیکھا کس طرح یہ میرے ساتھ بات کرتا ہے...... آخر میں اس کی ماں ہوں...... ذرا احساس نہیں......''

''اصل میں بھابی...... اب پرانی بات کو میں کیا دُہراؤں...... آپ تحمل سے ذرا میری بات سنیں...... جب آپ اس کو چھوڑ کر گئی تھیں تو اس کی عمر کیا تھی......؟ کتنا معصوم بچہ تھا وہ...... آپ نے انا کی جنگ میں اسے پلٹ کر نہیں دیکھا...... بعض دفعہ تو میں خود حیران ہوتا ہوں کہ آپ اس کے بغیر کیسے رہ گئیں......؟''

''وہ بھائی صاحب میں بہت غصے میں تھی...... زوار نے میرے ساتھ......'' وہ آگے بولتیں کہ انہوں نے بات کاٹ دی۔

''زوار نے کچھ بھی کیا ہو...... اس بچے کا کیا قصور تھا...... آپ ماں تھیں بھابی...... خود سوچیں...... غور کریں...... اس بچے نے تو آپ کے لمس کو محسوس کرنا ابھی شروع بھی نہیں کیا تھا...... چند ماہ کے بچے کو آپ نے تنہا چھوڑ دیا...... اس نے ابھی اپنا پہلا قدم بھی زمین پر نہ رکھا تھا...... آپ نے چھ سال اس کے بغیر کیسے گزار لیے...... حیرت ہے مجھے تو یقین نہیں آتا کہ آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں......؟ لیکن آپ نے ایسا کیا...... اپنے مفاد کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا...... ظاہر ہے پھر اس کو بھی حق ہے......؟''

''میں ماں ہوں اس کی......'' ردا بیگم چیخ کر بولیں...... ''آخر فیضان بھی تو ہے......''

''بھابی...... بھائی، فیضان کو آپ نے بھرپور توجہ دی ہے...... یہ بات یاد رکھیں......'' وہ بولے۔

''بہر حال ان خاتون کا اعزاز کی زندگی پہ احسان ہے مگر '' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے ردا بیگم کے چہرے کی رعونت کچھ کم ہوگئی تھی..... آنسو ان کے چہرے پہ گر رہے تھے.....

''آپ طریقے وسلیقے کے ساتھ اپنے بیٹے کو اپنا بنائیں..... اعزاز سے بہت لوگوں نے بہت محبت کی ہے..... اسے بہت پیار دیا ہے..... بہت خوش قسمت ہے اعزاز جب آپ اسے روتا بلکتا چھوڑ چلی گئیں تو قدرت نے اسے ایک ایسی خاتون کی گود میں دے دیا جو سراپا محبت تھی..... پیار تھی..... اس پیار نے اسے دیکھیں بکھرنے نہیں دیا..... ٹوٹنے نہیں دیا..... آپ جب لوٹ کر آئیں تو وہ پانچ سال کا تھا..... مگر اس نے کبھی آپ سے شکوہ نہیں کیا..... نفرت نہیں کی..... ہاں اجنبی سا ہوگیا..... اور پھر قدرت نے آپ کو فیضان سے نوازا تو اعزاز نے پلٹ کر یہ نہیں کہا کہ میرے لیے آپ نے محبت کا کونا کیوں خالی رکھا.....؟ وہ فیضان سے کس قدر محبت کرتا ہے..... آپ جانتی ہیں ناں بھابی..... پھر ستم در ستم آپ نے زوار شاہ سے زبردستی کروا کروا نیہ سے اس کی شادی کرادی..... یہ ایک اور ظلم کیا آپ نے..... اگر میں یہاں ہوتا تو یہ شادی کبھی نہ ہونے دیتا..... خیر..... وہ تو واپس چلی گئی ہے..... اچھا ہے اسے عقل تو آئی..... معاف کیجیے بھائی میرا لیکچر بہت لمبا ہوگیا ہے.....'' انہوں نے ردا بیگم کی طرف دیکھا۔

جواب میں انہوں نے الٹا سوال کردیا کہ محب اللہ ورطۂ حیرت میں پڑ گئے..... ''ان خاتون کا نام کیا ہے بھائی صاحب.....؟''

''کیوں تمہیں ان خاتون سے کیا لینا دینا..... گڑے مردے کیوں اکھیڑ رہی ہو..... اب وقت گزر چکا ہے.....'' زوار شاہ فوراً بولے۔

یک دم خاموشی چھا گئی..... ردا بیگم کی بولتی بند ہوگئی تھی..... محب اللہ جانتے تھے کہ اگر زوار شاہ نے اس معاملے میں بولنا شروع کیا تو نتائج بڑے سنگین ہوجائیں گے..... محب اللہ نے ردا بیگم کو اشارے سے خاموش کرایا..... وہ مصلحتاً چپ ہو کر جذباتی انداز میں اٹھیں..... اور اوپر اپنے کمرے کی طرف جانے والی سیڑھیوں پہ قدم رکھتی ہوئی چلی گئیں۔

''اس نے پھر مسئلہ اٹھایا ہے ناں..... یہ کبھی نہیں سمجھے گی.....'' زوار شاہ نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

''کم آن یار..... طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے..... سب ٹھیک ہوجائے گا..... ڈونٹ وری.....''

محب اللہ نے انہیں غور سے دیکھا..... زوار شاہ کے چہرے پہ تھکن اور شکستگی کے آثار تھے..... جیسے اپنے آپ سے مستقل جنگ کررہے ہوں۔

''کیا ہوا زوار.....؟'' محب اللہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار..... بس دل بوجھل سا رہتا ہے..... جانے کیا مسئلہ ہے.....'' انہوں نے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''تم ابھی کہاں گئے تھے.....؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''ڈاکٹر سرفراز کے پاس.....''

''تو.....؟'' وہ یک دم تڑپ کر سیدھے ہو گئے..... زوار ان کو دیکھ کر مسکرائے۔

''تو یہ کہ بہت سارے ٹیسٹ لکھ کر دے دیے ہیں سو صبح کروانے ہیں..... پریشانی کی بات نہیں ہے.....''

''خوش رہو میرے دوست، ویسے ایک بات کہوں.....'' محب اللہ نے بہت نرمی سے پوچھا۔

''ہاں کہو.....'' وہ بھی اسی انداز میں گویا ہوئے۔

''کیا..... ماضی کی کوئی یاد پریشان کررہی ہے؟''

زوار شاہ نے بہت زخمی نظروں سے ان کی طرف دیکھا..... ''یاد کب پریشان نہیں کرتی..... وہ بھولی ہی کب ہے.....؟'' وہ بڑبڑائے..... محب اللہ نے اس ایک لمحے میں بہت کچھ سمجھ لیا۔

''سنو بہت سی یادوں کو آباد کرکے دل کا بوجھ باہر نکال سکتے ہو..... خود کو ہلکا، پھلکا کرلو..... زمانہ ابھی اتنا بے اعتبار بھی نہیں..... کوئی حل، کوئی تدبیر کرتے

ہیں یار......

سارے جھگڑے ہیں یہاں تقدیر کے
ہے کسی تدبیر کا چلنا عبث"

"معلوم ہے تم احتیاط سے کام لے رہے ہو...... کیا فائدہ ہے اب اسے یاد کرنے کا، اسے تو میں تقدیر کا لکھا سمجھتا ہوں...... ایسا ہونا تھا...... میں نے کاغذ پہ سمندر بنا دیا تھا...... مگر ہوا نے آتے ہی وہ ندی میں بہا دیا تھا......" وہ افسردگی سے بولے۔

تیز بارش کی آواز اچانک محسوس ہونے لگی...... لاؤنج کی کھڑکی سے باہر سرمئی شام کا عکس نمایاں ہو رہا تھا...... زوار شاہ کے آنسوؤں کو بارش کی زبان مل گئی تھی...... وہ یک دم کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے اور بارش میں آنکھوں کی نمی چھپانے لگے...... محبّ اللہ کی آواز ان کے کانوں میں گونجی۔

"تم نے مہرو بھابی کو کچھ کہنے کا موقع دیا ہوتا...... تم نے صرف ان آوازوں پر کان دھرے جو تمہارے سامنے تھیں...... ایک موقع دیتے، کسی کی سنتے...... اپنے بیٹے کو بھی کبھی نہیں دیکھا...... اپنا محاسبہ بھی کرتے یار......" وہ دھیرے، دھیرے سمجھانے لگے۔

"پلیز محبّ...... بس کردو...... میری یادوں کو بھیگتے رہنے دو...... مجھے کچھ نہیں سننا پلیز......" وہ بالکل چپ چاپ کھڑے برستی بارش کو دیکھ رہے تھے۔

محبّ اللہ افسردگی سے انہیں دیکھتے ہوئے سوچتے رہے...... "زوار شاہ کیا سے کیا ہوگئے تھے...... کاش اپنا محاسبہ کرتے......"

اور اس لمحے جب بارش ہر شے پر برس رہی تھی...... مہر النسا بھی بارش کے موسم میں اداس بیٹھی تھیں...... چھاجوں مینہ برس رہا تھا...... باہر محلے کے بچوں کی آواز میں خوشی نمایاں ہوگئی تھی...... ابھی تھوڑی دیر پہلے ریبال سے فون پر بات ہوئی تھی...... محلے پڑوس نے ریبال کو ٹی وی چینل پر دیکھا تھا...... ہر کوئی اس کے کارنامے پر مہرو کو مبارک باد دے رہا تھا......

انہیں اپنی تربیت پر ناز تھا اور جب ریبال نے سارا قصہ سنایا تو انہیں اس لڑکی پہ بہت پیار آیا...... جو مظلوم تھی اور کردار کی مضبوط، ان کے بیٹے کے کردار کو دیکھتے ہوئے اس نے اسلام قبول کیا تھا......

"یا اللہ...... میرے ریبال کو نظرِ بد سے بچانا اور اسے عروج عطا کرنا......" بے اختیار ان کا جی چاہنے لگا کہ ریبال ان کے پاس آجائے...... وہ ماضی کی یادوں کو بھلانا چاہتی تھیں...... اس چہرے کے خدوخال سے چھٹکارا چاہتی تھیں جو ملتے ہی بچھڑ گیا تھا...... ان کے دل کا درد موسلا دھار بارش میں ویرانیٔ دل بنا ہوا تھا...... یہی تو موسم تھا جو سب کچھ بہا کر لے گیا تھا......

ان کا چاہنے والا شوہر...... سوکھی مہندی کی خوشبوؤں سے سجی زندگی، پھولوں سے، دھنک رنگوں سے، بارشوں میں کھیلتے ہوئے زندگی سے لطف اندوز دل...... پتا ہی نہیں چلا کہ کب خوابوں کا آئینہ کرچی، کرچی ہو کر بکھر گیا تھا...... کب اس کے خواب کے تسلسل میں دراڑیں پڑ گئی تھیں......

خواب سے حقیقت کا سفر عام ہو گیا تھا......

کیا واقعی وہ بدکردار تھی......

اُف...... وہ سوچ بھی کیسے سکتا تھا......

نہیں...... اس نے سوچا...... اور عمل بھی کیا...... مہر النسا سوال جواب کے کٹہرے میں کھڑی تھی......

"تمہیں خود سے جدا کر دیا......"

وہ گیلی لکڑی کی طرح سسک، سسک کر رونے لگیں...... کتنے آنسوان کے اندر رکے ہوئے تھے......

وہ باکردار ہو کر بھی بے کردار تھیں...... خون کے رشتے ایسے ہوتے ہیں......

"اُف...... میری اماں اسی صدمے سے مر گئیں...... اور میں صرف خشک آنسوؤں کے ساتھ سب دیکھتی رہی...... تم تو کہتے تھے میرے کردار کی بلندی دیکھ کر مجھے شریکِ حیات بنایا ہے...... کیا یہ تھے وہ تمہارے اقرار، وہ عہد کہ زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑو گے...... میرا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی باپ سے

محبت تو کیا اس کی شکل بھی نہ دیکھ سکا مگر......'' انہوں نے جیسے خود کو سنبھالا۔

''میرا بیٹا کردار اور حُسنِ عمل سے مالا مال ہے......آج پوری دنیائے اسلام میں اس کے نام کے سب معترف ہیں...... اس نے اسلامی تعلیمات کے ذریعے ایک لڑکی کو دائرۂ اسلام میں داخل کرلیا ہے...... اس سے بڑی کوئی اور بات کیا ہوسکتی ہے......'' وہ آسودگی سے مسکرائیں۔

''مجھے اللہ کے انصاف کا انتظار ہے...... میری ماں نے مرتے وقت کہا تھا......وقت تمہارے کردار کی گواہی دے گا مہرو...... ذرا صبر کرو...... سب کے چہرے سامنے آجائیں گے......''

ماں کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی...... اور اسی گونج میں انہیں زینب کا خیال آیا۔

''میری ماں جائی ہے......اور زندگی بھر سے دشمنی کرتی چلی آرہی ہے......کبھی چین سے رہنے نہ دیا...... اور جب ریبال چلا گیا ہے تو پلٹ کر نہ دیکھا...... پتا نہیں کس نئی سازش کی تیاری میں ہے......''

باہر بارش تھم چکی تھی...... صحن کے اطراف میں ڈھلان سے اوپر پانی کچے میں جمع ہو چکا تھا......وہ من روکے......آنسوؤں کو دل میں دفنائے زخمی وجود کے ساتھ پانی نکالنے کے لیے صحن کی طرف چل دیں......اب آسمان بالکل خاموش تھا......بجلی کی چمک تھوڑی، تھوڑی دیر بعد اپنا احساس دلا رہی تھی......وائپر سے پانی نکالتے ہوئے اچانک زور سے بجلی کڑکنے کی آواز آئی تو وہ سہم کر اپنی جگہ پر بیٹھتی چلی گئیں۔

''الٰہی خیر...... کس غریب کے آشیانے پہ گری ہے یہ بجلی......رحم کر......میرے مالک......'' وہ دعا مانگنے لگیں اور رات بھر ہلکی، ہلکی بوندا باندی کے ساتھ سفر طے کرتی رہی۔

☆......☆......☆

جو جستجو کروں یہ راز پا بھی سکتا ہوں
میں کائنات سے پردہ اٹھا بھی سکتا ہوں

نہ کوئی زائچہ کھینچوں نہ دیکھوں ہاتھ تیرا
میں تیرے بارے میں سب کچھ بتا بھی سکتا ہوں

اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا......محب اللہ کا پورا شجرہ اس کے سامنے تھا......وہ ایک نئی چال پہ کام کررہی تھی...... روزی نے مسکراتے ہوئے شاطرانہ انداز میں ان کی بنیادی باتوں کو دیکھا، سوچا، لکھا اور پھر ان کے نام ای میل ٹائپ کرنے لگی۔

''مزہ تو اب آئے گا......'' وہ تلخی سے مسکرائی......

''بہت شریف بنتے ہو مسٹر......تم روزی کی چھتری کے نیچے آکر ہی سانس لوگے......اور پھر ایک ایک سانس کا حساب میں لوں گی......''

پھر اس نے ایک پروفائل (profile) میں جاکر ایک تصویر کو اسکین کیا......ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ محب اللہ اور زوار شاہ نمایاں تھے...... وہ مسکراتی لڑکی روزی کے دل و دماغ میں بسی تھی۔

''نہیں چھوڑوں گی تم لوگوں کو...... یاد کروگے...... برباد کردوں گی...... روزی نے کسی کو معاف نہیں کیا آج تک......کوئی نہیں بچا میرے وار سے......'' زندگی کے کسی موسم سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی......وہ صرف اپنے دل اور دماغ کے موسم کو سنتی تھی......اور اب بھی وہ اپنے ذہن کے کشکول سے تمام راز باہر نکالتی جارہی تھی......اور یہ طے تھا اس بار وہ بہت تیاری میں تھی......

☆......☆......☆

وہ رات کے اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹا جانے کیا سوچ رہا تھا......بکھری ہوئی سوچیں تھیں جب واٹس ایپ پر میسج کی ٹون نے اسے بکھری سوچوں سے جگا دیا......

''یار اعزاز میری کلاس فیلو ہے...... بہت دنوں سے اس کا کوئی پتا نہیں ہے...... وہ میری بہت اچھی دوست ہے......نہ اس کا فون پک ہو رہا ہے......نہ اس کے گھر کا نمبر...... یار تم پلیز اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو...... میں بہت فکر مند ہوں......''

''کیا وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے......؟''
انہوں نے میسج ٹائپ کیا......

''ہاں بس یونہی سمجھ لو......'' جواب کچھ لمحوں میں اسکرین پہ جگمگانے لگا......

''او کے......ایڈریس سینڈ کرو......''

''اس کا نام تو لکھو......''

''تشمیرہ......''

''کشمیرہ......'' وہ اسپیلنگ کی غلطی سے وہ کشمیرہ ہو گیا......نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا......

''او کے......میں کرتا ہوں......ڈونٹ وری......''

انہیں ایڈریس مل چکا تھا۔

''او کے...... کل دیکھوں گا......'' ریبال کی پریشانی اب ان کی پریشانی بن گئی تھی......

☆......☆......☆

اگلے دن سورج بڑی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا......

بارش کے آثار دور، دور تک نہ تھے...... ہر شے پہ خشکی تھی...... کسی چیز کو دیکھ کر احساس ہی نہ ہوتا تھا بارش نے ہر گوشے کو بھگو دیا تھا......ریبال کے کام کے سلسلے میں وہ مطلوبہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے...... ابھی وہ راستے میں تھے۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستے... غزل تائم گاڑی میں گونج رہا تھا......وہ مکمل طور پر اس غزل کے سحر میں ڈوب کر گاڑی چلا رہے تھے......تب ہی ان کا موبائل بج اٹھا۔

Dr, Raheel Calling......خیریت......وہ سوچنے لگے۔

''جی ڈاکٹر راحیل کیا ہوا......؟''

''فوراً آپ سے ملنا ہے......''

''ہم تو کل ہی ملے تھے...... بہت جلدی میری یاد آ گئی......''

''ارے یار......تمہاری شدید ضرورت ہے...... تم فوراً میرے پاس آ جاؤ......''

''خیریت......!'' وہ واقعی حیرت زدہ تھے۔

''ہاں خیریت...... مگر تم فوراً آ جاؤ...... ورنہ خیریت نہ ہوگی......'' ڈاکٹر راحیل نے دھمکی دی......

''او کے......''

موبائل کو سائڈ میں رکھتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے کہ اب واپسی پر کشمیرہ نامی لڑکی کے ایڈریس پہ جاؤں گا...... یہ سوچ کر اعزاز نے گاڑی کو ڈاکٹر راحیل کے اسپتال کی جانب موڑ دیا......سلمان علوی کا میوزیکل ٹریک اونچے سُروں میں بج رہا تھا......'میری تنہائی پر مسکراتے رہے......اجنبی شہر کے اجنبی راستے......

☆......☆......☆

جھوٹ ہیں سارے ڈر
سب سے بڑا سچ دنیا میں
اللہ اکبر!

وہ جیسے ہی اس کے گھر میں داخل ہوا......اس کی نظر سامنے دیوار پر لگے بڑے سے فریم پہ پڑی...... جس پہ کندہ الفاظ نے اسے حیرت زدہ کر دیا......

''اے اللہ......اپنی محبت کو میرے لیے ہر چیز کی محبت سے بڑھا دے......مجھ میں اپنا خوف ہر چیز کے خوف سے زیادہ کر دے...... دنیا کی طلب پر اپنی ملاقات کا شوق غالب کر دے...... اور جب تو دنیا والوں کو ان کی دنیا سے ٹھنڈک دے تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک اپنی عبادت میں رکھ دے......آمین......!''

اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد وہ پہلی بار اس کے اپارٹمنٹ میں آیا تھا......

''السلام علیکم......! آپ یہ جوس لیں......''

ریبال نے پلٹ کر دیکھا...... بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹے وہ جہاں نور تھی......جو بالکل مختلف لگ رہی تھی......وہ کچھ لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا......چہرے پہ اس کے ایک نیا رنگ تھا اور مسکراہٹ میں سکون تھا......وہ گھونٹ، گھونٹ جوس پی کر اٹھ کھڑا ہو گیا۔

''آپ ابھی نہیں جا سکتے......'' وہ یک دم سامنے آ گئی۔

''کیوں......؟'' وہ حیران ہو گیا۔

’’اس لیے کہ میں نے آپ کے لیے کھانا بنایا ہے......‘‘
’’لیکن......‘‘ وہ گھبرا کے بولا۔
’’میں نے پہلی بار آپ کو بلایا ہے......اور آپ میرے ہاتھ کا کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے......‘‘
’’اوکے......‘‘ اس نے اپنی ہار تسلیم کرتے ہوئے کہا......

وہ اسے پندرہ منٹ کا کہہ کر چلی گئی...... وہ اطراف کا جائزہ لینے لگا......

ایک طرف بک شیلف کارنر بنا ہوا تھا......قرآن پاک خوب صورت کور اور رحل کے ساتھ رکھا ہوا تھا...... تمام اسلامی کتب کے ساتھ انجیل اور زبور کے کلام بھی رکھے تھے...... وہ یونہی کتب کا مطالعہ کرتے ہوئے پیچھے مڑا اور بریانی کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی......

’’کھانا لگا دیا ہے آجائیں......‘‘ وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔

’’جی بالکل...... پاکستانی کھانوں کا ذائقہ آپ کو ملے گا...... میٹھے میں شیر خرما ہے...... کیونکہ ابھی عید گزری ہے......‘‘

’’آپ آجائیں پلیز......کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے...... اور مجھے پتا ہے پاکستانی مرد ٹھنڈا کھانا نہیں کھاتے......‘‘

’’اوہ......اتنی معلومات......‘‘ وہ ہنسنے لگا۔

’’آپ کھانا کھا کر بتایئے گا کیسا بنا ہے......؟‘‘ وہ اشتیاق بھرے لہجے میں بولی۔

بہت نفاست سے اس نے کھانا لگایا تھا......لوکی کا رائتہ اور سلاد بھی میز پر سجا ہوا تھا۔

بسم اللہ کہہ کر اس نے ریبال کے لیے پلیٹ میں بریانی نکالی...... رائتہ اور سلاد کا ڈونگا اس کی طرف بڑھایا...... ریبال نے چمچہ اور کانٹے کو ایک طرف رکھا اور ہاتھ سے کھانے لگا۔

’’بخدا...... بہت اچھی بنائی ہے...... بالکل یوں لگ رہا ہے...... جیسے میری امی سے سیکھی ہو آپ نے...... مزہ آگیا......‘‘ وہ صاف گوئی سے تعریف کرنے لگا۔

’’جی شکریہ!‘‘ وہ شرما سی گئی۔

’’میٹھا بھی تو لیں......‘‘ کھانے کے بعد جہاں نور نے خوش ہو کر میٹھے کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔

’’ضرور......‘‘ وہ شیر خرما پیالے میں نکال کر چمچے سے کھانے لگا......

’’واہ جینی......میرا مطلب ہے جہاں نور تمہیں کیسے پتا کہ یہ سب ہمارے ہاں بنتا ہے......‘‘ وہ حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔

’’سب معلومات حاصل کی ہیں میں نے...... اب میں مسلمان ہوں......میری قدر کیجیے......اور سنیے یہ عید الفطر کا اہتمام تھا......اب آپ کو مجھے عیدی بھی دینی ہے۔‘‘

’’جی...... عیدی...... کیا مطلب......؟‘‘ وہ حیران ہوا۔

’’جی عیدی......‘‘ وہ مان سے اپنا ہاتھ پھیلا کر بولی...... اس نے دیکھا اس کے ہاتھ میں مہندی کے خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے...... اور چوڑیاں بھی اس نے پہنی تھیں۔

’’دیں ناں......‘‘

اور اس نے جرمن مارک کا بڑا نوٹ نکال کے اس کے ہاتھ پہ رکھا تو جہاں نور نے اسے خوش ہو کر سلام کیا......

اس کے انداز میں کیا تھا......؟
اس کے حنائی ہاتھوں کی خوب صورتی......
اور...... بہت کچھ اس کے اندر سوال اٹھنے لگے......

وہ جب وہاں سے رخصت ہوا ہے......تو جرمنی کے خوب صورت موسم کے ساتھ، ساتھ جہاں نور کے پیغامات اسے کچھ نیا سندیسہ دے رہے تھے......وہ ان موسموں سے جی چراتا......صرف تشمیرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا...... جو اس کے دماغ میں آکر بسی ہوئی تھی...... وہ کسی مصیبت میں تھی...... اور اسے تا حال اس کی خبر نہ تھی......

(باقی آئندہ)



گولڈن اسٹار

طیبہ عنصر مغل

''ماما دیکھیں ٹیچر نے میرے گال پہ گولڈن اسٹار بنایا ہے۔'' ننھے عزیر نے خوشی سے اپنا گال ماں کو دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا بیٹا جانی ابھی دیکھتی ہوں۔'' ارمین جو فون پر اپنی دوست سے گپ شپ میں کافی دیر سے مصروف تھی...... عزیر کو ٹال دیا۔

''نہیں، مجھے نہیں پتا ممی آپ کو اسی وقت میرا اسٹار دیکھنا ہوگا تھوڑی دیر بعد تو یہ مٹ جائے گا ناں۔''

عزیر نے ضدی لہجے میں کہہ کر ماں کا چہرہ اپنی طرف گھمانے کی کوشش کی۔

''بہت ضدی ہو گئے ہو تم عزیر...... لاؤ دکھاؤ کہاں ملا تمہیں اسٹار......'' ارمین نے جھنجلاتے ہوئے سرسری طور پر ایک نظر اس پر ڈالی۔ ''اوہ...... ماشاء اللہ! میرے بیٹے کو اسکول سے اسٹار ملا گیا...... واہ...... یقیناً آپ نے اچھا سا ٹیسٹ دیا ہوگا تبھی تو اسٹار ملا گیا میرے گولو کو۔'' اس نے عزیر کے چہرے کو سرسری سا دیکھ کر گال کا بوسہ لیا اور دوبارہ سے فون پر گپ شپ میں لگ گئی۔

''ممی آپ نے تو میری پوری بات سنی بھی نہیں...... یہ مجھے ٹیسٹ کی وجہ سے نہیں ملا بلکہ یہ مجھے میرے ٹیچر نے پیار سے دیا ہے وہ کہتی ہیں میں بہت اچھا بچہ ہوں سب سے اچھا والا بچہ...... ٹیچر مجھے روزانہ کہتی ہیں۔'' ارمین کی توجہ عزیر کی باتوں پہ کب تھی' وہ تو اپنی سہیلی سے کل کی ون ڈش پارٹی کا پروگرام طے کر رہی تھی لیکن عزیر اسے تنگ نہ کرے'' اوں...... ہوں'' کہہ، کہہ کر ساتھ عزیر کو بھی مطمئن کر رہی تھی کہ جیسے وہ اس کی بات سن رہی ہے۔ وہ اب کوئی نرسری کلاس کا بچہ نہیں تھا، وہ کلاس فورتھ کا طالب علم تھا۔ آٹھ سال کا بے حد خوب صورت بچہ تھا۔ اس کے اسکول کی سب سے خوب صورت ذہین اور ویل ڈریسڈ فیشن ایبل ٹیچر مس صائمہ طارق اس کی کلاس ٹیچر تھیں جو.... بے حد نفاست پسند ٹیچر تھیں اور جو بھی کلاس لیتی ان بچوں کی سب سے پسندیدہ ٹیچر بن جاتی تھیں۔ پورا اسکول ان کا گرویدہ تھا اور عزیر کو تو وہ بہت خصوصی توجہ دیتی تھیں کہ وہ بچہ تھا ہی اتنا پیارا...... خوب صورت اور ذہین بچہ اور جب وہ مس صائمہ کی ساری باتیں تابعداری سے مانتا تو صائمہ کو اس پر بے حد پیار آ جاتا اکثر وہ اس کے منہ پر اسٹار بنا دیتی تھیں اور اس کے گال چوم لیتیں اور عزیر پھولے نہ سماتا۔

☆☆☆

''رئیس جی، کتنی بار کہا ہے کہ آپ یہ چونچلے میرے ساتھ اب عزیر کے سامنے مت کیا کریں۔'' ارمین نے اپنے شوہر کے والہانہ محبت کے مظاہروں پر چڑ کر کہا۔ اس وقت وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

عزیر قالین پر بیٹھا ہوا تھا اور رئیس احمد جو انگلش مووی دیکھ رہے تھے اس پر چلتی فلم سے دھیان ہٹا کر وہ اپنے پاس صوفے پر بیٹھی ارمین کو پیار سے چھیڑنے لگے تو ارمین کو اسے دھیان دلانا پڑا کہ ان کا بیٹا بھی وہیں موجود ہے۔ عزیر جو بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا، اس کی توجہ پاپا پر بھی تھی۔ لیکن جن باتوں پر ارمین شوہر کو منع کر رہی تھی وہ اگرچہ جائز تھیں لیکن اسے اس بات کا دھیان نہ رہا کہ وہ شوہر کو یہ بات اشارے کنایے میں باور کروا دیتی تو زیادہ اچھا تھا کیونکہ اب ان کا بیٹا چھوٹا سا بچہ نہیں تھا بلکہ سکستھ کلاس کا طالب علم تھا اور سمجھی اور ناسمجھی کے درمیان کی خطرناک عمر میں تھا۔ ارمین، رئیس کے ساتھ بحث میں الجھی ہوئی تھی۔ اور جہاں ان دونوں کا لفظ، لفظ عزیر کو سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہیں ٹی، وی پر رئیس کی لگائی انگلش مووی میں وہ کچھ چل رہا تھا جو عزیر کے دیکھنے کے قابل ہرگز نہیں تھا۔ مگر وہ اب مکمل انہماک سے ٹی وی پر چلتے سین میں کھو گیا تھا۔ اپنے جھگڑے میں دونوں ماں، باپ بے خبر تھے کہ جو رومانس ان کو بیڈ روم میں زیب دیتا اسے وہ لاؤنج میں لے آئے تھے۔ اس بات سے وہ بے پروا تھے کہ ان کے رومینس سے کئی زیادہ خطرناک وہ مووی تھی جو اس وقت ٹی وی لاؤنج میں موجود ان کے ٹی وی پر چل رہی تھی۔

☆☆☆

''ارے واہ......! کتنے کیوٹ لگ رہے ہو آپ عزیر صاحب! آج تو آپ ایک دم ینگ مین لگ رہے ہیں۔ اب تو آپ کا قد بھی مجھ سے بڑھ گیا ہے بھئی!'' میم صائمہ..... نے دوستوں کی سی بے تکلفی سے عزیر کے پیٹ میں ایک ہلکا سا مکا لگایا اور پھر پیار سے ان کی ناک کو دبایا۔ عزیر کو میم صائمہ کا چھونا آج بہت الگ سا لگا...... اور اس کا جی چاہا کہ میم صائمہ اس کو پھر سے ویسے ہی پیار کریں۔ آج اسکول میں سالانہ فنکشن

تھا اور تمام بچے یونیفارم کے بجائے اپنی پسند کے کپڑوں میں اسکول آئے تھے......عزیر نے بھی اپنے لیے بہترین لباس کا انتخاب کیا تھا۔ بلیک پینٹ اور بلیک لیدر جیکٹ میں اس کا قد بارہ سالہ بچے کا نہیں بلکہ ایک نوجوان جیسا لگ رہا تھا۔ تمام فنکشن کے دوران اس کی نظریں میم صائمہ ہی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ تو عام دنوں میں بھی بہت نک سک سے تیار ہو کر اسکول آتی تھیں لیکن آج تو بلیک لباس میں غضب ڈھا رہی تھیں۔ لگتا تھا تیار بھی پارلر سے ہوئی تھیں...... بہت تیز اور منفرد میک اپ اور بالوں کا انوکھا اسٹائل دوسری ٹیچرز سے انہیں منفرد بتا رہا تھا......اور پتا نہیں کون سا پرفیوم تھا جس کا انہوں نے استعمال کیا تھا، ان کی آمد کے ساتھ اس کی خوشبو سارے ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔

عزیر جس اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا وہ ایک نجی اسکول تھا اور یہاں کم عمر لڑکیوں کو بھی اسکول والے تعینات کر لیتے تھے۔ ان کی تعلیم زیادہ تر میٹرک یا انٹر ہوتی تھی مگر ان کی اسپوکن انگلش اور ظاہری روپ کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر اساتذہ چونکہ کم عمر ہوتی تھیں تو ٹیچرز اور بچوں کے درمیان جنریشن گیپ بھی بہت کم ہوتا تھا۔ اور اساتذہ کو بچوں سے کتنا گھلنا ملنا ہے اور کہاں فاصلہ رکھنا ہے ان ناتجربے کار ٹیچرز کو خود اس بات کا علم و ادراک نہیں تھا۔ اسکول والوں کو تو ان کم تعلیم یافتہ اور ناتجربہ کار ٹیچرز کو زیادہ تنخواہ نہیں دینی پڑتی تھی۔ اس لیے ان کے لیے تو یہ معمول کی کارروائی تھی۔

''عزیر تم نے دوستوں کے ساتھ کھیلنا اور میرے ساتھ اسکول کی باتیں کرنا بھی بند کر دیا ہے بیٹا۔ مجھے بتاؤ ناں کہ اب آپ کے اسکول میں آپ کی اور کیا، کیا سرگرمیاں ہیں۔ اسکول اور تمہارے دوست وغیرہ کیسے ہیں۔'' ارمین نے تشویش بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''ممی کچھ خاص نہیں......سب ویسا ہی ہے جیسا ہمیشہ سے تھا۔'' عزیر جو لیپ ٹاپ کھولے میم صائمہ سے چیٹنگ میں مصروف تھا اسے ماں کی مداخلت

ناگوار گزری۔
''ایک تو اس کمپیوٹر نامی بلا نے بچوں کو والدین سے بالکل ہی دور کر دیا ہے۔ رئیس بھی ناں جو تم کہتے ہو جھٹ سے پورا کر دیتے ہیں۔'' ڈیسک ٹاپ جو لاؤنج میں رکھا تھا تو ارمین آتے جاتے اس پر نظر ڈال لیتی تھی کہ اسکرین پر کیا چل رہا اور وہ اس وقت کس کام میں مصروف ہے۔
مگر، اب تو پاپا نے جب سے اس کو لیپ ٹاپ لا کر دیا تھا تو وہ اپنے کمرے میں ہی گھسا رہتا تھا اور فون کی سہولت وہ الگ تھی۔ جب چاہتا وہ اس ایڈوانس ٹیکنالوجی والے فون پر نیٹ کھول لیتا تھا۔
''یار ہر بات میں بچے کو روک ٹوک مت کیا کرو...... اب اس کی عمر ایسی ہے کہ وہ بگڑ بھی سکتا ہے۔'' رئیس نے فریش ہو کر واش روم سے نکلتے ہوئے اسے تنبیہ کی۔
دراصل رئیس تو دیر سے گھر آتے تھے۔ ارمین جو پہلے بے پروا تھی۔ اب عزیر کی جانب سے فکر مند رہنے لگی تھی۔ اب بھی وہ تھوڑی دیر پہلے جب عزیر کے کمرے میں دودھ لے کر گئی تو وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید وہ سو چکا تھا اور بند لائٹ کو دیکھ کر وہ واپس پلٹنے ہی لگی تھی کہ اس کی نظر رضائی میں منہ گھسا کے سوتے بنے عزیر پر پڑی۔ بظاہر تو لگ رہا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ لیکن رضائی میں سے چھن، چھن کر آتی سیل فون کی روشنی سے اس کو اندازہ ہوا کہ عزیر سو نہیں رہا بلکہ وہ اپنے موبائل فون پر مصروف ہے۔ وہ آگے بڑھی اور ایک جھٹکے سے رضائی اس پر سے ہٹائی۔
''تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ہمیں بے وقوف بنا لو گے اور ہم بن جائیں گے۔'' اس نے فون اس سے لینا چاہا تو عزیر نے جلدی سے موبائل والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور جلدی اس کو بند کر دیا۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے عزیر......'' وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔
''آپ جائیں اپنی دوستوں سے گپ شپ کریں یا پاپا کے ساتھ مل کر کوئی مووی دیکھیں۔ میں آپ کی عمر کا تو نہیں ہوں کہ میری دلچسپیاں آپ جیسی ہوں۔'' وہ بدتمیزی سے بھرے لہجے میں بولا۔
''میں تمہیں تھپڑ بھی لگا سکتی ہوں اور تمہاری شکایت تمہارے پاپا سے بھی کروں گی۔'' ارمین نے صدمے بھرے لہجے میں کہا۔
'' تو جائیں کردیں شکایت مجھے پروا نہیں...... میں پڑھائی میں اچھا ہوں اور پاپا نے خود یہ چیزیں مجھے میری ذہانت پہ گفٹ کی ہیں۔''
''یا اللہ! میں کیا کروں کہ تم پہلے جیسے عزیر بن جاؤ......'' ارمین سر پکڑ کے وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔
''ایک بات کہوں ممی آپ اگر میم صائمہ جیسی ہوتیں تو کتنی مختلف ہوتیں اور کتنا اچھا ہوتا۔'' عزیر نے طنزیہ لہجے میں اس کے کانوں میں زہر گھولا تو اسے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔
جب بھی عزیر اس قسم کی بات کرتا تو ارمین کا سر گھوم جاتا۔ اب تو پچھلے دو سالوں سے وہ ہر بات کے درمیان اپنی ٹیچر کو لے آتا اور تو اور وہ ماں کی شخصیت کے ساتھ صائمہ ٹیچر کی شخصیت کا موازنہ کرتا تھا۔
''ممی آپ میم صائمہ سے ملیں کتنی کول (cool) ہیں وہ...... ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں۔'' گویا وہ ان کے سحر میں کھو سا جاتا۔ ''پتا ہے جب وہ بات کرتی ہیں ناں تو ان کی آواز بہت میٹھی ہوتی ہے۔ آپ کو تو ان کی طرح تیار ہونا بھی نہیں آتا۔ وہ اتنی اچھی طرح تیار ہوتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔''
شروع، شروع میں ارمین ہنس کر ٹالتی رہی اور ایک دوبارہ میم صائمہ سے ملنے اسکول بھی گئی۔ اسے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ دونوں بار وہ فل میک اپ اور چھوٹی سی فٹنگ والی قمیص اور ٹانگوں کے ساتھ چپکے ہوئے پاجامے میں بے ہودہ فیشن کی تشہیری ماڈل لگ رہی تھی۔ ارمین پر ایک ٹیچر کی حیثیت سے ان کا کوئی اچھا امپریشن نہیں پڑا تھا۔ اس نے پرنسپل سے درخواست بھی کی تھی کہ اس کے بیٹے کا سیکشن بدل دیا جائے لیکن پرنسپل نے یہ کہہ کر معذرت

کرلی کہ اب سالانہ امتحانات بہت نزدیک ہیں اور اس وقت سیکشن تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔

☆☆☆

آج عزیر کا رزلٹ آرہا تھا۔ ماما، پاپا دونوں انوائٹڈ تھے۔ رئیس کی تو میٹنگ تھی اس لیے اس نے رزلٹ پہ جانے سے معذرت کرلی لیکن ارمین بدستور ہر سال کی طرح رزلٹ ڈے پر موجود تھی۔ عزیر، اس کا بیٹا بالکل شہزادوں جیسا لگ رہا تھا اور اس وقت تو ارمین کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب ساتویں کلاس کے رزلٹ کی اناؤنسمنٹ میں پہلی پوزیشن کے لیے عزیر کا نام پکارا گیا۔ ارمین اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی، خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ عزیر نے بہت تمکنت سے اپنا انعام وصول کیا اور نیچے اترا تو ارمین بیٹے کو گلے لگانے کو آگے بڑھی...... لیکن عزیر نے نیچے اترتے ہی اپنی ٹیچر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس کا تیرہ سالہ لمبا تڑنگا بیٹا بچوں کی طرح ماں کے بجائے اپنی ٹیچر صائمہ کے گلے بلا جھجک لگ گیا۔ جو بے فکری سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے مبارک باد دے رہی تھی۔ استاد کا شاگرد سے رشتہ روحانی ماں، باپ جیسا ہوتا۔ لیکن جانے کیوں ارمین کو یہ منظر قدرے عجیب سا لگا۔

☆☆☆

ارمین لاؤنج میں صوفے پر سر پکڑے بیٹھی تھی اور اس کے آس پاس برتنوں اور ڈیکوریشن پیسز کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ غلطی کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ جو آج نوبت یہاں تک آپہنچی۔

وہ تھوڑی دیر قبل اپنی ایک سہیلی سے مل کر گھر آئی تھی اور یہ پہلی بار کی بات تھوڑی تھی کہ وہ سہیلی سے ملنے گئی ہو اور عزیر جو اس کی واپسی سے پہلے اسکول سے گھر آجاتا تھا۔ ایک بار یا دو بار عزیر نے احتجاج کیا تھا جب وہ سات آٹھ سال کا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے گھر پر اکیلا مت چھوڑا کریں۔ مجھے ڈر لگتا ہے لیکن ارمین نے اس کی بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ بلکہ اکثر تو چھٹی والے دن بھی رئیس اور ارمین کسی نہ کسی گیٹ ٹوگیدر پر چلے جاتے اور عزیر کو گھریلو ملازمہ کے حوالے کرجاتے۔

گھر میں کیسا ڈر جبکہ ملازمہ گھر میں ہے۔ یہ کہہ کر وہ تسلی سے گھر سے چلے جاتے۔ عزیر کے رونے پر رئیس احمد اس کو کہتے کہ ٹی وی لگالو کوئی گیم کھیلو، نیٹ آن کرلو اور اب تو عزیر نے نہ صرف احتجاج کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ جیسے منتظر رہتا تھا کہ کب ماں، باپ گھر سے جائیں تو وہ آزادی سے اپنی من مانی کرسکے اور وہ من مانی ایسی اخلاق باختہ تھیں جنہوں نے اس کو بارہ سال کا بچہ نہیں رہنے دیا تھا بلکہ بائیس چوبیس سالہ نوجوان جیسا بنا دیا تھا۔ اس کے اندر کا بارہ سالہ بچہ جانے کب والدین کی بے پروائی، ٹیچر کے بے باکی بھرے انداز اور میڈیا کی بے راہ روآزادی کی نذر ہوگیا تھا۔ یہ سب باتیں ارمین کی سمجھ میں تب آئیں جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا۔

پچھلے ایک ہفتہ سے عزیر ایک ایسی ضد پر اڑ چکا تھا جس ضد نے ارمین کے دماغ کا فیوز اڑا دیا تھا۔ کتنے آرام سے کہہ دیا تھا اس نے۔ ”ممی آپ میری شادی مس صائمہ سے کروادیں۔“ لیکن ارمین کے لیے وہ الفاظ نہیں تھے ایک بم تھے جس نے اس کے جسم کے گویا پرخچے اڑا دیے تھے۔ تیرہ سال کا بچہ اپنی بیس سالہ استاد سے شادی کی ضد بالکل ویسے ہی کررہا تھا جیسے بازار میں کوئی نیا کھلونا دیکھ کر بچہ مچل جائے۔

اِدھر اسکول میں بھی ٹیچر صائمہ کو اپنی بے تکلفی کی فصل کو کاٹنے کا وقت آگیا تھا۔ ان دنوں مس صائمہ کے گھر والوں نے ان کی شادی کی تاریخ پکی کردی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے مٹھائی لائی تھی اور سارے اسٹاف میں بانٹ رہی تھی اور بہت خوش تھی۔ وہ اپنی ساتھی ٹیچرز کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف تھی۔ اس کی ساتھی ٹیچر اس کے منگیتر کے نام اسے چھیڑ رہی تھیں۔ اور اس کے منگیتر کی تصویر ایک ٹیچر سے دوسری ٹیچر اور دوسری تیسری ٹیچر کے ہاتھوں میں جارہی تھی کہ اچانک عزیر نے تصویر کو جھپٹ لیا اور غصے سے

تصویر کے ٹکڑے کر ڈالے۔ باقی ٹیچر کے ساتھ صائمہ بھی تھوڑی دیر کو ساکت ہوگئی لیکن اگلے لمحے اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ عزیر کے منہ پر دے مارا۔ عزیر نے نہ تو غصہ کیا نہ ہی رویا۔ صرف ایک جملہ دُہراتا رہا۔

''آپ کسی اور کی نہیں صرف میری ہیں۔ صرف میری۔'' صائمہ کی شکایت پر پرنسپل کے دفتر میں اس کے والدین کو طلب کیا گیا۔ صائمہ اور عزیر بھی آفس میں پہلے سے موجود تھے لیکن وہ بنا خوف کے سب کے سامنے وہاں بھی وہی الفاظ دُہراتا رہا۔ آخر کار پرنسپل نے ارمین اور رئیس احمد سے معذرت کرتے ہوئے عزیر کو اسکول سے فارغ کر دیا۔ آج ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ رئیس نے تو اس دن اسکول سے واپسی پر عزیر کو مار، مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ ارمین کبھی اسے رئیس کی مار پیٹ سے بچاتی تو کبھی خود اس کی ضد پر عاجز آ کر کھڑا کھوٹا سناتی۔

آج بھی رئیس کے گھر سے جانے کے بعد اس نے یہی رٹ لگا رکھی تھی کہ ''مجھے مس صائمہ سے ہی شادی کرنی ہے۔ مجھے ان سے محبت ہے آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''میں تمہاری بات کو تب سمجھ پاتی کہ جب تم کوئی جائز بات کر رہے ہوتے۔ یہ کوئی سیل فون کا نیا ماڈل یا کوئی لیپ ٹاپ یا کوئی کھلونا نہیں جو تمہاری بات فوراً پوری کر دی جائے۔ یہ ہر طرح سے نامناسب ضد ہے ہم تمہاری ضد پوری نہیں کر سکتے۔ وہ تمہاری استاد ہے شرم کرو...... اس کی شادی طے ہو چکی ہے اور تم بھول چکے ہو کہ محض ایک تیرہ سالہ بچے ہو۔'' ارمین روہانسی ہوگئی تھی۔ ''تمہیں تو ابھی شادی کا مطلب بھی نہیں پتا میرے بیٹے۔''

''نہیں ہوں بچہ میں...... نہیں ہوں۔'' وہ بولتا جا رہا تھا اور کمرے کی چیزیں اِدھر اُدھر پھینک اور توڑ رہا تھا۔

''پتا ہے مجھے شادی کا مطلب پتا ہے ہر لحاظ سے...... مجھے سب پتا ہے۔'' اور اس سے آگے وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ تو ارمین نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کا تیرہ سالہ عزیر ایک تیس سالہ شادی شدہ مرد کے جیسا علم کہاں سے لایا۔ عزیر تو غصے سے توڑ پھوڑ کر کے اپنے کمرے میں جا کر بند ہوگیا۔

اور ارمین حق دق بیٹھی تھی اس میں اتنی سکت نہیں بچی تھی کہ وہ اٹھ کر بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹ لیتی۔ اس کے گھر کا تو شیرازہ ہی بکھر چکا تھا۔ کیا، کیا سمیٹتی۔ ہر چیز ریشم کے دھاگوں کے جیسے الجھ گئی تھی۔

میم صائمہ پر وقتی طور پر اس واقعہ کا اثر ہوا...... لیکن پھر وہ مزے سے اسکول کی روٹین میں مگن ہوگئی۔ بالآخر اس نے چھٹیاں لے لیں، دو دن کے وقفے سے اس کو مایوں بیٹھنا تھا۔ اور شادی کے فنکشن شروع ہو رہے تھے۔ عزیر اسکول تو چھوڑ چکا تھا لیکن اپنے دوستوں سے فون پر مکمل رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ مس صائمہ اپنی شادی کے لیے چھٹی لے چکی ہیں اس کو پتا چلا تو وہ جنونی ہوگیا۔

اور پھر وہ ہوا جس کا کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔

''رئیس احمد اب عزیر کا کیا، کیا جائے۔ اسے بورڈنگ بھیج دیں۔'' ارمین نے رئیس سے اداس لہجے میں کہا۔

''ارمین یہ وقتی ابال ہے، کچھ دن میں یہ ضد ختم ہو جائے گی ارمین تم تسلی رکھو۔ ہو جاتا ہے اس عمر میں اکثر بچوں کو ٹیچرز پہ کرش لیکن میچورڈ ہونے پر وہ اپنی ان حرکتوں کو یاد کر کے ہنسا کرے گا۔'' ارمین نے بستر پر کمبل سیدھا کر کے بیٹھتے ہوئے کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن اگلے لمحے گولی کی آواز سے پورا گھر گونج اٹھا۔ رئیس اور ارمین ننگے پاؤں عزیر کے کمرے کی جانب دوڑے۔

عزیر اپنے کمرے میں فرش پر خون میں لت پت پڑا تھا ساتھ ہی اس کے ہاتھ کے نزدیک رئیس کا ریوالور پڑا تھا۔ ارمین منظر دیکھ کر بے ہوش ہو کر رئیس کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ غلطی کس سے اور کہاں ہوئی یہ کوئی بتانے والا نہیں تھا۔

وہ اتنا چیخ چکی تھی کہ اس کے سینے میں اس کی سانسیں ہانپ رہی تھیں اور وہ اتنا بول چکی تھی کہ اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ اب اپنے معنی کھو کر گونگے ہو چکے تھے۔

وہ بیڈ پر ساکت بیٹھی تھی۔ شولڈر تک کٹے اس کے بال الجھ اور بکھر چکے تھے۔ دوپٹا اس کے قدموں میں پڑا اپنی بے عزتی کا نوحہ سنا رہا تھا۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو گالوں پر بہہ، بہہ کر لکیریں بنا کر خاموش اور خشک ہو چکے تھے، وہ ایک ٹک خلاؤں میں کسی اچھی امید کو تلاش کر رہی تھی۔ شاہ میر ندامت سے اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

ناولٹ

عزیز قارئین ...... بہت دنوں سے میں کوئی تحریر نہیں لکھ پائی تھی ...... سو اپنی پیاری دوست عذرا رسول کے بے حد اصرار پر یہ کہانی لکھی اور اپنی یہ تحریر میں انہی کے نام کرتی ہوں۔

اک کوہِ گراں ہے

ناہید فاطمہ حسنین

زندگی کا سب سے بد صورت لمحہ وہ ہوتا ہے جب ہمارا محبوب ہم سے ہاتھ چھڑا کر انجانے رستے کی سمت مڑ جائے ...... اور جاتے سمے پل بھر کے لیے ہی سہی ...... ہمیں نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے ...... اور ہم اس کی دور ہوتی پشت پر حسرت سے اس امید کے ساتھ اپنی نگاہیں گاڑ دیں کہ شاید ...... وہ پلٹ کر ہماری نظروں میں چھپی یاس کو پڑھ لے اور لوٹ آئے ...... اور زندگی کا سب سے خوب صورت لمحہ ......؟

انہی خوب صورت اور بد صورت لمحوں کی دلسوز داستان





''یہ سب کیا ہوگیا شامی۔'' جب اس کی نظریں شاہ میر سے چار ہوئیں تو وہ سسک کر بیڈ سے اتر کر قالین پر اس کے پاس آبیٹھی۔ پپڑائے ہونٹوں کو زبان پھیر کر کئی بار تر کرنا چاہا...... مگر وہ تو ایسے جیسے پیدائشی خشک بنجر زمین...... ''وہ کچھ جو نہیں ہونا چاہیے تھا......'' وہ پھر شاہ میر کے سینے سے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

شاہ میر نے بے ساختہ اسے بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ وہ اس کے سینے سے لگی... پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہی۔

''میں نے کب ایسا چاہا تھا۔ مجھے نہیں خبر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا میں...... میں بے حد شرمندہ ہوں نمی......''

''تمہاری شرمندگی اب عمر بھر کے لیے میری شرمندگی بن جائے گی۔'' کمرے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟ بولو...... مجھے منہ دکھانے کے قابل تک نہ چھوڑا......'' وہ یکلخت اسے پیچھے دھکیل کر بہت زور سے چیخ کر اپنا چہرہ چھپا کر دھواں دھار رونے لگی۔

اس نے اسے پکڑنا چاہا...... سنبھالنا چاہا تو اس نے شاہ میر کو بہت زور کا دھکا دیا خود سے پرے دھکیلا...... پھر اس کے سینے پر بے تحاشا گھونسے مارنے لگی۔

''نفرت ہے مجھے تم سے۔'' جسم کی پوری توانائی مجتمع کر کے وہ چیخی۔ ''تھوکتی ہوں میں تم پر تم میری عزت کے محافظ تھے ناں کہ لٹیرے......'' وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑی ہوئی دوپٹا اٹھایا اسے پورے جسم اور سر کے گرد اچھی طرح لپیٹا۔ اپنا بیگ اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ شاہ میر نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے پوری قوت سے اسے دوبارہ دھکیل دیا، وہ سسکیوں کو حلق کے اندر روکتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔

وہ اس کے پیچھے لپکا۔

''رکو...... میں تمہیں گھر تک تو چھوڑ آؤں۔''

''گھر......؟ کون سا گھر......'' اس نے انتہائی حقارت و استہزا سے کہا۔

''وہ جس سے عنقریب مجھے بے دخل کر دیا جائے گا۔'' اس نے دوپٹا منہ میں دبا کر چیخ روکی اور گھر سے نکل گئی۔

وہ اس کے پیچھے تھا۔ مگر وہ بہت تیزی سے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ شاہ میری سر پکڑ کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ گرتی پڑتی گھر میں گھسی۔ پھپو لاؤنج میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اسے کاٹ دار نظروں سے تکا۔ وہ خود کو سنبھالتی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

''آج تو سلام دعا سے بھی گئیں محترمہ......'' اس کی اور پھپو کی بات چیت بند تھی۔ یہ معمول کی بات تھی لیکن گھر میں گھستے ہی وہ سلام ضرور کرتی تھی جو آج وہ نہ کر سکی...... اسے پھپو کی پھنکارتی آواز پیچھے سے سنائی دی تو آج زندگی میں پہلی بار اسے پھپو سے بات چیت بند ہونے پر رب کا شکر ادا کرنا پڑا۔

وہ بستر پر ڈھیر ہوگئی...... سسکیوں کی آواز دھیرے، دھیرے بلند ہونے لگی تو اس نے تکیہ منہ پر رکھ کر بھینچ لیا۔ پھر وہ کسی خیال کے زیر اثر چونکی، تیزی سے اٹھ کر اس نے خواب آور گولیاں کھائیں جو وہ کبھی کبھار کھایا کرتی تھی۔ پُرسکون ہونے کی سعی میں اس نے آنکھیں موندلیں۔

☆☆☆

شدید بھوک سے اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ کتنی تاریخیں گزار کر جاگی تھی اسے کچھ علم نہیں تھا۔ سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور اسے چکر آرہے تھے۔ وہ کافی نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ اسے کھانے کے لیے کون پوچھتا۔ اس گھر میں کل دو ہی نفوس تھے جو آپس میں بات چیت منقطع کر بیٹھے تھے۔ پیٹ بڑا پاپی ہے اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کتنا بڑا حادثہ یا سانحہ گزر چکا ہے، وہ تو کھانے کو مانگتا ہے، چکراتے سر کے ساتھ اٹھ کر وہ باہر آئی، سناٹا بتا رہا تھا کہ گھر میں پھپو نہیں جو وہ اکثر ہی نہیں ہوتی تھیں اس

نے پھر شکر ادا کیا۔ چائے اور سینڈوچ لے کر وہ چھوٹی راؤنڈ ٹیبل پر آ بیٹھی۔ سینڈوچ کھانے کے دوران وہ پھر اس واقعے کو دُہرانے لگی۔ شاہ میر پر وہ خود سے زیادہ بھروسا کرتی تھی۔ اور اسی اندھے اعتماد کا۔ نتیجہ وہ بھگت رہی تھی......وہ پھر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

کافی دیر رونے کے بعد وہ بالآخر چپ ہوگئی......

کہ یہی عام طور پر ہوتا ہے ایک بندہ کب تک مسلسل روئے، اسے آگے کا سوچنا تھا۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کے دوراہے پر دم سادھے کھڑی تھی۔

اس نے موبائل پر ایک نظر ڈالی، زارا کی گیارہ کالز کے ساتھ آفس کی اور شاہ میر کی کئی کالز مسڈ ہو چکی تھیں۔ وہ زارا کے ساتھ اس کی کار میں آفس جایا کرتی تھی تو لازماً زارا نے اس کے نہ آنے پر کالز کی ہوں گی اور آفس سے اس کی غیر حاضری کی وجہ جاننے کے سبب کالز آئی ہوں گی۔ اور شامی کی کالز......ہونہہ......اس نے حقارت سے سر جھٹکا۔

☆☆☆

شاہ میر، ثمین کا یونی فیلو تھا دونوں آپس میں محبت کرتے تھے جب شادی کا وقت آیا تو وہ دونوں گھرانوں نے غیر خاندان میں شادی نہ کرنے کا جواز بنا کر شادی سے انکار کر دیا۔ کچھ عرصے بعد شامی نے اپنی فیملی کو ثمین سے شادی پر رضا مند کر لیا مگر اس کی پھپو کسی طرح تیار نہ ہوئیں اور یوں ان کی شادی کا معاملہ قصۂ پارینہ بن گیا۔ اس نے جاب کر لی اور شاہ میر اپنے والد کے کاروبار سے منسلک ہو گیا۔ دونوں کی ملاقاتیں بند نہیں ہوئی تھیں۔ شاہ میر ہی اکثر اسے کورٹ میرج کا مشورہ دیا کرتا اور وہ ہمیشہ کہتی......

''اس طرح ہم ایک دوسرے کو تو پالیں گے لیکن میں تمہارے گھر والوں کے دل میں اپنی عزت بنانے میں ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤں گی۔''

اس روز پھپو سے اس کا زبردست جھگڑا ہوا تھا، وہ دل ہلکا کرنے شامی کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کے گھر والے قریبی عزیز کی شادی میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ وہ گھر پر تنہا تھا اُسے روتا دیکھ کر دلاسا تسلی دیتے، دیتے بہک گیا تھا اور وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جس کے بعد معافی تلافی سب بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جو پہلے ہی دل گرفتہ تھی اب مزید ٹوٹ پھوٹ گئی۔

☆☆☆

اس روز سے آج تک شاہ میر ڈھنگ سے سو نہیں سکا تھا۔ وہ کیسے اور کیونکر بہکا وہ خود حیران تھا۔ اسے یاد ہے کہ وہ پھپو کی بدسلوکی سے شا کی سر جھکائے رو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ بے ساختہ اسے اپنے دل میں بھر لے۔ اس نے ثمین کا سر اپنے سینے سے ٹکایا تو وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی، وہ اسے روتا نہیں دیکھ سکتا تھا، وہ اسے بے تحاشا پیار کرتا تھا۔ اس کی آنکھ میں اس کی وجہ سے کبھی کوئی آنسو نہیں آیا تھا تو وہ اسے آج کیسے روتا دیکھ سکتا تھا۔ اس نے شدتِ جذبات میں آکر اسے خود سے بھینچ لیا۔ اور پھر وہی لمحہ اس کے ہاتھوں سے پھسلا تو اسے خطاکار بنا گیا۔ اس نے تمام عمر کے لیے اس کی آنکھوں کے کٹوروں کو آنسوؤں اور دامن کو داغ سے بھر دیا تھا۔ ساری زندگی کے لیے اس کی راہ میں کانٹے بچھا دیے تھے۔ اس کی زندگی کے چہرے پر ان مٹ کالک مل دی تھی۔ وہ سگریٹ نوش نہ تھا لیکن اتنے دنوں میں وہ چین اسموکر بن چکا تھا۔ دن رات اندھیرے کمرے میں بند سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کئی دن بعد جب پاپا کی کال آئی کہ آفس والے پریشان ہیں تم آفس کیوں نہیں جا رہے تب اس نے اپنی بیماری کا بہانہ بنایا تھا۔

☆☆☆

وہ بے چین ہو کر پاگلوں کی طرح اسے فون کیے جا رہا تھا۔ دوسری طرف کال جا تو رہی تھی مگر فون اٹینڈ نہیں کیا جا رہا تھا۔ وہ اس کی پھپو کی عادت سے خوب واقف تھا سو اس کے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ کئی بار اس نے اس کے گھر کے کئی چکر لگائے مگر بار، بار بند گیٹ اس کا منہ چڑاتا تھا۔ دروازے پر لگی گھنٹی بجانے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی وہ خوب واقف تھا اگر اس نے بیل بجا دی تو اس کی پھپو اس کی تو بے عزتی کریں گی ہی

کریں گی، ثمین کا الگ حشر کردیں گی۔ اور اب وہ ثمین کو مزید کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ بِنا اطلاع کے آفس سے غیر حاضر تھی۔ اس کو آخری شوکاز نوٹس کے لیٹر ہیڈ پرنٹنگ لیٹر مل چکا تھا۔ جسے اس نے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹکی نیم دراز حالت میں تھی...... آنکھوں کے آگے دھند ناچ رہی تھی پھر کچھ دیر کے بعد اردگرد کا سارا منظر تاریکی میں ڈوب گیا سامنے نقطے میں جو واضح تصویر تھی وہ بہت دور گزرے ماضی کی تھی وہ نیم وا آنکھوں سے اس منظر کو دیکھنے لگی۔

''نہیں رہنا میں نے تمہارے ساتھ...... نہیں ہوتا میرا گزارہ...... مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت طلاق چاہیے۔'' نیلم بہت زور، زور سے چیخ رہی تھی۔

اور وہ...... آٹھ دس سالہ بچی لاؤنج میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کے نیچے دبکی بیٹھی تھی۔

''مجھے بھی تمہیں ساتھ رکھنے کا کوئی شوق نہیں، تم ابھی اور اسی وقت جاسکتی ہو، طلاق کے کاغذات تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔'' اسد نے بھی عاقبت نااندیشی کی حد کردی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی اکلوتی ثمین کے بارے میں سوچنا تک گوارا نہیں کیا...... وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے اور نہ اتنی بڑی کہ سب سمجھ جائے۔

نیلم نے کمرے سے باہر جانے کی غرض سے پوری شدت سے دروازے کو کھول کر دیوار سے ٹکرایا۔

''ٹھہرو......'' اسد گرجے۔

''اب ایک لمحے کا رکنا بھی مجھ پر حرام ہے۔'' نیلم بہت طیش میں تھی۔

''ثمین کا فیصلہ کر کے جاؤ۔'' غصے میں اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

''یہ تمہاری اولاد ہے تم ہی رکھو......'' نیلم نے سوچنے میں لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ تڑ سے کہا۔

''واہ......'' اسد تمسخر سے ہنسے۔ ''اس پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا...... اگر طلاق چاہیے تو اس بات کا فیصلہ ابھی ہونا چاہیے۔ ورنہ عدالت میں جوتیاں گھستا تو کیا...... تمہاری عمر گزر جائے گی...... طلاق نہیں ملے گی۔'' سچ ہے جب دو ساتھ رہنے والے جدا ہونے کا...... راہیں بدلنے کا فیصلہ کرلیں تو اپنی ہر مشترکہ چیز بار لگنے لگتی ہے۔

نیلم عدالتوں کے نظام سے واقف ہو نہ ہو مرد کی خصلت سے بخوبی واقف تھی۔ گہری سانس بھر کر رک گئی...... ''ہاں بولو...... کیا فیصلہ کرو گے؟''

''یہ تو طے ہوگیا کہ تم کوئی بہت اچھی ماں تو ہو نہیں جو بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاؤ......'' اسد کا طنز نیلم نے کڑوے گھونٹ کی طرح تحمل سے حلق سے اتارا۔

''آگے بولو......'' اس نے آنکھیں میچ کر کھول لیں۔

''ہوں......'' اسد نے ہنکارا بھرا۔

''ثمین کو کچھ عرصہ تم رکھو گی اور کچھ عرصہ میں......''

''ڈن......'' نیلم نے دانت کچکچائے اور کمرے سے نکل گئی۔

پھر اس آٹھ دس سالہ بچی کو کچھ علم نہیں ہوسکا کہ طلاق ہوئی یا نہیں مگر اتنا وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے بعد اس کی ماں اس کے نانا کے گھر جا کر بہت خوش رہنے لگی اور کبھی بابا کے گھر نہ آئی اور وہ محض ایک rolling stone کی طرح کبھی ماما اور کبھی بابا کے گھر کے درمیان بٹ گئی...... اور اس عمل میں نہ بابا کا گھر کبھی اس کا بن سکا نہ ماما کا...... ماما جب ایک انکل کے ساتھ گھومنے نکل جاتیں تب اس کے نانا اس کی دیکھ بھال کرتے۔ نانا نے اسے بہت پیار دیا مگر وہ ہر قیمت پر اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھاتے رہے کہ اس کی ماں ہر طرح سے ٹھیک ہے جبکہ اس کے باپ کے رویّے نے اس کی ماں کو بددل کر کے اس فیصلے پر مجبور کیا ہے۔

اور جب وہ بابا کے گھر آتی تو یہاں تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ ایک دن بابا اپنی بیوہ بہن عطیہ کو اپنے گھر لے آئے۔

عطیہ کو اس کی سگی پھپھو تھیں لیکن ان کا ناروا سلوک کسی سوتیلے پن سے کم نہیں تھا۔ بابا اسے عطیہ کے حوالے کر کے گویا آزاد ہو گئے تھے۔ پھپھو کی وجہ سے اس کا جی چاہتا وہ ماما ہی کے گھر رہے۔ مگر ماما اسے مستقل اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہی نہیں تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ وہ بہت دن تک ماما کے گھر نہ جا سکی۔ اس نے دبے، دبے لفظوں میں بابا سے ماما کے گھر جانے پر اصرار کیا۔ بابا نے کوئی جواب نہیں دیا تو عطیہ بھنا کر بولیں۔

''وہ تمہاری ماں نہیں ہے، ایک آوارہ عورت ہے، اس نے اپنے عاشق سے شادی کر لی ہے۔ اب تم اس گھر میں کیسے جا سکتی ہو۔'' اسے پھپھو کے منہ سے اپنی ماں کی شان میں کہے جملے بالکل پسند نہیں آئے۔ وہ ایک ڈری سہمی بچی تھی سو چپ ہو گئی مگر اس سب کے باوجود وہ اپنی ماما سے نفرت نہ کر سکی۔

اس کے بعد اسے اپنی ماں کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ پتھر پر بھی پانی کا قطرہ پڑتا رہے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے، عطیہ نے نیلم کے حوالے سے ایسا برین واش کیا کہ ثمین کو رفتہ، رفتہ ماں سے نفرت ہو گئی۔

☆☆☆

ماما کی شادی سے وہ جس اذیت و کرب سے گزری تھی... وہی اذیت و کرب ایک بار پھر اس کے در پر دستک دینے آ گئے۔ اب کی بار کردار تبدیل ہو گیا تھا۔ اور اب وہ کردار اس کا باپ تھا۔ انہوں نے جس عورت سے شادی کی اس نے شروع ہی سے ثمین سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا اور بابا کو نئی نویلی کے نخرے اٹھاتے ہی بن پڑی۔

☆☆☆

وہ گھر بھر کے کپڑے دھونے کے بعد ان کے سوکھنے پر استری کر رہی تھی اور بابا عطیہ سے مخاطب تھے۔ جب اس کا نام آیا تب اس کے کان کھڑے ہوئے، استری کرتے ہاتھ رک گئے۔ اس کا رواں، رواں کان بن گیا تھا۔ بابا پھپھو سے دھیمی آواز میں مخاطب تھے۔

''دیکھو عطیہ اس گھر کے بالائی پورشن کا کرایہ تم دو افراد کو بہت کافی ہو گا۔ جس سے تمہاری اور ثمین کی اچھی گزر بسر ہو سکے گی۔ ثمین تمہاری بھتیجی ہے، امید ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گی۔ میں اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو رہا ہوں۔ حسنہ (دوسری بیوی) یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی...... میں آتا جاتا رہوں گا۔'' آخری جملے پر وہ بری طرح چونکی تھی...... مڑ کر لحظہ بھر کو باپ کو تکا...... نہ جانے اس کے دل میں کیسی خواہش نے سر ابھارا۔ اس کا جی چاہا وہ دوڑ کر بابا سے لپٹ جائے...... انہیں روک لے۔

''مت جائیں مجھے چھوڑ کر......'' وہ چلّا، چلّا کر کہے...... مگر اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، وہ اب آٹھ دس سال کی بچی نہ تھی، خود کو کنٹرول کر سکتی تھی۔ مگر اپنی آنکھوں پر اسے بالکل اختیار نہیں تھا۔

ٹپ ٹپ...... کئی آنسو آنکھوں کی دہلیز پار کر کے ٹوٹ، ٹوٹ کر کپڑوں میں جذب ہونے لگے۔

☆☆☆

بابا اپنی نئی بیوی کو لے کر نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گئے۔ شروع، شروع میں انہوں نے خیر خیریت کے کئی فون کیے پھر رفتہ، رفتہ یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی حالت میں جب کمر دکھنے لگی تو وہ ماضی کے ایوانوں سے نکل... آئی بستر پر نیچے کھسک کر لیٹ گئی۔ پلکیں بوجھل ہونے لگیں تو اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

زارا اس سے ملنے آئی تو وہ غنودگی میں تھی۔ دو ماہ سے اس کا یہی معمول تھا کہ وہ خواب آور دواؤں کے سہارے جی رہی تھی۔ پھپھو چونکی ضرور تھیں بالآخر اس سے معلوم بھی کرنا چاہا کہ وہ آفس کیوں نہیں جا رہی؟ کیوں کمرے میں بند ہے مگر اس نے تو جیسے گونگے کا گڑ کھا لیا تھا اسے تو خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب

دے یا آئندہ اسے کیا کرنا ہے؟ اور جو سمجھ آیا تو یہی کہ اسے بس سوتے رہنا ہے کبوتر کی طرح حالات سے منہ چھپا کر آنکھیں موندے رکھنا ہے، یا شتر مرغ کی طرح گردن ریت میں دبا لینی ہے۔ اسے دنیا سے نفرت ہوگئی تھی، وہ سمجھتی تھی کہ اس کے ساتھ پیش آنے والا سانحہ دنیا کے علم میں آچکا ہے۔ بالآخر زارا نے جگ بھر کر پانی اس پر انڈیلا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ زارا نے بتایا کہ اسے آفس سے ٹرمینیٹ کر دیا گیا ہے اور جب اس نے نہایت پرسکون ہو کر کہا کہ یہ سب اس کے علم میں ہے تو زارا نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم بتاتی کیوں نہیں؟'' تب وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ اس کا اس دنیا میں تھا ہی کون؟ ایک واحد پھپو...... جو والد کی نگاہیں پھیرتے ہی سوتیلی ہوگئی تھیں...... ''سچ ہے لاوارثوں کا کوئی رشتہ سگا نہیں ہوتا۔''

☆☆☆

عمرے کو جاتے ہوئے اس کے والد اور سوتیلی والدہ کا پلین کریش ہوگیا اور یوں اس کے والد اور سوتیلی ماں کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچی...... ان کے مرنے کے بعد وکیل کے ذریعے اسے پتا چلا کہ وہ شاندار فلیٹ اس کے نام ہے، پھپو نے اپنی ہوشیاری سے اس فلیٹ کو کرایہ پر اٹھا دیا اور یوں اس کا کرایہ بھی ان کی ہوس کی نذر ہوتا رہا...... اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنا حق لے سکے۔ اس کے دل میں پھپو کے خلاف نفرت بڑھتی چلی گئی۔ وہ بااختیار ہو کر بھی بہت بے اختیار و بے بس تھی...... وہ پھپو سے بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ اسے معمولی، معمولی ضرورتوں کے لیے اپنا حق بھیک کی طرح ان سے مانگنا پڑتا تھا اور وہ مہنگائی کا رونا رو کر اس کی ضرورتوں کو پسِ پشت ڈالتی رہتیں۔ بالآخر اس نے اپنے مسائل کے حل کے لیے جاب کرلی۔ اس نے اپنی ضرورتوں کے لیے ان کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ادھر پھپو کی من چاہی مراد بر آئی تھی۔ اسے اپنے گالوں پر پڑتے والے پھپو کے تمام چانٹے ازبر تھے۔ اسے یاد تھا کہ جب اس کے سر میں جوئیں پڑ گئی تھیں تو پھپو نے کلاس سیونتھ (7th) میں پڑھنے والی بچی کو گنجا کروا دیا تھا اور وہ شرمندگی میں اسکول نہ جاسکی اور وہ سال اس کا ضائع ہوگیا تھا۔

دونوں میں مدت سے بات چیت بند تھی کبھی کبھار واجبی سی بات چیت ہوجاتی ورنہ پھپو اپنے میں مگن تھیں، ان کی دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جن کے پاس وہ کام سے فارغ ہو کر پہنچ جاتی تھیں......

اس واقعے کے بعد سے وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرچکی تھیں مگر اب اس نے ان کی ہمت توڑ ڈالی تھی...... وہ کمرے کو لاک کر کے سوتی رہتی اور پھپو زارا کے آنے پر اسے واپس بھیج دیا کرتیں۔ آج اتفاق تھا کہ پھپو کسی کام سے گھر سے نکل رہی تھیں تو زارا تقریباً زبردستی گھس آئی اور ثمین تک پہنچ گئی۔

ثمین، زارا کو دیکھ کر دھواں دھار رونے لگی۔ زارا اسے چپ کراتی رہی مگر جب ثمین نے خود پر بیتی اسے سنائی تو جیسے زارا کو سکتہ ہوگیا۔ زارا اس کی جھوٹی ہمت بندھاتی گھر تک واپس آگئی مگر اپنا دھیان، خیال سب ثمین ہی کے پاس چھوڑ آئی۔ اسے اس اکیلی تنہا لڑکی پر رہ، رہ کر بے حد ترس آرہا تھا وہ اسے زندگی کی طرف لانے کی تدبیر کرنے میں جت گئی۔

☆☆☆

اگلے روز زارا اسے زبردستی ریسٹورنٹ لے آئی۔ وہ اسے بار، بار سمجھا رہی تھی۔

''دیکھو ثمین جو ہوگیا اسے شبِ گزشتہ کا بھیانک خواب سمجھو، بھول جاؤ...... زندگی میں بہت کچھ ہوتا ہے زندگی کو فیس کرنا سیکھو......'' وہ لہجہ بھر کورکی۔

''تم نے پھپو کو تو کچھ نہیں بتایا؟'' اس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

ثمین نے نفی میں گردن ہلادی۔

''ویری گڈ...... تم بے وقوف لڑکی سے اس عقلمندی کی توقع تو نہیں تھی...... خیر...... بس اب یہ سوچو آئندہ کیا کرنا ہے۔''

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا، شامی نے میرا اعتبار توڑا ہے' اب میں کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی۔''

''زندگی شامی سے شروع ہو کر شامی پر ختم نہیں ہو جاتی۔'' زارا نے سر پیٹا۔ ''کسی ایک فراڈ شخص کی خاطر تم ساری دنیا کو اس کی جگہ رکھ کر نہیں سوچ سکتیں۔ وہ جو تم سے مخلص تھا ہی نہیں، مدتوں تم سے محبت کا سوانگ بھرتا رہا...... کھلا تو تم پر دنیا بھر کی کالک مل کر چلا گیا۔ مت سوچو اسے...... کبھی اس کا نام بھی لینا گوارا مت کرنا...... سمجھو وہ تمہاری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ بس زندگی کو دوبارہ شروع کرو۔''

''نہیں......'' ثمین نے نفی میں گردن ہلا کر ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور رونے لگی۔ ''میں بہت بزدل ہوں...... اتنی بزدل کہ آئینے میں اپنا سامنا بھی نہیں کر سکتی۔''

''تمہیں اپنا سامنا بھی کرنا ہے اور دنیا کا بھی...... بس تمہیں ہمت کی ضرورت ہے۔'' وہ روتی ہوئی ثمین کی پشت کو تھپتھپا کر پیار سے سہلانے لگی۔

☆☆☆

وہ اس دن سے آج تک بے پناہ پریشان اور شرمندہ تھا۔ آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ثمین سے مل کر ہی آئے گا...... بے گناہ تو وہ تھا ہی نہیں، تو بھلا ... بے گناہی کیا ثابت کرے گا، ہاں دل سے معافی ضرور مانگے گا۔ اسے ہر صورت شادی پر رضامند کرے گا۔ اس کی پھپھو کو منائے گا یہی سب سوچ کر وہ اس کی ڈور بیل بجا رہا تھا۔

''آپ کون؟'' گیٹ کی کھڑکی کھولنے والی پھپھو ہی تھیں...... وہ اسے قطعاً نہیں پہچانی تھیں کیونکہ ایک ہی بار وہ اپنے والدین کے ساتھ ثمین کا رشتہ لینے آیا تھا۔

''جی میں......'' اس نے بہ مشکل تھوک نگلا۔

''جی وہ...... ثمین دیوان ہیں گھر پر......'' وہ گڑبڑا گیا اور اسی گھبراہٹ میں ساری پلاننگ بھول گیا' ثمین کا نام اس کے منہ سے سنتے ہی پھپھو کی تیوری چڑھ گئی۔

''تم کون ہو؟'' لمحہ بھر میں وہ آپ سے تم کی سیڑھی پر بالکل نیچے اتر آئیں۔ وہ اب گیٹ بھی کھول چکی تھیں۔

''وہ میں......'' پھر جیسے اسے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ ''میں ان کا آفس کولیگ ہوں، وہ آفس نہیں آرہیں۔'' یہاں اس نے سچ بولا تھا۔ وہ آفس کے کئی چکر لگا چکا تھا، آخری بار اسے علم ہوا کہ وہ ٹرمینیٹ کر دی گئی ہے۔ اس بات کو اس نے پھپھو سے قصداً چھپایا۔

''ہمیں اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں کہ وہ آفس کیوں نہیں جا رہی۔ پورا پورا دن بستر پر پڑی رہتی ہے' پوچھ، پوچھ تھک گئے کچھ نہیں بتاتی، ہمیں بھی کوئی شوق نہیں اس سے بات کرنے کا؟''

''آپ انہیں بلا دیں پلیز...... مجھے اسی بارے میں ان سے ضروری بات کرنی ہے۔'' اب وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔

''ارے کہاں سے بلاؤں جب وہ گھر پر ہے ہی نہیں۔'' پھپھو جھلا گئیں۔ ''خدا جانے اپنی دوست زارا کے ساتھ کہاں، کہاں ماری پھرتی ہے، فون نہیں ہے تمہارے پاس؟'' خالص لڑاکا جاہل عورتوں کی طرح پھپھو نے کہا۔

''جی موبائل تو ہے مگر وہ......'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ پھپھو تڑخیں۔

''بس اسی پر رابطہ کرو' میرا دماغ نہ چاٹو......'' دھاڑ کی آواز سے انہوں نے گیٹ بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس روز وہ ثمین سے ملنے آئی تو پھپھو بل جمع کروانے جا رہی تھیں' اسے دیکھ کر رک گئیں۔

''یہ بتاؤ زارا کہ ثمین کو ہوا کیا ہے؟'' انہوں نے شاہ میر کی آمد کو قصداً پوشیدہ رکھا۔ زارا بوکھلا گئی۔

''آخر کیا وجہ ہے یہ تین مہینے سے کمرے میں بند ہے۔ آفس بھی نہیں جاتی۔ لگتا ہے نکال دی گئی ہے۔''

''جج...... جی شاید......'' زارا گھبرائی۔

''شاید، کیوں؟ تمہیں تو سب پتا ہونا چاہیے، تم دونوں کا آفس ایک ہی ہے۔'' وہ بہت جہاندیدہ

عورت تھیں۔
''مم...... مجھے نہیں پتا، میرا ٹرانسفر دوسری برانچ میں کر دیا گیا ہے۔ اور...... اور ثمین مجھے کچھ بتاتی نہیں ہے۔'' اس کی گھبراہٹ نے پھپھو کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔
''دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

☆☆☆

''خدا را مجھے معاف کردو...... میری بات تو سنو...... فون تو پک کرو...... مجھے ازالے کا ایک موقع تو دو۔'' گھر آ کر وہ نہ جانے کتنے میسیجز ثمین کو کر چکا تھا۔ مگر ثمین کے موبائل نے بھی شاید گونگے کا گڑ کھا لیا تھا۔ نہ میسیجز کا کوئی جواب آتا نہ وہ فون اٹھاتی۔ اصل میں اس نے شاہ میر کے نمبر کو screen list میں ڈال کر hide کر دیا تھا...... اتنا تو وہ جانتا تھا کہ ثمین نے سم تبدیل نہیں کی ہے ورنہ دوسری طرف بیل نہ بجتی۔

☆☆☆

''بولو میں پھپھو کو کیا جواب دوں؟'' زارا سوتی جاگتی ثمین کے بال سنوار رہی تھی۔
''چپ سادھ لو...... میری طرح...... یہی سب سے اچھا جواب ہے۔'' ثمین نے نیند کی گولیوں کے زیرِ اثر آنکھیں موند لیں۔
زارا اسے بیچارگی سے تکے چلی گئی۔

☆☆☆

''دو تین مہینوں سے یہ سب کیا ڈراما چل رہا ہے۔'' ٹی وی کی آواز مدھم کر کے انہوں نے کھانا کھاتی ثمین پر نظریں گاڑیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''میں کتا نہیں ہوں جو گھنٹے بھر سے بھونکے جا رہی ہوں۔ مجھے جواب دو تم آفس کیوں نہیں جا رہیں؟'' وہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔
''میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' پھپھو بہت زور سے چنگھاڑیں۔
''میرے پاس آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں۔ بہتر ہے آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔'' زارا کی دی ہمت کام آئی۔ اس نے تڑ سے پھپھو کو سنا دیا۔ وہ سناٹے میں آ گئیں انہیں ثمین سے کب ایسے جواب کی توقع تھی۔
''اگر میں اپنے کام سے کام رکھوں تو پھر کل سے اپنے کھانے کا بندوبست خود کر لو۔'' پھپھو نے غصے میں ٹی وی ریموٹ کو زور سے صوفے پر پٹخا مگر وہ لڑھک کر زمین پر جا گرا۔ اور دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ پھپھو پیر پٹختی کمرے میں چلی گئیں اور ثمین کانپ کر رہ گئی۔ زارا نے اسے یہیں تک کا تو سبق پڑھایا تھا۔

☆☆☆

زارا کی امی نے ثمین کو اپنے گھر بلایا تھا اور وہ آج ہی اپنے کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ میں لیٹ ہو گئی تھیں۔ ادھر وہ دونوں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔
ثمین چکراتے سر کو لیے زارا کے بیڈ پر دراز ہو گئی۔ پھپھو کی روداد سناتے، سناتے وہ ہانپ گئی تھی۔
''تم جیسا بزدل شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہو۔'' زارا پیچ و تاب کھا رہی تھی اور وہ اپنے دکھوں کا بار زارا کے شانوں پر رکھ کر ہلکی پھلکی ہو کر آنکھیں موند چکی تھی۔
''کتنا سوتی ہو یار......'' زارا الجھ ہی تو گئی...... مگر ثمین کو پروا ہی کب تھی۔

☆☆☆

''محبت تو اِک جاوداں زندگی ہے، تو سے نیناں لاگے......'' وہ اور اقصیٰ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اتر کر جونہی لابی میں آئے تو شاہ میر نے ان کے گزرتے ہی گٹار بجا کر گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز بے حد سُریلی تھی، وہ بہت ڈوب کر گا رہا تھا...... اس نے خفیف سی گردن موڑ کر شاہ میر کو تکا وہ محبت پاش نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر سیدھی ہو رہی' اس کی آواز دور تک ان کا پیچھا کرتی اس کے قدموں میں بیڑیاں ڈال رہی تھی۔
پتنگے کو جلنے کا ارمان کیوں ہے؟ لابی سے نکلنے سے اس نے لمحے بھر کو آخری نگاہ ڈالنے کو مڑ کر اسے تکا

اور بری طرح چونکی تھی...... نہ جانے شاہ میر کی نظروں میں کیا تھا؟

شاہ میر نے اپنے دوست کے ذریعے اسے دوستی کا پیغام بھیجا وہ ڈرپوک لڑکی اور سہم کر رہ گئی۔ اس روز آرٹس لابی عبور کرتے اس کے قدم کانپ رہے تھے۔ وہ تنہا تھی اور شاہ میر اپنے دوستوں کے ساتھ آرٹس لابی کے ٹھنڈے فرش پر محفل جمائے بیٹھا تھا۔ کوئی نیا گیت الاپ رہا تھا اس کو دور سے آتا دیکھ کر اس نے گیت ہی بدل دیا تھا۔

''تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آ کر تو دیکھو
تڑپنے پہ میرے نہ پھر تم ہنسو گے
کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو''

گیت گانے میں اس کے دوست اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے اور وہ چلتے، چلتے لڑکھڑا رہی تھی۔ آج آرٹس لابی کا سفر بھی نہ ختم ہونے والا لگ رہا تھا۔

اور پھر بالآخر شاہ میر نے اسے قائل کر ہی لیا۔ اور وہ ڈرتے، ڈرتے بھی محبت میں اس کی ہم سفر بن گئی۔ شاہ میر اس کا بے پناہ خیال رکھتا۔ ہر لمحہ اس سے رابطے میں رہتا۔ آئے دن نصیحتوں کا پنڈورا بکس کھول کر رکھتا۔ پھر دھیرے، دھیرے اسے بھی یہ سب کچھ اچھا لگنے لگا اور وہ دل وجان سے شاہ میر کی الفت میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنے ماضی کا ایک، ایک ورق شاہ میر کے سامنے کھول کے رکھ دیا...... شاہ میر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی ایک، ایک محرومی کا ازالہ کرے گا...... اس کی آنکھ میں کبھی اس کی وجہ سے آنسو نہیں آئیں گے...... مگر پھر یوں ہوا کہ دونوں کی تعلیم ختم ہونے سے قبل ہی بابا نے دوسری شادی رچالی اور وہ نئے فلیٹ میں منتقل ہوگئے...... ثمین بالکل تنہا ہو کر رہ گئی۔ اس کا سمسٹر ختم ہوا، رزلٹ آیا تو بابا اور اس کی نئی امی عمرے پر جاتے ہوئے فضائی حادثے کا شکار ہوگئے۔ اس لمحے شاہ میر ہی تھا جس نے اسے سنبھالا دیا۔

☆☆☆

''او بھرڈ ونچی...... امی آگئیں اب تو اٹھ جاؤ، کھانا انتظار کر رہا ہے۔'' زارا نے شوخی سے کہہ کر اسے جھنجوڑا...... وہ چکراتے ہوئے سر سے اٹھی سامنے کا منظر دھندلا تھا۔ آنٹی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھیں اسے ان کے چہرے پر دائرے ناچتے نظر آرہے تھے۔

''آجاؤ بیٹا، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''اُف خدا میں کتنا سوئی۔'' وہ سنبھل کر بیڈ کراؤن سے ٹکی۔ آنٹی بار سے آچکی تھیں۔ کھانا پکا کر ٹیبل پر سرو کر کے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ جونہی بستر سے اتری چکرا کر لڑھک گئی۔

''ارے، ارے زارا سنبھالو۔'' آنٹی گھبرا کر اس تک آئیں اسے بغور دیکھا۔ اسے ٹیبل پر لاتے، لاتے ان کی سوچ کی پرواز بہت دور تک چلی گئی مگر وہ مصلحتاً خاموش رہیں۔ کھانے کے بعد انہوں نے اسے زبردستی روک لیا اور عطیہ بیگم کو اطلاع دے دی۔ عطیہ جل بھن گئیں مگر کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔ اگلے روز چھٹی تھی وہ ثمین سے بھرپور گفتگو کر سکتی تھیں۔ رات انہوں نے اسے سلیپنگ پلز بھی نہیں لینے دیں۔ اب وہ صبح اس کے جاگنے کی منتظر تھیں...... وہ جاگی تو کافی فریش تھی اسے بھرپور اور پُرسکون نیند آئی تھی۔

''سب سے پہلے تو تم، کل میرے ساتھ چل کر اپنا چیک اپ کرواؤ......'' ناشتے سے فارغ ہو کر آنٹی نے اس سے کہا۔ وہ ثمین کے حوالے سے ایک، ایک بات سے زارا کے توسط سے واقف تھیں۔

''چیک اپ......؟ کیوں، مجھے کیا ہوا؟'' ثمین نے چونک کر تیوری چڑھائی۔

''اللہ کرے کچھ نہ ہوا ہو......'' انہوں نے دل میں سوچا۔ ''مجھے تم بہت کمزور لگ رہی ہو۔'' آنٹی نے بات بنائی۔

''دیکھو ثمین اس دنیا میں اپنا حق مانگا نہیں جاتا، نہ کسی دوسرے کا دیا جاتا ہے اپنا حق نہ ملے تو چھینا جاتا ہے، تمہیں علم ہی نہیں کہ تم کتنی طاقتور ہو دو منزلہ گھر تمہارا...... لگژری اپارٹمنٹ تمہارا...... پھر بھی تم ایک،

ایک پائی کے لیے اپنی پھپو کی طرف دیکھتی ہو، وہ خزانے پر بیٹھے سانپ کے مانند پھنکارتی رہتی ہیں اور تم ڈرتی رہتی ہو......انہوں نے کہا ان کا پکایا کھانا مت کھانا......تم سہم گئیں......یہ کھانا وہ تمہارے پیسوں سے پکاتی ہیں۔''

''جانتی ہوں آنٹی۔'' وہ بہت ہولے سے بولی۔

''جب جانتی ہو تو مجھے بتاؤ وہ کیسے تمہیں روک سکتی ہیں، جتنے عرصے انہوں نے مفت میں تمہارے گھر اور پیسے پر قبضہ کیا اتنے پیسے دے کر تم ایک میڈ بھی رکھ سکتی ہو، تمہیں چاہیے تھا کہ تم ان سے اس وقت کہتیں......آپ فوراً یہ گھر چھوڑ دیں۔''

''نہیں آنٹی، میں اس طرح ان سے نہیں کہہ سکتی...... وہ مجھے نہ نکالیں لیکن اگر وہ گھر چھوڑ کر چلی گئیں تو میں تنہا رہ جاؤں گی۔'' اس کی آواز اور نظریں دونوں مدھم تھیں۔

''وہ کہیں نہیں جاتیں......مفت میں اتنا بڑا گھر ملا ہوا ہے۔'' زارا درمیان میں بول پڑی، آنٹی نے تائید میں سر ہلایا۔

''اچھا چلو...... تم لوگ کوئی اچھی سی مووی دیکھو...... میں کام سمیٹوں، آج چھٹی ہے کام والی تو آئے گی نہیں اور ہاں کل میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے۔'' وہ جاتے ہوئے مڑ کر بولیں۔''میں تمہیں گھر سے پک کرلوں گی۔ پھپو کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ کمرے سے نکل گئیں۔

''ممی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بلکہ تم پھپو کو باور کرادو یہ تمہارا گھر ہے، مفت میں رہیں گی تو کھانا پکانا پڑے گا۔'' زارا نے آخری جملہ گا، گا کر کہا اسے ہنسی آنے لگی تبھی آنٹی کسی کام سے پھر سے کمرے میں آئیں۔

''بالکل، بالکل...... بالکل مت ڈرو......''

''تمہیں اپنی طاقت کا پتا ہی نہیں ورنہ تم حکومت کررہی ہوتیں۔'' زارا اس کی برین واشنگ کررہی تھی۔

☆☆☆

''یہ کہاں کی تیاری ہے؟'' اسے آنٹی کے ساتھ ڈاکٹر کے جانا تھا، تیار ہوتا دیکھ کر پھپو تڑخیں......انہیں اس کی ایک، ایک ادا پُراسرار لگ رہی تھی۔

''آپ کو بتانا ضروری نہیں......'' اس نے خود میں خوب ہمت مجتمع کر کے کہا۔

''بی بی شریفوں کی طرح رہنا ہے تو رہو۔''

''یہی بات آپ کے لیے ہے، منہ بند کر کے رہنا ہے تو رہتی رہیں، یہ گھر میرا ہے، ایسا نہ ہو کھڑے، کھڑے گھر سے نکالا مل جائے۔''

پھپو فق منہ کے ساتھ اسے تکنے لگیں۔ وہ تو انتہائی ڈری سہمی لڑکی تھی۔ آج اسے کیا ہوگیا تھا۔

پھر انہوں نے غصے سے سر جھٹکا۔

''ایک رات زارا کے کیا گزار کر آئیں بدلحاظ بدزبان اور چلتر ہی ہوگئیں۔''

''اس سب کے لیے آپ نے ہی مجبور کیا ہے۔''

''اب وہ گھسے اس گھر میں...... دیکھتی ہوں۔'' پھپو پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکلیں۔

''اس گھر میں لوگ میری مرضی سے آئیں گے اور میری مرضی سے جائیں گے، یہ میرا گھر ہے۔'' کمرے سے نکلتے، نکلتے بھی ثمین کے جملوں نے ان کا پیچھا کیا۔ ثمین خود میں ایک نئی انرجی محسوس کررہی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے اس کے وجود میں ایک نئے وجود کی خبر دی تو آنٹی کے ساتھ، ساتھ وہ بھی ڈھے سی گئی۔ اسے لگا اس کے وجود کی عمارت میں زلزلے نے تباہی مچادی ہے۔

''نہیں بی بی ...... ایک تو ہم یہ گناہ کا کام نہیں کرتے، دوسرے اب بہت دیر ہوچکی ہے...... پھر یہ خود بھی بہت کمزور ہیں، اینمک ہیں آپ ان پر کیوں ظلم کررہی ہیں؟ اللہ اولاد کی نعمت بھی اپنے محبوب بندوں کو دیتا ہے۔'' آنٹی نے ڈاکٹر سے جھک کر سرگوشی میں کچھ کہا جس کے جواب میں ڈاکٹر نے تقریر جھاڑ دی۔

''آپ ان کی کون ہیں؟'' ڈاکٹر اب بھی آنٹی کو شاکی نظروں سے تک رہی تھی۔

''مم...... ماں......'' آنٹی نے خود کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی۔

''ماں ہو کر بیٹی کو مشورہ دے رہی ہیں کہ آنے والے وجود کو قبل از وقت ختم کر دو...... اور خود بیٹی کو بھی موت کے منہ میں دھکیل رہی ہیں...... واہ شاباش...... بہت اچھی ماں ہیں۔ کیا آپ نے ان کے شوہر سے پوچھ لیا ہے۔'' آخری جملہ طنزیہ تھا۔

''جائیں بی بی جائیں، میں یہ کام نہیں کرتی۔'' ڈاکٹر نے غصے سے فائل کھینچی آنٹی اٹھنے لگیں۔

''جب کوئی وجود تخلیق پا جاتا ہے تو رب اس کے رزق کا خود بندوبست کرتا ہے اور رزق میں کھانا پینا کپڑا لتا، غرض تمام ضروریاتِ زندگی آ جاتی ہے۔ وہ رازق ہے، اس نے بندوں کا ذمّہ لیا ہے، وہ اپنی ذمّے داری سے روگردانی کرنے والا نہیں۔'' ڈاکٹر نہ جانے کیا سمجھ کر تقریر کرنے لگی۔

ثمین کے اردگرد دھند کے جالے تنے ہوئے تھے۔ دور پاس کی ہر شے دائروں میں گھوم رہی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے آنٹی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔

''مجھے اندھیروں میں دھکیل کر جانے والا خود نہ جانے کہاں عیش کر رہا ہوگا۔''

☆☆☆

''محبت تو اِک جاوداں زندگی ہے۔'' وہ دیوار سے سر ٹیکے قالین پر پیر پھیلائے بیٹھا بار، بار یہی سونگ سنے جا رہا تھا۔ اس سونگ سے منسلک یونیورسٹی کی یادیں کسی فلم کے مانند اس کی نظروں میں گھوم رہی تھیں۔ ایش ٹرے سگریٹوں کے ٹوٹوں سے بھر چکی تھی۔ انگلیوں میں دبی آخری سگریٹ کا گل اس کی پوروں کو جلانے لگا تب اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی تو باقی ٹُوٹے قالین پر آ رہے تبھی مما روم میں داخل ہوئیں اور بے تحاشا کھانستے ہوئے لائٹ آن کی، انہوں نے دوپٹے سے ناک کو ڈھانپا اور چلائیں۔

''کیا ہو گیا ہے شاہ میر تمہیں۔ کیوں خود کو قتل کرنے کے در پے ہو۔'' وہ کھانستی جاتیں دوسرے ہاتھ سے پردے ایک طرف سرکاتی جاتیں۔

''زندگی کسی ایک ہی لڑکی پر آ کر ختم نہیں ہو جاتی۔'' شاہ میر نے ان کو اجنبی نظروں سے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ وہ اس حادثے سے پورے طور پر لاعلم تھیں۔ جس کا باعث شاہ میر کی ذات تھی۔

''اب اگر اس کی پھپو اس کا رشتہ نہیں دیتیں تو ہم اغوا تو نہیں کر سکتے اسے کہ نہیں بھئی ہمارے شہزادے نے جس کی خواہش کی ہمیں ہر صورت وہی ملنی چاہیے......'' وہ سر جھکائے کارپٹ پر نگاہیں گاڑے رہا' وہ انہیں کیسے بتاتا کہ بات یہیں پر آ کر ختم نہیں ہو گئی ہے...... وہ ضمیر کا قیدی بن گیا ہے، کیا وہ اسے آزادی دلا سکتی ہیں؟

''تم کہتے ہو تو میں دوبارہ ان کے گھر چلی جاتی ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر رشتہ مانگوں گی۔'' مما نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''مما اب وہ وہاں نہیں رہتی۔''

''کہاں گئی؟'' مما نے بالکل عام سے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا...... سارا شہر کھنگال ڈالا...... وہ نہیں ملتی۔'' چونکہ وہ پھپو سے ملنے کے بعد بھی کئی بار ان کے گھر جا چکا تھا اور پھپو نے اپنی جان چھڑانے کے چکر میں اسے باہر کے باہر ہی یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں جا چکی ہے۔ مما بہت پیار سے اس کے قریب آئیں کہ اچانک اچھل پڑیں۔ دوپٹا دوبارہ ناک پر رکھ لیا۔

''شاہ میر......'' انہوں نے غصے میں اس کے نام کو کھینچا...... ''کس قدر سگریٹ کی بُو ہے توبہ ہے۔ تمہارے تو روم، روم میں یہ بدبو بس گئی ہے۔'' وہ دور ہو کر کرسی پر جا بیٹھیں۔ کافی ساعتیں دبے پاؤں گزر گئیں۔ مما نے خود کو کمپوز کیا گلا کھنکھارا۔

''شاہ میر...... رفعت آنٹی نے ایک لڑکی بتائی ہے تمہیں میچ کرتی ہے۔''

''مما میں بالکل شادی کے موڈ میں نہیں۔ آپ سوری کر لیں۔'' وہ اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

''حد ہوتی ہے...... شادیاں بھی بھلا موڈ پر ہوتی ہیں۔'' انہوں نے سر پکڑ لیا۔

☆☆☆

اس نئی افتاد نے تو اسے اور زیادہ ہراساں اور قنوطی بنا دیا تھا۔ خود کو خوب ڈھک اوڑھ کر رکھتی، ہر ممکن خود کو بڑی سی چادر میں چھپاتی مگر جب آنٹی کے ساتھ اسے ڈاکٹر کے جانا پڑتا تو پھپو اسے عجیب نظروں سے تکتیں۔ اسے ان سے خوف آنے لگا تھا۔ جس کا اظہار اس نے آنٹی سے کیا تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔

''دیکھو ثمین، حالات کو فیس تو کرنا ہے۔ اگر پھپو کچھ گڑ بڑ کرتی ہیں تو مجھے فون کر دینا...... اور ہاں...... میری ایک کلائنٹ کے ایک واقف کار کا orphan house ہے، میں ان سے بات کرلوں گی۔ تم آگے کی بالکل فکر مت کرنا۔''

اس نے ممنونیت سے سر ان کے سینے پر ٹیک دیا۔ آنسو کا ایک قطرہ اس کی آنکھ سے نکل کر آنٹی کے دوپٹے میں جا چھپا۔

''محبت تو اِک جاوداں زندگی ہے۔'' دور کہیں بجتا نغمہ اس کے کانوں میں سرسرایا تو اس نے اپنے کان دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیے۔

''کم ظرف، دھوکے باز، فراڈیا۔'' وہ دیر تک سسکتی رہی۔

''جیسی ماں ویسی بیٹی (فحش گالیاں) یہ کس کا گناہ تیرے وجود میں پل رہا ہے؟'' پھپو نے اسے بغور دیکھا تو بالوں سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ اس نئی اور بالکل اچانک پڑنے والی افتاد کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ تیورا کر گر پڑی۔ پھپو نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی مرمت کی۔

''بدمعاش، بدچلن ہمارے خاندان پر کالک مل دی۔'' وہ اسے دونوں ہاتھوں اور کبھی، کبھی لاتوں سے مارتی جاتیں۔

''تبھی تو کہوں کمرے میں کیوں بند ہے؟ ہو نہ ہو یہ اسی آفس والے لڑکے کا گناہ ہے جو ہر چند دن بعد تجھے پوچھنے چلا آتا تھا۔'' ثمین نے ان کے اس جملے کو بغور سنا پھر وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ ساتھ میں خود کو مار سے بچاتی بھی جاتی اور سوچوں کے گرداب میں اندر ہی اندر ڈوبتی بھی جاتی۔

''تو...... تو شاہ میر اسے ملنے آتا رہا اور پھپو اس سے چھپاتی رہیں۔'' اسے لمحہ ہی لگا یہ سب سمجھنے میں...... اس کے ہونٹ اور ناک سے خون جاری تھا وہ گرتی پڑتی اٹھی خود کو پھپو سے بچاتی کمرے میں گھس گئی۔ وہ سسکیوں سے روتی جاتی اور آنٹی کو فون پر سب روداد سناتی جاتی۔

☆☆☆

بہت زوردار دستک تھی جیسے آنے والا دروازہ توڑ ہی ڈالے گا۔ پھپو بڑبڑاتی دروازے تک آئیں۔ زارا کے والدین کو دیکھ کر پھپو کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے دروازہ پورا نہیں کھولا تھا۔ زارا کی ماں بہت باہمت اور مرد مار قسم کی خاتون تھیں پوری طاقت سے دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ ساتھ میں زارا اور اس کے والد بھی تھے۔

''ثمین کو بلائیں۔'' کڑک دار آواز سے وہ گویا ہوئیں۔

''وہ...... وہ سو گئی ہے۔'' پھپو کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ وہ ثمین کے فون پر آئی ہیں۔ آوازوں کے شور سے ثمین باہر نکل آئی۔ آنٹی کو دیکھ کر وہ دوڑ کر اُن سے لپٹ کر سسک اٹھی۔

''ارے یہ کیا؟'' انہوں نے اسے خود سے الگ کر کے دیکھا۔

ہونٹ پھٹ چکا تھا جہاں سے اب بھی خون رس رہا تھا، ناک کا خون البتہ جم چکا تھا۔ ماتھے کا گومڑ نیلے رنگ کا ہو چکا تھا۔

''کیا آپ کو علم ہے یہ پولیس کیس ہے؟'' وہ پھپو کی سمت گھوم کر چیخیں۔

''مم...... میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''آپ پولیس کو فون کریں۔'' زارا کی امی کی آواز مدھم نہیں ہوئی تھی، وہ اپنے شوہر سے مخاطب

تھیں۔ ساتھ میں پھپھو کو بھی تکتی جاتی تھیں۔

''مم...... مگر میں نے کیا کیا ہے؟''

''یہ پولیس آپ سے خود اگلوا لے گی۔''

''دیکھیں بہن......'' خود کو کمپوز کرتے ہوئے پھپھو خوشامد پر اتر آئیں۔

''آپ کو نہیں پتا کہ اس نے کیا، کیا ہے؟ میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا محترمہ...... آپ فی الفور ثمین کا گھر خالی کر دیں۔''

''اس نے ہمارے خاندان کے منہ پر کالک ملی ہے۔'' پھپھو نے بلا تکان بات جاری رکھی۔

''محترمہ...... آپ کے علم میں کچھ نہیں...... یہ اس گناہ کا بوجھ ڈھو رہی ہے جو اس سے زبردستی کیا گیا ہے...... جس میں اس کی مرضی کا کوئی حصہ نہیں۔'' یہ زارا کے والد تھے۔ پھپھو دنگ انہیں تکتی رہ گئیں۔

''تو...... تو یہ مجھے بتاتی ناں......'' پھپھو نے تھوک نگلا۔

''کاش...... کاش آپ کا کردار ایسا ہوتا...... اتنا شفیق، اتنا مہربان کہ ثمین آپ کے کاندھوں پر سر رکھ کر دل کا بوجھ اتار کر ہلکی پھلکی ہو جاتی...... آپ سگی پھوپی ہیں مگر آپ کا کردار کسی ظالم و سوتیلی سے کم نہیں۔'' زارا کی امی کا غصہ کم ہو کے نہیں دے رہا تھا۔

پھپھو گم صم سب کو تک رہی تھیں۔

''یا تو آپ ابھی اور اسی وقت ثمین کا گھر خالی کر دیں یا پھر......''

''مم...... مگر اس کے والد نے یہ گھر مجھے دیا ہے۔'' پھپھو نے ان کی بات درمیان سے اچکی۔

''لائیں پیپرز دکھائیں۔'' وہ ایک کہنہ مشق وکیل تھیں۔ سو جرح کرنے لگیں۔

''نہیں، پیپرز نہیں ہیں۔'' منہ زبانی کہا تھا۔

''ہا......'' وہ ہنسیں۔ ''ایسی باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں...... یا تو آپ گھر خالی کریں...... یا اپنی زبان کو تالو سے لگا کر رکھیں۔ یہ گھر ثمین کا ہے۔ وہ جب چاہے آپ کو نکال سکتی ہے۔'' پھپھو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی رہ گئیں۔

☆☆☆

حفظِ ماتقدم کے طور پر زارا کی ماں نے اسے فلیٹ میں شفٹ ہونے کو کہا تا کہ اس پرانے محلے میں ثمین کے کردار پر انگلی نہ اٹھے۔ پھپھو طوعاً و کرہاً اس کے ساتھ فلیٹ میں شفٹ ہوئیں۔ کیونکہ زارا کی امی نے انہیں کہہ دیا تھا کہ اب اس دو منزلہ گھر کا کرایہ ثمین لے گی یا تو آپ ثمین کے ساتھ فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں یا پھر اپنا کہیں اور بندوبست کر لیں۔

وہ اس بڑھاپے میں کہاں جاتیں۔ سو چپ چاپ منہ سیئے فلیٹ میں آ گئیں۔ یہاں ثمین نے اپنے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی۔ گھر میں پھپھو کا کردار بھی ایک کھانا پکانے والی ملازمہ سے کم نہیں رہ گیا تھا۔ ثمین ان سے صرف مطلب کی بات کرتی تھی۔

اسپتال میں آنٹی نے بچے کی ولدیت کے خانے میں شاہ میر کا نام لکھوانا تھا جو بیوی اور ہونے والے بچے کو چھوڑ کر دور دیس جا بسا تھا۔ زارا کی امی بہت زیرک وکیل تھیں اور انتہا درجے کی مخلص خاتون بھی۔

☆☆☆

شاہ میر شادی کے معاملے میں ماں کے حکم کو تو اب تک ٹالتا رہا تھا لیکن جب اس کے پاپا نے اس سے حتمی بات کی تو سر جھکانے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ ایشل اس کے والد کے دوست کی بیٹی تھی، خوش شکل و خوش لباس...... جب دونوں کے والدین نے اس رشتے پر منظوری کی مہر ثبت کی تو ایشل کے خوابوں میں شاہ میر جیسے وجیہہ نوجوان نے ڈیرے ڈال دیے۔

☆☆☆

ایشل دلہن بنی سامنے بیٹھی تھی اور شاہ میر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کو کیسے آگے بڑھائے۔ اس سے اسے الفاظ کا چناؤ کرنے میں انتہائی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا پھر اس نے کچھ سوچ کر گلا کھنکھارا۔

''ایشل میں تمہیں کسی قسم کے دھوکے میں رکھنا

نہیں چاہتا......'' شادی کی پہلی رات اسے اپنے شوہر سے یہ کس قسم کے جملے سننے کو مل رہے تھے۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''یہ شادی قطعاً پاپا کی ضد کا نتیجہ ہے۔'' ایشل کو اپنی سماعتوں میں دھماکوں کی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔

''میرا گوشت پوست کا بنا وجود بظاہر بڑی مضبوط عمارت ہے لیکن یہ ''دل'' کے وجود سے بالکل خالی ہے۔'' شاہ میر اپنی دُھن میں بولے چلا جارہا تھا۔

''تمہیں یہاں سب کچھ ملے گا میرے دل کے سوا......'' ایشل تو چکرا کے رہ گئی۔

نہ منہ دکھائی نہ زندگی کی شاہراہ پر سفر کا آغاز کرتے میٹھے بول......وہ مڑا اور ایشل کے بالکل قریب آ گیا۔ اس نے بہت بے بسی سے ایشل کا ہاتھ تھاما۔

''میں......میں ضمیر کا قیدی ہوں ایشل......''

ایشل نے محسوس کیا اس کے محبوب مجازی خدا کے ہاتھ برف کی سل کی طرح یخ ہو رہے تھے۔

''میں نے جس لڑکی کو چاہا، اس کے ساتھ غلطی کر بیٹھا اور اسے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ خدا جانے وہ کہاں چلی گئی۔'' شاہ میر آبدیدہ تھا۔

ایشل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شادی کی پہلی رات ہی اسے اپنے مجازی خدا سے انتہا درجے کی گھن آئی۔ جسمانی و روحانی دونوں طور پر اس کا شوہر کسی اور کا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی غلطی کو کس سہولت سے اس کی سماعتوں میں انڈیل رہا تھا۔ یہی غلطی عورت سے ہو جائے تو زمین کے کنارے اس کے لیے تنگ کر دیے جاتے ہیں۔

غصہ، غم، دکھ، افسوس نہ جانے کون، کون سے جذبے یکے بعد دیگرے ایشل کے جسم کو شل کر رہے تھے۔

''میں ضمیر کا قیدی ہوں۔'' اس جملے کی تکرار کرتے، کرتے شاہ میر نے اپنا سر تھام لیا۔ اس سے ایشل کا جی چاہا وہ کم از کم اتنی زور سے تو چیخے کہ چھت اکھڑ کر ان پر آ رہے...... در و دیوار ڈھے جائیں...... زمین میں ایسا ارتعاش پیدا ہو کہ یہ حجلۂ عروسی اندر دھنس جائے......مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ہاں اس کے جسم میں اٹھتا طوفان شدت سے سر مار، مار کر اس کے وجود کو گھائل کرتا رہا۔

کافی سمے بیت گیا۔ اندر کے طوفان سے لڑتے، لڑتے بہت تحمل سے اس نے شاہ میر کو کاندھے سے چھوا۔

''جو ہو گیا وہ حرفِ غلط ضرور تھا، اسے کاٹا جا سکتا ہے نہ مٹایا جا سکتا ہے......زندگی کی کتاب کا یہی اصول ہے۔ اس پر لکھی تحریر مٹ نہیں سکتی...... ہاں......ہم آئندہ پلٹ جانے والا صفحہ بہت احتیاط سے لکھیں...... یہ تو ہو سکتا ہے ناں؟'' اس نے جواب طلب نظروں سے شاہ میر کی سمت دیکھا۔ شاہ میر نے خفیف سا گردن کو موڑا۔

''میں اسے بھول نہیں پاتا......'' ٹوٹا کانچ جیسے شاہ میر نے اس کے دل میں پیوست کر دیا۔ وہ بہت بردبار اور معاملہ فہم تھی۔ یہ وار بھی سہہ گئی۔

''کسی کو یاد رکھنا...... یا بھول جانا...... یہ انسانی اختیار میں نہیں۔ سو آپ آئندہ کی زندگی جو میرے ساتھ شروع ہوئی ہے اسے تلخ نہ کیجیے......آپ مجھے کوئی خوشی مت دیں...... میں کبھی آپ سے آپ کی روح طلب نہیں کروں گی۔ میں اپنی ہر خوشی سے دست بردار ہوتی ہوں۔''

شاہ میر نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جھلمل ستارے تھے۔

''میں آپ کے راز کی امین بھی رہوں گی۔ اب اس راز کو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں دُہرائے گا۔ لیکن دنیا والوں کے سامنے میں آپ کے لیے اور آپ میرے لیے اجنبی نہ ہوں۔'' بہت دیر تک اسے تکتے رہنے کے بعد شاہ میر نے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔

پھر جیب سے ایک ڈبیا نکال کر بے حد قیمتی بریسلیٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ دیر ایشل اسے تکتی رہی۔ شاہ میر اٹھا اور سامنے صوفے پر جا بیٹھا۔ یہ

سائن تھا کہ اپنی منہ دکھائی خود ہی پہن لو۔ ایشل نے بریسلیٹ خود ہی اٹھالیا۔

شاہ میر نے ڈیک مدھم سُروں میں آن کیا۔

''محبت تو اِک جاوداں زندگی ہے۔'' شاہ میر نے سر صوفے سے ٹیک کر آنکھیں موندلیں۔ ایشل نے چور نظروں سے اسے تکا۔ وہ اس رومینٹک سونگ میں کوشش کے باوجود بھی کھو نہیں سکتی تھی۔ یہ کسی اور کو خوابوں میں سجا کر سنا جارہا تھا۔

وہ ڈریسنگ روم میں چینج کرنے چلی گئی۔ اور آکر کروٹ بدل کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ یہ اس کی ازدواجی زندگی کی شروعات کا پہلا دن تھا۔ اس نے آنکھیں ضرور موندلی تھیں لیکن سوئی نہیں تھی۔ کافی لمحے بنا چاپ کیے گزر گئے تبھی شاہ میر نے اس کے بازو پر اپنا سرد ہاتھ رکھ دیا۔ ایشل کا دل بری طرح دھڑکا۔

☆☆☆

یہاں شاہ میر نے ایشل کے ہمراہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک نئے سفر کا آغاز کیا تو وہاں دوسری طرف ثمین نے ایک ان چاہے نحیف ونزار وجود کو جنم دیا۔

''مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔'' سسٹر کی آواز پر اس نے چہرہ ڈھانپ لیا۔ پہلی بار شاہ میر کا چہرہ اس کے سامنے لہرایا۔ اسے لگا اس کا وجود کئی ٹکڑوں میں بٹ کر ذلت کی اتھا گہرائی میں جا گرا ہے۔ آنٹی کا چہرہ بھی دھواں، دھواں تھا۔

''بی بی بیٹی کو بوجھ سمجھنا بھی گناہ ہے۔'' ایک سسٹر نے اس کے منہ چھپا کر رونے کو نہ جانے کون سے معنی پہنائے جو اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا۔

اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی آنٹی بچی اور ثمین کو لے کر ''یتیم خانے'' پہنچ گئیں۔ انہوں نے اپنی دوست سے پہلے ہی بات کر رکھی تھی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ ثمین کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے، وہ ثمین کی دوسری شادی کریں گی لہٰذا وہ بچی کو اس کی زندگی سے مائنس کرنا چاہتی ہیں۔

☆☆☆



غزل

آج پھر تیری یاد آئی ہے
شہرِ خوشبو سے صبا آئی ہے
دل کے آنگن میں پھول مہکے ہیں
پھر کسی شوخ کی یاد آئی ہے
مہکی، مہکی سی فضا ہے ہر سو
زلف کس شان سے لہرائی ہے
ترچھی نظروں سے دیکھنا ان کا
ہائے کیا شانِ دلربائی ہے
دل میں یادوں کی ایک لہر اٹھی
آج پھر آنکھ جو بھر آئی ہے

کلام: فریدہ افتخار، اسلام آباد

وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو پھپو نے غم، غصہ، دکھ، طنز کے ملے جلے تاثرات سے اس کا سواگت کیا۔ زارا کی امی کو دیکھ کر وہ کچھ سنبھل گئیں۔ انہیں زارا کی ماں سے قدرے خوف آنے لگا تھا۔ اس روز زارا کی امی اس کے ہمراہ اس کے گھر رکیں۔

☆☆☆

سوچوں کے گرداب میں اتنے چکر تھے کہ وہ چکرا جایا کرتی۔ نیند کی گولیاں بھی اب کم ہی اثر کرتی تھیں۔ کافی ٹائم گزر چکا تھا مگر وہ اس لمحے کو اپنی زندگی سے نکال ہی نہیں پارہی تھی جب بچی ایڈمنسٹریٹر کو دینے کے بعد وہ اور آنٹی دروازے تک آئیں تو اسے محسوس ہوا وہ اپنے اعضا کا کوئی حصہ

وہاں چھوڑ آئی ہو۔

ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان، انگلیاں، سر، چہرہ سب اس نے چھو کر محسوس کیے۔ سب اپنی جگہ موجود تھے...... پھر...... پھر وہ کیا تھا جو اس سے رہ گیا تھا...... اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ بھول آئی تھی یا گنوا بیٹھی تھی۔

خود کو مڑ کر دیکھنے سے وہ روک نہ پائی۔ آخری بار ہی سہی۔ اس نے بچی کو دیکھ لیا تھا۔ ننھی جان بلک کر روئی تھی۔

یہ وہی ہے جس کے سبب اب وہ ذلت آمیز زندگی گزارے گی۔ اس نے بہت گہری سانس کھینچ کر اپنے اندر اتاری۔ ممتا کے جذبے کو کسی برف کی یخ سل کے نیچے دبا دیا۔ تیزی سے دروازہ عبور کیا جیسے اب اگر مڑ کر دیکھا تو پتھر کی ہو جائے گی۔

☆☆☆

تین دن بعد وہ اسی orphan house میں موجود تھی...... ایڈمنسٹر کے سامنے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”آپ اس بچی کو کسی لاولد خاندان کو نہیں دیں گے۔“ اس کا بس ایک ہی اصرار تھا۔ ایڈمنسٹریٹر قادر شاہ اسے سمجھائے جا رہے تھے کہ اتنی چھوٹی بچیاں ہم اس house میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ تو اتفاق ہے کہ بچی اب تک یہیں ہے۔ ورنہ اِدھر کوئی نوزائدہ آیا اُدھر کسی خاندان نے اسے اڈاپٹ کر لیا۔

”میں...... میں سچ کہتی ہوں...... اسے لے جاؤں گی۔“ نہ جانے کیسے بلا سوچے اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”ابھی کچھ ٹائم تو میں اس سے ملنے بھی نہیں آسکوں گی۔“

”کب......؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹی۔

”آپ کب تک اس کو لے جائیں گی؟“

اور اس کب کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

گھر سے لائی اچھی خاصی رقم اس نے ٹیبل پر ڈال دی۔

”آپ ان پیسوں میں اس بچی کے لیے کوئی میڈ رکھ دیں۔ میں اس کا پورا خرچہ اٹھاؤں گی۔“ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اب تو اس سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

بہت منت سماجت، بحث و مباحثے کے بعد بادلِ ناخواستہ قادر شاہ تیار ہو گئے۔

پھر اس کے بعد وہ اچھی خاصی رقم کسی نہ کسی کے ہاتھ بھجواتی رہی مگر ملنے نہیں گئی۔ فون بھی کرتی مجبوریاں بھی بتاتی...... بالآخر قادر شاہ نے تھک کر خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

دن گزر رہے تھے سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اس کے شانوں کو بوجھل کیے ہوئے تھا۔ کل وقتی ملازمہ کے سبب پھوپھو گھر کا فالتو جز و بن کر رہ گئی تھیں۔ اب ان کا دل تو جو کچھ بولتا اور تولتا تھا وہ اپنی جگہ مگر ان کی زبان واقعی تالو سے ایلفی کی طرح چپک گئی تھی۔

اس ایک سال میں وہ کچھ، کچھ سنبھل چکی تھی۔ اب آنٹی اور زارا کا اس کے گھر آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ آنٹی کے مشورے پر اس نے ایک فرم میں جاب کر لی تھی۔

☆☆☆

”محبت تو اِک جاوداں زندگی ہے۔“ اس نے اپنے کولیگ کو فون کیا رنگ ٹون میں اس غزل کو سنتے ہی اس کی حالت اتھل پتھل ہونے لگی۔ وہ بہت دور ماضی میں بھٹکنے لگی۔ اس ماضی سے پیچھا چھڑانے کے وہ کئی جتن کر چکی تھی مگر اس کا ماضی ایک عفریت کی طرح اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

اس لمحے اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ آفس سے سیدھی اسی orphan house جا پہنچی اور اپنی بیٹی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آنٹی کی دوست کا حوالہ دیا۔ بہت بحث و مباحثے کے بعد بالآخر ایڈمنسٹریٹر نے بچی بلوا کر اس کی گود میں دی۔

اس کی گود میں ایک نرم گرم وجود، اس کا لمس...... وہ محبت پاش نظروں سے اسے تکتی رہی۔ زندگی میں پہلی بار اس کنواری ماں کو احساس ہوا کہ عورت بچہ پیدا کرے یا نہ کرے وہ پیدائشی ماں ہوتی ہے۔

اس نے سنہری بالوں اور ڈارک براؤن آنکھوں والی بچی کو بہت غور سے دیکھا یوں جیسے دل کے کیمرے میں اس کی تصویر سیو کرلی ہو۔ تبھی بچی مسکرائی تو اس کے گالوں کے بھنور بہت گہرے ہوگئے اور وہ دم بخود اسے تکے چلی گئی۔

''کاش میں تمہیں گھر دے سکتی۔ تم کتنی حسین ہو...... کاش تمہاری ولدیت کے خانے میں تمہارے والد کے جائز ہونے کا بھی کوئی خانہ ہوتا۔'' وہ سوچے چلی گئی اور پھر ایکا ایکی جیسے اسے چکر آنے لگے۔

اس نے بچی میڈ کو پکڑائی جو بچی (سارہ) کو لے کر آئی تھی پھر اس نے پرس سے پوری سیلری نکال کر ایڈمنسٹریٹر کی طرف بڑھائی۔ یہ اس رقم کے علاوہ تھی جو وہ بھجوائی رہی تھی۔

''میں اس بچی سے ملنے آتی رہوں گی، یہ پیسے اس کے کھلونوں، کپڑوں اور دودھ کے ہیں۔ اس کو اچھی غذا ملتی رہنی چاہیے۔ آئندہ میں اس کے لیے سب سامان خود ہی لے آیا کروں گی۔ ابھی آپ یہ رکھ لیں۔''

''دیکھیں جی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں سب بچوں کو اچھا ہی رکھا جاتا ہے۔'' ایڈمنسٹریٹر نے انکار کیا۔

وہ کسی صورت نہ مانی اور رقم رکھ کر ہی اٹھی۔ وہ آنسو پونچھتی باہر آگئی پھر اس کے بعد کبھی کبھار بچی سے ملنا اس نے اپنا معمول بنالیا۔

☆☆☆

ہر سال کی طرح آج بھی شاہ میر کمرے میں نیم تاریکی کیے روایتی کینڈل کیک پر سجائے تنہا بیٹھا تھا اور گیت وہی بج رہا تھا جو اول دن ثمین کو دیکھتے ہی اس نے گایا تھا۔

دور بیٹھی ایشل ہر سال کی طرح خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل پر آج بھی روزِ اول کی طرح آرے چل رہے تھے مگر وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

وہ کتنی بے بس تھی اپنے شوہر کو ایک غیر عورت کی سالگرہ منانے سے آج تک روک نہیں پائی تھی۔ وہ جانتی تھی جب تک موم بتی پگھل نہ جائے شاہ میر نے ٹرانس ہی میں رہنا ہے۔

''کاش تمہاری زندگی سے ثمین کا عفریت نکل جائے تو تم کتنے اچھے شوہر ہو۔ ہر طرح خیال رکھنے والے، وجیہہ پرسنالٹی، قدآور، خوب صورت، گمبھیر آواز والے......'' اسے مدت پہلے کہیں پڑھی لائنز یاد آگئیں۔

''دو بہت اچھے لائف پارٹنرز، ضروری نہیں زندگی کی شاہراہ پر ایک دوسرے کے بہت اچھے رفیق کار بھی ثابت ہوں۔''

''کیا میری محبت میں کوئی کمی کوئی کجی ہے جو آپ ثمین کو آج تک نہیں بھول پائے؟'' شاہ میر کے اٹھتے ہی ایشل نے دھیرے سے پوچھا۔

''وہ میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے، دل کی دھڑکن کو بے ترتیب کرنے والا ردھم ہے، سانسوں کا زیروبم ہے...... جس دن رگوں میں خون منجمد ہوجائے، دھڑکنیں بے ترتیب ہوکر تھم جائیں اور سانسوں کا زیروبم ساکت ہوجائے، سمجھ لینا...... یاد رکھنے اور بھول جانے کی کہانی ختم ہوگئی۔''

''اوہ...... خدا نہ کرے......'' ایشل نے گھبرا کر اپنا دل تھام لیا۔

وہ اسے نہ چاہے...... مگر وہ تو اسے چاہتی تھی جس نے بہت ایمان داری سے اول روز ہی اسے بتا دیا تھا میرے جسم کی عمارت دل کے وجود سے خالی ہے۔

☆☆☆

زندگی کے طویل گیارہ برس گزر چکے تھے۔ یہ گیارہ برس اس نے تپتی ریت پر گزارے تھے۔ ان گیارہ برسوں میں وہ اپنی بیٹی کو لمحہ بھر کے لیے بھی فراموش نہیں کرسکی تھی۔ اب اس سے ملتے رہنا اس کے معمولات میں شامل ہوگیا تھا۔ ایڈمنسٹریٹر نے بتایا کہ اب انہوں نے میڈ کو فارغ کردیا ہے۔

پھپھو کا انتقال ہوچکا تھا۔ زارا شادی ہوکر بحرین

چلی گئی تھی۔ اس کے والدین کینیڈا شفٹ ہو گئے تھے اور وہ مٹھی سے پھسل جانے والی ریت کی طرح خالی رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی دل میں ایک شناسا نام کی کسک اٹھتی تو پہروں وہ جاگا کرتی۔ اب تو خواب آور ادویات بھی کارگر ثابت نہ ہوتیں۔ اب اکثر تنہائی میں وہ شاہ میر کی گائی غزل سنا کرتی۔

''شاہ میر...... شاہ میر......'' وہ دھیرے سے پکاری۔ پھر تواتر سے پکارتی چلی گئی۔ اب اسے شاہ میر کو پکارنا بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ یاد کے پردے پر چھائی گہری دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی تو اسے تصور میں شاہ میر کو دیکھنا بھی اچھا لگنے لگا۔

''نہ جانے وہ کہاں ہوگا؟...... کیسا ہوگا؟ کیا مجھے یاد کرتا ہوگا؟'' دل نے دل سے ڈھیروں سوال کر ڈالے۔

''کیا پتا شادی کر کے ایک بہت خوشگوار زندگی گزار رہا ہو۔'' اس خیال کے آتے ہی اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی۔

''میری زندگی برباد کر کے خود عیش کر رہا ہوگا۔'' وہ پاگل جنونیوں کی طرح اپنے بال نوچنے لگی۔ اپنا ہاتھ اپنے ہی دانتوں سے کاٹ ڈالا پھر بے جان ہو کر ایزی چیئر پر ڈھے گئی۔

☆☆☆

دو دن سے اسے تیز بخار نے آلیا تھا۔ نہ جانے اسے اپنی بیٹی بے تحاشا کیوں یاد آرہی تھی۔ وہ ہمیشہ بیٹی کے لیے کچھ نہ کچھ لے جاتی تھی خاص طور پر بہترین کپڑے۔ مگر آج وہ بنا اطلاع دیے خالی ہاتھ ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ ایڈمنسٹریٹر غائب تھا۔ پیون نے بتایا کہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ آپ انتظار کر لیں مگر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ یہ کوئی بہت بڑا ادارہ نہ تھا سامنے کھڑکی سے صحن کا منظر صاف نظر آرہا تھا مختلف عمر کی بچیاں صحن میں پڑتی دھوپ میں کام کر رہی تھیں۔ اس کا دل بے قرار ہوا تو وہ کھڑکی کے قریب پہنچ گئی، ادارے کی ملازمہ ایک بچی پر بری طرح برس رہی تھی۔ اس کا کلیجا منہ کو آیا۔

''اُف خدا لوگ یتیموں اور بے بسوں کے حوالے سے رب سے کیوں نہیں ڈرتے۔'' وہ آبدیدہ ہوگئی۔ تبھی ملازمہ نے ایک بچی کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ثمین کو لگا یہ تھپڑ اس کی بیٹی کے منہ پر کسی نے مارا ہو۔ بچیاں سانجھی ہوتی ہیں، وہ تیزی سے صحن کی سمت بھاگی۔

''اتنی گندی جھاڑو لگاتی ہو...... کل کپڑے بھی صاف نہیں دھوئے تھے۔'' ملازمہ کی آواز انتہائی کرخت تھی۔ بچی چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپے رو رہی تھی۔ اصل میں تو بچی سے پانی گر جانے کے سبب ملازمہ پھسل گئی تھی جس کا غصہ وہ نکال رہی تھی۔

''کیا کرتی ہو بچی کے ساتھ......'' وہ چیخی تو بچی نے بھی سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس لمحے اسے زمین آسمان گھومتے محسوس ہوئے۔ وہ اس کی سارہ تھی، وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''آنٹی مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ یہ مجھے بہت مارتی ہیں۔'' وہ مسلسل اس سے لپٹی سسک رہی تھی اور اس کا دم اس کے حلق میں آکر اٹک گیا تھا۔

''بیگم صاب! آپ اندر جائیں۔ یہاں اس طرف آنے کے آرڈر نہیں ہیں۔'' ملازمہ اس ناگہانی افتاد سے گھبرا گئی۔

''بند کرواپنی بکواس۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

''یہاں بچوں کی اصلاح اور تربیت کے لیے ہر کام سکھایا جاتا ہے۔'' ملازمہ نے سارہ کو کھینچ لیا۔

''چپ ہو جاؤ۔'' وہ بہت زور سے چیخی۔

''مار، مار کر کون کام سکھاتا ہے؟'' چکراتے سر سے وہ اندر بھاگی۔ بچی رو، رو کر فریاد کرتی رہ گئی۔ ملازمہ اسے اندر گھسیٹ کر لے گئی۔

''آنٹی...... آنٹی......'' سارہ کی آواز کی بے بسی اس کے کان کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی مگر وہ بے حد مجبور تھی، بھاگتی ہوئی اندر آگئی۔ ایڈمنسٹریٹر آچکا تھا۔ اس کے اوسان خطا تھے۔

''او بی بی آپ اندر کیوں گئیں؟''

''یہ سب کیا تماشا ہے میری بیٹی کے ساتھ...... کیا میں اس سب کے پیسے دیتی ہوں؟'' وہ روتی جارہی تھی۔

''بی بی آپ بیٹھیں تسلی سے بات سنیں، میں اس ملازمہ کے خلاف تادیبی کارروائی کرتا ہوں۔'' بہت ایمان داری سے وہ نہ جانے کیا، کیا کہتا رہا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

وہ پوری رات اس نے انگاروں پر لوٹ کر گزاری۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کے درمیان ڈول رہی تھی۔ پوری رات کی جاگی صبح اس کی آنکھ لگ گئی تقریباً گیارہ بجے وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو فوراً ہی اس نے شاہ میر کے سیل فون نمبر پر کال کی اسے اور تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ اگلی بیل پر ہی اس نے کال ریسیو کرلی تھی۔

''ثمین......'' ایک مدت بعد اسے شاہ میر کی گمبھیر مگر بے قرار آواز سنائی دی۔ اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

نہ جانے شاہ میر نے اس اثنا میں کتنی ہی بارا سے پکارڈالا۔

''م...... مجھے...... مجھے تم سے ملنا ہے۔'' بس وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

''ہاں ، ہاں کیوں...... نہیں...... تم جب اور جہاں کہو......''

''تم...... تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' بے قراری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ شاہ میر کے ساتھ، ساتھ ثمین کا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا گویا بجھتا شعلہ آخری سانسیں بھر رہا ہو۔

☆☆☆

اور زندگی کا سب سے خوب صورت لمحہ وہ ہوتا ہے جب ہمارا ہاتھ ہمارے ہم سفر کے ہاتھ میں ہو اور ہمارے اٹھتے قدم ایک دوسرے کے قدموں کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور ایک ہی ردھم میں گنگنا رہے ہوں...... پھر چاہے اس کی نگاہ کا مرکز ومحور کوئی بھی ہو، کسی طرف بھی ہو...... اسے ہر جگہ، ہر طرف ہم ہی ہم نظر آئیں گے...... اور جب زندگی سے خوشیوں بھرا خوب صورت لمحے ریت کی طرح پھسل جائے تو زندگی میں باقی بچتا ہی کیا ہے......؟

وہ دونوں ریستوران میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ثمین تے نظریں جھکائی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھ میں آئے بلاوجہ کے آنسوؤں سے انتہائی بیزار ہورہی تھی۔ اسے خود پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔ وہ اپنے کمزور پڑ جانے پر جھنجلا بھی رہی تھی۔ جیسے تیسے اس نے آنسوؤں کو کنٹرول کیا۔

شاہ میر بہت چاہت اور سچائی سے اسے تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت ندامت تھی۔ وہ بغور اسے تکتا رہا تھا اور اس کے بولنے کا منتظر بھی رہا۔ اسے ثمین ان گیارہ بارہ برسوں کے بعد کافی کمزور نظر آئی۔ بشاشت تو شاید اس کے اپنے چہرے پر بھی نہیں رہی تھی۔

ثمین نے تھوک نگلا خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ گلا کھنکھار کر بات کا آغاز کیا تو پھر بہتے پانی کی طرح سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

شاہ میر کا چہرہ متغیر ہوتا چلا گیا۔

''تم نے کتنے کوہ گراں، موسم کے جبر تنہا ہی سہہ لیے......'' اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھو کر چھوڑ دیا۔ اس نے چھوئی موئی کی طرح کسمسا کر ہاتھ ٹیبل سے ہٹا کر اپنی گود میں رکھ لیے۔ سر بدستور جھکا ہوا تھا۔

''ایک بار تو پکارا ہوتا۔'' شاہ میر نے بہت وارفتگی سے سرگوشی کی۔

''بے شک میں خطا کار تھا، گناہ گار تھا۔ رات دن اپنے رب سے گڑگڑا کر معافی مانگتا رہا...... کہ ندامت کے آنسو تو بڑے سے بڑا گناہ دھو دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ میں اس کی رحمت سے مایوس نہ تھا مگر بندے......'' اس نے بغور ثمین کو دیکھا...... ثمین نے سر مزید جھکا دیا۔

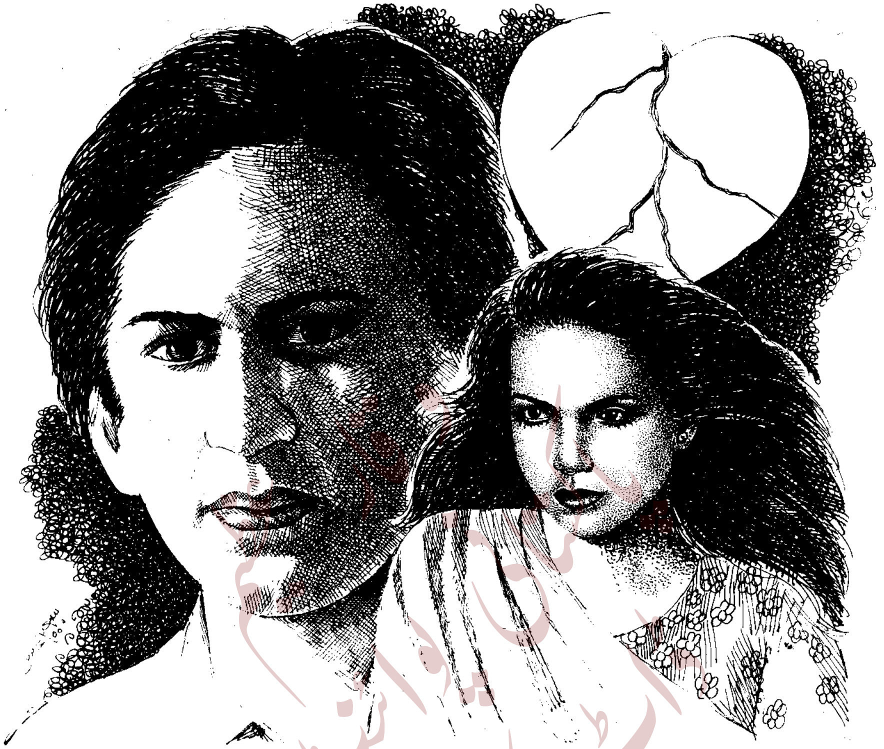
''مگر بندے معاف نہیں کرتے۔'' اس نے جملہ دُہرایا۔ ''سو تم نے بھی کبھی مجھے معاف نہ کیا۔'' آنسو ضبط کرنے کی چاہ میں اس کا سر مزید جھکتا چلا گیا۔

اس کی نگاہ اپنے پیر کے انگوٹھے پر آ کر ٹک گئی۔
''میں نے تمہیں کتنا ڈھونڈا آفس، گھر، بازار...... تمہاری دوستوں میں...... کہاں، کہاں میں نہیں پھرا...... کتنے ہی فون کیے۔ دیکھو تمہارا نمبر آج تک سینے سے لگائے رکھا...... مگر تم نے......''
''میں چاہتی ہوں تم اپنی بچی own کرلو......'' ثمین نے خود کو کمپوزڈ کرلیا تھا۔ اس کی قطع کلامی کر کے ایک دم بولی۔ پھر جب بہت دیر تک دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو اس نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے تکا۔
وہ کچھ سوچ رہا تھا۔
اور کسی گھڑیال کی ٹک، ٹک کی طرح اس کا دل ڈول رہا تھا، وہ نہیں جانتی تھی وہ کیا جواب دے گا۔ کچھ لمحے سرکے اور یکا یک وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پینٹ کے پاکٹ میں ڈال لیے۔
''چلو اٹھو......'' وہ کسی روبوٹ کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

دونوں گاڑی میں آبیٹھے۔ اگنیشن میں کی ڈال کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے ساتھ ہی ٹیپ آن کر دیا۔
''محبت تو اِک جاوداں زندگی ہے...... تو سے نیناں لاگے......'' اُف خدا اس گانے سے پیچھا کیوں نہیں چھوٹ جاتا...... ثمین کو جیسے چکر آنے لگے۔ اس نے منہ کھڑکی سے باہر کی طرف کرلیا۔ منظر تیزی سے گزر کر دھندلے اور دور ہوتے جا رہے تھے مگر اس کی دماغی اسکرین بالکل صاف سلیٹ کی طرح ہوتی جا رہی تھی کوئی منظر دماغ میں نہیں ٹھہر پا رہا تھا۔ دماغ میں ہجوم تھا تو یادوں کا، باتوں کا، گزرے لمحوں کا...... جو سب گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے کٹورے پھر جل تھل ہونے لگے تو اسے اپنی ہارٹ بیٹ واضح سنائی دینے لگی۔
گاڑی ایک جھٹکے سے رک چکی تھی۔
اس نے گردن سیدھی کر کے سامنے دیکھا۔

سامنے کا منظر آنسوؤں کے سبب اب بھی دھندلا اور غیر واضح تھا۔
شاہ میر نے کار لاک کر کے اس کی سائڈ والا دروازہ کھولا۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو اپنے دامن میں گرایا مگر کٹورے پھر بھر گئے۔ اس دھندلکے میں اسے شاہ میر کا پیار سے بڑھا ہاتھ نظر آیا۔
وہ اس کے بڑھے ہاتھ کو نظر انداز کر کے گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ لمحہ بھر کو شاہ میر کا چہرہ دھواں، دھواں ہو گیا مگر جلد ہی وہ سنبھل گیا۔ وہ بہت بردباری سے آگے بڑھا...... اس نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح اسے follow کیا۔ موقع پاتے ہی تیزی سے ٹشو سے اپنے آنسو خشک کیے۔ سامنے جو منظر تھا وہ اس کے لیے قطعی غیر متوقع، حیران کُن اور اجنبی تھا جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھی۔ یہ وہ جگہ ہرگز نہیں تھی جہاں اس کی سارہ رہتی تھی۔
کیا شاہ میر اس کی زندگی کا دوسرا دھوکا دینے جا رہا تھا؟ اس نے سوالیہ نظروں سے شاہ میر کو دیکھا تو دل جل گیا۔
وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر بے ریا، پُرخلوص...... محبت سے بھرپور...... اس نے اب کی بار شاہ میر کو استفہامیہ تکا پھر خود ہی بولی۔
''یہ وہ جگہ تو نہیں...... جہاں سارہ رہتی ہے......''
''جانتا ہوں۔'' وہ بہت وارفتگی سے مسکرایا۔
''سارہ کے پاس بھی چلتے ہیں...... مگر پہلے میں خود کو اس کا اہل تو ثابت کردوں کہ میں باپ ہوں۔''
''قاری شیر دل محمد...... نکاح خواں''، لکھی تختی کی جانب اشارہ کیا اور دوبارہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔
کچھ دیر کشمکش و پیچ کا عالم رہا پھر گویا اس نے خواب کے عالم میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے بڑھے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔



مہرِ وفا

فرح بھٹو

وہ نرم و نازک کلیوں جیسی لڑکی تھی۔ جس کا ایمان محبت اور جس کا عقیدہ خالص وفا پر تھا۔ جس کی نس نس میں یہ ایقان بھرا تھا کہ شدتِ عشق مقابل کو بھی اسی رفتار سے آپ کی محبت میں گرفتار کر دیتی ہے جس کے زور پر آپ کسی کے لیے دیدہ و دل وا کیے رکھتے ہیں۔ اب اس بات میں کتنی سچائی تھی مہر وفا اس سے بے نیاز اپنے یقین کے ساتھ جیتی تھی۔

''مہر وفا'' یہ نام ہی اپنے اندر محبت اور وفا سمیٹے ہوئے تھا اور اپنے نام کے ہو بہو محبت و وفا کے جذبات سے گندھی وہ لڑکی کسی آفاقی دنیا سے آئی لگتی تھی۔

چاند جیسا حسین چہرہ، بھونرا سی کالی آنکھیں، ستواں ناک اور پنکھڑی سے ہونٹ۔ سرو قد نازک سراپا اور اس دلکش وجود کے اندر دھڑکتا خوب صورت دل جو محبت کے ساز پر رقص کرتا تھا۔

اماں بی، ابا میاں ہوں یا چھوٹی بہن ہانی وہ ان سب پر یکساں جان چھڑکتی تھی۔ سہلیوں کی پُرخلوص سہیلی تھی۔اسے تعلق نبھانے اور برتنے کا سلیقہ تھا۔

یونیورسٹی کی فضاؤں میں قدم رکھا تو اپنی ذہانت' حسن اور شائستگی سے دھوم مچادی۔ ہر لڑکا مہر وفا سے دو گھڑی بات کرنے کا متمنی نظر آتا پر مہر خالص مشرقی اقدار کی پابند لڑکی اپنے پروں پر پانی نہ پڑنے دیتی بہ ظاہر نرم لبوں پر مسکراہٹ اور پسِ پردہ محتاط رویّہ......

اس کا ماننا تھا کہ اپنے قیمتی جذبوں کا زیاں نہیں کرنا پل دو پل کی آشنائی سے دامن میں رسوائی کی خاک ہی بھرتی ہے' ماتھے پر افشاں نہیں سجتی...... محبت کا خالص جذبہ ہر ایک پر لٹایا نہیں جاسکتا یوں مہر وفا اپنی محبت اور وفا کو سینت، سینت کر رکھتی، کسی محبت کرنے والے شہزادے کی منتظر تھی جو اس کے وجود کو سچی چاہت سے سیراب کرے اور مہر کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا آفاق حسن کسی شہزادے کی آن بان لیے اس کے دل کی مسند پر براجمان ہوگیا تھا۔ مہر وفا یونیورسٹی میں چند اتفاقی ملاقاتوں کے بعد اس سے یوں مانوس ہوئی گویا آفاق حسن اس کے جنم جنم کا ساتھی ہو وہ بھی مہر کی طرح حسن میں بے مثال اور ذہانت میں باکمال تھا۔

مہر کے واسطے وہ محبت کے پانیوں سے بھرا ایک بادل تھا جو ہر آن اس پر محبتوں کی بارش برسایا کرتا جس میں مہر پور' پور بھیگا کرتی وہ جذبوں میں شدت پسند لڑکا تھا۔ مہر وفا کو اس نے عشق کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

ان دنوں وہ کھلتا گلاب بن گئی تھی۔ اسے دیکھ کر دنیا کو آفاق پر رشک آیا کرتا کہ وہ چمکتا ماہتاب تھی۔

خوشی کے ہنڈولوں میں جھولتے وقت یوں گزرا کہ خبر نہ ہوئی اور فائنل امتحان سر پر آگئے چند دنوں کے بعد جدائی کا آسیب دونوں کے بیچ حائل ہوا چاہتا تھا دونوں کا دن بھر کا ساتھ تمام ہونے والا تھا مہر وفا کے نین کٹورے پانی سے بھرنے لگے تھے۔

''پگلی یہ وقتی جدائی ہے میں بہت جلد اماں اور بہن کو تمہارے گھر بھیج کر تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔''

اس روز مہر کا بے پناہ اداس چہرہ دیکھ کر آفاق نے گویا مژدۂ جاں سنایا۔

''سچ آفاق اب زندگی تمہارے وجود کے بن ادھوری ہے۔'' اس نے اعتراف کیا تھا۔

مہر وفا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملائے تو آفاق نے کسی متاع کی طرح وہ اشک اپنی انگلیوں کی پوروں میں چن لیے تھے۔

وہ دن عہد و پیان اور تجدیدِ وفا کا دن تھا۔

ان کے جذبوں سے بوجھل الفاظ ہوائیں اپنے کاندھوں پر لیے پھر رہی تھیں' ان الفاظ میں ہلکورے کھاتا ملن کا یقین شامل تھا آکاش پر اڑان بھرتے پرندے بھی اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر ان کی محبت کی تائید کر رہے تھے پھر آفاق نے ایک نوکیلے پتھر کی مدد سے ایک درخت کے تنے پر جلی حروف میں اپنا اور مہر وفا کا نام ساتھ' ساتھ کھود کر لکھا اس کے بعد وہ دونوں دلوں میں پیار' محبت اور نیک خواہشات لے کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے ان دونوں کو یقین تھا کہ یہ جدائی عارضی ہے اس کے بعد ان کو ہمیشہ' ہمیشہ کے لیے ایک ہوجانا ہے۔

اور ان کے اس معصوم سے یقین پر قسمت مسکرائی تھی۔

☆☆☆

''بہن میں معذرت خواہ ہوں کہ ہم ذات برادری سے باہر لڑکیاں نہیں بیاہتے۔''

اماں نے مہمان خواتین کی آمد کا مقصد جان کر ٹکا سا جواب دیا تو دروازے کی اوٹ میں کھڑی مہر وفا کانپ کر رہ گئی۔

''بہن اب یہ فرسودہ رسم و رواج کہاں چلتے ہیں تعلیم نے انسان کو شعور دیا ہے پھر ہمارے مذہب میں بھی ذات' پات' رنگ' نسل کا کوئی امتیاز موجود نہیں۔ انسان کا کردار اور دینداری اہمیت رکھتی ہے۔'' آفاق کی ماں نے احتجاج کیا تھا۔

''ہمارے یہاں یہی چلتا آیا ہے اور شاید چلتا رہے گا۔'' اماں نے بے مروتی کی حد کردی۔

''بہن خیالات کی وسعت ترقی کی ضمانت ہے۔

زمانہ کہاں سے کہاں جا پہنچا اور آپ؟......''

''میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔'' اماں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ نفیس سی دو خواتین اپنا سا منہ لے کر خالی ہاتھ لوٹ گئیں۔

مہر وفا کا دل بین کرتا رہا مگر وہ مہر بہ لب تھی۔

خاندان کی مخالفت لے کر اس کو اعلیٰ تعلیم دلانے والے والدین اس معاملے میں روایتی ثابت ہوئے تھے ابا بھی اماں کے ہمنوا تھے۔

''مہر وفا تم اسٹینڈ لو۔ ورنہ ہمارے خواب ادھورے رہ جائیں گے اور ہم دونوں اپنی ذات میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔'' آفاق نے فون پر انتہائی جذباتیت سے کہا۔

مہر جانتی تھی کہ وہ بہت صدمے میں تھا۔

''آفاق میں کچھ نہیں کر سکتی میں کچھ تھی... میرے لیے ان لوگوں نے اپنے پرانے طور طریقے جیسے پہلے بدل لیے اب بھی بدل جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔'' مہر وفا کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''تو تم ہماری محبت کو ان فضول رواجوں کی نذر کر دو گی، چپ چاپ خاموشی سے کچھ سالوں بعد میرا خیال دل میں لیے کسی اور کی ڈولی چڑھ جاؤ گی؟'' آفاق کا لہجہ آگ برسا رہا تھا۔

''نہیں کبھی نہیں... تم جو نہیں تو دوسرا بھی کوئی نہیں۔'' مہر وفا تڑپ اٹھی۔

''تو سمجھاؤ اپنے والدین کو......''

''آفاق وہ اس بات کو نہیں سمجھ رہے میرے ابا کہتے ہیں اچھی بیٹی ہو تو اپنے پیار کی قربانی دو یہ سب وقتی باتیں ہیں۔ اور آفاق میں ان کی بات نہیں گنوا سکتی مجھے قربانی دینی ہے۔ مجھے اپنی تعلیم پر کوئی حرف نہیں آنے دینا۔''

مہر وفا کو اپنے ابا سے کی گئی گفتگو یاد آئی تو وہ مغموم ہو کر رہ گئی۔

''بس تو ٹھیک ہے تم ہماری محبت کا گلا گھونٹ کر اس کو اپنے آنگن میں دفن کر دو اور اس پر حسرت کا مزار بنا کر روتی رہو۔'' آفاق طنزیہ انداز میں بولا۔

باجی انجم انصار کے نام

میرا جیون
میرے جیون کی
ساری خوشیاں
سارے سکھ سارے آرام
میری آپی
تیرے نام
اور
تیرا جیون
تیرے جیون کے
سارے دکھ
سارے غم
سارے آلام
میری آپی
میرے نام

از: صبا نور، لیہ

''ایسا ہی کروں گی آفاق' میرا نام مہر وفا ہے اور مجھے مرتے دم تک وفا نبھانی ہے ہاں مگر تم اس بات سے مستثنیٰ ہو تمہارا جہاں دل کرے نکاح کر لینا۔'' مہر کڑے دل سے بولی تھی۔

''مہر کیا میری محبت تمہیں کچی مٹی کا کچا گھڑا لگتی ہے جو ایک ٹھوکر میں دو ٹکڑے ہو جائے بہت افسوس ہوا کہ تم مجھے اور میری محبت کو پہچان نہ سکیں۔'' آفاق کی آواز میں دکھ گھل گیا۔

''تم نہیں تو دوسرا کوئی بھی نہیں مہر......'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا تھا اور لائن منقطع کر دی تھی۔

مہر نے بے جان ہاتھوں سے فون کا ریسور کریڈل پر رکھا تھا۔

☆☆☆

اور پھر مہر وفا نے زندگی گزاری نہیں تھی بلکہ زندگی نے مہر وفا کو گزارہ تھا۔ نہ جانے کتنے ماہ و سال بیت چلے

مہروفا اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گئی۔ خوشی اور رنگ اس سے روٹھ گئے۔ ہر آنے والے رشتے کو انکار کر کے اس کے سیاہ بالوں میں کب چاندی کے تار جھلملانے لگے پتا ہی نہ چلا۔ مہر نے وقت گزاری کو درس و تدریس کا شعبہ چن لیا اور دن رات کی محنتِ شاقہ سے بالآخر ٹیچر سے پرنسپل کی کرسی تک جا پہنچی۔

کالج کی کم عمر کچے ذہن کی لڑکیوں میں وہ عہدِ رفتہ کی مہروفا کو تلاشتی تھی اور دعا گو رہتی کہ ان نازک کلیوں کا مستقبل ان کے خوابوں کی تعبیر لیے ہوئے ہو اور کوئی دوسری مہروفا نہ بننے پائے جس کی زندگی حسرت سے عبارت رہی۔

☆☆☆

اور پھر ایک دن مہروفا پرنسپل روم میں بیٹھی تھی کہ ایک نازک سی لڑکی نے کمرے میں قدم رکھا جس کے مانوس نقوش اور چہرہ مہرہ دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔

وہ لڑکی ہو بہو آفاق جیسی نظر آتی تھی۔

مہروفا کا دل پارہ، پارہ ہو گیا حالانکہ اس نے اپنے تئیں آفاق کو اپنی زندگی خوشی سے آگے بڑھانے کا مشورہ دیا تھا پر اب جب یہ سامنے آیا کہ وہ اس کی طرح جوگی نہیں بنا تو دل کی رگیں جیسے کٹنے سی لگیں۔

وہ لڑکی مہروفا کو اپنی جانب مستقل ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنے سے کچھ بے چین سی ہو گئی تھی۔

مہروفا کی آنکھوں میں جگمگاتے آنسو بھی باعثِ حیرت تھے۔

"میڈم اس فارم پر آپ کے دستخط چاہئیں۔"

اس نے ایک کاغذ آگے بڑھایا۔

مہروفا جھلملاتی بینائی سے عینک کی اوٹ میں اس کاغذ کو بغور دیکھنے لگی۔

جس میں اس لڑکی کا نام اور دوسری تفصیلات درج تھیں مہروفا نے دانستہ نظریں کاغذ پر جما دی تھیں۔

نام: مہرین حسن۔

والد: رزاق حسن کیانی۔ وہ حسن کے نام پر ٹھٹکی پھر اگلی سطر پر نظر ڈالی۔

مہروفا نے بے یقینی سے دوبارہ پڑھا پھر سہ بار...... رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں سکڑتا دل معمول پر آیا۔

وہ مسکرا کر سائن کرنے لگی۔

"بیٹا آپ آفاق حسن کیانی کی کیا لگتی ہیں؟"

مہر جان گئی تھی کہ وہ آفاق کے ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

"وہ میرے چچا تھے میڈم۔" مہرین ادب سے بولی۔

لفظ "تھے" پر مہروفا چونک اٹھی۔

"تھے کا کیا مطلب؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔

"میڈم اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

الفاظ تھے یا دھماکا مہروفا کے پرخچے جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں گھڑی یک ٹک مہرین کو دیکھے گئی۔

"کیسے؟" مہر کے لب پھڑپھڑائے۔

مہرین نے اچنبھے سے اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔

"وہ دراصل ایک لڑکی جس کو وہ بہت چاہتے تھے اس سے شادی نہ ہونے کی صورت میں بہت دلبرداشتہ ہو گئے تھے اور رفتہ، رفتہ دل کی بیماری نے ان کو جکڑ لیا۔ میڈم میں نے اپنے بچپنے سے ہی انہیں بس افسردہ اور بیمار دیکھا اور پھر ایک دن وہ ہارٹ فیل سے چل بسے۔"

مہرین افسردگی سے بولتی جا رہی تھی اور مہروفا سائیں، سائیں کرتی سماعتوں سے سنتی جا رہی تھی۔

وہ فارم پر اس کے سائن لے کر جا چکی تھی مگر اس کو لامتناہی سوچوں کے ساتھ چھوڑ گئی۔

"تو ثابت ہوا کہ میں صرف نام کی مہروفا رہی محبت میں اصل وفا تو تم نے نبھائی آفاق! میں تو سانسیں لیتی رہی تمہارے ساتھ بھی تمہارے بعد بھی لیکن تم، تم نے تو زندگی سے ہی منہ موڑ لیا میرے بعد......"

مہروفا نے اذیت سے سوچا اور میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

صبحِ آرزو

افشین جہاں آرا

شریف بھائی نام کے ہی نہیں، کردار کے بھی شریف تھے۔ پورے محلّے میں ان کی شرافت کا ڈنکا تھا اسی کردار کی بنا پر سب ہی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چھوٹا سا قد، چہرے پر بھولپن، انداز میں سادگی اور پھر سب کے کام آنا۔ محلّے میں ان کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں بچوں کی چاکلیٹ، چپس اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں ہوتی تھیں۔

شریف بھائی پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے



تھے۔ تمام بھائی شادی شدہ تھے لیکن ان کی شادی نہ ہوسکی اس کی کیا وجہ تھی۔ وہ تو شاید انہیں بھی معلوم نہیں کہ چھوٹے بھائیوں کے گھر بستے گئے اور وہ بخوشی ان میں شرکت کرتے گئے، نہ کسی سے جلن نہ حسد جب وقت گزر گیا تو وہی بھائی ان سے کہتے کہ اب ایسی بھی کیا شرافت کہ اپنا ہی نقصان کرلو......ہمیں دیکھو ہم نے اماں کی پسند سے کالی دیکھی نہ گوری اور آٹھ، آٹھ بچے پیدا کرلیے۔ بھائی ان کا مذاق اڑاتے ہوئے طنزیہ کہتے تو وہ اپنا دل مسوس کررہ جاتے ”کیا ہم نے واقعی خود اپنا نقصان کیا ہے یا ہم کسی کو اچھے ہی نہ لگے۔“ وہ دل میں سوچتے ”ہاں ہم کسی کو اچھے ہی نہیں لگے ہوں گے اور وہ خود سے ہی شرمندہ ہوجاتے......لیکن اماں نے ہمارے لیے کیوں نہ کوشش کی......اب ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ اماں نے ہمارے لیے کوشش ہی نہیں کی ہو۔“ وہ اماں کو بھی اس الزام سے بری کردیتے......”ہونہ ہو شاید ہم ہی اچھے نہیں ہیں جو کسی کے دل کو بھائے نہیں۔“

”شریف بھائی چاکلیٹ دیں، بسکٹ دیں۔“ کسی نے انہیں چونکا دیا۔

”جی ہاں، کیوں نہیں۔“ انہوں نے گاہک کو جلدی سے مطلوبہ چیزیں دیں۔ دکان پر اس وقت آنے والے گاہکوں کا رش کم تھا، کوئی اِکا دُکا آجاتا تو انہیں ان کے خیالات سے چونکا جاتا۔

جب تک ماں کا دم سلامت ہے، وہ کوشش کرکے اپنے آپ میں یا اپنی دنیا میں مگن رہتے لیکن ماں کا سایہ اٹھتے ہی وہ جیسے اس بھری دنیا میں اکیلے رہ جائیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ اٹھتے۔ ان کی ماں ان کا بے حد خیال رکھتی تھیں اپنے طور پر آنے جانے والوں سے ان کے رشتے کی بات بھی کرتیں تو کہیں سے کوئی مثبت جواب نہیں پاکر بیٹے کو بھی نہیں بتاتیں کہ مرد کے لیے رشتہ ملنا کیا مشکل تھا (بقول ان کے) ”ارے بہن تمہارے بیٹے کا قد بہت چھوٹا ہے اور پھر کام بھی کوئی خاص نہیں کرتا۔“ ایک رشتے کروانے والی نے کہا تو... ساجدہ خاتون کو برا لگ گیا۔

”اے ہائے مرد ہی تو ہے، اچھی طرح رکھے گا تمہاری بیٹی کو اور پھر ہمارے بیٹے کی شرافت کی گواہی زمانہ دیتا ہے۔“ وہ برا مانتے ہوئے کہتیں۔

”ساجدہ بیگم زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے اب لوگوں کو اپنی بیٹی کے لیے باہر کے رشتے چاہیے ہوتے ہیں، بینک کی اچھی جاب چاہتے ہیں۔“

”چلو ٹھیک ہے بھئی، ہمارے شریف کی قسمت کا ستارہ بھی ضرور چمکے گا۔“ وہ آہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوتیں۔

رات بھر شریف بھائی اپنے خیالوں میں الجھے رہے تو صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ ہوٹل سے ناشتا لے کر آرہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے آواز لگائی۔

”شریف بھائی بریانی کب کھلا رہے ہو۔“ آنے والے نے پیچھے سے آکر ان کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

”یار جب اللہ کی مرضی ہوگی۔“

”اچھا سنو تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے مجید بھائی کو جانتے ہو ناں تمہارے بھائی عمر کے دوست......انہوں نے ہم سے تمہارے بارے میں کہا ہے ان کی بہن ہے اب تو ان کی عمر بھی کافی ہوگئی ہے پر دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہیں اگر کہو تو بات آگے چلائیں۔“

ان کی بات پر وہ نہ خوش ہوسکے اور نہ ہی برا منا سکے۔

”نہیں یار ابھی میں اپنی دکان اچھی طرح سیٹ کرنا چاہتا ہوں پھر دیکھیں گے۔“ انہوں نے وقت پر ہی اسے منع کردیا۔

”اماں تم ٹھیک تو ہو ناں یہاں دکان پر کیوں آگئیں، ہمیں بلالیتیں۔“

”اے بیٹا شریف صبح سے طبیعت اچھی نہیں ہے۔“ وہ کچھ دیر بیٹے کے پاس بیٹھ کر چلی گئیں......شریف بھائی کے دل میں ماں کی بات لگ گئی، ایک لے دے کر ماں ہی تو دنیا میں ان کا واحد سہارا تھیں۔

''یا اللہ ہماری ماں کو سلامت رکھ......'' انہوں نے ماں کے لیے دعا کی لیکن آہستہ آہستہ وہ زیادہ بیمار ہوتی گئیں اور ایک روز اپنے رب سے جاملیں......شریف بھائی کی تو جیسے دنیا ہی اجڑ گئی......کئی دن دکان نہ کھولی بس چپ چاپ خاموشی سے وہ جیسے ایک طرف کے ہو گئے۔ قرآن پاک پڑھنا اور ماں کو بخشنا اب یہی ان کا معمول ہو گیا تھا۔ ماں کے دسویں کے بعد بھائیوں نے سمجھایا۔

''کیا ہماری ماں نہیں مری ہے جو تم ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے ہو۔'' چھوٹے بھائی نے کہا۔

''میاں تمہارے ساتھ تمہاری فیملی ہے اس کی ماں ہی اس کا سہارا تھی۔'' اس کا دکھ بجا ہے۔

چچا جان نے تلملا کر کہا۔ ''تم سب اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دہ ہو، تم سب کی شادیوں میں میرے بچے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن تم بے غیرتوں سے اس کا گھر نہ بسایا جاسکا۔'' وہ دکھ سے چلا رہے تھے۔

''تم لوگ اب اس کی دکان پر اپنے بچوں کو بٹھا کر اس کی دکان میں کیا حصہ ڈالنا چاہتے ہو۔'' چچا جان نے تلخی سے کہا۔

''ارے آپ کیوں اتنا خفا ہو رہے ہو، ہم نے اگر نہ کی تو آپ ہی کروا دیتے، سگے نہ سہی رشتے کے چچا تو ہیں۔'' شریف کے سب سے چھوٹے بھائی مختار نے چچا سے کہا تو شریف بھائی حیرت سے اسے دیکھنے لگے اور بس چپ چاپ دکان کھول کر ہی بیٹھ گئے......دکان کھلتے ہی محلے کے بچے خوش ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں دکان پر بچوں کا رش تھا، بے فکرے بچے خوشی، خوشی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے اور شریف بھائی انہیں دیکھ کر ان کی خوشی میں خوش تھے۔

''کاش ہم بھی ایسے ہی بچے ہوتے۔'' اس سوچ کے ساتھ ہی انہیں اپنی اماں یاد آگئیں اور آنسو.... بے اختیار ان کی آنکھوں میں آگئے۔

اب انہوں نے پوری دلجمعی سے دکان میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ بچوں کی چیزوں کے علاوہ انہوں نے



مجھ سے ملیے

میرا نام فرخندہ جعفری ہے اور میرا تعلق گجرات سے ہے۔ مجھے بچپن سے ہی لکھنے اور بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ میرا یہ شوق اتنا پختہ تھا کہ مجھے رستے چلتے کوئی کاغذ نظر آجاتا تھا تو میں فوراً اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتی تھی گھر والے ہنستے تھے۔ مگر مجھے یہ شوق اپنے والد صاحب اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انہیں دیکھ کر پیدا ہوا۔ ان کی لائبریری میں اردو، پشتو، پنجابی زبانوں کی بے شمار کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ میں ان کی اجازت سے اچھی اور سبق آموز کتابیں پڑھتی تھی۔ پھر بڑی، بڑی رائٹر جیسے بشریٰ رحمان، رضیہ بٹ اور دیگر کی تحریریں پڑھیں۔ اور پھر نظریں ایک ہی رسالے پر آکر اٹک گئی تھیں وہ ہے ماہنامہ پاکیزہ......

پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں اور کبھی، کبھی اس میں لکھتی بھی ہوں۔ جسے بہنیں پسند بھی کرتی ہیں۔ تمام رائٹرز اور قارئین کو پاکیزہ کی سالگرہ اور عید کی بھی مبارک ہو۔ اللہ کرے پاکیزہ اسی طرح دن رات ترقی کی منازل پر گامزن رہے۔ (الٰہی آمین)

عام ضروریات کی چیزیں بھی رکھ لی تھیں، محلے والوں کو اب اور سہولت ہوگئی تھی۔ پہلے وہ ان چیزوں کے لیے دور جاتے تھے اب گھر کے قریب یہ چیزیں بھی ملنے لگی تھیں تو سب کو اچھا لگا اور سب ہی اس سہولت سے فیض یاب ہونے لگے۔ کام میں دلچسپی نے دکان کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی اور وہ ایک چھوٹے سے جنرل اسٹور میں بدل گئی۔ بچے بڑوں سب کا رش بڑھنے لگا اور پیسے کی بھی فراوانی ہونے لگی لیکن شریف بھائی کے دل سے اداسی تھی کہ غائب ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ البتہ اب انہوں نے اپنے لیے ایک اچھا موبائل فون خرید لیا تھا اس پر وہ کبھی کبھار دوستوں سے باتیں کر لیتے تھے، ایس ایم ایس کرنا انہیں آتا نہیں تھا۔ کسی دوست کی مدد سے مشکل سے ایس ایم ایس کرنا سیکھا تو سودا سلف منگوانے میں بھی آسانی ہونے لگی۔ جب لڑکوں کا دکان پر رش بڑھتا تو وہ انہیں چھیڑتے۔

''شریف بھائی کسی لڑکی سے دوستی کرلو، دیکھو ناں کیسا مزہ آتا ہے تم کہو تو میں دوں بہت سے نمبر...... پھر جس سے دل چاہے یا جو تمہیں اچھی لگے۔ اس سے بات کر لینا۔'' ایک لڑکے نے تمسخر پن سے کہا۔

''ارے چھوڑو بیٹا۔''

''بھئی دوستی کرو گے تو کیا پتا بات آگے بڑھ جائے اور شریف بھائی تمہارا گھر بھی بس جائے۔'' شریف بھائی منہ کھولے بھولپن سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اب ان باتوں سے خود کو دست بردار سمجھ لیا تھا۔

''ارے یار اب کون ہم سے بات کرے گا اور سچ بتائیں ہم نے آج تک کسی لڑکی سے بات بھی نہیں کی بلکہ ہمیں بات کرنا ہی نہیں آتی اور تم لوگ تو کوئی اچھی بات نہیں کرتے۔ لڑکیوں کو یوں بے وقوف بنانا بہت بری بات ہے۔'' وہ ہلکا سا خفا ہو گئے لیکن اندر دل ہی دل میں کچھ گدگدایا ضرور تھا لیکن وہ نظر انداز کر گئے اور پھر وہی دن رات کی مصروفیت اور شریف بھائی تھے۔

''چچا جان السلام علیکم!'' چچا جان کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر شریف بھائی نے ادب سے کہا۔

''جیتے رہو میاں سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے ناں ماشاء اللہ...... اب تو تم نے دکان بہت بڑھا لی بھئی واہ، واہ...... دل خوش ہوگیا۔'' چچا جان نے دکان پر نظر ڈالتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''میاں اب تمہارا کام چل نکلا ہے تو شادی بھی کر ہی ڈالو۔'' چچا جان بولے۔

''پر چچا جان اس سلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں اور اب ہماری عمر بھی تو نہیں رہی اس دسمبر میں ہم چھیالیس سال کے ہو جائیں گے۔ اماں ہوتی تو کچھ سوچتیں۔'' انہوں نے بیچارگی سے کہا۔

''ارے میاں ایک لڑکی ہے ہماری نظر میں، انٹر کیا ہے تم سے کچھ سال ہی چھوٹی ہوگی۔ والد کا انتقال ہوگیا ہے، مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے ان کے بعد یہ استانی بن گئیں۔ محلے میں ہی اسکول سے وہیں پڑھانے جاتی ہے، رنگ ذرا گہرا سانولا ہے، پر ناک نقشہ اچھا ہے، تم کہو تو اور تم نہ بھی کہو تو ہم تو بات آگے ضرور بڑھائیں گے۔ تمہارے سگے چھوٹے بھائیوں کے طعنے ہم سے نہیں سنے جاتے۔ کم بختو نے تمہارے لیے کچھ کیا نہیں اور تمہاری ماں کے مرنے پر کیسی بے غیرتی سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں تو جو کالی گوری ملی ہم نے کرلی۔ اب ہم ہی تمہارا گھر بسا کر دکھائیں گے۔ دیکھتے ہیں تم کیسے انکار کرتے ہو یا کوئی دوسرا کچھ بولتا ہے۔'' انہوں نے غصے اور فکر کے ملے جلے جذبات سے کہا تو شریف بھائی کے دل میں کہیں کسی خوشی نے چپکے سے سر اٹھایا لیکن وہ خاموش رہے۔

''تم ان میں کسی کو کچھ نہ بتانا، کل ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے ذرا اچھا سا تیار ہو جانا، سمجھ رہے ہو ناں۔''

انہوں نے پیار سے کہا تو چچا جان کے لیے ان کے دل میں احترام اور بڑھ گیا اور چلے گئے تو شریف بھائی کے دل میں یہ بات کہیں سے آگئی کہ کوئی ہمیں پسند بھی کرے گا یا نہیں......

اگلے دن وہ شام میں کریم کلر کا شلوار قمیص

پہن کر اچھی طرح بال جما کر تیار ہو گئے اور چچا جان کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چچا جان آ گئے اور وہ انہیں لے کر روانہ ہو گئے۔

''بیٹا اپنی عادت کے مطابق خاموش نہ رہنا، اس کی والدہ جو کچھ پوچھیں اچھے سے بتا دینا ویسے تو ہم تمہارے بارے میں انہیں سب کچھ بتا چکے ہیں۔'' شریف بھائی بیچارے شرافت سے چچا جان کی باتیں سنتے جا رہے تھے اور کچھ دیر بعد وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

چھوٹے سے کمرے میں ان کو اور چچا جان کو بٹھا دیا گیا۔

''چچا جان ہم ٹھیک لگ رہے ہیں ناں.....'' انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ارے میاں بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔'' اتنے میں لڑکی اپنی والدہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہاتھ میں ٹرے اور اس میں شربت کے گلاس لیے ہوئے.......... چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار قمیص میں وہ جاذبِ نظر لگ رہی تھی۔ شریف بھائی نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''بیٹی کیا مضامین پڑھاتی ہیں آپ؟'' چچا جان نے اس سے پوچھا۔

''جی ہم میتھس اور سائنس لیتے ہیں۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ اس کی والدہ نے شریف بھائی سے دو تین سوال کیے جس کے انہوں نے مناسب جواب دیے۔ تھوڑی دیر میں وہ یعنی شریف بھائی اور چچا جان وہاں سے اٹھ گئے۔

''کیسی لگی تمہیں سلمیٰ بیٹی؟'' راستے میں چچا جان نے شریف بھائی سے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس ٹھیک ہے، ہم کل ہی سلمیٰ کے گھر جا کر تمہارا رشتہ دیتے ہیں۔'' دو دن بعد سلمیٰ کی والدہ نے اس رشتے کو ہاں کر دی اور شریف بھائی کی بات آخر کار بن ہی گئی۔

رشتہ طے ہونے کے ٹھیک ایک مہینے بعد سلمیٰ ان کی شریکِ حیات بن کر ان کے گھر آ گئیں۔ شریف بھائی کی دنیا ہی بدل گئی۔ گھر میں بیگم نے وہ سلیقہ دکھایا جو کہ شریف بھائی نے کباڑ خانہ بنایا ہوا تھا نکل کر ایسا آیا کہ شریف بھائی حیران ہی رہ گئے۔

''آپ بہت اچھی ہیں سلمیٰ بیگم آپ نے ہماری زندگی ہی بدل دی ہے۔ ہم نے تو اپنی زندگی کو تنہا سمجھ لیا تھا اور اپنی اماں کے بعد تو ماشاء ہم بالکل اکیلے ہی ہو گئے تھے۔'' ادھر سلمیٰ بیگم بھی خوش تھیں شریف بھائی کی شکل میں ایک اچھا شریف ساتھی اور قدر دان جو مل گیا تھا۔

''آپ بھی بہت اچھے ہیں کہ آپ نے ہمیں قبول کیا۔''

''دراصل ہمارے چچا جان کا ہم پر یہ احسان ہے کہلانے کو تو وہ رشتے کے چچا ہیں لیکن سگوں سے زیادہ انہوں نے ہمارے بارے میں سوچا، ہمارے بھائی تو ہمارا بہت مذاق اڑاتے تھے اور ہمیں تنہا دیکھ کر انہوں نے اپنے بچوں کو ہماری دکان پر بٹھانا شروع کر دیا کہ ہمارے بعد وہ خود بخود دکان سنبھال لیں گے لیکن میرا رب بہت بڑا ہے۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ نے شریف بھائی کی اور بھی سن لی۔ ایک عدد بیٹا جب ان کی گود میں آیا تو ان کی آنکھوں سے تواتر سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔ خدا کی قدرت کے کرشمے پر وہ صرف حیران تھے کہ اللہ سب کی سنتا ہے۔ اور وہی قادرِ مطلق ہے وہ بچے کو دیکھ، دیکھ کر نہال ہوتے تھے۔ گھر میں بہت رونق ہو گئی تھی۔ دکان پر جو بھی آتا وہ شریف بھائی کو مبارک باد دیتا۔ شریف بھائی جو ہمیشہ اداس اور پریشان رہتے تھے ایسے شاد ہوئے کہ دنیا کی ہر چیز انہیں اچھی لگنے لگی۔ دل میں کمال کا اطمینان اتر آیا۔ وہ ہر لمحے اپنے رب کے شکر گزار رہتے۔ اب اپنی ماں کے لیے وہ اور خشوع و خضوع سے دعائیں کرتے کہ شاید یہ ان کی ماں کی ہی دعاؤں کا اثر تھا جس نے ان کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ سچ ہے اللہ پر توکل ہی کامیابی کے راستے کھولتا ہے۔



ناولٹ

اب تو کوئی خضر ملے

منشا محسن علی

میں نے سرسید ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے اس دن خود کو دنیا کا سب سے بے بس اور لاچار انسان محسوس کیا تھا..... فنکشن کب کا ختم ہو چکا تھا..... آسمان پر گھرے بادلوں کی اوٹ سے جھلکتے چاند نے جیسے مجھے شکوہ بھری نظروں سے دیکھا تھا، میں نے بے ساختہ نظر چراتے ہوئے گہری سانس لی تھی..... "ہاں..... تو رحمان علی اب تمہیں بھی آنکھیں چرانے، نظر آنے کے خوف سے پہلو تہی برتنے کا ہنر آہی گیا....." سامنے پختہ روش



کے گرد لگے لمبے چھتنار درخت یوں لگتا تھا وہیں کھڑے، کھڑے مرگئے ہوں...... جیسے میں سیڑھیوں پر بیٹھے، بیٹھے مرسا گیا ہوں...... انسان مرجاتے ہیں تو درخت کیوں نہیں...... اس بات پر ہر کسی کو ہنسنا چاہیے۔ میں بھی ہنس رہا ہوں...... ہنستا جارہا ہوں۔

''رحمان علی...... کھوکھلی ہنسی مت ہنسو......'' چاند میں چرخہ کاتتی بڑھیا نے طنزیہ دیکھا تھا۔ مجھے ایسی چپ لگی کہ بس...... جیسے کیل گاڑ دیے گئے ہوں۔

بارش ہونے لگی ہے...... بارش کے ننھے، ننھے قطرے جیسے وجود پر چابک کی طرح لگ رہے ہیں...... مگر میں دم سادھے سیڑھیوں پر بیٹھا ہوں...... مجھ پر بھی جیسے کوئی اثر نہیں ہو رہا...... کسی پر بھی نہیں ہوتا شاید......

میں چیخ، چیخ کر کہنا چاہتا ہوں...... ''جناح بار، بار نہیں آتے...... کبھی، کبھی خود جناح بننا پڑتا ہے۔''

مگر پہل کون کرے......؟ سوچ کی زنجیروں سے بندھے وجود پہل نہیں کرتے۔

ہری جھنڈیاں اڑتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف آ گری تھیں جب میں نے اٹھانا چاہا تو بیرن ہوا انہیں مٹی کی طرف لے گئی۔ میں سیڑھیاں اتر کر مٹی کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ ہری جھنڈیوں میں سفید ہلال جگمگاتا ہوا مٹی ہونے کو تھا۔

میں نے آستین سے مٹی پونچھی تھی...... یوں لگا آفس میں لگی تصویر سے دو آنکھیں نکل کر میرے سامنے آن ٹھہری ہوں۔

''دیکھا رحمان علی...... یہ ہے آج کا پاکستان...... سوچوں پر پہرے ہیں...... وجود منافقت کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ اور حب الوطنی کا اظہار تو خبطی پن ہے۔'' میں زمین میں گڑا جارہا ہوں۔

دور کسی اسٹوڈنٹ کی بھدی آواز گونجی تھی "Its raining please dance...... with me" اور مجھے لگا میں کسی گنبد میں گول، گول رقص کرتا جارہا ہوں۔ اور میرے اردگرد لاشے بکھرے پڑے ہیں...... تہذیب کے...... ثقافت کے...... تدبر کے...... اور حب الوطنی کے...... اور میرا بیٹا وہ کچھ دیر پہلے مجھے کہہ رہا تھا۔

''ڈیڈ...... پلیز اسٹاپ اِٹ...... پاکستان' پاکستان اُف...... leave this topic آج کل کوئی بھی حب الوطنی کے قصے نہیں سننا چاہتا۔ ایسے لوگوں کو ''خبطی'' کہا جاتا ہے۔'' اور میں اپنے ویل ایجوکیٹڈ بیٹے کو چاہ کر بھی نہیں کہہ پایا تھا۔''اذان علی...... تمہارا باپ خبطی ہے۔ ہاں خبطی......''

شام ڈھل، ڈھل کر رات کی چوکھٹ پر قدم دھرتی ہے، میں برستی بارش میں کچی مٹی پر بیٹھا رو رہا ہوں، روتا جارہا ہوں۔

"I can't leave this topic"

میرے وجود کے درخت کی جڑ، جڑ میں پاکستان کی محبت سانس لے رہی ہے...... میں یہ محبت ختم کر ہی نہیں سکتا...... برستی بارش میں...... بھیگے چاند کی بھیگی ٹھنڈی روشنی میں ایک سرگوشی ابھری...... اور شرقاً غرباً شمالاً جنوباً سفر کرتی ہوئی بازگشت کے وجود میں ڈھلی۔

''میں میر جعفر نہیں ہوں......''

☆☆☆

''ابا پاکستان تو بن جائے گا ناں......؟'' اِک سوال اس رات فضا میں لرزا تھا۔ آم کے گرد آلود پتوں سے ہلکی سی چاند کی روشنی کچے آنگن میں بکھری ہوئی تھی...... آمنہ چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی تھی...... ہلکی، ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کا وجود ان گنت بھیدوں سے پُر تھا...... برآمدے کے ستون سے بندھے وجود کی شعلہ بار نظریں آمنہ پر تھیں...... خاکستر کرتی ہوئی۔

''ہاں...... میری دھی بنے گا...... ضرور بنے گا...... وہ دن آنے والا ہے......'' خادم کے چہرے پر آس کی لو لرز رہی تھی۔ آمنہ نے بے خیالی میں انہیں دیکھا اور پھر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

''وہاں ہم آزادی سے رہیں گے ناں...... سب ہم مذہب، عبادتیں کھلے عام، وہاں خوف تو نہیں ہوگا؟'' ابا نے بالغ چہرے پر دوسوسے ابھرتے دیکھے تھے۔

''نہ بیٹی...... وہاں امن اور شانتی ہوگی، وہاں غلامی کی زنجیریں نہیں ہوں گی۔ وہاں ذات پات کا کٹھن بھید بھاؤ بھی نہ ہوگا...... وہاں، ہم مسلمان اسلام کے طریقے پر زندگی بسر کریں گے......'' عبادت گزار آمنہ کے چہرے پر شوق کا لمحہ آن ٹھہرا تھا۔

''پتا ہے ابا...... میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ ہمارا الگ وطن جلد سے جلد وجود میں آجائے...... اپنی سوندھی مٹی کی خوشبو سے بڑھ کر کچھ نہیں...... اپنے وطن میں سر چھپانے کی جگہ بھی مل گئی ناں تو راضی خوشی رہ لیں گے...... کاش وہ دن جلد سے جلد آئے......'' آس کی لڑیاں آواز میں جڑی ہوئی تھیں...... قطار در قطار...... برآمدے کے طاق میں چراغ جل رہا تھا...... ہلکی زرد روشنی کے گرد پروانے منڈلاتے جل، جل جاتے، ان کی لاشوں کا ڈھیر لگ گیا تھا...... ابا نے گہری سانس لی تھی۔

''میری دھی...... دعا کیا کر...... جناح کی کوششیں رنگ لائیں...... اور مسلمانوں کا الگ وطن وجود میں آئے تبھی سکون کی سانس ملے گی...... وہ چراغ پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی۔

''کتنی حیرت کی بات ہے ناں...... کہ ایک منحنی اور بظاہر کمزور شخص فقط جذبۂ حب الوطنی کی بنیاد پر نیا وطن حاصل کرنے والا ہے...... کیا سوچ کی جنگ اتنی قوی اور بھرپور ہوتی ہے کہ ایک ملک حاصل کرلیا جائے؟ اور وہ بھی ایسا ملک جس کے تاج میں اسلام کا نگینہ جڑا ہو...... شاید ہر اس کی فضا میں آزادی کے نقارے کی گونج بھرنا آسان نہیں ہوتا...... مقصد سامنے رکھ کر ڈٹ جانے کے اعزاز ضرور ملا کرتے ہیں...... جناح کو بھی ملے گا......'' چاند نے روشنی کا پیالہ الٹ دیا تھا۔ روشنی چار اطراف بکھرنے لگی تھی...... ابا نے پیار سے اس کا چہرہ دیکھا...... سمجھدار...... ذہین سی آمنہ...... چاند کی روشنی میں وہ انہیں نور کے مجسمے کے مانند لگی تھی۔

''بیٹی...... اتنے لوگوں میں آزادی کی امید پیدا کرنا آسان نہیں مگر قائداعظم نے یہ کیا...... وہ اس فن میں ماہر ہے کہ دلوں کی جنگ حوصلوں، جذبوں سے جیتی جاتی ہے...... جن کے سامنے سب ہیچ ہے...... اس دانا شخص نے دل جیتے ہیں۔''

برآمدے کے ستون سے بندھا وہ زنجیر ہلائے جارہا ہے...... کہ آمنہ پلٹ کر دیکھے...... مگر وہ دیکھتی ہی نہیں...... دور کماد کے کھیتوں میں جھینگر بول رہے تھے...... وہ ہاتھوں کی لکیریں کھوج رہی تھی...... رات سے......

''میری ہر دعا اسی بات پر ختم ہوتی ہے کہ ہمارا پاکستان بن جائے...... جہاں ہمیں دھتکارا نہ جائے...... ہمارے حقوق پامال نہ کیے جائیں...... جہاں سروں سے چادریں نہ کھینچی جائیں...... جہاں ڈر سجدے سے سر اٹھانے پر مجبور نہ کردے......'' اس کی آواز میں صدیوں کا اداس ساز آن ٹھہرا تھا...... کتنا ضروری تھا، کتنا ضروری ہے پاکستان کا بننا...... نئے ملک بنانے میں تو صدیاں لگتی ہیں...... تو کیا یہ سفر بھی صدیوں پر محیط ہوگا؟

آمنہ سوچ رہی تھی...... فضا میں ایک بے بس سی آواز ابھری تھی۔

''آمی...... مجھے کھول دے۔'' وہ رونے لگا تھا۔ سسکیاں...... التجائیں۔

آمنہ نے ابا کو دیکھا تھا۔ ''ابا وہ رو رہا ہے؟'' ستون سے بندھے وجود کی آنکھوں سے آنسو ٹپ، ٹپ گر رہے ہیں...... ٹھوڑی سینے سے جالگی۔

''آمنہ اگر وہ گھر سے نکل گیا تو رستہ بھول جائے گا۔'' ابا نے دکھی ہوکر کہا تھا۔

''نہیں بھولے گا...... اس کی آنکھوں میں بے بسی ہے ابا......''

''یہ جو تو اس پر ترس کھاتی ہے ناں...... اسی کا نقصان کرتی ہے۔''

''آمی...... مجھے چھوڑ دے...... درد ہو رہا ہے۔'' زنجیر سے بندھے اختر نے کرلا کر دوبارہ کہا تھا۔ وہ دل پر پتھر رکھے بیٹھی رہی...... بے حس و حرکت...... ابا بھی آنکھیں موندے پڑے تھے۔

ملگجا سا چاند آسمان کے وسط میں آن ٹھہرا تھا...... چنبیلی کی مدھم خوشبو آنگن میں اڑتی رہی......

آمنہ نے مڑ کر دیکھا وہ پلر سے ٹیک لگائے غنودگی میں تھا...... وہ ننگے پاؤں چلتی اس کے پاس آتی اور قریب بیٹھ گئی تھی منہ سے تھوک بہہ رہی تھی۔ قریب ہی چیونٹے پڑے تھے۔ آمنہ کو رونا آنے لگا تھا...... وہ اکثر چیونٹے پکڑ کر کھالیتا تھا...... تیل میں بھیگے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ہولے سے پیشانی چومی تھی۔

اختر کی آنکھیں جھٹکے سے کھلی تھیں، اس نے زور سے آمنہ کو دھکا دیا تھا وہ سیدھی دیوار سے جا لگی تھی...... ماتھے پر خراش آگئی تھی...... خون بہنے لگا...... اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو انگلیوں کی پوریں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔

زنجیر کی آواز پاس آئی...... اس نے سر اٹھایا تھا۔ وہ پاس بیٹھا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا...... پھر آگے ہوا...... جھکا اور آمنہ کا ماتھا چوم لیا...... زنجیر کی آواز دور ہوتی گئی۔

وہ دوبارہ ستون سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا...... طاق میں رکھے چراغ کی مدھم لرزتی لو میں آمنہ نے دیکھا وہ اردگرد سے بے نیاز فرش سے چیونٹے پکڑ، پکڑ کر کھاتا جارہا ہے...... آہ...... یوں لگا اذیت ننگی ہو کر ان کے آنگن میں ٹہل رہی ہو......

آمنہ نے آگے ہو کر دوپٹے کے پلو سے اس کا منہ صاف کیا تھا...... وہ ساکت بیٹھا منہ بسورے اسے دیکھتا رہا۔

''وہ دیکھو اختر...... چاند......'' آمنہ نے چاند کی طرف اشارہ کیا وہ تالی بجا کر ہنسا تھا...... زنجیر کی آواز دور تک سناٹے کا سحر پاش، پاش کرگئی۔

''آمی...... میں، میں چاند......'' اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھی، چاند کو دیکھا پھر آمنہ کو متوجہ کیا۔ کاجل سے بھری آنکھوں کا سوال آمنہ کو زخمی کر گیا ہے...... وہ کلائی میں پہنی چوڑی کو گھمانے لگی۔ اور گھماتی چلی گئی...... چھن، کھن، کھن...... ن...... ن!

''ہاں میرا بھائی چاند ہے......'' اختر قہقہہ لگا کر ہنسا ...... اور پھر...... ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

''شش......'' ابا کی طرف اشارہ تھا۔

آمنہ اپنا منہ اس کی طرف کر کے سرگوشی میں بولی تھی۔ ''چاند میں داغ ہے مگر میرے بھائی میں کوئی داغ نہیں......'' چاند لمحوں میں یہ سرگوشی دور تک پھیل گئی۔

آمنہ ننگے پاؤں فرش پر بیٹھی رو رہی تھی...... روتی جارہی تھی۔

وہ حیرت سے اسے دیکھتا...... اور فرش پر رینگتا چیونٹا اٹھا کر ہتھیلی پر رکھے بیٹھا تھا۔ چاند ٹہلتا ہوا اپنا سفر طے کررہا تھا۔ رات ڈھلتی جارہی تھی۔

☆☆☆

لائبریری میں پن ڈراپ سائیلنس تھا...... کھلی کھڑکیوں سے سونے کی طرح سنہری دھوپ پگھل، پگھل کر گر رہی تھی۔ بک شیلف کے ساتھ عقبی دیوار پر ان کی تصویر آویزاں تھی...... آنکھوں پر عینک لگائے، سیاہ آنکھوں میں ذہانت جھلکتی تھی...... مجھے اس کمزور سے شخص پر رشک آرہا تھا...... شاید سب کو آتا ہے...... تصویریں باتیں کرتی ہیں؟ شاید نہیں...... مگر وہ مجھ سے باتیں کرتے تھے...... اور ہر روز کرتے تھے۔

''تمہیں پتا ہے رحمان علی...... یہ جو پاکستان ہے ناں، یہ ایسے ہی نہیں بن گیا...... کوئی بھی چیز بغیر وجہ کے نہیں بن جاتی...... اس کے پیچھے بھی اسلاف کی قربانیوں، تجویزوں، نذرانوں کا ہاتھ ہے...... تمہیں کٹی پھٹی لاشیں، تنہا ننھے بچے، بے آبرو مائیں، بیٹیاں نظر نہیں آتیں؟ ریلوے اسٹیشن پر اپنے عزیزوں کی لاشیں بوریوں میں بند کر کے ضبط کی چوکھٹ پر بیٹھے مسافر نظر نہیں آتے؟ اوڑھنیاں پھٹی ہوئی سرخ آندھیوں کے ساتھ انجانے دیس پرواز کرتی نظر نہیں آتیں؟ جان کنی کے عالم میں بند آنکھوں سے، مقفل ہونٹوں کی صدا ''احد، احد'' سنائی نہیں دیتی؟ سب کو یہ منظر نظر آتا ہے مگر یہ میرے ہم وطن پاکستان کو بوجھ کیوں خیال کرتے ہیں؟'' اس ذہین شخص کے وہ سوال جیسے غلام گردشوں کی محرابوں میں گونجتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

کاش......ہاں......کاش یہ گونج بے خبر لوگوں کو باخبر کرتی......

میں نے ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی تھی...... بک شیلف کے پار سے آوازیں اڑتی ہوئی چاروں اطراف میں گھوم رہی تھیں......

''یار......اذان......تمہارے بابا کو پاکستان کے علاوہ اور کسی ٹاپک پر بات کرنا نہیں آتا......اب تو اسٹوڈنٹس نے بھی بور ہو کر ان کا لیکچر اٹینڈ کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

میرا سارا وجود ''کان'' بن گیا تھا......میں لاعلم تھا کہ اگلے پل میں ''برف'' ہو جاؤں گا......

"I don't know him but I think he is getting sick and crazy"

عینک کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں سے مجھے بہت شرم آتی تھی......وہ نسلی تھی، دلاسا پایا کچھ اور......

''پتا ہے رحمان علی......جب وقت اپنی ڈگر پر چلتے، چلتے مڑ کر راستوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہے تب یہی سب ہوتا ہے، نئی بات نہیں...... یہ ہوتا آرہا ہے۔پاکستان بننے کی کہانی آج کی یوتھ کے لیے اس کہانی جتنی بھی اہمیت نہیں رکھتی جو رات کے آخری پہر صرف اور صرف وقت گزاری کے لیے سنائی جاتی ہیں...... پل بھر کا قصہ...... پل بھر کا کھیل......پھر سب ختم......''

''تو کیا پاکستان صرف میجک اسٹوری بن چکا ہے؟ صرف اِک سحر......'' مجھے لگا لائبریری کے پن ڈراپ سائیلنس کو وہ سوال ہلکے ہلکے شور سے توڑ رہے ہوں۔ وقت کی سرگوشی نے دھمال ڈالا ہے۔

''یہ جو وطن ہوتے ہیں ناں یہ ریاضت اور کوششوں سے ملتے ہیں......اور حب الوطنی سے خالی دلوں پر لعنت ہو۔''

مجھے لگا میری تربیت کیا میرا بیٹا اسی لعنت کے حصار میں کھڑا ہوگا......یہ وطن کیا صرف مٹی کا ڈھیر ہوتے ہیں جن پر کرّوفر سے چلا جاتا ہے......اکڑ دکھائی جاتی ہے ......شاید...... مگر وہ جو وقت صدیوں پرانی بازگشت دُہرا رہا ہے...... پاکستان کا مطلب کیا؟

''نہیں کوئی لائقِ عبادت مگر اللہ اور محمد اللہ کے آخری رسول ہیں۔''

☆☆☆

برگد کے پیڑ کے نیچے وہ ساری لڑکیاں جمع تھیں......یہ ایک ایسا معمول تھا جو جانے کب سے دُہرایا جارہا تھا...... برگد کے پیڑ پر بیٹھی کوئلوں کے سحر طاری کرتے سُر فضا کو بوجھل کر دیتے تھے...... آمنہ غائب دماغی کے عالم میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھی تھی۔

''کیوں بیزار بیٹھی ہو؟'' سمرن نے اسے ٹہوکا دیا۔

''نہیں تو......'' وہ ہڑبڑا کر بولی۔سب سہیلیوں کی نظریں اس پر جمی تھیں......اسے ان نظروں کے بدلنے سے خوف آیا تھا۔

''پاکستان بنے گا تو کیا تم لوگ، یہ جگہ چھوڑ جاؤ گے؟'' رجنی کے سوال پر اس نے دور، دور تک پھیلے کھیتوں پر نظریں دوڑائی تھیں...... خالی اور بے مقصد......

''ہاں......ہم تو اب یہاں مسافر ہیں۔ چھوڑ جائیں گے۔ کبھی، کبھی سوچتی ہوں جگہیں چھوڑنا کتنا آسان ہوتا ہے مگر یہ یادیں بھلانا بہت ہی مشکل۔'' گہری آنکھوں کا کاجل پھیلنے لگا تھا......سمرن اب جھولے سے اتر کر اس کے قریب آن بیٹھی تھی۔ جھولے کی رسی اب کسی بھی وجود سے خالی جھول رہی تھی......

''میں جانتی ہوں آمنہ......ہم نے اتنا وقت ساتھ گزارہ ہے...... اکٹھے پلی بڑھی ہیں......مذہب سے بالاتر ہو کر ہم صرف اور صرف انسانیت کی لڑی میں پروئی ہوئی تھیں...... کچنار کے باغوں میں بیتے دن، بارشوں میں نئے، نئے پکوانوں کے ذائقے، رات کے پہر گلی میں مٹی کے دیئے جلا کر قصے کہانیاں سنانے کا وقت، مسجد، مندروں میں نیاز اور پرساد بٹنے کا وقت، یہ سب باتیں، یادیں بھلانا آسان نہیں......جگہوں کے بدلنے سے

فاصلے نہیں آجاتے، یہ یادیں تو ہم سب کی سانجھی ہوتی ہیں ناں۔...... ''سمرن کی بات پر آمنہ نے مٹی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

''ہاں...... کچھ بھی بھولنا آسان تو نہیں......''

''پاس کے گاؤں میں ہنگامے ہو رہے ہیں، مسلمانوں کو دیس بدر کیا جارہا ہے، ان کے گھر جلائے جارہے ہیں...... اور لڑکیوں کو تو......'' رجنی خوف سے بولی تھی۔

آخری الفاظ ہونٹوں میں دبے رہ گئے تھے......

آمنہ اداس سی ہنسی ہنس دی۔

''گھر جلیں گے، بستیاں اجڑیں گی۔ عزتیں لٹیں گی، یہ سب ہوگا مگر پاکستان کا مطالبہ تو برقرار رہے گا...... پاکستان تو بن کے ہی رہے گا۔''

اور پاکستان کا خواب برصغیر کا بچہ، بچہ دیکھ رہا تھا...... ایک ایسی دھرتی جہاں صرف مسلمان ہوں گے...... امن اور شانتی ہوگی...... پورے برصغیر میں جماعتیں زور پکڑ چکی تھیں...... اور ہندوؤں، سکھوں کا گٹھ جوڑ بھی ہوچکا تھا...... مسلمانوں کی بستیاں نذرِ آتش کردی گئی تھیں...... نوجوان لڑکیاں اغوا کی جارہی تھیں...... ہر طرف خوف و ہراس کا بگل بج چکا تھا...... مسلمانوں کو ہر طرح سے زک پہنچائی جارہی تھیں۔

نعرے گونج رہے تھے...... ''بٹ کے رہے گا ہندوستان...... لے کے رہیں گے پاکستان'' نحیف اور کمزور جناح ڈٹ چکا تھا...... کانگریس غیظ و غضب سے آتش فشاں بن چکی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے سچے ساتھی پاکستان کے قیام کے لیے دن رات محنت کر رہے تھے...... ان کی ولولے سے بھرپور تقاریر نے جوانوں کے دلوں میں جوش بھر دیا تھا۔

سہ پہر کی چوکھٹ پر شام نے قدم رکھا تھا...... نارنجی گولہ آسمان سے سرکتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن ہوچکا تھا...... ہر طرف نارنجی پن پھیل چکا تھا۔

آمنہ نے جب گھر میں قدم رکھا تو دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی...... ابا باہر تھے، وہ بھاگتی ہوئی برآمدے کی طرف آئی تھی...... ستون کے قریب ٹوٹی ہوئی زنجیر پڑی تھی اور اختر غائب تھا، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی تھی...... اس نے گلیاں، سارے راستے چھان مارے تھے، وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ آوازیں دے دے کر بلاتی رہی...... مگر وہ سامنے آیا ہی نہیں...... وہ عقبی گردوارے، مندر کی طرف بھی دیکھ آئی تھی۔

آخر تھک ہار کر جب اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے...... اس نے اسے مسجد کی بیرونی دیوار سے لگے بیٹھے دیکھا تھا...... وہ دوڑ کر اس کے پاس آئی تھی...... وہ آنکھیں موندے بیٹھا تھا...... لباس جگہ، جگہ سے پھٹ چکا تھا...... اور ننگے پاؤں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے اور خون بہہ، بہہ کر خاک میں جذب ہو رہا تھا...... آمنہ نے دوپٹے سے اس کا گرد آلود چہرہ پونچھا تھا۔

''اختر......'' وہ چپ بیٹھا رہا...... ایسی چپ جو متوحش کردے...... خوف میں مبتلا کردے...... وہ اس کی آنکھیں کھلنے کا انتظار کرتی رہی...... پھر پکارا......

''اختر......'' لمحے بیتے، وہ جھکی اور اس کے پاؤں سے کانٹے نکالنے لگی...... پہلی سسکی، دوسری...... تیسری......

''آمی......'' اس نے نیم وا آنکھوں سے اسے پکارا...... وہ چپ چاپ اٹھی اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

''چل گھر چل......''

''نہ...... آمی...... نہ...... میں اِدھر ہی......'' وہ بڑبڑاتا رہا...... وہ کھینچتی رہی ہے مگر وہ جم کر وہیں بیٹھا رہا...... آخر تھک ہار کر آمنہ نے اسے تھپڑ جڑ دیا...... اس نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا...... دیکھتا رہا......

''گھر کیوں نہیں چلتا؟''

''میں ناہیں......'' وہ نفی میں سر ہلاتا رہا...... راستے تاریکی میں ڈوبنے لگے تھے۔

آمنہ نے اسے دوسرے گال پر تھپڑ مارا تھا...... وہ چپ بیٹھا رہا۔ وہ زور، زور سے چلائی تھی۔

''میرے اللہ یہ کون سی آزمائش ہے......'' اب وہ

رو رہی تھی۔

''امی...... گھر......'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑی تھی...... وہ سر جھکائے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ چلتے، چلتے رکا اور ننگے پاؤں کی طرف اشارہ کیا تھا...... آمنہ نے خاموشی سے اپنے چپل اس کے آگے کر دیے۔ اس نے خوشی، خوشی آمنہ کے چپل پہن لیے اور بار، بار دیکھتا رہا...... کھیتوں پر اندھیرا چھا گیا...... وہ اس کے ساتھ، ساتھ ننگے پاؤں چلتی جا رہی تھی...... ''وہ اللہ......'' دفعتاً وہ مڑا اور مسجد کی طرف اشارہ کیا۔

آمنہ نے تاریک پگڈنڈی کے پار بنی مسجد کو دیکھا تھا اور بڑبڑائی تھی۔ ''اللہ ہی تو ہے۔'' وہ دونوں گھر آئے تو ابا پریشان سے آنگن میں ٹہل رہے تھے...... وہ انہیں بتانے لگی اور وہ زمین پر نظریں گاڑے کھڑا رہا...... اور اس رات ابا اسے زنجیر سے باندھنے لگے تو آمنہ نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا تھا۔

''ابا...... آج اسے کچھ نہ کہیں، وہ کہیں نہیں جائے گا۔''

ابا عشا کی نماز پڑھ کر لیٹ گئے تو وہ آنکھوں کی جھری سے آسمان پر ٹکے چاند کو دیکھتی رہی یہاں تک کہ آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں...... کھارا نمکین پانی...... چاند کی مدھم چاندنی میں آمنہ نے اسے دیکھا تھا وہ کچی مٹی پر سجدہ ریز تھا...... وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ ہلکی سی سرگوشی چاروں قطبین میں گونجتی رہی...... ''اللہ...... اللہ......'' وہ فرش پر سوتا تھا ہمیشہ...... اور وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ یہ بات نہ تو آمنہ پہلے سمجھی تھی اور نہ ہی آج سمجھ رہی تھی۔

وہ چارپائی سے اٹھ کر چلتی ہوئی اس کے قریب کچی مٹی کے فرش پر بیٹھ گئی۔

وہ اردگرد سے بے نیاز سجدے میں گرا پڑا تھا۔

آمنہ مٹی پر ٹکے اس کے ماتھے کو دیکھ رہی تھی۔

''میں نہ پہلے کبھی تمہیں سمجھ پائی اور نہ آج سمجھ پاؤں گی...... بس مجھے اتنا پتا ہے کہ تم ہماری آزمائش نہیں ہو...... آزمائشیں ایسی نہیں ہوتیں۔''

اور رات جو سحر کا عکس دکھاتی ہے...... مسکراتی ہے...... بھید بھری مسکراہٹ اور دیوانے کا ورد جاری ہے، احد...... احد...... ''اللہ ایک ہے...... اللہ ایک ہے۔''

☆☆☆

پیپل کی گھنی چھاؤں میں سکھوں اور ہندوؤں کی پنچایت لگی ہوئی تھی...... کانگریس پارٹی کی اشتعال انگیز تقاریر نے ہندوؤں کے دلوں میں بے تحاشا نفرت بھر دی تھی...... وہ جو بھائی چارے کی فضا قائم تھی وہ خواب و خیال ہو چکی تھی...... دلوں میں عداوت نے جگہ بنالی تھی...... سمرن کے ابا پنڈت موہن داس نے ایک لمبی تقریر کی تھی۔

''اب جناح برصغیر بانٹنے کی بات کر رہا ہے تو ہم کیوں مسلوں سے تعلقات روا رکھیں...... دوسرے شہروں، بستیوں میں مسلمانوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی نسل پنپنے نہ پائے...... اگر ہم نے بھی یہ نہ کیا تو بھارت سرکار ہم سے خفا ہوگی۔ اب بھائی چارے کا وقت نہیں ہے...... ارے آگے بڑھو...... اور تباہ کر دو مسلمانوں کو......''

زہر میں ڈوبے وہ الفاظ پیپل کے پیڑ پر اٹکھیلیاں کرتی خاکستری چڑیوں نے سن کر امن کی تباہی پر دہائی دی تھی مگر سارے لفظ ختم...... کچھ بچا ہی نہیں...... کچھ رہا ہی نہیں......

بڑھی ہوئی توند والے راجیشن نے کیچ بھرے ناخنوں سے اپنی گنجی چندیا کو کھجایا تھا اور اردگرد بیٹھے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر شیطانی ہنسی ہنس دیا تھا۔ ''ارے میں تو کہوں...... یہ موہن داس جو بھی کہوے ہے ٹھیک کہوے ہے اب رشتے، دوستیاں پالنے کا وقت نا ہی ہے...... اب تو آگے بڑھنے، جھپٹ کر چھین لینے کا وقت ہے۔'' یوں لگا جیسے چار اطراف میں شیطانی لکیر کھینچ دی گئی ہو حد...... دائرہ...... نفرت اور رقابت کا......

''کچھ تو عقل کو ہاتھ مارو...... کچھ وقت کا تو ساتھ ہے ناں...... بھلے گھڑی بھر کا بھی ہو مگر مسلوں نے ہمیشہ ہمارے ساتھ برادرانہ تعلقات استوار رکھے

موسم گرما اور ہم

تحریر: کرن خان، لاہور

موسم گرما سے لطف اندوز ہونا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ سعادت تو متوسط طبقے (ارے نہیں اگر غریب طبقہ کہا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا) کو حاصل ہوتی ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو اوپری طبقے کے لوگ ہیں انہیں موسم گرما اور موسم سرما کے فرق کا کیا علم؟ جنہوں نے ائرکنڈیشنڈ گھروں سے نکل کر، ائرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر کر کے، ائرکنڈیشنڈ آفسوں میں آرام کرنا مطلب کام کرنا ہے انہیں اب دیکھیے ناں......

یہ تو گرمی میں بھی سردی کا مزہ لیتے ہیں
اور ہم جیسے نہروں میں نہا لیتے ہیں

جی، جی ان نہروں سے میری مراد ابھی تو جلو پارک کی نہر ہے جو گھر کے نزدیک ترین ہے۔ کیا بچے، کیا جوان اور کیا بوڑھے سبھی اس گندے پانی ......نہیں، نہیں میرا مطلب ٹھنڈے پانی سے نہا کر خود کو ٹھنڈا کرتے ہیں اور تو اور برقع میں لپٹی عورتیں بھی ناقابل برداشت گرمی سے بچنے کے لیے ایک آدھ غوطہ لگا ہی لیتی ہیں۔ غالب بھی ایک باکمال شاعر تھے۔ ان کا مرغوب پھل آم تھا۔ جی تو ان کی تقلید کرتے، کرتے پہلے ہم نے شاعری سے لو لگائی اور پھر آموں سے......جی تو بقول ہمارے

ہائے گرمی، ہائے گرمی ہم کو بڑا ستائے گرمی
آموں پر جو نظر پڑے تو ہم کو پھر بھائے گرمی

یہ تو ہو گیا شاعری اور آموں سے لگاؤ کا معاملہ اب بات ذرا ان حشرات کی ہو جائے کہ گرمیوں میں جن کی آمد ہوتی ہے، سب سے پہلے تو میں اس کا تعارف کرواؤں گی جو اس ننھی سی جان کو سب سے زیادہ ڈراتی ہے، تو وہ ہے تتلی، جی ہاں تتلی جو قوس قزح کے رنگوں کو خود میں سمائے کبھی پھولوں پر، کبھی آبشاروں پر اور کبھی، کبھی ہمارے گھروں میں دبے پروں چلی آتی ہے اور اس ہی کی نسل سے ایک تتلی یا پتنگی اکثر اوقات جب رات کے سائے گہرے ہو رہے ہوتے ہیں تو وہ بلب کے اوپر منڈلاتی ہوئی نظر آتی ہے اس وقت دل کس زوروں سے دھڑک رہا ہوتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر کبھی وہ قریب آجائے تو ہم ہائے، ہائے امی کہتے وہاں سے دوڑ لگا دیتے ہیں۔ ایک اور شے ہوتی ہے چھپکلی! گرمیوں

ہیں......دکھ، درد میں بھی شریک رہے ہیں اور ہماری بہو، بیٹیوں کو ہمیشہ اپنا ہی سمجھا ہے، ہماری عزت ان کی عزت ہے اور ان کی عزت ہماری...... چار دن کے بدلتے حالات میں پرانے تعلقات فراموش کر دینا ٹھیک نہیں ہے۔'' منشی رام چندر نے راجیشن کو ناگواری سے دیکھا تھا۔

''ارے اتنے ہی مروڑ اٹھ رہے ہیں تو سارے مسلوں کو اپنے گھر پناہ دے، دے...... بڑے بھائی چارے یاد آرہے ہیں ناں تجھے۔'' راجیشن کی سر پر لگی اور تلوؤں پر بجھی تھی......

رام چند خاموشی اختیار کر گیا تھا۔ بھلا نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ دو پگڈنڈیوں پر دھول اڑتی رہی......اور جیسے فضا میں ٹھہر گئی تھی......کانگریس نے اپنے کارندے بستی، بستی بھیج کر مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تھا......عداوت کا یہ لاوا جیسے پل بھر میں پھٹا تھا اور اس کے اثرات بہت دور، دور تک پھیل گئے

تھے......وقت بدلا تھا......سوچ بدلی تھی......ایسی آندھی چلی تھی کہ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔ دور، دور تک پھیلی مسلمان بستیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا، خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ جیسے سارے برصغیر میں خون کی بساند اڑ رہی تھی......قائداعظم محمد علی جناح اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک ایسی ریاست کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے جو اسلام کے اصولوں پر قائم کی جاتی، جہاں ذات پات سے بالاتر ہو کر انسانیت کا پرچار کیا جاتا......مسلمانوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی ہوتی علاوہ ازیں اقلیتوں کے بھی الگ سے حقوق مقرر کیے جاتے......مگر مسلم لیگ کے اس موقف کی بھرپور مخالفت کانگریس کر رہی تھی......جس کی وجہ وہ عناد اور دشمنی تھی جو ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جانے کب سے پنپ رہی تھی۔

فیروز پور گاؤں میں خادم بھی جانے کب سے رہ رہے تھے یہیں پلے بڑھے تھے......ہندو، سکھ، مسلمانوں

میں چھپکلی کی آمد بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے مگر ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ اس لیے کہ ہم اس سے بالکل نہیں ڈرتے اور وجہ یہ ہے کہ یہ ہمیں ڈرانے والی تتلی کو اپنا شکار بنالیتی ہے۔ کاکروچ! ان کی آمد اس وقت ہوتی ہے جب ہم سوچکے ہوتے ہیں اور یہ بیچارے ہمارا بچا کچا کھا کر ہی گزارہ کرلیتے ہیں۔ کنکھجورا! ان کی پیداوار ان پائپوں اور نالیوں میں ہوتی ہے جہاں کچن کا پانی اور خوراک کے ذرّے جاتے ہیں اور پھر یہ رینگتے ہوئے گھر کے دوسرے حصوں میں خصوصاً غسل خانے میں چلے جاتے ہیں۔ اگر یہ جسم کے ساتھ چپک جائیں تو پھر اترنے کا نام نہیں لیتے۔ اپنی ٹانگیں گوشت کے اندر پیوست کرلیتے ہیں۔ گویا ایسا معلوم ہورہا ہوتا ہے کب کے بچھڑے مل رہے ہوں اور انہیں خود سے جدا کرنے کے لیے بڑے ظالمانہ طریقے سے چمٹا گرم کرکے ان پر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ بیچارے درد کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی گرفت کمزور کردیتے ہیں اور آپ پر ایک عدد گھوری ڈالتے ہوئے ہمیشہ کے لیے جدا ہوجاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ

اب تو ہم بچھڑ گئے ہیں، کرنا ہے انتظار
اگلی ہی گرمیوں میں ملیں گے پھر سے یار

یہ تو خیر از راہِ تفنن لکھ ڈالا مگر سچ ہے کہ موسم گرما میں جب گرمی حد سے تجاوز کرجائے اور انسان پسینے سے شرابور ہونے لگے تو اس وقت جو چیز ہمیں سب سے زیادہ راحت پہنچاتی ہے وہ ہے بارش۔ جب ابر کرم برستا ہے تو بنجر ہوتا انسان پھر سے سرسبز و شاداب ہونے لگتا ہے اور اللہ کی یہ نعمت ہم پر رحمت بن کر برستی ہے۔ جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں۔ ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' بے شک رب کریم کی نعمتیں بے شمار ہیں اور یہ سارے موسم ہم مخلوق کے فائدے کے لیے ہی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کو دنیا بھر میں سونے کی چڑیا کہا جاتا ہے اور یہ بالکل درست بھی ہے۔ رب کریم کا ہم پر خاص کرم ہے جو اس نے ہمیں ایسے ملک میں پیدا کیا جہاں سال میں چار موسم آتے ہیں اور ہم ہر موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں سارا سال گرمی رہتی ہے یا پھر سردی...... مجھے ذاتی طور پر جتنی سردی پسند ہے اتنی گرمی بھی...... اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب گرمی کی شدت زیادہ ہوتی ہے تو رب کریم تیز ہوائیں چلا کر موسم خوشگوار بنادیتے ہیں۔ وہ رب جو اپنے بندے سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے، وہ بھلا اپنے بندے کو گرمی سے بلکتا کیسے دیکھ سکتا ہے، اس لیے کبھی مینہ برسا کر اور کبھی تیز ہواؤں سے وہ اپنی محبت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ صد شکر ہے اس مالک کا۔

کی آپس میں خوب بنتی تھی...... اور وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے...... خادم علی کی شریک حیات دو بچوں کو چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کرگئیں...... اختر دماغی مرض میں مبتلا تھا جو کبھی کبھی اتنی شدت اختیار کرجاتا تھا کہ اسے روکنا نہایت ہی مشکل ہوتا اور دوسری طرف آمنہ تھی ان کی سمجھدار اور قابلِ فخر بیٹی...... سارا گھر اسی نے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا بھی خیال رکھتی تھی...... جیسے، جیسے اختر بڑا ہوتا گیا تھا تو اس کے مزاج میں بھی سرکشی آتی گئی...... وہ گھر کے کھلے دروازے سے باہر نکل جاتا اور اکثر اسے راستے بھول جاتے تو اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا اور آمنہ اسے ڈھونڈنے کی فکر میں ہلکان ہوتی رہتی۔ کئی دفعہ تو محلے والے اسے پکڑ کر لاتے تھے۔

رات کے آخری پہر تاروں کے جھرمٹ کو تکتے وہ ابا سے سوال جواب کیے جاتی...... اور ابا مسکرا مسکرا کر جواب دیے جاتے۔

''ابا...... پاکستان میں ہم آزادی سے رہیں گے ناں...... کسی قسم کی کوئی پابندی تو نہیں ہوگی ناں......؟'' ابا کی نظریں آسمان پر ہوتیں۔

''ہاں آمنہ، جناح اسی لیے تو کوشش کررہے ہیں...... ہمارا رہن سہن ہندوؤں، سکھوں سے قطعاً الگ ہے...... دو قومی نظریہ اسی بات کی تائید کرتا ہے مگر کانگریس اسی بات سے انکاری ہے۔''

''مگر کیوں ابا......؟'' وہ حیران ہوتی۔

''کیونکہ شروع سے ہی ان کی خواہش ہے کہ مسلمان غلامی کی زندگی بسر کریں...... مگر اب یہ سب خواب و خیال ہوچکا اب مسلمانوں کو نیا وطن حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

وہ ابا سے کرید، کرید کر سوال کرتی جاتی...... اس نے سبز کپڑے کے جانے کتنے ہی ہلالی پرچم سلائی کر رکھے تھے۔ مسلمان پاکستان کے حصول کے لیے تن من دھن تک کی قربانیاں دینے کو تیار تھے۔

جیسے ہی قیام پاکستان کی تحریک اٹھی تو ہندوؤں اور سکھوں کے برتاؤ میں واضح فرق جھلکنے لگا تھا۔ قریبی شہروں میں فسادات جڑ پکڑنے لگے تھے اور ان کی تپش دور، دور تک پھیل گئی تھی...... جب فیروز پور کے قریبی گاؤں میں مسلمانوں پر حملے کی خبر پہنچی تو خادم علی نے آمنہ کو پاس بٹھا کر سمجھایا تھا۔ اور وہ ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی تھی...... متوحش سی ہو کر...... کسی خوفزدہ غزال کی طرح۔

''دیکھو آمنہ بیٹی...... حالات روز بروز بگڑتے جارہے ہیں کوئی خبر نہیں وقت کس رخ پلٹے...... زندگی اور موت کا کچھ پتا نہیں...... کچھ خبر نہیں...... مجھے پتا ہے میری بیٹی بہت بہادر ہے...... زندگی آزمائشوں، تکلیفوں کا دوسرا نام ہے...... تکلیف کے موقع پر صبر کرلینا اور سن آمنہ میرے اختر کا خیال رکھنا تو، تو جانتی ہے ناں کہ وہ جھلا اگر قدم بھی باہر رکھے تو رستے بھول جاتا ہے......'' وہ اسے اپنے ساتھ لگائے رو رہے تھے...... آمنہ کو جیسے خوف آیا تھا...... بے تحاشا خوف......

''تو اختر کا خیال رکھ لے گی ناں......؟'' کتنی آس، کتنی امید تھی اس لہجے میں...... آمنہ بنت خادم علی کا دل موم کے مانند پگھل پگھل گیا...... وہ آنسو چھپاتی سر اثبات میں ہلا گئی تھی۔

چاند میں چرخہ کاتتی بڑھیا نے اچٹتی نظر آمنہ پر ڈالی تھی۔

''بہادر لوگوں کا امتحان بڑا مشکل ہوتا ہے اور آمنہ بنت خادم علی جان رکھے وہ بہادروں کے قبیلے میں سے ہے...... بہادر آنسو نہیں بہاتے' وہ آخری سانس تک لڑتے ہیں...... لڑتے رہتے ہیں...... اور...... اور پھر مرجاتے ہیں۔''

☆☆☆

''ہری جھنڈیوں سے ہال سجا کر، یوم آزادی کی لمبی، لمبی تقاریر پڑھ کر کیا وطن کا حق ادا ہو جاتا ہے......؟'' سر سید ہال کو ڈیکوریٹ کرتے، لاابالی سے قہقہے لگاتے اسٹوڈنٹس کو میں نے غور سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا......

کتنی غیر اہم سی حیثیت ہوتی ہے۔ کسی بھی ملک کی...... کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ جینز، پینٹس میں ملبوس وہ لڑکے اسٹیج سیٹ کررہے تھے۔ میں ہنسا تھا......

''رحمان علی...... یہ اتنے غیر اہم سوال تمہیں ہی کیوں تنگ کرتے ہیں۔'' کاریڈور سے دبی، دبی ہنسی کی آواز گونجتی رہی...... میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے رحمان؟'' وہ ..... میرے قریب آن بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تھا۔

''اسٹوڈنٹس یوم آزادی کے فنکشن کی ارینجمنٹ کررہے ہیں تو انہیں ہی دیکھ رہا ہوں......'' وہ مسکرائے تھے۔

''آج کل کی جنریشن بہت دلچسپی لیتی ہے ایسے فنکشنز میں۔'' میں نے سفید چونے زدہ دیواروں کو دیکھا تھا...... دیکھتا رہ گیا۔

''آپ کیوں چاہتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے تو ضرور پاکستان پر بحث کی جائے۔''

''اذان...... میں تو......'' اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔

''اگر میں اس فنکشن میں حصہ لے بھی رہا ہوں تو صرف اس جیت کے لیے جو میرا اسمبل ہے۔ آج کل زندگی میں پاکستان سے بڑھ کر بھی مسئلے مسائل ہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے آپ کو خاموشیوں کے پہر میں جامد پایا تھا۔

''ہاں...... اور مسئلے بھی تو ہوتے ہیں۔'' کھڑکیوں سے نظر آتی بیلا ورکی بیلیں سفید پھولوں سے ڈھکی تھیں۔

ریڈ کارپٹ وسیع وعریض ہال کے دروازے سے لے کر اسٹیج کے اسٹیپس تک بچھا ہوا تھا...... پروفیسر حضرات، اسٹوڈنٹس، کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے...... میں اگلی رو میں سکون سے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا ہوں......

مجھے لفظ ''سکون'' پر بہت بڑا قہقہہ تو ضرور لگانا چاہیے...... خیر چھوڑیں اسے۔ سربراہی کرسیوں پر مہمانِ خصوصی براجمان تھے جو یقیناً سیاسی شخصیات ہی تھے۔

سیاست کے حوالے سے میں ہمیشہ ایک ہی بات کہتا آیا ہوں کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہر کوئی بات کرسکتا ہے......اور آسانی سے کرسکتا ہے......چاہے وہ شخص پڑھا لکھا ہو یا پھر ان پڑھ......

سر سید ہال نغموں کے میش اپ سے گونج اٹھا ہے......اور یہ تو صرف گونج ہی ہے......دل کی صدا تو نہیں......

ہم زندہ قوم ہیں　　پائندہ قوم ہیں
چاند میری زمیں　　پھول میرا وطن

تالیوں کی گونج میں ایک سیاسی حکمران کا استقبال کیا گیا تھا......وہ مسکراتے ہوئے سارے ہال پر نظریں جمائے مائیک پکڑ رہے تھے...... نک سک سے تیار......قیمتی شلوار قمیص پر خوب صورت واسکٹ، مہنگی سی واچ جس پر ہلکی سی روشنی بھی پڑتی تو وہ چمک اٹھتی تھی۔

وہ بول رہے تھے اور ان کی آواز سر سید ہال کے سناٹے میں پھیل رہی تھی......چونے زدہ دیواروں سے ٹکراتی ہوئی......

''ڈیئر اسٹوڈنٹس......آج جس جگہ ہم آزادانہ زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیں مذہبی، سماجی آزادی بھی حاصل ہے تو اس کی سب کی بڑی وجہ صرف اور صرف قائداعظم ہیں جنہوں نے اپنی قوم کے لیے دن رات انتھک محنت کر کے ایک ایسے وطن کا حصول ممکن بنایا جس کی بنیاد اسلام ہے......اور پاکستان کے وجود میں آنے کے پیچھے بہت سی قربانیوں کا ہاتھ ہے۔ عزت، جان، مال مختصر یہ کہ ہر طرح کی قربانی پیش کی گئی جس کی وجہ سے پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک جداگانہ طریقے سے نمودار ہوا......'' میں نے غائب دماغی سے سارے ہال پر نظریں دوڑائی تھیں۔ بالکل میرے قریب وہ بیٹھے تھے۔ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے، ذہانت سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ......انہوں نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''پتا ہے رحمان، دنیا کا سب سے آسان ترین کام کیا ہوتا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تھا......انہوں نے اسٹیج کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''قربانیوں اور ایثار کے قصے، کہانیاں بیان کرنا اگر قربانی دینے کا وقت آئے تو پیٹھ موڑ لی جائے......کتنا تکلیف دہ احساس ہوتا ہے ناں یہ......''

میں نے ان کی بات پر سر اثبات میں ہلایا......

ڈائس پر مائیک تھامے دلکش انداز میں وہ اذان ابن رحمان علی تھا......کیا مجھے تاسف کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔

اسٹیج پر میرا بیٹا پاکستان کی محبت میں نہیں کھڑا تھا بلکہ وہ تو صرف اپنے وجود کی چاہ کے آگے بے بس تھا۔ وہ گلا تر کرتے ہوئے دلکش انداز میں بول رہا تھا...... وہ بولتا تھا تو خاموشیوں کا وجود احترام کے لبادے میں لپٹ جاتا تھا۔

''آج پاکستان کو ہماری ضرورت ہے...... پاکستان کی ترقی، خوشحالی کی ضامن یوتھ ہے......آج اسی جذبے، اسی حب الوطنی کی ضرورت ہے جو انہتر سال پہلے تھی......زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھ کر اپنے، اپنے مقاصد پاکر ہم پاکستان کا نام روشن کرسکتے ہیں...... اور ہمیں ضرور ایسا کرنا چاہیے......آپ کو، مجھے، ہم سب کو...... کیونکہ آج یہی وقت کی ضرورت ہے...... پاکستان اسلاف کی قربانیوں، وفاداریوں کا نام ہے...... ہمیں جناح کے پاکستان کو نئے سرے سے اوپر اٹھانا ہے......دہشت گردی، انتہا پسندی، فرقہ واریت ان سب اشتعال انگیز عناصر کا مقابلہ ہمیں ڈٹ کر کرنا ہوگا......ہم ایک ہیں......we are unity'' میں نے اذان علی کے چہرے پر فریب کے جوش کو دیکھا تھا......ہال سناٹے کی زد میں تھا......میرا دل چاہا اس کا گریبان پکڑلوں......اور سارے ہال کے سامنے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھوں۔

''تمہیں تو پاکستان کی باتیں کرنے والے خبطی لگتے ہیں ناں......تمہیں تو پاکستان کی بات کرنا بھی ناگواری کا احساس دلاتا ہے ناں......تو اب کیوں مادہ پرست انسان......'' تالیاں گونجتی رہیں۔

مگر میں یہ اسے چاہ کر بھی نہیں کہہ پایا تھا......میں نے سر جھکا لیا۔

کھڑکیوں کے پار آسمان کی چوکھٹ پر بادلوں کی چوٹیاں سر اٹھا رہی تھیں..... میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں دیکھا تھا، وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

"I am not a brave man" وہ ذہین شخص مسکرایا تھا..... میں جانتا تھا کہ وہ کیسی مسکراہٹ تھی..... ایک ایسی مسکراہٹ جو تسلی، دلاسے دینے کے وقت کام آتی ہے..... اور وہ بھی اب یہی کر رہے تھے۔

"انہیں حب الوطنی سے چڑ ہے..... انہیں پاکستان سے لگاؤ نہیں..... مگر پتا ہے رحمان علی وہ وقت جلد آئے گا..... جب انہیں پاکستان کی ضرورت ہوگی..... انسان کی زندگی "مذہب" اور "ملک" کے حوالوں سے چلتی ہے..... انہیں خبر نہیں کہ جناح بار، بار خضر بن کر مدد کو نہیں آتے۔"

میں انہیں اپنی کرسی سے اٹھ کر آہستہ، آہستہ سر سید ہال کے فرش پر بچھے ریڈ کارپٹ پر چلتے ہوئے ہال کے مین دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھتا رہا..... وہ پیٹھ موڑے جا رہے تھے۔ وہ پلٹ کر نہیں دیکھیں گے، وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

"please com back" ہال کی چونے زدہ دیواریں مجھ پر ہنس رہی ہیں، قہقہے لگا کر، طنزیہ ہنسی۔

زمانہ شناس ہوا سرگوشیوں کے رتھ پر سوار ہو کر ایک سرگوشی ہال کے در و دیوار میں چھوڑ گئی ہے۔

"زمانہ خبردار رہے..... جناح بار، بار نہیں آتے۔"

☆☆☆

قہر نے دھرتی کے سینے پر پنجے گاڑ دیے ہیں..... درختوں کی سرسراہٹ میں نوحے گونج رہے ہیں..... وحشت، ڈر..... آسمان نے نظر اس پر ڈالی جو مردہ باپ کا وجود گود میں لیے بیٹھی ہے۔

"ابا..... آنکھیں کھولیں..... دیکھیں آپ کی آمنہ آپ کو آوازیں دے رہی ہے۔" اس کی چیخ نے سناٹے میں شگاف ڈالا تھا۔ "ابا آنکھیں کھولیں۔" اس نے ان کا چہرہ تھپتھپایا تھا۔

اس کے لمبے سیاہ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے..... وہ دھاڑیں مار، مار کر روتی رہی..... وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے..... پیٹھ پیچھے ایسا وار کرتا ہے کہ پتا چلتا ہے اور نہ ہی خبر ملتی ہے..... وہ بھی جیسے بے خبری میں ماری گئی تھی۔ وہ ان کا سر گود میں لیے بیٹھی رہی..... روتی رہی..... آنکھیں تھیں کہ خشک ہی نہیں ہوتی تھیں۔

وہ ستون کے پاس بیٹھے اختر کے پاس آن بیٹھی جو خلاؤں میں جانے کیا گھورے جا رہا تھا۔

"ابا کہتے تھے کہ میں بہت بہادر ہوں اختر..... مگر دیکھو..... مجھے پر نظر ڈالو، میں رو رہی ہوں..... میرا کلیجا پھٹ رہا ہے، میرے دل کے چار خانے الگ، الگ کر دیے گئے ہیں..... ہم یتیم ہو گئے اختر.....“ وہ روتی رہی، وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

اس نے چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں..... ننگے سر اور ننگے پاؤں بیٹھی رہی..... آنگن میں لگے آم کا سایہ جیسے ڈرانے لگا تھا۔ فسادات کی وبا بڑی تیزی سے پھیلتی ہے اور اب بھی تیزی سے پھیلی تھی..... ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملے کرنے شروع کر دیے تھے..... خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی..... سرخ..... لال..... موت..... خادم کے عین سینے پر کسی نے خنجر گھونپ دیا تھا..... امام رحمت ان کی لاش گھر لایا تھا..... آنگن میں ٹہلتی آمنہ دھم سے زمین پر گری تھی اور آنکھوں کی پتلیاں پھر سی گئی تھیں۔

وقت دور سے اپنی چابک لہرا کر للکار رہا تھا..... وہ وحشت کے عالم میں دیواروں سے سر ٹکراتی رہی..... اور زنجیر شور مچاتی رہی..... "آمی..... آمی....."

اور اسی گہرے اندھیرے والی رات کو امام رحمت، خادم علی کو پرانے قبرستان مٹی میں دبا آئے تھے..... انہوں نے روتے ہوئے آمنہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"دیکھ میری دھی..... حالات نے اچانک ہی پلٹا کھایا ہے..... حالات آگے مزید بگڑیں گے..... بیٹی..... تم دو دن میں ضروری سامان باندھ لینا ہم سفر پر نکل کھڑے ہوں گے۔" وہ سراسیمگی کے عالم میں بیٹھی انہیں دیکھتی رہی..... کچھ سمجھ نہیں آیا کہ انہیں کیا کہے.....

جانے وہ کب تک اس عالم میں رہتی جب اسے اختر کی آوازوں نے جیسے گہرے گڑھے سے باہر کھینچ نکالا تھا۔ دو دن ہو گئے تھے وہ بھوکا پیاسا ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا...... بس ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

''امی...... مجھے کھول۔'' وہ روتا تو چپ ہی نہ کرتا تھا۔ وہ خشک آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ جاتی۔

''دیکھ...... اختر تجھے جوان بہن پر ترس نہیں آتا...... تو راستہ بھولا تو میں تجھے کہاں ڈھونڈتی پھروں گی؟'' اور پھر اختر کو ایسی چپ لگی کہ بس یوں لگتا تھا جیسے لبوں پر پتھریلی چٹان رکھ دی گئی ہو...... جو سرکے گی ہی نہیں۔

اور اس رات آمنہ بنت خادم علی نے اپنے پاگل اور بالغ بھائی کو خود نہلایا تھا...... اس کی غلاظت صاف کی تھی...... اور وہ اس رات پہلی بار شاید زندگی میں پہلی بار ابا کی چارپائی پر سویا تھا۔

وہ اٹھ، اٹھ کر دیکھتی کہیں وہ باہر نہ چلا گیا ہو...... مگر نہیں وہ وہیں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

آمنہ کو لگا اختر کی جگہ ابا وہاں سوئے ہوئے ہوں۔ اس رات اسے فرش پر لمبے پڑتے آم کا سایہ بھی نہ ڈرا سکا...... ہاں بس اتنا ہوا وہ دوپٹے کا پلو منہ میں دیے گھٹ، گھٹ کر روتی رہی تھی۔ سمرن اور اس کی دوسری سہیلیاں گھر اسے ملنے آئی تھیں۔

''ہمیں پتا ہے آمنہ...... تمہارے دکھ اور تکلیفوں کا...... جانے کیسی ہوا چلی ہے کہ ہر شے، ہر رشتہ تہس نہس ہو گیا ہے۔ ہماری برادری کے لوگ غصے میں پاگل ہو رہے ہیں...... غصے اور جنون میں کچھ نہیں سوجھتا...... تو اختر کو لے کر یہاں سے دور کہیں چلی جا......'' اور وہ ان کی باتوں پر حیرت زدہ سی بیٹھی رہی تھی۔

رات ابلیس کے لبادے میں اتری اور جبر کی خبر دیتی زمین زادوں کے مقابل آن ٹھہری...... گہرے کالی رات کے اندھیرے میں بلوائیوں نے مسلمان گھرانوں پر چڑھائی کر دی تھی...... بوڑھے لوگوں کی گردنیں اڑادی گئیں۔ بچوں کے سر تن سے جدا کر دیے گئے تھے...... اور جوان لڑکوں کو معذور کر دیا گیا...... جوان لڑکیوں کی عزتوں کو تار، تار کر دیا گیا...... آخری تارہ بھی اس بربریت کے مظاہرے پر چھپ گیا تھا۔

دبی، دبی چیخیں، سسکیاں، آہٹیں گونجتی رہیں۔

وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر اختر کے پاس لیٹ گئی تھی...... وہ اس سے لپٹی ہوئی آواز نکالے بغیر روتی رہی۔ اور وہ آمنہ کا ''جھلا'' بھائی اس کا سر تھپکتا رہا۔

اور آدھی رات کو جب اندھیرے نے ہر شے کو نگل لیا تھا...... آمنہ کی آنکھ کھلی تھی، اس کا پہلو اختر کے وجود سے خالی تھا...... وہ ننگے پاؤں گلیوں میں بھاگتی، لالٹین تھامے اسے ڈھونڈتی رہی...... اس کے پیروں سے خون رسنے لگا تھا۔ اور پھر بہت جگہ تلاش کرنے کے بعد وہ اسے وہیں مسجد کے پاس بیٹھا ملا تھا۔

آمنہ نے اسے گریبان سے پکڑا تھا...... اور لالٹین مسجد کی چار دیواری والی چھوٹی منڈیروں پر رکھ دی تھی۔ میلی زرد سی روشنی پھیل رہی تھی۔

''مجھے کیوں اکیلا چھوڑ آئے تھے؟'' وہ وحشت کے عالم میں اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

''امی...... ابا......'' آمنہ جو سمجھ رہی تھی کہ وہ ابا کو بھول چکا ہوگا وہ غلط تھی۔

وہ رو رہا تھا...... مسجد کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے وہ دونوں، بہن بھائی رو رہے تھے۔

''اختر...... ابا ہمیں چھوڑ گئے...... ہم یتیم ہو گئے ہیں...... ہم اکیلے رہ گئے ہیں۔'' کچھ لمحے وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ پھر وہ اٹھی ایک ہاتھ سے اختر کا... ہاتھ پکڑا...... دوسرے سے لالٹین اٹھائی اور وہ دونوں آگے چلنے لگے۔ ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔

پتھریلی کانٹوں والی زمین پر وہ رک گیا تھا...... اس نے اپنے ننگے پیروں کو دیکھا اور پھر آمنہ کے پیروں پر نظر ڈالی تھی...... گرد آلود، خون میں لتھڑے پاؤں...... وہ بھی

ننگے پاؤں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور مشرق سے ہلکا سا روشنی کا غبار اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔
وہ جھکا اور آمنہ کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا..... وہ لالٹین تھامے ساکت کھڑی تھی۔ مجسمہ پتھر کا..... اور آسمانوں کی اور پرواز کرتے ابابیلوں کے جوڑے نے وہ منظر بڑی شان سے دیکھا تھا۔
فجر کے ملگجے نورانی اجالے میں اختر ابن خادم علی، آمنہ بنت خادم علی کے پاؤں چوم رہا تھا۔ اور رو رہا تھا..... وقت ٹھہرا..... زمانے گزرے.....
وہ دونوں ساتھ چلنے لگے..... لالٹین کی لو لرز رہی تھی..... آمنہ ہولے سے بڑبڑائی تھی۔
''ابا دیکھیں آج آپ کی آمنہ ننگے پاؤں کھڑی ہے..... بہت بہادر ہوں میں..... ہوں ناں.....؟'' اس کا سوال بازگشت بنا فجر کی چوکھٹ پر دیوانہ وار منڈلاتا رہا..... گھومتا رہا۔
اور وہ دونوں چلتے رہے..... چلتے رہے..... گھر کی دہلیز پر آن پہنچے۔
☆☆☆
طوفان آیا تھا یا دھرتی پر قیامت خیمہ زن ہوئی تھی وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکی تھی کچھ نہ جان سکی۔
رات کے آخری پہر وہ رات کا حصہ بنے چہروں کو چھپائے آنگن میں کودے تھے..... اختر آرام سے سو رہا تھا، وہ دھڑ کتے دل سے اٹھ بیٹھی..... سرگوشیاں رات کی پہرے دار بنی تھیں۔
''لڑکی کو اٹھالو.....'' پہلی آواز..... وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ اس نے وحشت سے اختر کو دیکھا تھا۔
''جوان لڑکی ہے..... پکڑ لیتے ہیں پھر کماد کے کھیتوں میں پھینک دیں گے.....'' رات کی چادر تلے ننگی تلواریں چمک رہی تھیں۔ اور پھر قیامت صغریٰ بپا ہوئی تھی..... لمحے، سیکنڈ، منٹ، طویل سفر.....
اور آمنہ بنت خادم علی نے خود کو کماد کے کھیتوں میں نڈھال پایا تھا۔ اذیت، کرب..... وہ دہاڑیں مار، مار کر رو رہی تھی۔ کچھ وقت پہلے وہ اپنے ننگے پاؤں دیکھ کر رو رہی تھی اور اب..... اب اس نے گھٹنوں میں سر چھپایا تھا..... دور کہیں سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ''دوڑو، بھاگو..... جان بچاؤ..... جان چلی جائے مگر عزت.....؟'' اس کے سر سے بال تک نوچ لیے گئے تھے۔
اور رات کو حکم ہوا کہ پردے ڈال رکھے..... اور رات حکم بجالائی۔
اور تاریک چاند کی سیاہی میں چرخہ کاتتی بڑھیا نے آمنہ بنت خادم علی کے لہولہان وجود کو اٹھتے دیکھا، گرتے دیکھا اور یہ سلسلہ جاری رہا..... یوں لگا صدیوں کا پہر آن ٹھہرا ہو..... جو کبھی ختم نہیں ہوگا..... جو بس ابتدا رکھتا ہے..... آہ..... وہ بہادر لڑکی گلیوں میں بکھرے لاشے پھلانگتی گھر ڈھونڈ رہی تھی..... اور جب گھر پہنچی تو خاک پر گری وہ سسکیاں لے رہی تھی..... اور وہ آج جان رہی تھی بہادری کے قصوں کا حصہ بننا آسان نہیں ہوتا..... قطعاً نہیں..... یہاں آنکھیں نہیں ''روح'' رو رہی تھی۔
اختر ابن خادم علی کی کٹی پھٹی لاش سیڑھیوں پر پڑی تھی۔ کھلی آنکھوں سے عجیب سی بے بسی جھانک رہی تھی۔ آمنہ نے رات ہی تو سوتے وقت سرسوں کا تیل بالوں میں لگایا تھا۔ یوں لگا مردہ سرسوں کی خوشبو آنگن میں چکرا رہی ہو..... چکراتی پھر رہی ہو۔
وہ اس کے خون سے تر کرتے کو پکڑ کر اسے جھنجوڑتی رہی۔ ''اختر اٹھو..... آنکھیں کھولو.....''
اسے لگا وہ پٹ سے آنکھیں کھولتا ہنس دے گا۔ ''آمی..... آمی.....''
مگر نہ آنکھیں کھلیں اور نہ ہی لبوں پر صدائیں ابھری تھیں..... نوحوں میں ڈوبی ہوا نے یہ منظر دیکھا اور آگے بڑھ گئی..... اسے لگا ابا سامنے سیڑھی پر آن بیٹھے ہوں۔ ''آمنہ..... سر ڈھانپ لے..... بیٹیاں ننگے سر اچھی نہیں لگتیں۔'' وہ دیواروں سے سر ٹکراتی رہی..... آہیں بھرتی رہی.....
''ابا میں لاوارث ہوگئی۔'' اس کا جھلا بھائی مردہ پڑا

تھا اور نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا جارہا تھا۔
وہ لڑکھڑاتی، گرتی پڑتی کمرے میں آئی تھی۔ ٹرنک پچکے ہوئے تھے۔ ہر چیز توڑ پھوڑ دی گئی تھی۔ کپڑوں کو آگ دکھا دی گئی تھی۔ دھواں اٹھا ہوگا...... در و دیوار سیاہی میں ملبوس نظر آتے تھے۔ اس کی ننھی، ننھی بنائی گئی سبز ہلالی پرچم والی جھنڈیاں ادھ جلی فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔
''وطن یونہی نہیں ملا کرتے...... قربانیاں دینی پڑتی ہیں...... تن من، دھن اور عزتوں کی بھی......'' اور وہ تو سب کچھ لٹا چکی تھی...... سونے کی ننھی بالیاں تک اس کے کانوں سے نوچ لی گئی تھیں...... ہلکا، ہلکا خون رس، رس کر فرش میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ در و دیوار کو دیکھتی رہی...... وحشت سے۔ امام رحمت عجلت میں اندر داخل ہوئے تھے...... وہ بے تحاشا رو رہے تھے۔ ان کا بھی سارا خاندان مٹ چکا تھا......
''آمنہ...... میری دھی...... چل جلدی کر قافلہ تیار ہے......'' اس نے سرخ نظریں اٹھائی تھیں۔
''چچا...... سب ختم ہوگیا......'' وہ بلک، بلک کر جلے ہوئے دروازے سے لگے کھڑے رو رہے تھے۔
''سب ختم...... کچھ نہیں بچا...... مگر مقصد تو پورا ہوا...... خواب تو کنارے لگا......'' آنکھوں کی اداسی میں چمک ابھری تھی...... وہ بڑبڑائی تھی۔
''پاکستان بن گیا......؟'' یہ سوال جیسے صدیوں کے چکر میں گھمن گھیریاں کھاتا ہوا اس کے لبوں سے برآمد ہوا تھا...... امام رحمت نے آنکھیں ہاتھ کی پشت سے صاف کی تھیں۔
''ہاں...... پاکستان...... پاکستان تو بن گیا۔ چلو...... میری بیٹی......'' وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آئے...... فرش سے ذرا پرے اختر کی لاش ویسے ہی پڑی ہے۔
امام رحمت نے آم کے پیڑ کے نیچے گڑھا کھودا تھا...... وہ جیسے غنودگی کے عالم میں سب دیکھتی رہی۔
اختر کی لاش کے قریب آئی اور اپنے زخمی ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کیا...... دیوانگی سے دیکھتی رہی...... سرخ آنکھوں سے جیسے سرخ پانی ٹپکا تھا...... آم کا پیڑ ساکت کھڑا تھا...... خاکستری چڑیوں نے سرگوشی کی تھی۔
''آنسوؤں کے رنگ سرخ بھی ہوتے ہیں۔'' وہ اختر پر جھکی اسے بوسے دے رہی تھی...... پیشانی چومی، ایک بار...... دوبار دل بھر آرہا تھا۔
''الوداع پیارے اختر الوداع......'' اور جب امام رحمت نے اختر کو آم کے نیچے کھودی گئی قبر میں اتارا تو کانپ گئی۔
''نہ میرے بھائی کا جنازہ ہوا...... نہ نام کی تختی لگی...... شہید مرتے نہیں...... ہاں وہ تو تا زندگی زندہ رہیں گے...... ہاں یہ سچ ہے۔'' اختر پر مٹی ڈالی جارہی تھی۔ خاک کے اوپر خاک...... آمنہ کے آنسو بھل، بھل بہہ رہے تھے۔ وہ آہستہ سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ پھر آخری بار پلٹ کر گھر کو دیکھا تھا۔ صحن خون سے لت پت تھا۔ گھر پر آخری نظر ڈالتی...... ہاتھ کی پشت سے آنسو چھپاتی آمنہ بنت خادم علی دہلیز پار کر گئی۔ اور یہ بات تاریخ داں ضرور سنہرے حروف میں لکھیں گے۔
''آمنہ بنت خادم علی ایک بہادر لڑکی تھی۔ اس کا تعلق بہادروں کے قبیلے سے تھا۔''
قافلوں کا سفر جاری ہے۔
تھکے، تھکے مسافروں کے چہروں پر جیسے صدیوں کی داستانیں رقم ہیں۔ دھاتی ٹرنک اٹھائے، پلیٹ فارم پر انسانوں کا مجمع لگا ہوا ہے...... ہر آنکھ رو رہی ہے۔ ہر دل نڈھال ہے، ہر کوئی قربانیاں دے کر قافلۂ آزادی کا ہم سفر بنا ہے۔
آمنہ دھاتی پٹریوں پر نظر جمائے بیٹھی سوچ رہی تھی...... ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔
''دیکھ لیں ابا...... آپ سچ کہتے تھے پاکستان بن گیا ہے مگر بھاری خراج چکانا پڑا...... رشتے، ناتے عزتیں سب قربان ہوگئیں...... کاش کہ اگلے وقتوں میں یہ داستانیں یاد رکھی جائیں۔''
''پاکستان زندہ باد......'' دور سے آواز قریب آرہی تھی۔ قافلے جمع ہو رہے تھے۔ پلیٹ فارم ہجوم سے بھر گیا۔

اگست کی وہ اداس شام آزادی کے دروازے کھولے کھڑی ہے۔

آمنہ نے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجا...... کھوجتی رہی...... آنسو ٹپ، ٹپ آنکھوں سے گرتے رہے، گر رہے ہیں۔

مگر وہ بہادر قبیلے کی باسی نم آنکھوں سے اداس ہنسی ہنستی......

''پاکستان پر تو ہمارا تن من دھن قربان ہے۔''

اور قصہ گو لوگوں نے آزادی کے قصوں میں حوصلوں، ولولوں، جذبوں اور صداقتوں کو رونمائی بخشی ہے۔

اور بھید بھری اداس شام اگست میں آج نعرے بھر رہے ہیں۔

''پاکستان زندہ باد......''

''پاکستان کا مطلب کیا...... لا الہ الا اللہ!''

اور اس منحنی بظاہر کمزور مگر ذہین اور روشن چمکدار، ذہین آنکھوں والے شخص نے پاکستان بنا ہی لیا۔

☆☆☆

میں سرسید ہال کی سیڑھیوں سے اٹھا اور اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہلالی جھنڈیاں اکٹھی کرنے لگا تھا۔ شاہ بلوط کے درختوں پر جگنوؤں کے جھرمٹ ٹھہر گئے ہیں۔

ہواؤں میں خنکی سی در آئی تھی...... زرد پتے اڑتے ہوئے میرے قدموں سے لپٹے جاتے تھے۔ میں نے دور، دور تک پھیلے ملگجے سے اندھیرے کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچا تھا۔

''ہاں شاید یہ بات سچ ہے کہ اب کوئی جناح نہیں آئے گا...... کوئی خضر قدم نہیں رکھے گا...... اگر ہمیں پاکستان کی ترقی، خوشحالی درکار ہے تو ہمیں سوچ بدلنا ہوگی...... سوچ جو کہ انسانی زندگی کا مرکز ہے...... محور ہے...... ہمیں اپنے آپ کو جناح کے روپ میں، خضر کے روپ میں ڈھالنا ہوگا......''

اسی پل مجھے اپنا بیٹا اذان رحمان علی یاد آیا تھا...... جس کے نزدیک پاکستان کی، مٹی کی باتیں کرنا پاگل پن ہے...... مگر اب مجھے ایک چیز سمجھ آ رہی ہے......

اور میں اس پر ہنسنا چاہتا ہوں...... بادلوں کی اوٹ سے ابھرتے چاند کو میں نے دیکھا تھا۔

look at me dear moon, I am laughing

''ہاں...... تو اذان جیسے اور کوئی دوسرے نوجوان پاکستان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں...... مگر وہ نہیں جانتے یہ حوالہ ہی تو ان کی کامیابی کی ضمانت ہے...... جو سوچ کے دروازوں کو وقت کی کنجی سے کھولے گا...... اور وہ وقت جلد آئے گا...... بہت جلد...... ہاں وہ نسل آئے گی جو تاریخ آزادی کے ابواب پر روشنی ڈالے گی...... تب آزادی کے قصے بڑی شان سے پڑھے جائیں گے...... سنائیں جائیں گے۔

اور وقت پھر سے دوبارہ محمد علی جوہر، سرسید احمد خان، لیاقت علی خان، چوہدری رحمت علی خان پیدا کرے گا۔ سارے حوالے پاکستان سے ہیں...... سارے رشتے اس مٹی سے ہیں۔

ایک پل کو تو سوندھی مٹی کو پھرول کر دیکھا جائے......

وطن کی مٹی میں شہیدوں کا لہو خوشبو بکھیر رہا ہے۔''

میں نے زمین پر بیٹھ کر ہتھیلیوں میں مٹی بھر کر اسے انگلیوں سے گزار کر سونگھا ہے......

"a magical fragrance" اور کچھ عرصے پہلے آمنہ بنت خادم علی نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر دعا کی تھی۔

''کاش...... ہماری قربانیاں اگلی نسلوں میں یاد رکھی جائیں......'' اور وہ دعا قبول ہوئی تھی۔

''وہ اسلاف کی قربانیاں یاد رکھی جا رہی ہیں۔'' میں نے آگے سڑک کی طرف بڑھتے ہوئے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔ سیڑھیوں پر ''وہ'' بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

''رحمان علی...... خضر بن جاؤ...... جناح ہو جاؤ......'' میں ہاتھ ہلاتا، مسکراتا ہوا پلٹ آیا تھا......

اور وقت کی محفل میں صدا گونجی ہے...... ''خضر کبھی مرتے نہیں......''



شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

غیبت...... مذمتِ اِلٰہی

تمام تر حمد و ثنا اس عظیم ذات کے لیے ہیں جو ہمارا رب ہے۔ وہ اللہ جس کے نورِ جلال سے سورج اور چاند پُر نور ہیں۔ جس کی توجہ ہر پاک، ایماندار نفس کی طرف ہوتی ہے۔ جس کا کرم اور فضل باوجود کثرت حاجات بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اے اللہ...... تو اپنی رحمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپؐ کی آل پر آپؐ کے اصحابؓ پر نازل فرما...... (آمین)

آج ہمارا موضوع غیبت ہے۔ غیبت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخص کا اس طرح ذکر کیا جائے کہ اگر وہ سنے تو برا جانے۔ خواہ اس ذکر کا تعلق اس کے جسمانی نقص سے ہو یا اخلاقی عیب سے ہو خواہ اس کے قول کو برا کہا جائے یا اس کے فعل کو خواہ اس کے نام میں کیڑے نکالے جائیں یا نسب میں...... اس کے دین، اس کی دنیا یہاں تک کہ کپڑے اور جانور کے بارے میں بھی وہ الفاظ استعمال کرنا جو اسے ناگوار گزریں غیبت ہے۔ ''بدن'' کا عیب یہ ہے کہ کسی کو چُندھا، بھینگا، گنجا، پستہ قد، لمبا، کالا کہا جائے یا پھر اس کے جسم میں موجود ایسے وصف کو کہا جائے جو اچھا نہ ہو۔ ''نسب'' کے سلسلے میں کسی کے باپ کو غلام...... فاسق، موچی یا کسی مکروہ پیشہ والا بتلایا جائے...... ''اخلاقی'' عیب یہ ہے کہ فلاں شخص بدمزاج ہے، بخیل ہے، متکبر، ریاکار اور بہت جلد غصہ ہو جانے والا...... بزدل، کمزور، عاجز یا ایسی ہی کسی اخلاقی برائی میں مبتلا ہو...... ان افعال میں جن کا تعلق دین سے ہے۔ اس طرح عیب لگایا جا سکتا ہے کہ وہ چور ہے، جھوٹا، مے نوش (شرابی) بے ایمان، ظالم، نماز روزہ اور دیگر عبادات میں سستی کرنے والا...... رکوع و سجود اچھی طرح ادا نہ کرنے والا ہے۔ دنیا سے تعلق رکھنے والے افعال میں عیب اس طرح ہے کہ وہ بے ادب ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آتا۔ دوسرے کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا۔ زیادہ بولتا ہے، زیادہ کھاتا ہے، زیادہ سوتا ہے، کپڑوں میں عیب اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی آستین چوڑی ہے۔ آپ کا دامن وسیع ہے، اس کے کپڑے گندے اور میلے ہیں۔

غیبت کا ماحصل (خلاصہ) یہ ہے کہ کسی آدمی کے متعلق ایسی بات کہنا کہ اگر وہ سُنے تو برا مانے...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیبت کی یہی تعریف فرمائی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص کسی کا اس طرح ذکر کرے تو وہ غیبت کا مرتکب کہلائے گا۔ اپنے رب کا نافرمان کہلائے گا...... اور اپنے بھائی کا گوشت کھانے والا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے دریافت کیا جانتے ہو غیبت کسے کہتے ہیں؟ عرض کیا گیا...... اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں...... فرمایا۔

''اپنے بھائی کی ناپسندیدہ بات کا ذکر کرنا (غیبت) ہے۔''

صحابہ نے عرض کیا...... یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر وہ بات اس شخص میں موجود ہو فرمایا...... اگر موجود ہو تو غیبت ہے ورنہ تہمت ہے۔ ایک بار سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں کسی شخص کا ذکر ہوا۔ صحابہ نے عرض کیا وہ تو بڑا عاجز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تم نے اس کی غیبت کی ہے۔ عرض کیا ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں، یہ عیب اس میں موجود ہے۔ فرمایا۔ ''یہی تو غیبت ہے اگر تم ایسی بات کہتے کہ جو اس میں موجود نہیں ہے تو اس پر تہمت لگاتے۔''

حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں۔ کسی دوسرے کا ذکر

تین طرح سے کیا جاتا ہے۔

غیبت، بہتان، افک

غیبت...... کسی ایسی بات کا ذکر کرنا جو اس میں موجود ہو۔

بہتان ..... وہ بات بیان کرنا جو اس میں موجود نہیں ہے۔

افک ..... وہ بات بیان کرنا جو تم نے کسی سے سنی ہو۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں غیبت کی مذمت کی ہے اور اسے اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو۔“

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”کُل مسلمان ۔اس کا خون، اس کا مال اس کی آبرو مسلمان پر حرام ہے۔“

غیبت سے مسلمان کی آبرو پر حرف آتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا......

”غیبت سے بچو...... اس لیے کہ یہ زنا سے سخت تر ہے۔“

اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی زنا کر کے اللہ سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرما دے گا تو اس گناہ سے نجات پا جاتا ہے۔ لیکن غیبت کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی گئی ہو...... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”معراج کی رات میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے چہروں کو ناخنوں سے نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں اور ان کی آبرو سے کھیلتے ہیں۔“

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جو شخص غیبت سے توبہ کر کے مرے گا۔ وہ جنت میں سب کے بعد داخل ہوگا اور جو توبہ کیے بغیر مرے گا وہ سب سے پہلے دوزخ میں جائے گا۔

حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے روزہ رکھنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں کوئی شخص افطار نہ کرے...... چنانچہ لوگوں نے روزہ رکھا۔ شام ہوئی لوگ ایک، ایک کر کے آتے ۔۔۔ اور افطار کرنے کی اجازت لے کر واپس ہو جاتے ایک شخص نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری دو لڑکیوں نے بھی دن بھر روزہ رکھا تھا، وہ آپ کے پاس آنے سے شرماتی ہیں اگر اجازت ہو تو وہ بھی افطار کر لیں۔

آپ نے اس سے اعراض فرمایا......اس نے پھر اجازت مانگی...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا......وہ روزے سے نہیں تھیں بھلا کوئی شخص دن بھر لوگوں کا گوشت کھا کر بھی روزے سے رہ سکتا ہے؟ تو ان، سے کہہ کہ اگر وہ روزے سے تھیں تو قے کریں۔ انہوں نے قے کی اور ہر ایک کے منہ سے جما ہوا خون نکلا۔ وہ شخص دوبارہ حاضر ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع دی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر یہ لوتھڑے ان کے پیٹوں میں رہ جاتے تو انہیں دوزخ کی آگ کھاتی۔“

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہمارا گزر ایسی دو قبروں پر ہوا جن کے مُردوں کو عذاب ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور یہ عذاب (بظاہر) کسی بڑے گناہ کے نتیجے میں نہیں دیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک تو لوگوں کی غیبت کیا کرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب کی نجاست سے نہیں بچتا تھا۔“ اس کے بعد آپ نے کھجور کی ایک یا دو تر شاخیں منگوائیں اور انہیں توڑا اور حکم دیا کہ ”ان کی قبروں میں گاڑ دی جائیں جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی ان کے عذاب میں کمی رہے گی۔“

حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ عذاب قبر کے تین حصے ہیں، ایک تہائی غیبت کی وجہ سے، ایک تہائی چغل خوری کے باعث اور ایک تہائی پیشاب کی نجاست سے نہ بچنے

کے باعث......

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں...... بخدا غیبت آدمی کے دین پر اتنی تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے کہ سرطان کا مرض بھی اتنی تیزی سے جسم پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم نے بعض اکابر سلف کو دیکھا ہے کہ وہ لوگ نماز پڑھنے، روزہ رکھنے کو عبادت نہیں سمجھتے تھے بلکہ لوگوں کی بے آبروئی سے بچنے کو عبادت سمجھتے تھے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب تم اپنے کسی دوست کے عیوب بیان کرنے کا ارادہ کرو تو اپنے عیوب یاد کرلو۔

حضرت حسنؓ خطاب فرمایا کرتے تھے کہ اے ابن آدم! تو اس وقت تک ایمان کی حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا جب تک کہ لوگوں کو اس عیب کی وجہ سے برا کہنا ترک نہیں کرے گا جو تیرے اندر موجود ہے۔ جب تو اپنے نفس کی اصلاح میں مصروف ہوگا تو دوسروں کے عیوب پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہوگی۔

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے چند حواریوں کے ساتھ مُردار کتے کے قریب سے گزرے۔ کسی نے کہا اس کتے میں کتنی بدبو ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کے دانت کتنے سفید ہیں، گویا آپ نے انہیں کتے کی غیبت کرنے سے منع فرمایا۔ اور اس بات پر تنبیہہ کی کہ وہ اللہ کی مخلوق کے محاسن کا ذکر کیا کریں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ''اللہ کا ذکر کیا کرو...... اس میں شفا ہے، لوگوں کا ذکر مت کیا کرو اس میں بیماری ہے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کسی کی بات بری لگتی یا ناگوار گزرتی تو یہ نہ فرماتے کہ فلاں شخص ایسا کرتا ہے بلکہ یوں فرماتے کہ ''لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔''

ایک شخص انتہائی بدحواسی کی حالت میں آیا اور اس نے کہا کہ مجھ سے ایک سخت گناہ سرزد ہوگیا ہے اس گناہ کی ندامت سے سخت پریشان ہوں برائے خدا کوئی ایسی تدبیر بتائیں کہ تلافی یا معافی ہوسکے اور میرا دل پُرسکون ہو...... بزرگ نے فرمایا کہ آخر وہ کون سا گناہ ہے جس کے لیے تم اس قدر گھبرا رہے ہو...... اس شخص نے سر جھکا کر کہا کہ حضرت میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔ ان بزرگ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید تم نے کسی کی غیبت کی ہے۔ اس سے اندازہ کریں کہ غیبت کو کس قدر برا سمجھا جاتا ہے۔

☆☆☆

مدینہ منورہ میں ایک عورت کا انتقال ہوگیا۔ جب پیشہ ور غسالہ مرنے والی خاتون کو نہلا رہی تھی تو اچانک اس نے قریب کھڑی ہوئی خواتین سے کہا کہ مرحومہ ایک بدکار عورت تھی۔ ابھی غسالہ کے الفاظ کی گونج ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اس کا ہاتھ مردہ عورت کے جسم سے چپک کر رہ گیا چند لمحوں تک مرحومہ کی رشتے دار خواتین اس راز کو سمجھ نہ سکیں۔ مگر جب انتہائی کوشش کے باوجود غسالہ کا ہاتھ بدن سے علیحٰدہ نہیں ہوسکا تو پھر ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ حاضرین نے اپنی آنکھوں سے بڑے، بڑے حیرت ناک مناظر دیکھے تھے مگر یہ واقعہ ان سب سے جدا تھا۔ لوگ جنازے کو بھول کر غسالہ کی جانب دیکھنے لگے جس کے چہرے پر دحشت برس رہی تھی۔ علمائے کرام سے بھی رجوع کیا گیا مگر کوئی شخص بھی اس عجیب وغریب مسئلے کا حل نہیں پیش کرسکا۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا اور میت کی تدفین میں تاخیر ہوتی جارہی تھی۔ غسالہ کے ساتھ مرحومہ کے عزیز واقارب بھی سخت پریشان تھے۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ اگر غسالہ کا ہاتھ الگ نہ ہوسکا تو پھر جنازے کو کس طرح دفن کیا جاسکے گا۔ یہ منظر دیکھ کر بعض لوگوں کے ذہن اس قدر منتشر ہوگئے کہ وہ غسالہ کا ہاتھ کاٹنے کی تجویز پیش کرنے لگے۔ اسی طرح میت کی تدفین ممکن تھی۔ اس تجویز پر غسالہ زاروقطار رونے لگی۔ تب ہی ہجوم میں سے ایک آواز ابھری کہ اس سلسلے میں حضرت امام مالک بن انسؒ سے رجوع کیا جائے۔ اس شخص کی بات تسلیم کرلی گئی پھر کچھ معززینِ شہر حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عجیب وغریب مسئلہ بیان کیا۔ حضرت امام مالکؒ بہت دیر تک غوروفکر

کرتے رہے پھر فرمایا۔ ”غسالہ نے مرنے والی خاتون کو یقیناً کوئی ایسا آزار پہنچایا ہے جسے خدا پسند نہیں کرتا۔ دریافت کرو کہ مرحومہ کے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا؟ یہ وہ عذاب ہے جسے قدرت دنیا میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔“

لوگ اٹھ کر چلے گئے اور جب انہوں نے غسالہ کو یہ بات بتائی تو وہ چیخ کر رونے لگی اور پھر فوراً یہ اعتراف کرلیا کہ اس نے مرحومہ پر بدکاری کی تہمت لگائی تھی۔ حضرت امام مالکؒ سے دوبارہ رجوع کیا گیا تو آپؒ نے فرمایا۔

”مرنے والی ایک پارسا خاتون تھی، خدا کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اہلِ دنیا کی نظر میں اس کی پاکبازی داغدار ہوجائے اسی لیے غسالہ کو تماشا بنادیا گیا ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کرسکیں۔ اب اس تہمت طراز عورت کے جسم پر سو دُرّے لگاؤ، ہاتھ الگ ہوجائے گا۔“ پھر ایسا ہی کیا گیا۔ شرعی حکم کے مطابق غسالہ کے سو درے لگائے گئے جیسے ہی سزا کی تکمیل ہوئی اس کا ہاتھ مرحومہ خاتون کے جسم سے الگ ہوگیا۔

☆☆☆

اکابرِ صوفیا کسی غائب کی بات نہیں کیا کرتے تھے کہ خدانخواستہ اس کی غیبت ہوجائے۔

غیبت کرنے والے پر جب واجب ہے کہ وہ اپنے فعل پر نادم ہو۔ تاسف کا اظہار کرے اور توبہ کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حق سے بری الذمہ ہوجائے پھر اس شخص سے معاف کرائے جس کی غیبت کی ہے۔ صرف زبان سے معافی کی درخواست کرنا کافی نہیں ہے بلکہ دل سے بھی نادم ہونا ضروری ہے۔

حدیث شریف سے ثابت ہے کہ اگر کسی نے مسلمان کی آبرو کو نقصان پہنچایا اور معافی نہ مانگی تو اس پر مواخذہ ہوگا اور نیکیاں لے کر یا گناہ دے کر بدلہ چکایا جائے گا۔

☆☆☆

شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیبت کو انتہائی گھناؤنا اور مکروہ فعل قرار دیا اور ہر ممکن طور پر اس سے اجتناب کا حکم دیا ہے مگر بعض صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ جب غیبت ناگزیر ہوجاتی ہے تو غیبت کی مندرجہ ذیل صورتوں کو مباح قرار دیا گیا۔

1۔ مظلوم کا اس کے ساتھ کیے گئے مظالم کو بیان کرنا۔

2۔ کسی دینی معاملے میں قاضی کے سامنے معاملے کی حقیقت کو بیان کردینا۔

3۔ کسی کے رشتے وغیرہ کے سلسلے میں اصل حقائق سے فریقین کو آگاہ کرنا۔

4۔ کسی بدکردار انسان سے متعلق لوگوں کو مطلع کردینا تاکہ وہ محتاط ہوجائیں۔

5۔ اصلاح کی نیت سے کسی کی غلط عادت کو بیان کرنا لیکن نام لے کر کسی شخصِ خاص کی طرف اشارہ کرکے نہ کہا جائے۔

6۔ معاشرے میں بدامنی اور گمراہ کن پروپیگنڈا کرنے والے افراد کے ارادوں اور عمل سے لوگوں کو واقف کرنا۔

غیبت زنا سے شدید تر گناہ ہے۔ مگر آج ہم اپنے اس معاشرے پر نظر ڈالیں تو شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو صبح سے شام تک کئی دفعہ اپنے رشتے داروں، عزیزوں، دوستوں کی غیبت نہ کرتا ہو جب دو لوگ آپس میں ملتے ہیں اور باہم گفتگو کرتے ہیں تو ان کی گفتگو کا بیشتر حصہ غیبت پر مشتمل ہوتا ہے۔ نہ مرد اس گناہ سے محفوظ ہیں اور نہ عورتیں...... ہر گھر میں، ہر محفل میں، ہر ملاقات میں، غیبت کا طوفان برپا ہے، بڑھ چڑھ کر غیبت میں حصہ لیا جاتا ہے۔ اللہ ہم میں سے اس رذیل عادت کو ختم کردے اور ہمیں اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حرفِ آخر...... اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت سے امید رکھتی ہوں کہ اس مضمون کی کسی غلطی پر کوتاہی پر یا کمی پر وہ مجھے معاف کردے گا کہ بے شک وہ اپنے بندوں کو معاف کرنا پسند فرماتا ہے۔ اے اللہ تو مجھے معاف فرمادے۔

اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو پاک کردے۔ مصفّا کردے۔ ایسا بنادے جیسا کہ وہ دیکھنا پسند فرماتا ہے، آمین۔

☆☆☆

وہ آئے بزم میں……

نزہت اصغر



دلکش احساسات کی مالک……
خوب صورت طرزِ فکر کی حامل……

ہماری پُرخلوص ساتھی……عذرا آفتاب سے خوشگوار ملاقات

وطنِ عزیز کے حسین اور باصلاحیت باسیوں کو جشن آزادی مبارک ہو۔ پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ ہمارا ملک روز افزوں ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہے اور اہالیانِ وطن جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر اپنے، اپنے شعبوں میں ملک اور ہم وطنوں کے لیے بے غرض کام کرتے رہیں۔ آج کی اس بزم میں ایسی ہی ایک دلکش ہم وطن محترمہ عذرا آفتاب کی آمد نے رونق بڑھائی ہے۔ عذرا کافی عرصے سے پاکیزہ سے وابستہ

ہیں۔ وہ پاکستان سے باہر سفر میں بھی رہتی ہیں۔ ان کی تحریریں انسانی قدروں کے گرد گھومتی ہیں، وہ فطرت کے حسن کو اپنی تحریروں کے ذریعے مزید اجاگر کرتی ہیں اور یہی بات ان کی روز مرّہ گفتگو میں بھی نمایاں ہے۔ تو آئیں ملاقات کرتے ہیں عذرا آفتاب سے کہ جن کی باتیں روشن اور چمکدار آفتاب کی طرح حدت اور توانائی بھی فراہم کررہی ہیں۔

پاکیزہ ✧......ایک زمانے میں آپ اکثر کہانیاں پاکیزہ میں بھیجا کرتی تھیں پھر ایک طویل وقفہ آگیا......کوئی خاص وجہ......؟

عذرا آفتاب ❖......وجہ تو کوئی خاص نہیں...... وقت ہی سوکھے پتوں کی طرح بے آواز ہوکر اڑ گیا...... میں خود بھی حیران ہوں......ایسا کیوں ہوا......اتنے وقت میں تو بہت کچھ لکھا جاسکتا تھا۔ آپ نے اتنی محبت سے یاد کیا ہے تو میں اپنی کہانیوں کے ساتھ آئی ہوں، یاددہانی کا شکریہ۔

پاکیزہ ✧......آپ کاغذ اور قلم کے شوق اور مشغلے کو قارئین کے سامنے کب لائیں......؟ اور گھر والوں کے کیا تاثرات تھے؟

عذرا آفتاب ❖......آپ اسے اتفاق کہیں یا پھر قدرت کا دیا ہوا بہترین انعام......یاد کرتی ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور اپنے اس شوق پر فخر بھی کرتی ہوں۔ ہر ماں کی طرح میری امی کے بھی میرے لیے کئی خوب صورت خواب تھے۔ وہ اچانک بیمار ہوئیں، تین ماہ بیمار رہ کر جوانی میں خدا کے گھر چلی گئیں۔ (اوہ! اللہ ان کی مغفرت کرے) چار افراد پر مشتمل میری فیملی تھی تین رہ گئے...... ہر روز کالج سے آکر تمام دن رویا کرتی تھی ایک دن میں نے سوچا کیوں نہ میں کہانیاں لکھوں...... قدرت مہربان ہوئی دو ہفتے میں چار شارٹ اسٹوریز میرے سامنے تھیں۔ میری امی کی دوست نے میری کہانی پڑھی اور وہ لے گئیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ساغر میگزین، میری کہانی ''شعلے'' کے ساتھ میرے پاس آگیا۔ پوری دوپہر میں حیرت اور خوشی کے احساسات کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ یہ میرے شوق کی ابتدا تھی۔ شام کو میرے والد، جنہیں ہم بھائی میاں جی کہتے تھے اور بھیا جی آگئے۔ میں نے چائے کے کپ اور میگزین سائڈ میں ٹیبل پر رکھ دیا۔ بھیا جی نے میگزین اٹھایا سرسری پڑھا......اور بھائی میاں جی کی طرف کھول کر بڑھا دیا۔ انہوں نے الٹ پلٹ کر دیکھا میری طرف غور سے دیکھتے رہے' ان کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ کھڑے ہوکر میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر باہر چلے گئے۔ ان دنوں بھائی میاں جی کی ہر شام قبرستان میں تلاوت کرتے ہوئے گزرا کرتی تھی۔ اس دن انہوں نے ہماری ماں کی یاد کے ساتھ اپنی خوشی ضرور شیئر کی ہوگی۔ بھیا جی نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر ہوا میں اچھالا......خوش ہوکر کہا۔ ''تم نے تو کمال کردیا۔ اس شوق کو جاری رکھنا۔'' (ہاں بے شک گھر والوں کا مثبت ردِعمل ہی اس شوق کو پروان چڑھاتا ہے)

پاکیزہ ✧......زمانۂ طالب علمی کی کوئی خوشگوار یاد شیئر کیجیے؟

عذرا آفتاب ❖ ہاں، کیا خوب یاد دلایا۔ اب اگر تھوڑا سا بھی سوچا تو الٹے پاؤں چل کر جانے کو دل مچل جائے گا۔ اور یہ ہو نہیں سکتا تو پھر یاد کرنے کا کیا فائدہ......

پاکیزہ ✧......جب آپ نے لکھنا شروع کیا تھا تو اس وقت آپ کن رائٹرز سے متاثر تھیں۔ یا ان کی تحریر سے کچھ سیکھتی تھیں؟

عذرا آفتاب ❖......ان دنوں میں حور اور زیب النساء پڑھا کرتی تھی۔ میگزین آتے ہی سب سے پہلے وحیدہ نسیم کی کہانی پڑھتی تھی۔ پھر شوق بھی ان ہی دنوں جاگا......شاید اسی وجہ میری پہلی کوشش کامیاب ہوئی۔ (وہ تو واقعی بڑے پائے کی رائٹر تھیں)

پاکیزہ ✧......آپ کی کہانیاں کتابی شکل میں بھی آئیں؟

عذرا آفتاب ❖......جی ہاں، کتابی شکل میں بھی پبلش ہوئی ہیں اور اکثر کہانیاں لندن کے میگزین

ساحل میں پبلش ہوتی رہتی ہیں۔ اور برنی بک سینٹر نے مجھے یہ اعزاز دیا ہے۔ میری کتابیں ہر بک سینٹر سے بھی مل رہی ہیں...... اور اب ان کی ویب سائٹ پر بھی ملتی ہیں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... آپ کے خیال میں افسانے اور کہانیوں میں تفریح کے ساتھ، ساتھ مقصدیت بھی ہونی چاہیے؟

عذرا آفتاب ❖...... جی بالکل...... اگر کہانی سے مقصدیت کو نکال دیا جائے تو پھر کہانی لکھنا بیکار ہے اور رائٹر کی تمام محنت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ اگر ذہن کسی بات سے اچھا اثر لے کر اچھائی کو اپنائے تو لکھنے والے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ (جی یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... پندرہ برس پہلے اور اب کی کہانیوں میں کچھ فرق پاتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... وقت کے ساتھ سوچ بھی بدلتی ہے اور رائٹر بھی اسی ماحول سے نکلتا ہے۔ اس لیے وہی کچھ لکھتا ہے جو وقت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کچھ مختلف نہیں لگتا۔

پاکیزہ ✧...... کیا خواتین رائٹرز اور مرد رائٹرز کی تحریریں پہچان لی جاتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... جی بالکل اندازِ بیاں اور سوچ دونوں کی جدا ہوتی ہے۔ تھوڑی سی تحریر پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... دوستوں کی محفل میں کبھی کوئی اختلاف آجائے تو اس کے بعد کیا آپ دوستی نبھاتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... ابھی تک کبھی ایسا ہوا نہیں ہے اور دوستی تو نبھانے کے لیے ہی ہوتی ہے اور اگر کوئی بہت ہی بڑی بات ہو جائے تو سلیقے سے درگزر کر دینا چاہیے۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔ (بالکل صحیح خیال ہے)

پاکیزہ ✧...... لوگوں سے ملنے کی کس حد تک شوقین ہیں یا فون پر ہی مبارک باد، تعزیت اور مزاج پرسی کر لیتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... مجھے جیسے ہی کوئی اطلاع ملتی ہے میں فون پر بات کر لیتی ہوں...... اور اگر وقت ہو تو چلی بھی جاتی ہوں۔ ویسے آج کل تو صحت اچھی نہیں رہتی۔ (اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے)

پاکیزہ ✧...... سوشل گیدرنگ اور سماجی تعلقات کس حد تک نبھاتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... میری کوشش ہوتی ہے کہ ضرور جاؤں۔ اگر کسی ذاتی مصروفیت کی وجہ سے نہ جا پاؤں تو معذرت کر لیتی ہوں...... اور پھر بھی وقت نکال کر چلی بھی جاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا بچپن کیسا گزرا...... کوئی ایسی یاد...... جو خیال آتے ہی دل چاہے کہ اسی وقت میں چلی جائیں؟

عذرا آفتاب ❖...... میرا بچپن بہت ہی خوب صورت تھا۔ ہم ایک بستی میں رہتے تھے۔ زمیندار گھرانا تھا۔ میرے والد شوقین اور آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ اس لیے ہماری زندگی بستی کے اور لوگوں سے بہت بہتر اور خوب صورت گزری۔ میری امی بھی اچھے ماحول اور زندہ دلی کی حامی تھیں۔ انہیں میوزک سے بھی لگاؤ تھا۔ شہر میں آنے والی نئی کتابیں وہ سب سے پہلے پڑھتی تھیں۔ اکثر کھلونے وہ مجھے خود بنا کر دیتی تھیں۔ میرے لیے گھر میں جھولا، طوطا، میمنا (بکری کا بچہ) یہ میرے کھلونے تھے۔ پودوں کا، پھولوں کا بہت شوق تھا۔ وہ کیاریاں، پودے، پھول خود ہی سنبھالتی تھیں۔ پرندوں سے بھی بہت پیار تھا۔ گرمی کی راتوں میں، میں پہلے کہانی سنتی تھی پھر چاند کے پیچھے آسمان پر بھاگتے ہوئے بادلوں کے درمیان میں خود کو چھپتا ہوا محسوس کرتی تھی اور اسی کیفیت میں سو جایا کرتی تھی...... اب جب بھی پورا چاند دیکھتی ہوں...... خوش ہو کر اسی ماحول میں پہنچ جاتی ہوں اور وہی خوشی ملتی ہے۔ (واہ بھئی)

پاکیزہ ✧...... آپ بچپن سے ہی نیچر کے اتنے زیادہ قریب ہیں۔ تو پھر بارش، قوسِ قزح، پھول، رنگ اور خوشبو خوش رنگ پرندے، مختلف آوازیں ان سب کے بارے میں اپنے احساسات کو کس طرح بیان کریں گی؟

عذرا آفتاب ❖...... مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یہ تمام چیزیں میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں، اور اس سے بھی بڑی بات کہ آپ بھی ان سب چیزوں سے آشنا ہیں۔ ورنہ تو لوگ بہت سرسری انداز میں دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ بارش کو میں بچپن سے ہی آنکھیں بند کر کے محسوس کیا کرتی تھی...... اور دعا کرتی تھی کہ دیر تک برستی رہے۔ بارش کے رکنے پر افسوس ہوتا تھا...... میری امی اکثر بیر بہوٹیاں شیشے کی بوتل میں نم ریت ملی مٹی میں کچھ دانے چاول کے ڈال کر ٹیبل پر رکھ دیا کرتی تھیں میں انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ بارش کے بعد اکثر رین بو...... یعنی دھنک کا ہالہ کچھ دیر کے لیے آسمان پر نمودار ہو جاتا تھا۔ میں یہ تمام رنگ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی اور سوچنے لگتی تھی کہ کاغذ پر اگر میں اماں کے ڈبے سے کچھ رنگ نکال کر بکھیر دوں اور بارش کے کچھ قطرے اس پر گریں تو...... اسی وقت (مٹھو) میرا طوطا مجھے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا میں اسے روٹی کھلانے لگتی تو (مینا) میرا بکری کا بچہ آکر میرے کُرتے کا دامن اپنے دانتوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتا اور میں اسے اپنی گود میں اٹھا کر جھولے میں جا کر بیٹھ جاتی تھی اور دل میں دعا کرتی تھی کہ اللہ کرے تھوڑی سی بارش اور ہو جائے اسی وقت ایک آواز دروازے سے آتی چنا گرم، بھیا جی دوڑ کر دروازے پر جاتے اور کاغذ کی تھیلی میں گرم بھنے ہوئے چنے لا کر مجھے دیتے۔ (کیا خوب زمانہ تھا) اور پھول قدرتی ہوں یا انسان کے بنائے ہوئے مجھے سب ہی اچھے لگتے ہیں۔ ویسے گلِ نرگس، سفید للی اور کاسنی رنگ کے لیونڈر انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح رنگ بھی سب ہی خوب صورت ہوتے ہیں اگر اپنی ذات کے حوالے سے کہوں تو سفید، کالا اور میرون پسند کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... اچھا پھر تو درخت کا بھی بتائیں کون سے پسند ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... برگد، پیپل، بزرگی کی وجہ سے...... اشوکا، باٹل پام اور یوکلپٹس یعنی سفیدہ...... وجاہت کی وجہ سے اچھے لگتے ہیں۔ یوکلپٹس کا درخت بارش کے بعد اپنی ہر پتی پر ایک قطرہ پانی کا روک لیتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں کسی کھمبے سے روشنی پڑنے پر کیا خوب صورت سماں ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ رات بھر خدا کا کرشمہ دیکھتے رہو اور رات بیت جائے۔ اسی طرح املتاس پر بہار میں پیلے پھولوں کے گچھے لٹکتے ہیں تو من میں ہلچل مچ جاتی ہے (واقعی آپ کس قدر نیچر کے قریب ہیں، سبحان اللہ)

پاکیزہ ✧...... کھانے میں کیا پسند کرتی ہیں اور لباس کون سا پہنتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖...... کھانا میں بہت سادہ کھاتی ہوں، گوشت پسند نہیں ہے، دال، چاول، سبزی کبھی کبھار شامی کباب پسند کرتی ہوں، اچار اور چٹنیاں میں خود بناتی ہوں، باہر کی چیزیں بہت کم منگاتی ہوں۔ (بہت خوب) لباس کی جہاں تک بات ہے پارٹی میں ساڑی پہنتی ہوں گھر میں کرتا، ٹراؤزر اور دوپٹا۔

پاکیزہ ✧...... فلم، ٹی وی اور انٹرنیٹ...... کس کا زیادہ شوق ہے؟

عذرا آفتاب ❖...... میں اکثر فلم دیکھتی ہوں، کبھی پکچر ہاؤس میں جا کر...... یا ٹی وی پر اور اگر پسند آجائے تو کئی بار دیکھتی ہوں۔ ٹی وی پر وہ ڈراما دیکھتی ہوں۔ جس میں کوئی سچائی ہو...... اخلاق سوز نہ تو ڈائیلاگ ہوں اور نہ ہاتھ کا کرشمہ...... انٹرنیٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

پاکیزہ ✧...... بات اگر قارئین کی پسند کی ہو تو رائٹر کو اپنی پسند سے لکھنا چاہیے یا جو قاری پسند کرے؟

عذرا آفتاب ❖...... دیکھیے سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے۔ اچھا اور برا کیا ہے...... ڈرامے، کہانیاں اس خیال سے لکھے جاتے ہیں کہ دیکھنے والے کو کوئی اچھا میسج ملے، برائی دکھائی تو ذہن بھی پریشان اور وقت الگ برباد ...... کیا ملا؟ دیکھنے والے کا وقت اچھا گزرے کچھ نیا کرنے کی امنگ ملے...... تو لکھنے والے کو خوشی اور سکون ملتا ہے۔ رائٹر اپنے قلم سے وہ سب کچھ سکھا دیتا ہے جو استاد بچپن میں بھی نہیں سکھا پاتے

کیونکہ اس وقت شعور پورے طور سے بیدار نہیں ہوا ہوتا......کم از کم میرا یہی خیال ہے۔ (اچھا خیال ہے)

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں آج کی نوجوان نسل کچھ مختلف ہے؟

عذرا آفتاب ❖......ہماری نوجوان نسل بہت ذہین اور باشعور اور صلاحیت سے بھر پور ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں ذرائع محدود اور قدم، قدم پر رکاوٹیں زیادہ ہیں۔ کوئی گائڈنیس نہیں۔ کوئی خیر خواہ بھی نہیں، ہر طرف خوف کا ماحول......ایسے حالات میں تو درخت بھی دھول میں اٹ کر اپنی پہچان کھو بیٹھتے ہیں۔ پھر ذہانت کیسے سانس لے، نئے آئیڈیاز کیسے پرورش پائیں۔ ہر روز کی مہنگائی الگ فکر معاش کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ ہمارے ذہین نوجوان بھی بوکھلا کر اپنی منزل کھو بیٹھتے ہیں۔ بس سمجھیں کہ ایک قسم کی ریس کا آغاز......حسد اور نفرت کی پیداوار کہاں جائیں یہ بیچارے ویلیوز کو کیسے برقرار رکھیں......گزرے وقتوں میں، بیٹی ماں کے نام سے اور بیٹا باپ، دادا کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ اب کار، ڈریسنگ اور موبائل سے پہچانا جاتا ہے......وقت کی گردش نے سب ہی کچھ گرد آلود کر دیا...... اس توڑ پھوڑ میں ہجرتوں کا بھی بہت زیادہ دخل ہے۔ ترقی کے راستے پر اپنے ماحول سے جو بھی نکلا تنہا ہو کر اپنی ذات میں کھو گیا۔ شعور بیدار رہا تو منزل مل گئی......راستے سے بھٹکا تو قسمت کو ذمے دار ٹھہرایا خود کو تسلی دینے کے لیے یہی ایک آسان لفظ تھا۔ (واہ کیا تجزیہ کیا ہے)

پاکیزہ ✧...... بیرون ملک میں رہ کر اسلامی تہوار اور قومی دن کی اہمیت کس قدر رہتی ہے اور یہ دن کیسے منائے جاتے ہیں؟

عذرا آفتاب ❖......بالکل اسی طرح جس طرح پاکستان میں منایا جاتا ہے۔ گھر میں وہی خوشی اور وہی رونق ہوتی ہے اور اپنے تمام رشتے دار، دوست احباب مشترکہ خوشیاں یاد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ میں تو اپنے بچپن کے کھلونے نہیں بھولی۔ مٹھو کی یاد ہر طوطے کی آواز سے تازہ ہو جاتی ہے۔

پاکیزہ ✧......سنا ہے وطن سے دور ہو کر جذبۂ حب الوطنی یا تو بالکل ختم ہو جاتا ہے یا پھر دو چند ہو جاتا ہے؟

عذرا آفتاب ❖......اپنا نام، اپنا ماضی اور اپنی محبتیں کبھی کوئی نہیں بھولتا......میں تو اپنا بچپن، جہاں اب میں بغیر ویزے کے جا بھی نہیں سکتی......خوابوں میں، خیالوں میں اکثر راتوں میں جاگ کر نند پاپری کے ساتھ کھیل آتی ہوں۔ اپنی جگہ سے لگاؤ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ یہی تو اصل زندگی ہے۔ (بالکل درست کہا)

پاکیزہ ✧......آپ کا زیادہ وقت لندن میں گزرتا ہے تو یورپ کے اور بھی ملک ضرور دیکھے ہوں گے......کچھ وہاں کا بھی تذکرہ ہو جائے؟

عذرا آفتاب ❖......جی ضرور......میں اور میرے بچے ایک ہی مزاج کے ہیں جب بھی موقع ملتا ہے......ہم ضرور گھومنے چلے جاتے ہیں۔ کئی ملکوں میں جانا ہوا ہے۔ میں نے بہت انجوائے کیا......اپنے ناول پُرامن کے دو چیپٹر میں نے سوئٹزرلینڈ میں لکھے تھے اس طرح میرے ناول کا خاص کیریکٹر اور دوسرے کردار بھی اس ماحول میں پوری طرح سیٹ ہو گئے۔ اور میری کہانی بہت خوب صورتی سے تکمیل کو پہنچی......پھر ایک اور دفعہ میں نارتھ ویلز گئی اس جگہ نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں نے ایک خیالی کہانی (ایک سفر ایک کہانی) کے نام سے لکھی۔ لکھنے کے بعد میں نے پڑھی تو مجھے ایسا لگا جیسے حقیقت میں اسی جگہ اور یہیں کے رہنے والوں کی ہے۔ میرے بچوں نے پڑھی تو ان کا بھی یہی کہنا تھا۔ ”مما کیا خواب میں کسی نے آکر آپ کو کہانی سنائی تھی؟“ (ارے واہ)

پاکیزہ ✧......کیا آپ کہانی کسی سچے واقعے سے متاثر ہو کر لکھتی ہیں یا خیالی ہوتی ہیں؟

عذرا آفتاب ❖......میری کہانی کے کردار خیالی ہوتے ہیں لیکن میں ہوں تو اسی معاشرے سے۔ مجھے اگر کوئی اچھا لگتا ہے اور کوئی کمی نظر آئے تو دل چاہتا ہے وہ یہ کام اس طرح سے کرے تو اس کی شخصیت میں بدلاؤ آ سکتا ہے۔ اب وہ اگر تھوڑا سا بھی اس اچھائی کو

اپنالے تو اور کئی لوگوں میں بھی وہی چینج آسکتا ہے۔اور کہانی کا مقصد وقت گزارنے کا مشغلہ بھی ہے۔ کچھ اچھا پڑھا تو ذہن پُرسکون ہوا کچھ سبق آموز پڑھا تو عقل کو خوب صورت راہ ملی اور بس......

پاکیزہ ✧......لکھنے کا شوق آپ کے کسی بچے میں بھی ہے؟

عذرا آفتاب ❖......شوق تو میرے تینوں بچوں میں ہے لیکن کب منظرِ عام پر آئے گا یہ نہیں کہہ سکتی۔خیال ہے کبھی نہ کبھی......رائٹرز فیملی کی طرح پہچان بن جائے گی۔

پاکیزہ ✧......آپ کی پسندیدہ کتاب پسندیدہ شخصیت اور پسندیدہ فلم بھی؟

عذرا آفتاب ❖......پسندیدہ کتابیں بے شمار ہیں، سرِفہرست خوشبو (پراسس) میرا اپنا ناول۔ پسندیدہ شخصیت ،گلزار صاحب، جاوید اختر اور پروین شاکر اور بہت سے رائٹرز میں انور مقصود سرِفہرست ہیں۔

پاکیزہ ✧......میوزک میں کیا پسند ہے؟

عذرا آفتاب ❖......گٹار، وائلن، ستار اور بانسری، جھینگر اور کوئل کی کوک بھی موسیقی ہی ہے۔

پاکیزہ ✧......شاعری کا شوق کس حد تک ہے؟

عذرا آفتاب ❖......شاعری سنتی بہت شوق سے ہوں اور نثری شاعری لکھتی بہت ذوق سے ہوں۔

پاکیزہ ✧......کبھی ٹی وی کے کسی پروگرام میں آنے کا اتفاق ہوا؟

عذرا آفتاب ❖......جی ہاں اپنی پہلی کتاب (کچھ یادیں، کچھ باتیں) پھر میری کتاب (پراسس) کے حوالے سے انڈس ٹی وی پروگرام کے ٹی ٹائم میں آئی ہوں۔ پروگرام میرے بہت اچھے ہوئے۔ پہلی میزبان شگفتہ یاسمین تھیں، دوسری مرتبہ امبر تھیں......اور بات تو بہت پرانی ہے پشاور ٹی وی اسٹیشن سے پہلی بار خواتین کے حوالے سے کچھ پروگرام میں نے کیے تھے۔ جو بہت اچھے گئے تھے۔

پاکیزہ ✧......آپ اپنی تخلیق کردہ کہانی پر داد کی طلبگار رہتی ہیں......یا تنقید سہنے کا بھی حوصلہ ہوتا ہے؟

عذرا آفتاب ❖......یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ تخلیق کرنے والا، چاہے رائٹر ہو یا کمہار ہو، وہ اپنی تخلیق کو بہت باریکی سے جانچتا ہے لیکن سب لوگوں کا زاویۂ نظر ایک نہیں ہوتا تو پھر شکایت کیسی۔

پاکیزہ ✧......ہمارے اکثر رائٹر اسکرپٹ لکھ رہے ہیں، کیا آپ کو بھی کبھی خیال آیا؟

عذرا آفتاب ❖......جی ہاں، کئی بار خیال آیا ہے۔ وہ اس لیے بھی کہ جب کوئی کیریکٹر بہت اچھا لکھا جاتا ہے تو خواہش تو ہوتی ہے کہ وہ منظرِ عام پر آئے ٹی وی کی وجہ سے پڑھنے کا رجحان بہت کم ہوگیا ہے۔میرا اپنا خیال ہے کہ کہانی پڑھنے کے بعد اسکرین پر دیکھی جائے تو زیادہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔اور زیادہ دلچسپ لگتا ہے۔

پاکیزہ ✧......دیکھا گیا ہے کہ رائٹنگ کے دوران اکثر ایک طویل گیپ آجاتا ہے کیا آپ کے ساتھ بھی کبھی ایسا ہوا؟ اور کتنے عرصے بعد رکاوٹ ختم ہوئی......اور کیا سبب بنا؟

عذرا آفتاب ❖......جی......میری زندگی میں جہاں اور نقصان ہوئے اس میں سے یہ ایک ہے، کوئی بھی شوق بہت پرسنل ہوتا ہے اور تکلیف دہ اس لیے کہ شوق زندگی کے تاروں کو مضبوط کردیتا ہے اور اگر یہ کھو جائے تو ٹوٹ پھوٹ بڑھ جاتی ہے۔ میں اپنے شوق سے تیس سال دور رہی...... یہ سفر کیسے کٹا، کچھ یاد نہیں اور رکاوٹ اس طرح دور ہوئی کہ میں پہلی بار کینیڈا گئی ائرپورٹ سے باہر نکلی تو میرے منہ سے بے اختیار نکلا......ارے یہ کوہ قاف کی سرزمین ہے، میری اماں مجھے بچپن میں کوہ قاف کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں، میرے بیٹے نے کہا۔اماں آپ دیکھتی جائیں ابھی تو نہ جانے کیا، کیا دیکھیں گی۔ٹورنٹو کی ایک خوب صورت سڑک پر چودھویں فلور پر رہائش تھی۔اپارٹمنٹ کی ونڈو سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے دور تک میپل لیف کے گھنے اور خوب صورت درخت تھے۔اور کھلا آسمان......صبح جس طرح سورج کو پل پل طلوع ہوتا دیکھتی تو دیکھتی ہی رہتی تھی، سوتی نہیں تھی...... پھر درختوں پر چڑیوں کی

چہچہاہٹ اور بلیک کلر کی خوب صورت گلہریاں......اوپر نیچے چھلانگیں لگا کر حیران کرتی رہتی تھیں۔ انہی دنوں برف باری بھی شروع ہوگئی......درخت زمین سب ہی کچھ سفید، اکثر تو لگتا تھا کہ جیسے زمین آسمان مل رہا ہو...... چڑیاں الگ برف کے فرش پر اتر کر اپنے چھوٹے، چھوٹے پنجوں کے نشانوں سے خوب صورت ڈیزائن بناتی تھیں......اور گلہریاں الگ چھپن چھپائی کھیلتی تھیں۔ عجب کرشمہ تھا......ایک صبح میں نیچے گئی......درختوں کے نیچے کیا دیکھتی ہوں۔ ڈارک میرون رنگ کی تین خوب صورت گلہریاں برف پر پکڑن پکڑائی کا کھیل کھیل رہی ہیں، کیا خوب صورت ان کی ٹیلو تھیں۔ گلہری ویسے بھی مجھے بچپن سے پسند رہی ہے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ کیا کسی پارلر سے تیار ہوکر آئی ہو...... میں بے اختیاری سے دیکھتی رہی۔ میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز اور خوب صورت بات تھی۔ بار، بار میں خود دُہرا رہی تھی۔ اللہ یہ تیری کیسی شان ہے تو نے مجھے کیا دکھایا...... یہ کیسا کرشمہ ہے...... برف تیز ہونے لگی...... میں گھر میں آئی کافی کا مگ بنایا اور دراز سے کاغذ اور پین نکلا اور میرا قلم لکھنے لگا...... مجھے نہیں معلوم کہ کیا لکھ رہی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں (چڑیا اور اس کے بچوں کی کہانی) ایک شارٹ اسٹوری بن کر میرے سامنے تھی۔ میں نے (خدا کی شان) اس کا نام رکھا اور میں زار و قطار دیر تک روتی رہی۔ اس دن میرے بچوں کو معلوم ہوا میں کبھی رائٹر تھی۔ میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ مجھے اپنی کھوئی ہوئی خوشی واپس مل گئی۔ اور آج اس نام کے ساتھ آپ کے سامنے ہوں...... یہ میرے لیے خود بھی حیران کن بات ہے۔ (بہت دلچسپ داستان سنائی)

پاکیزہ ✧......کچھ ذاتی باتیں اور فیملی سے تعارف بھی ہوجائے؟

عذرا آفتاب ❖......جی ضرور میری فیملی بہت مختصر ہے، میں اور میرے تین بچے......ایک بیٹا...... اور دو بیٹیاں...... میرے شوہر آفتاب ایس خان بہت باا خلاق اور مخلص انسان تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ معاشرے میں اچھا مقام تھا۔ زندگی بھرپور تھی۔ ہم دونوں ہی گھومنے پھرنے کے شوقین تھے۔ ہر سیزن میں مری جایا کرتے تھے۔ افغانستان اور ہندوستان دیکھا فار ایسٹ کے پانچ ملک سری لنکا، ملائشیا، کوالالمپور، سنگاپور اور بینکاک سترہ دنوں کے ایک پروگرام میں ٹورسٹ ٹرپ کے ساتھ چھوٹے بچوں کے ہمراہ گئے......لگتا تھا زندگی اسی طرح خوب صورتی سے گزرتی رہے گی۔ لیکن خدا کو ہمارا اتنا ہی ساتھ منظور تھا۔ آفتاب ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہوئے۔ ہر جتن کیا، ایک سال بیمار رہنے کے بعد اللہ کے گھر چلے گئے۔ کچھ دن تعزیت کے لیے آنے والوں کا آنا جانا رہا۔ پھر دستور کے مطابق وہی ہوا۔ گھر کا سرپرست چلا جائے تو وقتی رسموں کے بعد کوئی بھی سر پر ہاتھ رکھنے والا یا ہمت بڑھانے والا نہیں آتا۔ میرے دو بچے سمجھدار تھے۔ حقیقت کو قبول کرلیا۔ چھوٹی بچی نو سال کی تھی، وہ بہت دنوں تک ڈسٹرب رہی۔ تعلیم سے بھی دور ہوئی۔ خوب صورت آنکھوں میں آنسو بسے راہ تکتی رہتی تھی۔ کوئی نہیں تھا جو یہ کہتا۔ (بیٹا میں ہوں ناں) میرے بڑے بچوں نے اسے بہلایا اور اس نے تھک ہار کر سمجھوتا کرلیا اور تعلیم میں خود کو چھپالیا۔ اور زندگی خوبی سے گزرنے لگی۔ آج میرے تینوں بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور بہت کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، پھر وہی خوشحال گھرانا ہے......کمی ہے تو ایک شخص کی جو نہ جانے کتنے خواب لے کر ابدی نیند سو گیا ہے۔ (اللہ آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبر دے)

پاکیزہ ✧......آپ جوانی میں تنہا ہوئیں...... بچوں کی ذمے داریاں تھیں کئی مشکلات بھی سامنے آئی ہوں گی، اکثر کئی لوگوں کے رویّوں کو بھی برداشت کیا ہوگا۔ کیسے گزارہ یہ لمبا سفر؟

عذرا آفتاب ❖......اکتیس سال کے بعد آج پہلی بار ایک حساس دل مجھ سے پوچھ رہا ہے...... کیسے گزارہ یہ سفر؟ کوئی آواز کہیں سے نہیں آئی تھی، نہ کوئی

احساس جاگا تھا۔ بھری فیملی تھی...... میرے دوستوں کو میرے اوپر اتنا یقین اور اعتماد تھا کہ میں گزر جاؤں گی اس کٹھن سفر سے......اب اگر میں یہ سفرنامہ سناؤں تو الفاظ کھو جائیں گے۔ لکھنے بیٹھوں تو قلم رک جائے گا شکر خدا کا یہ ہے کہ میرا بھرم قائم ہے، یہی ایک لفظ تھا جو آفی (میرے شوہر) نے آنکھیں بند کر کے کہا تھا۔

پاکیزہ ✧......ایک ذاتی سا سوال......آپ کے شوہر ایک سال بیمار رہے اس عرصے میں کوئی وصیت کوئی بات یا آپ کے اور بچوں کے حوالے سے کی۔ جو یاد آنے پر شدت سے کوئی کمی محسوس ہوتی ہو؟

عذرا آفتاب ❖......جی ہاں میرے لیے میرے شوہر کی طرف سے ایک آنر کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیماری کے دوران ایک بھی ایسی بات نہیں کی جو مجھے نا امید کرتی......ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے چھپتے سے رہتے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ کہیں دل آزاری نہ ہو جائے، کچھ پوچھنے یا بتانے کے لیے لب کھلتے ہی نہیں تھے۔ آخری چند دن پہلے ایک رات میں زمین پر دیوار سے ٹیک لگا کر سوگئی۔ انہیں باتھ روم جانا تھا۔ اور جا نہیں پا رہے تھے۔ میری آنکھ کھلی اور میں گھبرا کر عجلت میں کھڑی ہوئی۔ انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا......مجبور سی مسکراہٹ سے بولے تم نے میرا بہت زیادہ خیال رکھا ہے، میں دعا کرتا ہوں اللہ کرے تم اپنے بچوں کے ساتھ بہت خوش رہو۔ زندگی چند دن کی ہی باقی رہ گئی تھی۔ اب میں جب بھی بچوں کے ساتھ گھومتی ہوں، خوش ہوتی ہوں آفی مسکراتے ہوئے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آج میں نے پہلی بار یہ بات آپ سے شیئر کی ہے۔ (آپ نے تو عذرا کافی ہمت سے وقت گزارہ......اللہ تو ہر حال میں بندے کا مددگار ہی ہوتا ہے)

پاکیزہ ✧......کینیڈا آپ کو بچپن کی کہانیوں کا کوہ قاف جیسا لگا اور آپ کو حقیقت میں اپنا کھویا ہوا شوق، اسٹوریز رائٹنگ جو برسا برس سے بالکل بھولی ہوئی تھیں معجزانہ انداز میں ملا......اور آپ پھر اسی شدت سے اپنے شوق میں مصروف ہو گئیں......اس کے علاوہ کینیڈا میں کیا دیکھا؟ ویسے یہ تو سفرنامہ ہی ہو جائے گا چلیں ہمارے قارئین بھی محظوظ ہوں گے۔

عذرا آفتاب ❖......میرے تو خواب و خیال بھی نہیں تھا کہ اتنا بڑا اور عجائبات سے بھرا ہوگا......میں نے کینیڈا کے کئی بڑے شہر دیکھے ٹورنٹو، ونی پیگ اور کئی شہر نیاگرا فال، ای این ٹاور میوزیم اور بے شمار جگہیں دیکھیں۔ ونی پیگ کا پارلیمنٹ ہاؤس بہت خوب صورت ہے اور مضبوط عمارت ہے۔ اس کے گارڈن میں کالے پتھر سے بنا ملکہ وکٹوریہ کا قد آدم مجسمہ، بنانے والے کی قدرت دیکھیے کہ پتھر میں ڈھل کر بھی مجسمہ اپنے دلی تاثرات نہ چھپا سکا کہ ملکہ کو کیا ایسا غم تھا جو پتھر بھی نہ چھپا سکا......کانوں میں ایک آواز آتی ہے عورت تیرا دوسرا نام کمزوری ہے میں بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ اور کئی دن تک میرے دل اور ذہن پر اثر رہا......اور بہت بلندی پر گولڈن بوائے کا ہاتھ گندم کی بالیوں کا گٹھا اٹھائے بلند ترین جگہ پر کھڑا ہے ہر جگہ سے دکھائی دیتا ہے سورج کی کرنیں جب اس پر پڑتی ہیں تو سونے کی پالش اور بھی چمک جاتی ہے۔ اس کی الگ ہی ہسٹری ہے، جن دنوں میں ونی پیگ گئی تھی انہی دنوں (کینیڈا ڈے) منایا گیا۔ پورا شہر سجا ہوا تھا......کئی جگہ میلے کی کوئی شکل میں فنکشن کیے جا رہے تھے۔ اس رات آتش بازی سے جس طرح آسمان سجا ہوا تھا ویسا تو میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس رات مجھے اپنا پاکستان بہت یاد آیا۔ اور میں نے سوچا (پاکستان ڈے) منانے کا خواب قائد اعظم نے بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ (بے شک ہماری قوم پاکستان ڈے آج بھی مناتی ہے مگر ناچ ناچ کر) ونی پیگ کا میوزیم بہت انوکھا اور خوب صورت ہے۔ اس سال میں نے کینیڈا کے سارے موسم دیکھے بہت اچھا لگا۔ ونی پیگ کی لائبریری میں، میں نے اپنی کتابیں بھی دیں اور انہوں نے بہت شکریے کے ساتھ لیں۔ وہاں اردو پڑھنے، سمجھنے اور بولنے والے کافی ہیں۔

پاکیزہ ✧......یورپ میں اردو ادب یعنی شاعر بھی اور ناول نگار، ادیب اپنا شوق کس طرح پورا کرتے ہیں؟

عذرا آفتاب ❖......لندن ہمیشہ سے ادب کا گہوارہ رہا ہے، ہر موقع پر ادبی محفلیں سجتی ہیں، اکثر لوگ بہت دور، دور سے آکر فنکشن اٹینڈ کرتے ہیں، خواتین کے لیے ایک انجمن......(انجمن ترقی اردو خواتین برطانیہ) کے نام سے قائم ہے۔ 2015ء میں عالمی مشاعرہ منعقد ہوا۔ کئی جگہ سے شاعر آئے ہوئے تھے۔ پاکستان سے سیما غزل اور میں تھی۔ (جی ہاں عذرا، وہاں عالمی اردو کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی جس میں جناب معراج رسول اور عذرا رسول صاحبہ نے بھی بطورِ خاص شرکت کی تھی) وہاں شاہین صدیقی کی شاعری کی کتاب (کرن آفتاب کی) بھی رونمائی تھی۔ ساحل کے بانی اور مدیر تنویر اختر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا......میں کہانیاں لکھتی ہوں انہوں نے بہت خوشی سے کہا ساحل کے لیے آپ ضرور لکھیں......اور اس طرح میری کہانیاں، ساحل میں آنے لگیں۔ کچھ عرصے کے بعد نجمہ عثمان لنڈن کی مایہ ناز رائٹر اور شاعرہ ان کی شاعری کی کتاب خیال کی خوشبو کی رونمائی ہاؤس آف لارڈ میں منائی گئی۔ ان حوالوں سے بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں کی گورنمنٹ ہمارے لوگوں کی ہمت افزائی اور ہمارے اردو ادب کی بقا کے لیے کس حد تک مدد کرتی ہے اور وہاں رہنے والے پاکستانی اپنے ملک، ثقافت اور ادب کے لحاظ سے کافی کام کر رہے ہیں۔ (بہت خوب بھئی) میرا ناول پر اس پبلش ہوا تو میں نے بھی ایک تقریب ہائی کم کی لائبریری کے ہال میں کی۔ لائبریرین نے شامل ہو کر میری کتاب بہت خوشی سے لی اور کہا کہ آج کل پاکستان سے اردو کی نئی کتابیں نہیں آرہیں ہمیں انتظار ہے، مجھے اپنی کامیابی پر بہت فخر ہے، کینیڈا اور لندن میں ادب کے حوالے سے میری کچھ پہچان بنی ہے۔ (چلیں اچھی بات ہے)

پاکیزہ ✧......پاکیزہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ بہنوں کی محفل میں آپ بھی شامل ہوں۔ اور اپنے خیالات شیئر کیجیے؟

عذرا آفتاب ❖......بہت شکریہ......سب سے پہلے تمام بہنیں میرا اسلام قبول کریں، میں پہلی بار آپ کی اس خوب صورت محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یہ محفل کاغذی نشست پر بہت خوب صورتی سے سجی ہوئی ہے، گفتگو کا انداز ایسا ہے جیسے سب آمنے سامنے بیٹھے ہوں اور ایک دوسرے کو محسوس کر رہے ہوں، باہر ٹھنڈی ہوا ہے، دور کہیں آم کے درخت پر کوئل اپنی دل کو چھو لینے والی آواز (کوک) میں اپنا سندیسہ کچھ اس انداز میں دے رہی ہے جیسے وہ بھی اس محفل کا حصہ ہو......اور کچھ یاد کر رہی ہو۔

کچھ یاد کرو، کچھ یاد کرو......
خوش رہنے کے لیے چھوٹی سی بات

اور جینے کے لیے ایک چھوٹی سی یاد ہی کافی ہے۔ (واہ بہت خوب اچھی شرکت ہے) کوئل کی آواز نے پورے ماحول کو مخاطب کر کے سوچ کا انداز بھی بدل دیا ہے اب نہ کوئی شکوہ ہے اور نہ شکایت، سکون ہی سکون......اللہ کرے یہ ایسے ہی کوکتی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پرندوں کی شکل میں بہت بڑا انعام دیا ہے۔ ان کی آوازیں روح میں اتر کر پُرسکون کر دیتی ہیں۔ (جی بے شک)

پاکیزہ ✧......پاکیزہ کے بارے میں اظہارِ خیال اور کوئی تجویز......؟

عذرا آفتاب ❖...... پاکیزہ اچھی اور معیاری کہانیوں کے ساتھ......کتابی شکل میں ایک اچھا ساتھی ہے بس سکون سے ایک کونے میں بیٹھو اور پڑھتے رہو......تھکن دور پریشانیاں ختم......آپ کے آرٹسٹ کی خاص طور سے تعریف کروں گی......رائٹر لفظوں سے کہانی لکھتا ہے تو آپ کا آرٹسٹ برش سے کہانی کی پنچ لائن ڈرا کر دیتا ہے۔ (آرٹسٹ صاحب آپ بھی خوش ہو جائیں) اور بہت ہی خوبی سے کرتا ہے اگر میری تجویز قابلِ قبول ہو تو میری رائے یہ ہے کہ ہماری بہنوں کے لیے پاکیزہ میں بہت کچھ ہے۔ وہ پڑھ کر اچھا وقت گزارتی ہیں، غور طلب بات یہ ہے جو میرے خیال میں بہت اہم بھی

ہے۔ ہمارے ہر گھر میں ایک (دادی ماں) ہے جو معذرت کے ساتھ نظر انداز ہو رہی ہے، تو کیوں نہ (دادی ماں کی کہانی بڑھاپے کی زبانی) کے عنوان سے ہر ماہ ایک دادی ماں کا انٹرویو ہو جائے۔ انہیں بھی تو اپنی شناخت ملے۔ وہ بھی تو بتائیں معاشرے کو بنانے میں ان کا کیا رول رہا ہے، وہ کون تھیں اور اب کون ہیں، کیا چاہتا ہے ان کا دل؟ یا پھر ایک صفحہ ان کے لیے مخصوص ہو جائے یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ تنہائی میں رہتی ہیں۔ بیٹی پرائی، بہو اجنبی کس سے کہیں حالِ دل؟ وقت بھی گزرتا نہیں اور کبھی کٹی پتنگ کی طرح اُڑ جاتا ہے، اندھیرے کا خوف نزدیک آنے لگتا ہے۔ سب خواتین اس بارے میں تحمل سے سوچیں۔ اس سیڑھی پر سب کو ہی آنا ہے..... میری دو کہانیاں چوری اور تنہائیوں کا سفر کچھ ایسے ہی خیال کے تحت لکھی گئیں جو پاکیزہ میں پبلش بھی ہوئیں۔ مجھے خیال ساتھا کہ مدرز ڈے کے حوالے سے ہو سکتا ہے کسی کی نظر پڑے اور ڈرامائی تشکیل ہو جائے۔ میری چشم دید تھیں..... تو بہت شکریہ پیارے پاکیزہ.....

پاکیزہ ✧..... اپنی ذات کے حوالے سے کچھ خاص کہنا چاہیں گی؟

عذرا آفتاب ❖..... میں اپنی ذات کے حوالے سے اتنا ہی کہوں گی کہ.....

میں ایک شاعرہ تھی.....
زندگی کے کاغذ پر لکھتی رہی، عمر بھر
لیکن نہ آیا داد لینے کا ڈھنگ
میں ایک چھوٹی سی چڑیا تھی
چہچہاتی پھری ڈال، ڈال
لیکن نہ سنا سکی کسی کو حالِ دل
تو خود کو سمیٹ کر اپنے ہی خول میں
موند لی ہیں آنکھیں
اور سوچ رہی ہوں.....
کیا..... میں ہی ایک اجنبی تھی
اس..... انسانوں کی بستی میں.....
(واہ بھئی کیا پُر فکر، فکر ہے)

☆☆☆

پاکیزہ ✧..... بہت شکریہ عذرا آفتاب آپ کا..... اتنے خوب صورت خیالات اور اندازِ بیاں سے ہمیں بھی نوازا..... اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کی صحت برقرار رہے اور آپ کا قلم رواں رہے۔ الٰہی آمین۔

☆☆☆

پیاری بہنو! عذرا آفتاب سے بہت ہی شاعرانہ اور افسانوی گفتگو مگر حقیقت کے پیرائے میں ہوئی۔ فطرت سے قربت اور زندگی کے لطیف و سبک تجربات نے ان کی تحریر کو دل سے قریب کر دیا..... جو کچھ باتیں ہوئیں نہایت دلچسپ اور بہترین اسباق سے پُر تھیں۔ ماہنامہ پاکیزہ کی خوش بختی ہے کہ مختلف النوع طرزِ فکر رکھنے والی مصنفات ہمارے ساتھ ہیں جن سے بہت کچھ سیکھنے کو، جاننے کو اور پہچاننے کو ملتا ہے۔ زندگی کے رویّوں میں سطحی اور سرسری اندازِ فکر دیرپا نہیں ہوتا اور نہ ہی اردگرد بسنے والوں کے لیے قابلِ قبول ہوتا ہے..... گہرائی اور گیرائی میں جائے بغیر آپ کو کسی بھی شے کا جوہر نصیب نہیں ہوتا ہے ایسے افراد کی قدر کیا کریں جو آپ کو بہترین اور مثبت طرزِ فکر اور خالص جذبوں کی طرف راغب کریں۔

ہمیں امید ہے آج کی یہ بزم بھی آپ کو یقیناً دل سے بھائی ہوگی..... انشاء اللہ اگلے ماہ ایک اور روشن فکر و نظر کی حامل شخصیت سے ملاقات ہوگی جب تک کے لیے اجازت اس دعائیہ جملوں کے ساتھ کہ اپنا خیال ضرور رکھیں ساتھ ہی اپنے سے وابستہ رشتوں کا خیال رکھیں اور اپنے پیارے وطن کے باسیوں کا بھی خیال رکھیں کہ انہی کے ساتھ ہمارا مرنا جینا ہے۔ پروردگار ہمارے وطن کو سلامت رکھے اور ہمیں آزادی کی دلکش و روشن صبحیں نصیب ہوتی رہیں۔ الٰہی آمین.....

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

۷۷

وطن سے دور وطن کا جشنِ آزادی

شائستہ زریں

حفیظ جون پوری نے کہا تھا

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

تلاشِ رزق میں دیارِ غیر بس جانے والوں کے لیے تو دیس کی ہوائیں بھی آکسیجن کا کام کرتی ہیں۔ پل، پل وطن کی یادیں اپنے حصار میں لیے رہتی ہیں ایسے میں اپنے مذہبی و ملی تہوار کے موقع پر وطن سے دوری دل میں محشر برپا کر دیتی ہے۔ ۱۴، اگست ہمارا سب سے بڑا ملی تہوار جسے تمام پاکستانی نہایت جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ جو وطن سے دور ہیں وہ بھی یہ تہوار وطن سے دور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مناتے ہیں، ایسے میں وہ کیا محسوس کرتے ہیں؟ اور کیسے ۱۴، اگست مناتے ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہم نے وطن سے دور اپنی چند ہم وطن خواتین سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ...

نیلوفر عباسی

ریڈیو وٹی وی آرٹسٹ ...... نیویارک

وطن سے دور اس کی ہر بات، ہر دن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ۱۴، اگست کو تو خاص طور پر اور کیوں نہ ہو کم سنی ہی سے نہایت جوش و خروش سے پاکستان کا جشن آزادی مناتی رہی ہوں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ، ساتھ جذبۂ حب الوطنی میں شدت آتی گئی۔ زمانۂ طالبعلمی ہی سے ریڈیو سے پروگرام کرنے لگی تھی۔ بزم طلبا کی کتنی ہی یادیں ہیں جو ہر ۱۴، اگست کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں۔ ۱۴، اگست کے حوالے سے یادگار ڈرامے اور کئی پروگرام کیے وطن سے دور اپنے ملک کا جشنِ آزادی مناتے ہوئے ان دنوں کی یادیں بہت ستاتی ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ USA کی ہر ریاست میں ۱۴، اگست بہت زبردست طریقے اور شان سے مناتے ہیں۔ پردے کا بھی اہتمام ہوتا ہے، سیمینارز اور دیگر پروگرامز بھی ہوتے ہیں۔ میلے لگتے ہیں۔ یہاں مقیم پاکستانی ملی جوش و جذبے سے حصہ لیتے ہیں۔ تب ہر لمحہ پاکستان کی یاد ستاتی ہے۔ ہم وطن سے دور اجتماعی طور پر اپنے وطن کی ترقی، بقا اور سلامتی کے لیے دعائیں کرتے ہیں اور دل سے یہی دعا نکلتی ہے اللہ پاکستان پر اپنی رحمتوں کے در کھلے رکھنا۔ جیوے جیوے پاکستان۔

غزالہ نگار اورکزئی

قلمکار، نیویارک

یہ طے شدہ امر ہے کہ جب ہجرت کی جائے تو بیشتر مسافر اپنے ساتھ وطن کی یادیں، باتیں، رویے، خوشبو ساتھ لے کر آتے ہیں۔ جب تک ہجرت کرنے والی نسل زندہ رہتی ہے۔ اس کے دل میں وطن کی صبحوں و شاموں کی یادیں زندہ و جاوید رہتی ہیں بقول اختر شیرانی

کیا اب بھی وطن میں ایسے ہی
سرمست نظارے ہوتے ہیں

اے دیس سے آنے والے بتا

پچھلی تین دہائیوں سے اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی پاکستانی کمیونٹی میں جوش وخروش سے جشنِ آزادی منانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں ۔۱۴، اگست کے قریبی اتوار کو لٹل پاکستان یعنی کونی آئی لینڈ پر بہت بڑا میلا لگتا ہے،



تقاریر، موسیقی، لذتِ کام و دہن، پاکستانی مصنوعات کے اسٹالز، کا اہتمام ہوتا ہے ۔ امریکن اور پاکستانی معززین خصوصاً سیاستدانوں کی شرکت ہر دو تقاریب میں لازم و ملزوم ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں جب امریکا میں پہلی بار آئی اور اس پریڈ اور میلے کی سج دھج دیکھی تو اگلی مرتبہ اپنے اور بہن کے لیے خصوصی اہتمام سے سبز قمیص، سفید دوپٹا سفید شلوار بنوا کر لائی ۔ جو ہم پریڈ پر بہت ذوق شوق سے پہنا کرتے تھے۔ نیویارک میں آباد ہونے کے پہلے دس سالوں میں' میں ایک این جی او "دستکھی" کے ساتھ رضا کارانہ کام کیا کرتی تھی ۔ جو یومِ آزادی پر اپنے جتھے کے ساتھ اس پریڈ میں شرکت کرتی تھی کافی عرصہ میں نے ان پریڈوں میں شرکت کی ۔ اور کونی آئی لینڈ کے میلوں میں بھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ خواتین کا ان میلوں میں سوائے تماشا دیکھنے کے اور کوئی قابلِ ذکر کردار نہیں ہوتا ۔ پھر رفتہ، رفتہ لوگوں نے اسے اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تو اس سے دلبرداشتہ ہو کر میں کنارہ کر کے بیٹھ گئی اب یا تو یومِ آزادی گھر بیٹھ کر مناتی ہوں یا کسی ایک تقریب میں چلی بھی جاتی ہوں تو اپنی ذاتی حیثیت میں ۔ ویسے بھی اب اڑے، اڑے پھرنے کی عمر نہیں رہی ۔ ہاں اگست شروع ہوتے ہی دل میں ایک عالم سدخوش خود بخود پھیل جاتا ہے۔

آپ سب کو جشنِ آزادی مبارک، اللہ پاکستان کو مضبوط اور سلامت تا قیامت رکھے، آمین۔

راحیلہ فردوس

نعت خواں، ہوسٹ آج ٹی وی یو ایس اے، نیوجرسی

وطن سے دوری کا احساس ہر پل ستاتا ہے میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں اور میرے بچے ۱۴، اگست پاکستان میں منائیں ۔ چند برس قبل میں نے جشنِ آزادی اپنے وطن ہی میں منایا تو بہت لطف آیا ۔ چونکہ میں نے ہمیشہ سے ۱۴، اگست کا بھرپور اہتمام کیا اس لیے دیارِ غیر میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے ۔ وہاں بھی ۱۴ اگست کی تقریبات میں کسی نہ کسی حوالے سے شریک ہوتی رہتی ہوں ۔ رہتی تو میں نیوجرسی میں ہوں لیکن ۱۴، اگست کو نیویارک میں ہوتی ہوں پاکستان آف لیگ امریکا کے ساتھ نیویارک میں ۱۴، اگست کے پروگرام آرگنائز کرتی ہوں ۔ اس میں قونصلر جنرل بھی تشریف لاتے ہیں ۔ اس رنگا رنگ ثقافتی تقریب میں پاکستانی فنکار وطن سے محبت کے اظہار کے لیے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں ، ملی نغمات گائے جاتے ہیں ۔ نیویارک میں پچھلے سال ایک گھنٹے کے لیے بچوں کی ایکٹیوٹیز کروائی تھیں ۔ پاکستانی ثقافت اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار وہاں پر مقیم پاکستان کی نئی نسل سے یہ کرواتی ہوں ۔ پاکستان کی محبت اور عقیدت کے تمام رنگ اس میں نمایاں ہوتے ہیں ۔ قومی نغمات پر مبنی ٹیبلوز ہوتے ہیں ۔ پاکستان کے چاروں صوبوں کی نمائندگی ہوتی ہے ۔ بچے اپنے کلچر اور پاکستانی ملبوسات میں شو کرتے ہیں اس طرح امریکا میں رہتے ہوئے بھی وہاں



کے پاکستانی بچے پاکستان سے محبت کے اظہار کو پسند کرتے ہیں۔خواتین کو بھی اس رنگا رنگ تقریب میں شامل کیا جاتا ہے اور پاکستان کے جشنِ آزادی کے حوالے سے ان سے گفتگو کی جاتی ہے۔چند برس قبل ۱۴ اگست کو پی ٹی وی گلوبل کے لیے لائیو پروگرام کیا اور پاکستان کے حوالے سے لوگوں کے تاثرات لیے۔اس گھڑی میرا دل چاہ رہا تھا کہ پاکستان پہنچ کر اپنے وطن کا جشنِ آزادی مناؤں بس یہ وطن سے دوری کا احساس ہی بہت ستاتا ہے۔

ناھید نیازی

مغنیہ۔۔۔برمنگھم

گئے دنوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں مغربی پاکستان اور سابق مشرقی پاکستان میں ہم نہایت جوش و خروش سے جشنِ آزادی مناتے تھے۔میں اور مصلح الدین بھرپور شرکت کرتے۔

یہ بنگالی سندھی پنجابی بلوچی پٹھان
ایک ہوئے ہیں سارے ان کا ملک ہے پاکستان

صدر ایوب کی فرمائش پر یہ قومی ترانہ کتنے شوق اور ولولے سے مصلح الدین اور میں نے ترتیب دیا تھا۔یہ ہم ہی جانتے تھے۔مگر پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی ہمارا پیارا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا ہمارا خواب چکنا چور ہوا۔اگلی ۱۴ اگست کو ترانہ یوں تبدیل کرنا پڑا۔



یہ پنجابی یہ سندھی اور یہ بلوچی، پٹھان
ایک ہوئے ہیں سارے ان کا ملک ہے پاکستان

میری مشرقی پاکستانی ساس نے کہا کہ ”میں ان ”دونوں“ کو کبھی معاف نہیں کروں گی جنہوں نے میری فیملی کے دو حصے کر دیے، دکھ تھا مگر ابھی شدت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی، اس کا گمان بھی نہ تھا، موجودہ دور کی پاکستانی ڈیموکریسی کے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ۱۴، اگست کے روز ملک سے دور ہوں یا نہ ہوں دکھ کے احساس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

تابندہ نعیم

سینئر براڈ کاسٹر جرنلسٹ، وائس آف امریکا، قلمکار۔واشنگٹن

چھٹی کلاس میں عمر گیارہ سال تھی۔پاکستان پچھلے کتنے سالوں سے چودہ اگست کو سبز جھنڈوں، جھنڈیوں اور روشنیوں سے سجا کر خوش ہونے کی عادت میں نیا، نیا مبتلا ہوا تھا میرے چپ چاپ رہنے والے سنجیدہ مزاج ابو کو، جنہوں نے کبھی اپنے کسی بچے کی سالگرہ بھی دھوم دھڑکے سے نہ منائی تھی، جانے کیا سوجھی کہ اٹھا کر لائٹوں والے کو گھر لے آئے۔گھر کی سب دیواروں پر باریک بندھی چھوٹی مرچوں جیسے ننھے بلب لٹکنے لگے۔ہم سب بچے گھر کے لان میں مٹی کے دیے سجا کر انتظار کرنے لگے کہ رات ہو تو تیل میں ڈوبی روئی کی بتیوں سے ”جشنِ آزادی مبارک“ کو روشن ہوتا ہوا دیکھیں۔رات ہوئی تو گھر سبز اور سفید مرچوں جیسی لائٹوں سے جگمگا اٹھا۔جگمگاتے گھر کے نیچے ہم بہن بھائی گھاس کے بیچ ہوا کی زد میں رکھے ہوئے دیوں سے لکھے ”جشنِ آزادی مبارک“ کو بجھنے سے بچانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔میرے ابو کے چہرے پر ایسی خوشی تھی جیسے گھر میں کوئی شادی کی تقریب ہو۔آج ابو میری زندگی میں



غزل

یارب تیری دنیا میں گل کم ہیں اور خار بہت
لوگ بھی دیتے ہیں لوگوں کو خوشیاں کم آزار بہت

تیری نگری کے باسی تو سورج چاند ستاروں جیسے
سب اچھے پر کرتے ہیں یہ زہریلے بیوپار بہت

جس کو دیکھو کرتا ہے وہ پھولوں جیسی پیاری باتیں
پر لفظوں میں رکھتے ہیں پتھروں کے انبار بہت

یارب تجھ سے ہے دنیا میں پیار محبت اور خوشی
ورنہ تو یہ لوگ ہیں رکھتے کانٹے اور انگار بہت

شاعرہ: جینا، کراچی

نہیں مگر جگمگاتا ہنستا مسکراتا چودہ اگست میٹھی سی یاد کی طرح احساس کے پردے پر دستک دیتا ہے۔ دیارِ غیر میں وطن کی آزادی کا جشن صرف چودہ اگست کو نہیں، ہر روز منایا جاتا ہے۔ وطن سے دور آکر پتا چلتا ہے کہ آپ وطن سے نکلے ہیں۔ وطن آپ میں سے نہیں نکل سکا۔ جب بھی بارش میں مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ اپنے پاکستان والے گھر کا صحن یاد آتا ہے۔ جب بھی حلیے سے کوئی امریکی دکھائی دینے والا دیسی ٹیکسی ڈرائیور اردو میں حال چال پوچھ کر حیران کرتا ہے، جب بھی کوئی حسین طرحدار لڑکی سبز شیفون کی شرٹ دوپٹے اور گولڈن سگریٹ پینٹ سفارت خانے کے فنکشن یا کمیونٹی ایونٹ میں گردن اٹھائے عاطف اسلم اور جواد احمد کے گیتوں پر سر دھنتی ہے تو پاکستان یاد آتا ہے۔ جب بھی ویک اینڈ پر پاکستانی چینل کے بیک گراؤنڈ میوزک میں تازہ پراٹھا توے سے اتاروں پاکستان والے امی کے پراٹھے یاد آتے ہیں ۔ جب بھی امریکی مشاعرے میں شستہ اردو کی باوزن نظم سنوں۔ جب بھی نامور نوجوان ملکی کرکٹر میری ٹی وی اسکرین پر رن انفرادی ڈھیر جمع کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی ٹیم کی کامیابی کے لیے کھیل کر دکھائے تو پاکستان کی یاد آتی ہے۔ جب بھی کوئی باصلاحیت فنکار اپنے فن، اصول، اخلاق اور کارکردگی سے بھارت اور امریکا میں اپنے آپ کو پاکستانی منوا کر دم لے تو پاکستانی ہونے پر خوشی ہوتی ہے۔ پاکستان تو دیارِ غیر میں رہنے والے ہر تارِ وطن کی رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ اسے یاد رکھنے اور اس کی آزادی کا جشن منانے کے لیے کسی خاص مہینے کی کسی مخصوص تاریخ کی ضرورت ہے ؟ کم از کم مجھے تو نہیں۔ میری ایک دوست اپنے بچوں کے لیے سبز اور سفید کریم والے کپ کیکس بناتی ہے۔ کچھ دوست پاکستانی سفارت خانے میں پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ دفتر میں ہوں یا گھر میں پاکستانی چینلز پر چودہ اگست کی تقریبات دیکھ لیتے ہیں۔ اگر چھٹی کا دن ہو تو پاکستان فون کر لیتے ہیں۔

فاخرہ گل

قلمکار۔۔۔اٹلی

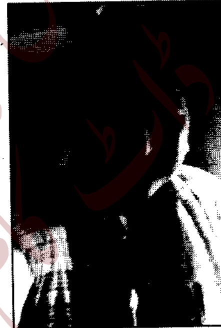
پاکستان میں ہم نہایت جوش و خروش سے اپنا جشنِ آزادی مناتے تھے۔ لیکن اٹلی کے شہر جہاں میں رہتی ہوں۔ یہاں پاکستانی کمیونٹی بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے اجتماعی طور پر مل جل کر جشنِ یوم آزادی کی تقریبات منعقد کر کے یہ دن منانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ البتہ میں پاکستانی پرچم کے ہم رنگ لباس اور چوڑیاں ضرور پہنتی ہوں۔ ابو جی نے پاکستان سے مجھے بہت خوب صورت پرچم اور جھنڈیاں بھیجی ہیں۔ پرچم میں اپنے ٹیرس پر لگاتی ہوں اور جھنڈیوں سے گھر سجاتی ہوں۔ اس طرح میں وہی جوش و خروش محسوس کرتی ہوں جو بچپن میں یوم آزادی پر گھر سجاتے ہوئے کرتی تھی۔ اور اپنے بچوں کو بھی اس جانب مائل کرتی ہوں۔ اور اس کے لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے بچوں پر اس دن کی اہمیت واضح کروں۔ سو میں انہیں بتاتی ہوں کہ ہمارے بزرگوں نے کتنی تگ و دو کے بعد پاکستان حاصل کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت کی تصویریں بھی انہیں دکھاتی ہوں لیکن بچے

پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوال زیادہ کرتے ہیں۔ میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ ہماری آنکھوں میں روشن پاکستان کا جوخواب ہے وہ کبھی نہ ٹوٹنے پائے آمین......

طلعت گیلانی ہمدانی

کونی آئی لینڈ

جب میں ۱۹۷۹ء میں امریکا آئی تھی تو مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوا۔ اب مسلم امریکن اٹوٹ انگ ہیں امریکا کا۔ نیویارک میں مسلمانوں کی تعداد ہاف ملین ہے۔ ابتدا میں تو پاکستان کے جشنِ آزادی کے موقع پر صرف پریڈ ہوتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ میلے لگنے لگے، کانسرٹ ہونے لگے۔ پاکستانی فنکار اپنے فن کے مظاہرے کرتے ہیں، وطن کے گیت گاتے ہیں۔ کونی آئی لینڈ جہاں میں رہتی ہوں میں مختلف پاکستانی تنظیمیں قومی جذبے اور جوش وخروش سے جشنِ آزادی کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہ دن مجھ

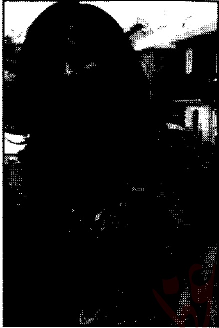


سمیت ہر پاکستانی کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے لیکن وہ جو وطن سے بہت دور ہیں ان کے لیے یہ نہایت یادگار اور قابلِ احترام دن ہے۔ یہاں ہم ملی جذبے سے سرشار اپنا جشنِ آزادی مناتے ہیں۔ پاکستانی کھانوں اور کلچر کا خاص اہتمام ہوتا ہے اور ان کی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ پاکستانی ترانے اور نغمے گائے جاتے ہیں۔ بھرپور طریقے سے اپنا جشنِ آزادی مناتے ہوئے اپنے پاکستانی ہونے پر ہم بہت فخر محسوس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر بسمہ شریف

ٹورنٹو

بلاشبہ ۱۴ اگست منانے کا اصل لطف پاکستان ہی میں ہے لیکن ہم وطن سے دور رہ کر بھی ۱۴ اگست مناتے ہیں ٹورنٹو میں اگر ۱۴ اگست منانا ہے تو اس کا اصل مزہ جرارڈ اسٹریٹ میں آتا ہے۔ یہاں پر ۱۴ اگست کو رنگا رنگ تقریبات ہوتی ہیں۔ ہر پاکستانی کی چھت پر پاکستان کا جھنڈا لہراتا نظر آتا ہے۔ شام سات بجے پوری روڈ کو بلاک کر دیا جاتا ہے۔



ٹورنٹو کی پولیس ٹریفک کو مانیٹر کرتی ہے بچوں سے لے کر بڑوں تک ۱۴ اگست کی شام تمام پاکستانی جرارڈ اسٹریٹ پر جمع ہوتے ہیں ایک چھوٹی سی ریلی نکالی جاتی ہے اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ وہاں موجود دکانوں میں سے چند دکانوں سے ریلی میں شریک افراد کے لیے مفت چائے اور شربت کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ ہمارا اکلوتا بیٹا مصطفیٰ بھی ہر سال ہمارے ساتھ نہایت جوش وخروش سے شریک ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑا پاکستانی پرچم ہم پاکستان سے ٹورنٹو لے کر آئے ہیں۔ اپنے گھر کی چھت پر ۱۴ اگست کو پاکستانی پرچم لہراتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ......یارب میرے وطن کا پرچم بلند رکھنا (آمین)

☆☆☆

معزز قارئین!

عزیزو! جشنِ آزادی مبارک

یہ بن یہ باغ یہ وادی مبارک

میری اور ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے تمام قارئین پاکیزہ کو جشنِ آزادی مبارک۔

☆☆☆

باتیں بہار وخزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

اس گردشِ لیل ونہار میں ہمارے شب وروز سیلِ رواں کی طرح گزرتے چلے جارہے ہیں۔ انہی گزرتے پل میں بے شمار کہانیاں، ڈھیروں قصے اور اَن گنت واقعات جنم لیتے چلے جارہے ہیں اور ہم ان کے کردار بنے تماشائے اہلِ کرم کبھی دیکھتے اور کبھی دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ آپ سب لوگ جو مصنفین اور بالخصوص قارئین کی حیثیت سے ہمارے ساتھ برسوں سے وابستہ ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں پاکیزہ صفحات کو رونق بخشتے چلے آئے ہیں اور یہی پاکیزہ کی کامیابی کا راز ہے کہ مخلص اور محنتی مصنفات اپنی پُر تنوع تخلیقات کے ذریعے اور تبصرہ نگار بہنیں اپنے دقیق تبصروں اور قیمتی آرا سمیت ہمارے ساتھ رہی ہیں اور انشاءاللہ رہیں گی۔

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت

☆ جبیں نیاز......ملتان

1۔ میں نے ان صفحات پر بہت سی بہنوں کے جوابات پڑھے اور میں بیشتر کے خیالات سے متفق ہوں کہ عورت اپنی شخصیت صرف اور صرف تعلیم حاصل کر کے پُر اثر بناسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو اور محض ڈگری کا حصول اس کا مقصد نہ ہو بلکہ علم کی دولت حاصل کر کے وہ اپنی شخصیت میں بھی علم کو ظاہر کرے۔ اپنے کردار اور زندگی کے معاملات میں عقل وسمجھ استعمال کر کے اپنے گھر اور معاشرے کو مثبت فکر دے۔ اپنی تعلیم کا رعب نہ جھاڑے بلکہ عملی اقدام کر کے دکھائے۔

2۔ جی ہاں زندگی میں بہت سے واقعات و لمحات گزرتے چلے جاتے ہیں کہ جو ہماری رائے، ہماری فکر موڑ دیتے ہیں۔ بچپن میں صرف اپنے کھیل کھلونے اور ماں، باپ اور گھر میں دلچسپی ہوتی ہے۔ لڑکپن، نوجوانی، جوانی میں اردگرد کا ماحول، سہیلیاں، دوستیں، رشتے داریاں شامل ہوجاتی ہیں اور سمجھیں آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ میں جو بہت شرمیلی اور کم بولنے اور کم گھلنے والی تھی۔ کالج اور یونیورسٹی میں دوستوں کو دیکھ کر بہت اعتماد آیا۔ شکر ہے میں نے آزادی کا غلط فائدہ نہیں اٹھایا۔ آج میں اپنا بچپن اور لڑکپن یاد کرتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں کیسی گھر گھسنی تھی مگر اب ایک بااعتماد عورت ہوں اور اپنے بچوں کو بھی اعتماد دے رہی ہوں۔

3۔ پاکیزہ تو ہماری جان ہے شاید میری تربیت میں اس کا بھی ہاتھ ضرور ہے کہ جب اتنی اچھی لکھنے والیوں کی کہانیاں پڑھتی تھی اور اسی نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ سب ہی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں، کبھی کبھی گھریلو عورت کی زندگی کی کہانی اس کی زبانی کے نام سے دیا کریں، یہ سلسلہ اچھے چلے گا۔

4۔ پیاری بہنو اور بزرگ لکھنے والیاں جواب نہیں بھی لکھ رہیں سب کو سلام......اور ڈھیروں، ڈھیر دعائیں۔ دل کی بات یہی ہے کہ تعلیم یافتہ بچیوں کی حمایت میں لکھا کریں اور ان کے حقوق بھی واضح کریں اور مثبت فکر کی کہانیاں لکھیں۔

5۔ میرا تعارف تو اوپر کے جوابات ہی ہیں مگر ایک شعر سنا دیتی ہوں اگرچہ بہت زبانِ زدِ عام ہے۔

اپنی تو یہ عادت ہے، بری ہے کہ بھلی ہے
ہنستے ہوئے ہر بات زمانے کی سہی ہے

☆ ملالہ اسلم......خانیوال

1۔ پہلا سوال ذرا مشکل ہے بہرحال جواب تو دینا

ہے تا کہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُراثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں......کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

ہے۔ روز و شب گزر ہی جاتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو پُراثر بنانے کے لیے پہلی چیز زبان کی مٹھاس ہے۔ اگر یہ میٹھی ہو تو اخلاق کو بھی ہم میٹھا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم و تربیت اپنا آپ منوانے کا فن اور پُراعتماد ہونا بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ خصوصاً عورت کا پُراعتماد ہونا آج کے فاسٹ دور میں ضروری ہے مگر اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہ کر اپنے آپ کو منوائے۔

2۔ گزرے ماہ و سال آپ کی جھولی میں بے شمار واقعات ڈال کر رخصت ہوتے ہیں اسی طرح ہر گزرا دن آپ کی جھولی میں کوئی نیا لمحہ ضرور ڈال کر جاتا ہے۔ بہت سے دلچسپ واقعات بھی ہیں لیکن وہیں پر بہت سے ایسے لمحے ہیں جو انسان کو دکھی کر جاتے ہیں۔ رائز کالج میں گزرا ہوا میرا ہر لمحہ قیمتی تھا۔ سر عمران کی تربیت نے میری زندگی کا رخ موڑا۔ بہت سے اپنوں کو خود سے بچھڑتے دیکھا، کچھ نئے لوگ زندگی میں آئے یہی زندگی کے رنگ ہیں۔

3۔ میں پاکیزہ کی مستقل قاری تو نہیں ہوں لیکن بہت بار پڑھا ہے۔ میں نے ایک بار ملتان میں خریدا تھا، عذرا آنی کے بیٹے کی شادی کا احوال پڑھا تھا۔ ڈاکٹر فاطمہ کی معصومیت پر بہت پیار بھی آیا تب ایک خط بھیجا تھا۔ ویسے ہر سلسلہ زبردست ہے مگر آپ کوئی تعارفی سلسلہ شروع کر دیں میری رائے پسند آئی ہو تو......

4۔ مصنفات سب ہی اپنی، اپنی جگہ اچھا لکھتی ہیں کسی ایک کی تعریف مشکل ہے۔ البتہ رفعت سراج اور انجم انصار کو میں نے بہت پڑھا ہے۔ اس کے علاوہ ثنا کنول حیرت ہوئی تم مجھ سے دو سال چھوٹی ہو ڈیئر ہاہاہا......

میری مصنفات سے درخواست ہے پلیز آرمی بھائیوں، ملکی حالات، بیروزگاری، غربت اور خواتین کے مسائل قلم بند ضرور کیجیے۔

5۔ اپنے بارے میں کیا لکھوں......؟

باوفا ہوں، مجسم محبت ہوں
پیار کی شمع جلانا ہنر ہے اپنا......
اس ہنر سے محبتوں کے رشتے کاڑھتی ہوں
ان رشتوں کو......اِک لڑی میں پُرو کر
اپنا آپ نچھاور کرتی ہوں
کیونکہ
ملالہ باوفا ہے، محبتوں سے گندھی بنتِ اسلم ہے

☆☆☆

پاکستان کی ستر سالہ تاریخ میں خواتین کا کردار

ہما بیگ

کسی بھی ملک کی ترقی و تعمیر میں مردوں کے ساتھ، ساتھ خواتین کا کردار بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستانی خواتین بھی مردوں کی طرح مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں خدمات انجام دے کر ملک و قوم کا نام روشن کر رہی ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ ایک عورت کی تعلیم پورے معاشرے اور نسل کی تعلیم ہوتی ہے۔ نپولین بونا پارٹ کا مشہور مقولہ تو آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو میں تمہیں بہترین قوم دوں گا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بہترین قوم اس وقت بنتی ہے جب مائیں پڑھی لکھی اور باشعور و سمجھدار ہوں۔

70 سال پہلے جب سلطنتِ خداداد ہمارا پیارا وطن عالمِ وجود میں آیا تو خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر آزادی کی آواز پر لبیک کہا اور نئی دھرتی کی طرف روانہ ہوگئیں اور سب نے اس کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کھلے آسمان تلے بھوکی پیاسی رہیں مگر راہِ حق سے پیچھے نہیں ہٹیں۔ محترمہ فاطمہ جناح، بیگم شاہنواز، سلمیٰ تصدق حسین، بیگم رعنا لیاقت علی خان، فاطمہ صغریٰ، بی اماں جیسی ان گنت خواتین نے اپنی زندگیاں آزادیِ سرزمین اور تشکیلِ پاکستان کے لیے وقف کر دیں۔

یوں تو بے شمار نام ہیں جنہیں تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جائے گا لیکن اس وقت میں صرف چند ان خواتین کا ذکر کروں گی جن کی بین الاقوامی سطح پر بھی پزیرائی ہوئی۔ انہیں مختلف ایوارڈ سے بھی نوازا گیا اور انہوں نے دنیا کے کونے، کونے میں پاکستان کا نام روشن کیا۔

2016ء 2015ء سیدہ غلام فاطمہ نے مزدوروں کے حقوق کے لیے کام کیا۔ بین الاقوامی تنظیم برائے مزدور کے لیے ایوارڈ حاصل کیا۔

☆ امینہ سید نے 1988ء میں بحیثیت MA oxford university press، میں پہلی پاکستانی خاتون کے طور پر کام کیا۔ ملٹی نیشنل ادارے کی پاکستان میں سربراہ رہیں۔

اس کے علاوہ ڈیڑھ سو سالوں میں پہلی خاتون ہیں جنہوں نے پہلے vice president پھر پریزیڈنٹ کے طور پر Over seas Investors chamber of commerce and industry(O,g,c,c,i) کے لیے کام کیا۔ پہلی اور واحد خاتون جنہیں یورپ کے سب سے خاص اور بڑے ایوارڈ OBE سے حکومت فرانس کی طرف سے ادب و فن کی خدمت کرنے پر نوازا گیا۔

☆ عائشہ فاروق جن کا تعلق بہاول پور سے ہے، 19 خواتین میں سے ایک ہیں جنہوں نے ائرفورس میں حصہ لیا۔ وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے جنگی لڑاکا طیاروں کی ٹریننگ حاصل کی۔ پاکستان کی خواتین کے لیے رول ماڈل بننے کے ساتھ، ساتھ سرحدوں کی

حفاظت کرنے والی ایک بہادر خاتون کے طور پر سامنے آئیں۔

☆نسیم حمید نوجوان ایتھلیٹ نے ساؤتھ ایشیا کی 100 meter کی ریس جیتی، SAF کھیلوں میں 2010ء میں جوڑھاکا میں منعقد ہوئے گولڈ میڈل جیتا اور کراچی میں لڑکیوں کی تربیت کے لیے نسیم اسپورٹس اکیڈمی بنائی۔

☆نیلوفر شاہد بحیثیت ڈریس ڈیزائنر اپنا برانڈ بنایا۔ بیرون ملک یعنی پیرس ،زیورخ ،ہالی وڈ ،انڈیا' سینٹرل ایشیا ،مڈل ایسٹ میں بڑے پیانے پر اپنے ملبوسات کی نمائش کی جہاں بڑے پیانے پر ان کے کام کی بے حد پزیرائی ہوئی۔ ان کے خاص مداحوں میں شاہی خاندانوں کی خواتین شامل ہیں سرفہرست..... پرنس ڈیانہ اور جمائما کا نام ہے۔2013ء میں حکومت فرانس کی طرف سے انہیں بیسٹ ڈیزائنر کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

☆محترمہ منیبہ مزاری، ایک نامور آرٹسٹ سماجی کارکن اور ادیبہ ......پاکستان کی پہلی اعزازی سفیر برائے اقوام متحدہ کا اعزاز حاصل کیا۔انہوں نے خواتین کے اختیارات اور عمومی مساوات کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

☆پروفیسر ڈاکٹر نرگس ماں والا نے L.I.G.o laboratory میں آئن اسٹائن کی 1915ء کی تھیوری پر کام کیا اور ان کی پیشگوئی کو صحیح ثابت کیا۔

☆فضا فرحان نے بحیثیت CEO بخش فاؤنڈیشن میں کام کیا اور اپنی محنت اور جانفشانی کی بنیاد پر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے اعلیٰ ترین درجے کے پینل میں جو خواتین کی معاشی خود اعتمادی کے لیے کام کرتا ہے۔اس ادارے میں بحیثیت سربراہ ان کا انتخاب ہوا۔

☆شرمین عبید چنائے نے خواتین پر بہترین ڈاکو مینٹری بنا کر پاکستان کو 88 Academy Award سے پہلی بار روشناس کرایا۔

☆محترمہ مزہ واحد نے زندگی بھر مزدوروں کے حقوق کے لیے آواز ہاند کی، انہی کے ساتھ زندگی گزاری خواتین کی تعلیم اور خصوصی طور پر ٹیچرز ٹریننگ کے لیے ناقابلِ فراموش کام کیا۔

70 سالہ تاریخ میں ایسی ہزاروں خواتین کے نام ہیں ادب اور شاعری میں ادا جعفری سے لے کر پروین شاکر، پروفیسر وحیدہ نسیم سے لے کر فاطمہ حسن اور شاہدہ حسن محترمہ سعدیہ راشد چیئر پرسن ہمدرد فاؤنڈیشن، بلقیس ایدھی، مہتاب اکبر راشدی، فاطمہ ثریا بجیا، بانو قدسیہ، کشور ناہید اور نہ جانے ایسے کتنے کارہائے نمایاں انجام دینے والی ہماری باہنر خواتین جنہوں نے اپنی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے گھریلو ذمے داریوں کو احسن طریقے سے بھی نبھایا اور ملک قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے مثبت اقدامات کیے۔

☆روشن ظفر نے Ayele یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی پھر ورلڈ بینک میں نوکری کی۔شروع سے ان کو Micro finance میں دلچسپی تھی جس کی بنا پر انہوں نے 1996ء میں Kashf فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی۔

U.S state department نے انہیں ایوارڈ سے نوازا جس کا نام ہے one woman iniciative Award ساتھ ہی ساتھ حکومتِ پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ تمغۂ امتیاز بھی ملا۔

☆منہال سہیل Female shooter انہوں نے 2016ء کے اولمپک مقابلوں میں حصہ لیا اور اٹھارہویں پوزیشن حاصل کی۔

☆ثمینہ بیگ وہ پہلی بہادر کوہ پیما لڑکی جس نے اکیلے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا۔اور اپنے بچپن کے خواب کو پورا کر دکھایا۔

ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے

☆☆

سوگوار سی عید

صبا آصف

پیاری بہنو! نزہت اصغر نے کہا تھا عید کی کوئی بات، کوئی یاد قارئین سے شیئر کریں میرے پاس بھی ایک یاد ہے مگر اداسی لیے ہوئے۔

ویسے تو یہ چوتھی عید ہے جو ہمارے دلوں میں خوشیوں کے بجائے اداسیاں بھر دیتی ہے کیونکہ عید کے موقع پر کبھی لوٹ کر نہ آنے والے بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔ میرے بھانجے فراز خان کو ہم سے جدا ہوئے تین سال ہو گئے بہت اچانک اور جوان موت جو اپنوں کو تو کیا غیروں کو بھی رُلا گئی۔ اس کے بعد دو عیدیں اور آئیں پہلی عید سے بھی زیادہ کٹھن وقت پہلی دفعہ تو سب ساتھ تھے دل چاہتا تھا کہ بس کمرا بند کر کے بیٹھ جاؤں نہ کوئی عید مبارک کہے اور نہ عید کی چہل پہل محسوس ہو۔ اور اس عید سے تین ماہ پہلے میری بڑی بہن کوثر جہاں رضائے الٰہی سے ہم سے ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں، فراز خان ان کے بڑے صاحبزادے تھے چاند دیکھ کر باجی کے بچوں سے بات کی بات کیا بس دونوں طرف سسکیاں ہی تھیں۔ بیٹی ہنزہ کا فون آنے پر بھی یہی حال تھا عید کی صبح نماز کے فوراً بعد میں اور آصف، باجی کے گھر گئے۔ میں لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی بچوں کے آنے پر بچوں کو گلے لگایا نہ کوئی بات کی بس خاشی سے سروں پر ہاتھ رکھ دیا ان کے سُتے چہرے اور سوجی آنکھیں دل دکھا رہی تھیں نہ جانے کتنا روئے ہوں گے عید پر ماں کو یاد کر کے شائلہ اور علیہ (باجی کی بہویں) وہ دونوں بھی اداس چہروں اور سوجی آنکھوں کے ساتھ بیٹیاں ہی معلوم ہو رہی تھیں۔ باجی کی بیماری کے دوران انہوں نے بیٹیوں کی طرح ہی خیال رکھا، اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے (آمین ثم آمین) سب خاموشی سے بیٹھے رہے میں نے باجی کے متعلق کوئی بات نہیں کی مجھ میں انہیں دوبارہ سے روتا دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد باجی کے بچوں کے بچوں کی کوئی معصومانہ حرکت یا غوں غاں تھوڑا سا متوجہ کرتی کبھی بچوں کی کوئی شرارت یا بات پر ہونٹوں پر مسکراہٹ ہلکی سی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی یا منہ سے کوئی جملہ نکلتا اور پھر گہری خاموشی...... صبح سے دو بار ہنزہ کا فون بھی آ چکا تھا۔ (ملتان سے) اسے پتا تھا ماما بہت اداس ہیں۔ ایک ماما ہی کیا سب ہی اداس تھے۔ ایبٹ آباد سے میری دوست مہ جبین کا فون آ گیا اس نے عید مبارک کہا میرا دل کٹ سا گیا میں خاموش رہی، وہ سمجھ گئی اس نے بھی بہت تسلی دی اور دل جوئی کی پھر بڑے پیار سے سمجھایا۔ صبا عید کے دن ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد ضرور دینی چاہیے، میں بہت شرمندہ ہوئی۔ ہم اپنے غم میں اتنا کھو جاتے ہیں کہ عید مبارک کہنا اور عید کی مبارک باد دینا لینا بھول جاتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں یہ کہ ہمیں برا سا لگتا ہے کہ ہمیں کوئی عید مبارک کہے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ اس کے بندے غم کی کیفیت سے جلد سے جلد نکلیں اور زندگی کی طرف لوٹیں اس لیے سوگ صرف تین دن کا ہے لیکن دل کے سوگ کا کیا کریں کچھ دیر کے بعد میں اور بینا دوسرے کمرے میں آ گئے بینا ((باجی کی بیٹی) بتانے لگی کہ کس طرح میں اسپتال پہنچی تھی اور وہاں پہنچنے پر پتا چلا کہ امی تو......بس وہ بھی روتی رہی میں بھی روتی رہی دل تو رونے کے بہانے ڈھونڈے، ہم دیر تک باجی کی باتیں کرتے رہے پھر امی، ابو، بھائی، بھابی، شاہین، انیلا وغیرہ آ گئے۔ وہ سب بھی ایسے ہی خاموشی سے بیٹھ گئے سب بے حد اداس تھے فہد باجی کا سب سے چھوٹا بیٹا بہت دیر تک اپنی نانی (میری امی) کے پاس بیٹھا رہا۔ کبھی امی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اور کبھی ان کے ہاتھوں کو ہاتھ میں لے لیتا۔ ماں کا لمس ماں کی ماں میں محسوس کرتا وہ مجھے کوئی چھوٹا سا بچہ لگا جو میلے میں ماں سے بچھڑ گیا ہو۔ یہ دنیا بھی تو ایک میلا ہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے باجی اور شدت سے یاد آئیں ہاں بس اب تو وہ ایک یاد ہی بن گئی ہیں، ایک دکھی یاد......ایک بہت خاموش اور سوگوار سی عید گزار کر رات گئے ہماری گھروں کو واپسی ہوئی۔ نہ جانے ہماری کتنی عیدیں ایسی ہی خاموش اور سوگوار گزریں گی پتا نہیں ہم کبھی دل سے خوش بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔

☆☆☆

فکاہیہ کالم — گوشۂ ظرافت — ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اپنے پیارے پاکیزہ قارئین کے اس ذوق کی سیرابی کے لیے ہم ہر ماہ ان صفحات پر فکاہیہ ادب کے پُر لطف و یادگار شہ پاروں سے انتخاب پیش کریں گے۔ اس ماہ مقبول و معروف مزاح نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کے مجموعے ”خندہ زن“ سے منتخب کردہ شہ پارے آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر......

دل ستانیاں

صاحب! دل کے ستانے کو پہلے شاعر کیا کم تھے کہ اب ڈاکٹر بھی اس میں لگ گئے ہیں۔ انہیں ہر خرابی دل ہی میں نظر آتی ہے۔ دل نہ ہوا، سابق حکومت ہوگئی۔ انہیں تو تحقیق بھی دلچسپ لگتی ہے جو دل پر چسپ ہو سکے۔ اگرچہ اب حالات ایسے ہیں کہ صرف وہ دل کے دورے سے محفوظ ہے جس کے پہلو میں دل ہی نہیں۔ جب سے فضا میں آلودگی بڑھی ہے، سب ہمیں اتنی تلقین کرتے ہیں کہ کبھی کبھی لگتا ہے، کہہ رہے ہوں۔ ”بے ضرورت سانس نہ لو، سانس بچاؤ کل کام آئے گی“۔ دو سو سال پہلے آکسیجن دریافت ہوئی تھی، اس سے پہلے پتا نہیں لوگ کیسے سانس لیتے تھے۔ ایسے ہی ہر چیز کے دل پر اثر ہونے کا سن سن کر ہم نے دل کا استعمال بہت کم کر دیا ہے۔ ظاہر ہے جتنا زیادہ استعمال ہوگا، اتنا زیادہ خرابی کا خطرہ ہوگا۔ ہمارے ہاں سیاست دان اور بڑے افسر تو پہلے ہی دل کا استعمال کم سے کم کرتے ہیں، زیادہ کام بے دلی ہی سے چلاتے ہیں، اسی لیے انہیں دل کا دورہ کم اور بیرونِ ملک کا دورہ زیادہ پڑتا ہے۔ پچھلے دنوں جرمن کے دل باختہ ڈاکٹر اسٹیفن این ویلیچ نے تحقیق کے بعد اعلان کیا کہ سوموار کے دن ہارٹ اٹیک سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ گویا دل کو حسن کے بعد، سگریٹ، شوگر اور سوموار سے خطرہ ہے۔ ڈاکٹر اسٹیفن دل کے امراض کے ماہر ہیں۔ ماہر وہ ہوتا ہے جو کسی آسان سوال کا مشکل جواب دے سکے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں چونکہ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اور چھٹی سے اگلے روز سوموار کو لوگوں کو دفتر جانا پڑتا ہے، اس اسٹریس کی وجہ سے ان کو سوموار کو ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ جیسے، ہم وہ چینی سب سے زیادہ استعمال کرنے لگے ہیں جس سے شوگر یا ذیابیطس نہیں ہوتی یعنی نکتہ چینی۔ ایسے ہی جرمنوں کو ایسی سوموار ڈھونڈنا چاہیے جو اتوار کے بعد نہ آتی ہو۔ سوموار آئے نہ ہارٹ اٹیک ہو یا یہ ہو کہ چھٹی سے اگلے دن دفتر لگا ہی نہیں کریں۔ ایسے ہی جب ہمیں پتا چلا کہ سب سے زیادہ ایکسیڈنٹ وہ لوگ کرتے ہیں جو پہلی مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہیں تو ہم نے حادثوں سے بچنے کے لیے یہ تجویز پیش کی تھی کہ پہلی مرتبہ بندے کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنا ہی نہیں چاہیے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن صاحب نے کہا تھا کہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ سب سے آخری بچہ بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس لیے آخری بچہ ہونا ہی نہیں چاہیے، ایسے ہی ہمارے ہاں ہر سابق حکومت کرپٹ ہوتی ہے، سو کرپشن سے بچنے کے لیے یہ ہونا چاہیے کہ سابق حکومت ہو ہی نہ لیکن کیا کریں لوگوں کو یہ باتیں سمجھ ہی نہیں آتیں۔ وہ تو یہ پوچھتے ہیں کہ جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو چوہے اسے خیر باد کیوں کہہ دیتے ہیں، حالانکہ انہیں کون سمجھائے کہ جو کشتی پہلے ہی ڈوب رہی ہے اسے بھلا چوہوں کی کیا ضرورت؟

آج لوگ دردِ دل کی شکایت کرتے ہیں۔ پہلے جس میں دردِ دل نہ ہوتا۔ اس کی شکایت کرتے۔ اب تو کچھ لوگ صرف اس لیے دل کے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں تا کہ لوگ سمجھیں کہ ان کے پہلو میں بھی دل ہے۔ لوگ بھی اکثر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دردِ دل رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو نہیں رکھتے۔ بندے میں خود اعتمادی نہ ہو تو اس کے ایک ہی رات میں بال سفید ہو جاتے ہیں اور عورت میں یہ نہ ہو تو ایک ہی رات میں کسی بھی رنگ کے...... ایسے بندے میں دردِ دل نہ ہو تو وہ کچھ بھی بن سکتا ہے۔ البتہ ہو تو صرف انسان ہی بن سکتا ہے۔

اس سے پہلے ایک ریسرچ یہ آئی تھی کہ دل کا دورہ کنواروں کی نسبت شادی شدہ کو زیادہ ہوتا ہے۔ شادی وہ بزنس ہے جس میں سلیپنگ پارٹنر سب سے زیادہ جاگتا ہے۔ ہمارا ایک دوست جس نے بچپن خسرے اور جوانی خسارے میں گزاری، کہنے لگا مجھے چھٹیاں چاہئیں، میری شادی ہے۔ "پوچھا۔" آپ نے گرمیوں کی چھٹیوں میں شادی کیوں نہیں کی؟" بولا۔ "اس لیے کہ میں اپنی چھٹیاں خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔" لیکن ہمارے وہ دوست شادی کے بعد دل کی بیماری کے بجائے سرطان میں مبتلا ہو گئے، ان کی بیوی کا برج سرطان جو ہے۔ پھر امریکا سے یہ تحقیق آئی کہ جس کی بیوی جتنی پڑھی لکھی ہوگی، اسے دل کی بیماری ہونے کے اتنے ہی زیادہ امکانات ہوں گے۔ یوں دل کا سارا بوجھ زنانہ تعلیمی اداروں پر ڈال دیا گیا۔ ہم مانتے ہیں کہ ان اداروں کے پاس سے گزرنے والوں کے دل پر اثر ہوتا ہے مگر اتنا علم نہ تھا کہ یہاں تعلیم کو فروغ نہیں دیا جا رہا بلکہ مردانہ دل کی بیماریوں کی شرح میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

اطلاع لاثانی

صاحب! تا اطلاع لاثانی ٹھٹھہ اور سجاول کے مچھلی فروشوں نے باقاعدہ احتجاج کر ہی دیا کہ اسمبلیوں میں سیاست دانوں کے دنگا فساد کو مچھلی منڈی کہنے سے ہمارے پیشے کی توہین ہوتی ہے۔ کرنل محمد خان صاحب نے ایک بار ہوائی جہاز کے سفر کی روداد میں لکھا ہے ایک شخص نے ایئر ہوسٹس کو چڑیل کہہ دیا تو ایک نوجوان نے کہا یہ ایئر ہوسٹس کو چڑیل کس نے کہا ہے؟ جس پر پیچھے سے آواز آئی کہ یہ چڑیل کو ایئر ہوسٹس کس نے کہا ہے۔ اس حساب سے تو مچھلی فروشوں کا احتجاج تب بنتا تھا اگر لوگ مچھلی منڈی کو اسمبلی کہتے۔

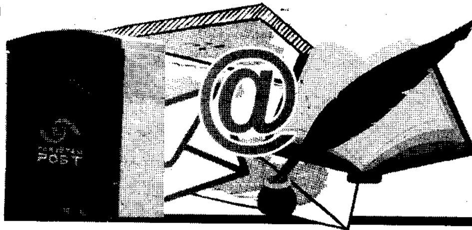
انسان دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک سیاست دان اور دوسرے خاموش طبع۔ ہمارے ایک دوست کہہ رہے تھے لگتا ہے بیٹا سیاست دان بنے گا کہ وہ یہ کہنے میں بھی دو گھنٹے لگا دیتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ ہمیں آج تک اسمبلی میں ایک ہی رکن کی تقریر پسند آئی، اس تقریر کی یہ خوبی تھی کہ وہ ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے ہی ایک بار چرچل، بجٹ تقریر میں اعداد و شمار سن رہے تھے انہوں نے دیکھا ایک رکن ہیرنگ ایڈ لگا کر بڑا سا سر آگے کو کیے توجہ سے سننے کی کوشش کر رہے ہیں تو چرچل نے ساتھ والے سے پوچھا یہ کون احمق ہے جسے قدرت نے جو موقع دیا ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ ان سے کسی نے پوچھا آپ نے اسمبلی میں کبھی غلطی کی؟ کہا۔ "ایک بار" پوچھا۔ "کیا ہوا تھا؟" بولے۔ "میں نے کہا تھا کہ میں نے غلطی کی ہے۔"

ہم نے سیاست دانوں سے ہر بار سیکھا اکثر سبق ہی سیکھا۔ گرگٹ تک نے ان سے رنگ بدلنا سیکھا۔ رکن اسمبلی وہ ہوتا ہے جو سنجیدہ موضوع کو غیر سنجیدگی سے لیتا ہے اور غیر سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ گفتگو کرتا ہے۔ ویسے مزاح نگار اور سیاست دان سنجیدہ بات کرے تو اس کا منہ سونگھنے کو دل چاہتا ہے۔

اچھے سیاست دان وہ ہوتے ہیں جنہوں نے جو کہنا ہوتا ہے اس کا نصف کہتے ہیں یہی نہیں، سنتے بھی اتنا ہی ہیں۔ سیاست دان اور شیطان غصے میں کم ہی آتے ہیں۔ غصے میں ہوں تو دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں سیاست دان ہر وقت جھوٹ بولتے رہتے ہیں یہ درست نہیں کیونکہ کبھی کبھی وہ چپ بھی ہوتے ہیں۔

طلبہ کے لڑنے کے لیے کالج، پہلوانوں کے لیے اکھاڑے اور لیڈروں کے لڑنے کے لیے جو اسٹیڈیم ہوتا ہے اسے اسمبلی کہتے ہیں۔ دنیا کے سب سے قیمتی رکن اسمبلی ہمارے ہاں ہیں۔ اسمبلی وہ جگہ ہے جو اتفاق سے نہیں ہمیشہ اختلاف سے چلتی ہے وہاں حزبِ اختلاف کا وجود ایسے ہی ہے جیسے ایک امریکی صدر جانسن نے کہا تھا کہ جس ٹاؤن میں ایک وکیل کا گزارہ نہ ہو وہاں دو ہو جائیں تو ان کا گزارہ بڑا اچھا ہو سکتا ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

تمام تعریفیں اس رب العزت جل شانہ کو زیبا ہیں جو ہمارا اور کل عالمین کا پروردگار ہے۔ وہ وحدہ لاشریک ہے...... اور کروڑ ہا درود و سلام رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ جن کی آمد سے جہالت وظلمت کے اندھیرے چھٹے اور دنیا میں حق کا بول بالا ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان کی قوت و پختگی کے ساتھ دونوں جہاں میں سرخروئی نصیب فرمائے اور اپنے کنزِ خاص سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو ہمارے حق میں بہتر ہو (الٰہی آمین)

☆☆☆

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! میری طرف سے آپ سب کو سلام اور پُرخلوص دعائیں...... کیا حال ہیں؟ امید ہے آپ سب نے اپنے چاہنے والوں کے ساتھ عید خوب بھرپور انداز میں گزاری ہوگی۔ آپ کے خطوط اور ٹیلی فون کالز مسلسل موصول ہو رہی ہیں...... مجھے اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ آپ بہنیں مجھ سے بات کرنے کی اتنی زیادہ خواہش رکھتی ہوں گی ورنہ میں اپنی دیگر مصروفیات سے وقت نکال کر آپ لوگوں سے بات کرنے کا کوئی نہ کوئی شیڈول بنا لیتی لیکن اب جیسا کہ آپ لوگ اس بات سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ میں تقریباً روز ہی کم از کم تین گھنٹوں کے لیے آفس تو ضرور آتی ہوں یوں آپ لوگ مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔ ٹیلی فون نمبرز تو ان صفحات پر مسلسل دیے جا رہے ہیں۔ ماہنامہ پاکیزہ سے آپ لوگوں کو دلی وابستگی اور اس کی بہتری کے سلسلے میں آپ کے عمدہ مشورے اور قابلِ غور تجاویز کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ آپ لوگوں کی آرا کی روشنی میں انشاء اللہ ہم پاکیزہ میں دلچسپ اور خوشگوار تبدیلیاں لاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر ممتاز ضیا آپ کی طبیعت اب کیسی ہے، آپ محفل میں کیوں نظر نہیں آرہیں؟ آپ کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ فوراً تبصرہ بھیجیں اور عقیلہ حق تم نے وعدہ خلافی شروع کر دی تمہارا تبصرہ نہیں پہنچا اور ناہید فاطمہ حسنین تمہارا شکریہ کہ میرے کہنے پر تم نے اپنی تحریر بھیجی جو اسی ماہ لگی ہے امید ہے اب قلم روک کر بیٹھ نہیں جاؤ گی۔ مسز افتخار شوق امید ہے آپ کے کاندھے کی چوٹ اب بہتر ہوگی۔ انشاء اللہ اسی طرح آپ سے باتیں ہوتی رہیں گی۔

آخر میں بہنوں کو جشنِ آزادی کی ڈھیروں مبارک باد کے ساتھ دعا گو بھی ہوں کہ یہ 14 اگست پوری قوم ایک ہو کر دلی جوش و جذبے کے ساتھ منائے۔ (الٰہی آمین)

فی امان اللہ!

دعا گو: عذرا رسول

☆☆☆

عزیز بہنو! یوم آزادی کی مبارک باد تو آپ نے وصول کر لی اور جناب 1947ء سے 2017ء تک کا سفر بخیر و خوبی گزر ہی گیا...... انشاء اللہ رہتی دنیا تک وطنِ عزیز آزادی کے پُررونق جشن یونہی مناتا رہے گا۔ جشن تو ضرور منانا چاہیے مگر پاکستان کی ترقی کا، خوشحالی کا، جدید ٹیکنالوجی سے لیس پاکستان کا...... ایسی سرزمین کا کہ جہاں کے باسی خود اپنے ہی ہم وطنوں کے لیے آزار کا باعث نہ بنیں...... ایسی دھرتی کہ جس کے کسانوں کو، مزدوروں کو، محنت کشوں کو اپنا حق بھیک کی طرح

نہ مانگنا پڑے۔ ہم بحث و مباحثے اور مذاکروں کے ذریعے بہت ہی آئیڈیل پاکستان کے خواب دیکھتے اور دکھاتے ہیں مگر نہ جانے کیوں عمل کے میدان میں صفر ہو جاتے ہیں۔ چلیں آئیں آج ہم اپنا محاسبہ کرتے ہیں اور دعا بھی مانگتے ہیں کہ ہمیں سچا محب وطن پاکستانی بننا نصیب ہو، (الٰہی آمین)۔

قارئینِ کرام آپ کا بہت شکریہ کہ آپ سب مسلسل میری حوصلہ افزائی اور ہر ممکن تعاون کر رہے ہیں۔ اسی باہمی رابطے سے ہم بہتر سے بہترین پاکیزہ کا سفر طے کرتے چلے جائیں گے انشاء اللہ...... ! آپ کو ہر آن خوش آمدید کہنے کے لیے ہمارے ٹیلی فون نمبرز درج ہیں۔ نزہت اصغر 03316266612 آفس لینڈ لائن 0213586783-02135802552-0213
EXT.122,107,118/02135895313

اور حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمیؑ اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانان عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الٰہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مصنفہ و ڈراما نگار سیما مناف اپنے بچوں سے مل کر کراچی پہنچنے والی ہیں۔
☆ مستقل تبصرہ نگار سنبل ملک اعوان، لاہور بے سہارا بوڑھوں کے لیے آغوش کے نام سے گھر تعمیر کروا رہی ہیں۔ (بہت خوب سنبل، بہنوں دعا کیجیے گا کہ سنبل ملک کو ایک پُر خلوص ہم سفر مل جائے، جزاک اللہ)
☆ شاعرہ شگفتہ شفیق اپنے اعزا سے ملنے اور مشاعروں میں شرکت کی غرض سے کینیڈا گئی ہوئی ہیں۔ (بہت خوب)
☆ رضوانہ پرنس لندن روانہ ہو گئیں۔
☆ مصنفہ شیریں حیدر اپنی بیٹی اور دیگر اعزا سے ملنے امریکا و کینیڈا گئی ہوئی ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری رفیعہ ابدالی کی بھتیجی کی شادی گزشتہ دنوں انجام پائی۔ (مبارک باد' بہنو! رفیعہ ابدالی اور ان کے بھائی کی شادی کے لیے بھی خصوصی دعا کی درخواست ہے۔)
☆ نئی رائٹر ثنا کنول، لودھراں آج کل کہانیاں لکھنے میں مصروف ہیں۔ (کوشش جاری رکھیے)
☆ سویرا فلک کی فیملی میں (ننھی پری) بیٹی کا اضافہ ہوا ہے (مبارک باد)
☆ رائٹر، شاعرہ اور صحافی ہما بیگ ایک پیارے سے نواسے کی نانی جان بن گئی ہیں۔ (مبارک ہو)
☆ مصنفہ صدف آصف، آسٹریلیا شفٹ ہو گئی ہیں۔
☆ آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ہماری پیاری مصنفہ فریدہ لاکھانی ادبی پروگراموں میں کافی متحرک ہیں...... پچھلے دنوں ایک مشاعرے میں انہوں نے بھی شرکت کی جس میں پاکستان سے شاعر نصیر ترابی و دیگران بھی مدعو تھے۔

سالگرہ مبارک ہو

☆ فصیحہ آصف خان، نزہت اصغر، صباحت بنگش، نگینہ بنگش، رضوانہ منظر، آمنہ حماد، انیلا عباس، فرحت حسین، عائشہ میر، تحسین ریاض...... ذوالقرنین حیدر، ناہید رقیب خان۔

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری لاہور کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔
☆ پیاری امینہ عندلیب سلانوالی تاحال بیمار ہیں۔
☆ مسز یاسمین، لیہ کی کزن شہناز کو بریسٹ کینسر تشخیص ہوا ہے۔
☆ مصنفہ سیما بنت عاصم پتے کے درد کے عارضے میں مبتلا ہیں۔
☆ محترمہ ذکیہ ایوب کی آنکھوں کی روشنی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔
☆ شاعرہ، مصنفہ اور ماہرِ تعلیم افتخار شوق، میاں چنوں حادثے میں زخمی ہو جانے کے باعث تاحال کاندھے کی

تکلیف میں مبتلا ہیں۔

انتقالِ پُرملال

☆اس ماہ محترمہ عذرا رسول کے بڑے بھائی نذر عباس کی برسی ہے۔
☆مستقل تبصرہ نگار پروین افضل شاہین، بہاول نگر کی والدہ محترمہ انتقال کر گئیں۔
☆مستقل تبصرہ نگار رفیعہ ابدالی، کراچی کی بڑی بھابی انتقال کر گئیں۔
☆نامور گلوکارہ ناہید اختر کے شوہر آصف علی پوتا انتقال کر گئے۔
☆پاکیزہ کی مستقبل تبصرہ نگار اور معروف کالم نگار نرگس نسیم، صابہ موہڑہ کی جیٹھانی انتقال کر گئیں۔
☆میری والدہ کنیز صغریٰ کی اس ماہ برسی ہے۔
☆مصنفہ اور مستقل تبصرہ نگار فصیحہ آصف خان، ملتان کی والدہ کی اس ماہ برسی ہے۔

☆☆☆

نگہت اعظمی، کراچی سے۔ ''جون کا پاکیزہ ابھی مکمل نہیں پڑھا کیونکہ رمضان میں مصروفیات بہت زیادہ تھیں اور اب تو جولائی کا شمارہ بھی ملا۔ رفعت سراج کا ناول میرا پسندیدہ ناول ہے، اس کی کیا تعریف کروں کیونکہ رفعت کا نام ہی کافی ہے۔ حالانکہ شروع کی دو تین قسطیں مجھے بہت زیادہ پسند نہیں آئیں لیکن اب تو سب سے پہلے میں ان ہی کا ناول پڑھتی ہوں۔ (شروع میں تو تعارفی اقساط ہوتی ہیں ناں) ناول کے بعد جو دو افسانہ نگاری کے میدان میں بہترین نام ہیں ایک نیلم احمد بشیر اور دوسری ناہید سلطانہ اختر...... ان کے افسانے رسالے میں ہوں تو ان کو پڑھے بغیر کوئی کیسے رہ سکتا ہے؟ دونوں ہی بہترین رائٹر ہیں اور دونوں نے بہت اعلیٰ معیار کا لکھا...... رفعت شبانہ نے بھی اچھا لکھا۔ عقیلہ حق نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا اور لڑکیوں کو بہت اچھے انداز میں نصیحت کی کہ کس طرح سسرال میں قدم جمانے کے لیے صبر کے گھونٹ پینا پڑتے ہیں۔ من جاں بازم بہت زیادہ طویل ہوتا جا رہا ہے۔ (جی اس بار آخری قسط ہے) سیما رضا میری بہت اچھی دوست ہے، میں نے اس کے ناول کی شروع کی قسطیں نہیں پڑھیں اب انشاء اللہ مکمل ناول پڑھ کر رائے دوں گی۔ انٹرویو ٹھیک تھا یعنی پاکیزہ کے مہمان...... جولائی کے شمارے میں ابھی تک رفعت سراج، غزالہ عزیز، عقیلہ حق کی تحاریر پڑھیں جو ساری ہی اچھی ہیں۔ فریدہ اشفاق کا انٹرویو ٹھیک تھا۔ باتیں بہار و خزاں کی پسند آیا۔ اسے جاری رکھنا۔ (جی ہاں یہ ایک ماہ کے وقفے سے لگتا رہتا ہے اس ماہ بھی ہے) اختر شجاعت اور ذکیہ بلگرامی کے مضامین مذہبی ہونے کے باوجود بور نہیں ہوتے۔ اور پڑھنے والوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اس شمارے میں نئی لکھنے والیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ نئی لکھنے والیوں میں ہاجرہ ریحان بہت اچھا لکھ رہی ہیں، میں ان کے افسانے ضرور پڑھتی ہوں۔'' (نگہت بہت دنوں بعد تبصرہ اور کہانی لے کر آئیں اب گیپ نہیں آنا چاہیے)

فریدہ لاکھانی، سڈنی آسٹریلیا سے۔ ''یہاں آسٹریلیا میں موسم بالکل الٹ ہے چونکہ ہماری سردیاں شروع ہو گئی ہیں اور روزے اپنا قد بڑھا نہیں سکتے، لہٰذا بارہ گھنٹے کا روزہ ہوتا ہے۔ رمضان کی وہی رونقیں پاکستان جیسی اب یہاں بھی ہماری حیران نگاہیں ہمیں دکھانے لگی ہیں۔ آبادی بڑھ رہی ہے، مسلمانوں کی خصوصاً ہم پاکستانیوں کی لہٰذا مسلم علاقے میں رات تراویح کے بعد جہاں دکانیں اور خورونوش اشیا بکتی ہیں وہاں روڈ پر فوڈ فیسٹول لگتا ہے اور لوگ رات ایک، ایک بجے بھی گھر جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ بیچارے پولیس والے کہتے ہیں اب تو گھر جائیں ہمیں بھی ڈیوٹی چینج کرنی اور آرام کرنا ہے مگر ایک میلے کا سماں ہوتا ہے، روڈ پر ہی تندور لگتے ہیں اور خوب نان و کباب بکتا ہے اس کی تپش اور گرمی کی وجہ سے لوگوں کو سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ عید کی خرید و فروخت بھی ساتھ، ساتھ چل رہی ہے اور مختلف جگہوں پر چاند رات میلوں کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے اگلے ہفتے کی رونقیں بڑھا رکھی ہیں۔ (آپ نے تو بھوک بڑھا دی فریدہ اب تو عید قربان کی بھی مبارک باد وصول کریں) چند ماہ قبل میں امریکا گئی تھی وہاں حبیب ولی محمد صاحب کے بیٹے رضوان ولی محمد نے میری غزل میرے سامنے سنائی اور انہوں نے اپنی البم میں بھی ڈالی ہے۔ اس وقت وہ کانسرٹ کر رہے ہیں امریکا اور کینیڈا میں جہاں اس غزل کو پیش کرنے والے ہیں۔'' (آپ کو مبارک ہو)

✉ رفعت خادم یونس، ملتان۔ آپ کے بھیجے گئے مراسلے باقاعدگی سے لگ رہے ہیں آپ کہانیوں پر بھی تبصرہ بھیجیں۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ راحیلہ بنت مہر علی، آما خیل ضلع ٹانک۔ آپ کی ای میلز موصول ہو رہی ہیں، مراسلے بھیجنے کا شکریہ، کہانیوں کے لیے کہنا ہے کہ ابھی مطالعے پر زور دیں۔

✍ نیلوفر خان، بہارہ کہو سے۔ ''باجی جب سے میری بچیاں رسالہ پڑھنے لگی ہیں تو میں باقاعدگی سے تبصرہ بھیجتی ہوں کہ ان کی رائے بھی شامل ہوتی ہے۔ اس دفعہ تو تمام افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ عقیلہ حق نے تمام عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ منشا محسن علی نے بہت خوب صورتی سے عشق و محبت کے باب رقم کیے اور سیمار رضا ردا نے تو ایمان کے تقاضے جس وضاحت اور باریکی سے بتائے وہ قابلِ غور ہیں۔ من جاں بازم میں سحر ساجد نے ہنیا کے جذبات بہت اچھی طرح بتائے۔ ویسے ثنا اور حیدر کی باتیں مزیدار تھیں۔ دیکھیں اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔ نادیہ احمد کا خلش بہت بہترین مکمل ناول تھا۔ بالکل آج کل کے حالات کے اوپر اس کے علاوہ عید سے متعلق کہانیاں بھی عمدہ تھیں۔ اس دفعہ وہ آئے بزم میں کمال کی سجی تھی۔ فریدہ اشفاق کی شعر بھری باتیں لطف دے گئیں۔ ارے واہ مہندی کے ڈیزائن بھی بہت اچھے تھے اور آپ نے نامور مزاح نگاروں کی تحریریں اچھی دیں یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ اختر شجاعت صاحبہ نے تقویٰ پر لکھ کر اپنے ایمان کو پرکھنے پر مجبور کردیا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی تحریر کے لیے الفاظ کم ہیں بہت ہی عمدہ...... عید کی مناسبت سے اشعار اور تراشے بھی سب اچھے تھے۔'' (نیلوفر تفصیلی تبصرے کا شکریہ...... اچھی بات ہے کہ بچیاں بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی ہیں، یہ تو نوعمر لڑکیوں کا بھی رسالہ ہے)

✍ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''جولائی کا پاکیزہ دلکش تحریروں سے سجا بہت اچھا لگا۔ عید کی مناسبت سے افسانے بہت عمدہ تھے۔ خاص طور پر عقیلہ حق کا مہر نہایت شاندار اور بہترین میسج سے بھرپور جامع تحریر تھی اسی طرح سجنا سنگ میری عید ریما نور رضوان نے بھی زبردست لکھا اور جناب چاند کی کھڑکی کا تو جواب نہیں منشا محسن علی نے بہت خوب صورت لکھا ہے واللہ اس دلنشیں ناولٹ کا جواب نہیں اسی طرح صاعقہ علی جیلانی کا گھر سے چوراہے تک بھی بہت جاندار تھا تقریباً تمام افسانے اور ناولٹ اچھے تھے مگر نہایت معذرت کے ساتھ کہ آپ کے سلسلے وار ناولز بالکل مزہ نہیں دے رہے۔ اس پر خصوصی توجہ دیں۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت کی تحریر دل کو چھوتی ہے تقویٰ کے بارے میں وضاحت سے لکھا گویا دل کو منور کر گیا اللہ ہم سب کو ہدایت دے، آمین۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں صغریٰ زیدی بہترین اشعار منتخب کرتی ہیں یہ سلسلہ تو ہمیں دل سے پسند ہے باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے مگر بہنوں کی محفل کا تو کوئی جواب ہی نہیں امید ہے آپ ہمیں بھولیں گی نہیں۔'' (بہنوں کو بھولا نہیں جاتا، آپ کی آرا اہم ہوتی ہیں، مصنفات تک آپ کی تعریف پہنچادی گئی ہے۔ سلسلے وار ناول آپ نے باقاعدگی سے نہیں پڑھے ایک آدھ قسط بھی چھوٹ جائے تو مزہ نہیں رہتا۔ ہماری مصنفات بہت تندہی سے آپ کے لیے لکھ رہی ہیں۔ رفعت سراج کی منظر نگاری، تاریخ دانی اور پھر کردار کے فکری تجزیے کا تو کوئی جواب نہیں اور شیریں حیدر رشتوں کی نزاکتوں کو بہت خوب صورتی سے بیان کرتی چلی جاتی ہیں)

✍ صبا نور، لیہ سے۔ ''جولائی کا شمارہ اپنے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ انجم آپی بہت اچھی محبت کرنے والی پُرخلوص اور ملنسار ہیں میں انہیں کبھی نہیں بھلا سکتی وہ ہمیشہ میری دعاؤں میں رہیں گی (جی بالکل) اللہ پاک انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین) بہنوں کی محفل میں سنبل ملک نے مجھے یاد کیا تو سنبل میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟ اور تم جو گھر بے سہارا لوگوں کے لیے بنا رہی ہو اللہ پاک اس کا آپ کو اجر دے گا...... ایک دکھی بہن جو کراچی سے ہیں میں نے ان کے لیے بہت دعا کی ہے اللہ انہیں صحت دے اور ان کی جلد اچھی سی جگہ شادی ہو جائے۔ عقیلہ حق کا افسانہ مہر بہت اچھا لگا محبت اور عزت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں اگر یہ نہ ملیں تو انسان ٹوٹ جاتا ہے بکھر جاتا ہے، انجم انصار کے ناول کی لاسٹ قسط بہت اچھی لگی۔ شکر ہے کہ صبا کو اپنا پیار مل گیا اور گم شدہ محبت گمشدہ نہیں رہی۔ صائمہ اکرم کا ڈراما کس چینل سے آن ائر ہوگا اور کب ہوگا؟ (یہ تو آپ کو باقاعدگی سے ٹی وی دیکھنے پر معلوم ہوگا) عظمیٰ آفاق پاکیزہ ڈائری بہت خوب صورتی سے سجاتی ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☒ منشا محسن علی، بھکر۔ امید ہے اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہوگی اور عید کی خوشیاں بھی جھولی میں بھری ہوں گی۔ آپ کا پُر خلوص طرزِ تخاطب بلاشبہ قابلِ قدر ہے۔ اگرچہ آپ طفلِ مکتب سہی مگر تحریر میں پختگی ہے۔ ترقی کی راہوں میں بہت سی رکاوٹیں آتی ہیں مگر اللہ کی مدد اور اس کی عطا کی ہوئی محنت شاملِ حال ہو تو سب وقت بہ آسانی گزر جاتا ہے آپ کے پُر خلوص جذبات کی ادارہ قدر کرتا ہے۔ مشقِ تحریر جاری رکھیے۔

☒ رابعہ افتخار شیخ آپ کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ باقاعدگی سے تبصرہ بھی بھیجیں تحریر کی اشاعت کا فیصلہ پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔

☒ نگہت غفار، کراچی۔ آپ کی تحریریں موصول ہوگئی ہیں۔ پڑھنے کے بعد اشاعت کا فیصلہ ہوگا۔ آپ کے مراسلات بہت خوب صورت ہوتے ہیں، شاعری بھیجنے کا شکریہ...... آپ کے پُر خلوص جذبات کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ ٹیلی فون نمبرز انہی صفحات پر درج ہیں۔

☒ حنا دیہ احمد، آپ کی کہانی جلد شائع ہوگی۔

☒ دانیہ آفرین، آپ کی مختصر کہانیاں بہت عمدہ ہیں انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شامل ہوں گی، رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ......

☒ شفق افتخار، آپ پہلے چھوٹی کہانیاں بھیجیں۔ پاکیزہ کے صفحات آپ لوگوں کے لیے ہی ہیں۔

✍ فردوس امین، گاؤں بار ٹھی سے۔ ''باجی آپ کو روزوں اور عید کی بہت مبارک باد مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے۔ میں بھی اس میں لکھنا چاہتی ہوں۔'' (آپ کو بھی مبارک ہو، آپ پہلے رسالے کا مطالعہ کریں پھر کہانیاں بھی لکھ ڈالیے گا......اور مراسلات بھی بھیجتی رہیں)

✍ صدف نورین، لاہور کینٹ سے۔ ''کچھ دوسرے رسائل پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یقین جانیں جو معیار پاکیزہ کا ہے وہ کسی اور رسالے کا نہیں ہے۔ پاکیزہ عرصہ دراز سے اپنے قارئین کی توجہ کا بے حد مرکز رہا ہے۔ ہر سلسلہ نمبر ون ہے۔ نئی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ مجھے مطالعے کا بے حد شوق ہے۔ کہانی لکھنے کا بہت شوق ہے پر لکھ نہیں پا رہی۔ اس لیے میں ذوق شوق سے مطالعے پر توجہ دے رہی ہوں تا کہ جب لکھوں تو اچھا معیاری لکھ سکوں۔'' (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ بہت اچھا کر رہی ہیں پہلے خوب مطالعہ کریں نامور مصنفات کو پڑھیں پھر لکھیں)

✍ ثمر کاظمی، ڈیرا اسماعیل خان سے۔ ''اس دفعہ مہندی لگائے ٹائٹل پر ماڈل خوب صورت تھی مجھے کچھ کہنا ہے میں نزہت اصغر کی دلچسپ باتیں دل کو چھو گئیں۔ رفعت سراج کی کہانی تو بندے کو گھما کر رکھ دیتی ہے۔ (جی ہاں اچھی چیز سمجھنے کے لیے دماغ کا استعمال ضروری ہے) منشا محسن علی کیا زبردست ناولٹ تھا چاند کی کھڑکی، من جاں بازم، سحر ساجد یہ کیا کر دیا آپ نے۔ موی اور حیدر کا جوڑ کیوں بنا دیا اور رہنیا اتنی بے حس اگلی قسط کا انتظار ہے۔ مسافت، غزالہ عزیز نے ٹھیک لکھا زندگی تو حسین ہے بھی خوب رہا بات ہو جائے خلش کی تو نادیہ احمد کی یہ تحریر مجھے اچھی لگی۔ ہم کو عبث بدنام کیا اب ختم کر دیں ورنہ کہانی میں جمود چھا جائے گا۔ (مصنفہ کہانی کو منطقی انجام تک پہنچا رہی ہیں) تخلیق کار افسانوں میں بازی لے گیا دو میٹھے بول اور باقی کہانیاں بھی زبردست تھیں، وہ آئے بزم میں فریدہ اشفاق کو دیکھ کر خوشی سے چیخ نکلی میری فیورٹ رائٹر شکستِ شب آج تک یاد ہے۔'' (ارے زیادہ زور سے مت چیخیں پڑوسی پریشان ہو جائیں گے۔ تبصرے کا شکریہ)

✍ ثمینہ کوکب، جہلم سے۔ ''حسبِ معمول پاکیزہ کے تمام سلسلے بہترین جا رہے ہیں۔ معراج رسول صاحب کو اللہ تعالیٰ صحتِ کاملہ عطا فرمائے اور بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتِ کامل سے شفا و زندگی عطا فرمائے، آمین۔ پاکیزہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ مزید کامرانیاں اور کامیابیاں سمیٹے۔ دن دگنی رات چوگنی ترقی نصیب ہو، آمین۔'' (پیاری ثمینہ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ...... کہانیوں پر بھی تبصرہ لکھیں)

✍ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ''کرن خان اسمی کا افسانہ کافی ہلکا تھا۔ معیار کا خیال رکھیں پلیز قسط وار سلسلے کم ہوں تو اچھا ہے۔ پاکیزہ سے ہمارا ناتا بہت پرانا ہے۔ اب ہم نانی، دادی بن چکے ہیں مگر پاکیزہ پڑھنے کی عادت نہیں گئی۔

پاکیزہ کا ایک اعلیٰ معیار ہے آج کی نئی رائٹرز اس بات کا ضرور خیال رکھیں اور آپ بھی انتخاب پر سمجھوتا نہ کریں۔ ہم پاکیزہ کو ہمیشہ بہترین دیکھنا چاہتے ہیں۔'' (مسرت ہماری رہنمائی کا شکریہ...... ہم دیگر باتوں کے علاوہ کہانی کے پیغام پر فوکس کرتے ہیں۔ بے شک نئی رائٹرز کے لیے تعمیری تنقید رہنما کا درجہ رکھتی ہے)

☜ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ''جولائی کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ اللہ پاک آپ سب کو بہت کامیابی دے۔ اس دفعہ رمضان اور عید کے بارے میں سب کہانیاں اچھی تھیں۔ بس میری بچیاں اور دوستیں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ میری شاعری اور مراسلات کو جگہ دیتی ہیں...... پچھلے دنوں میرے بچے بیمار رہے اس لیے تفصیلی تبصرہ نہ بھیج سکی۔'' (اللہ انہیں صحت دے، کوئی بات نہیں اگست کے شمارے پر تفصیلی تبصرہ لکھ دینا۔ دعاؤں کا شکریہ)

☜ طاہرہ، خوشاب سے۔ ''باجی پاکیزہ تو میری جان ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ پاکیزہ نے میری زندگی بنا دی ہے۔ ہمارے گھر سے ڈاک خانہ بہت دور ہے۔ ہر ماہ باقاعدگی سے خط نہیں لکھ سکتی اس لیے فون پر بات کرنی پڑتی ہے۔ میرے شوہر بھی شوق سے پڑھتے ہیں شکر ہے میرے پڑھنے پر پابندی نہیں ہے۔ رسالے میں جناب معراج رسول صاحب کی طبیعت کا پڑھ کر ہم دونوں نے الگ الگ دو، دو نفل حاجت کے پڑھ کران کی صحت کے لیے دعا کی (جزاک اللہ طاہرہ) آپ سے بات کر کے اچھا لگتا ہے۔ آپ نے بہت اچھا، بہنوں کی محفل میں لکھا ہے عذرا آپی کی باتیں بھی اپنائیت لیے ہوتی ہیں۔ پاکیزہ نے ہم بہنوں کو جوڑے رکھا ہے۔ ناظمہ شاہین، واہ کینٹ اور سنبل ملک، لاہور سے کہنا ہے کہ مجھ سے رابطہ کریں۔ (جی بہنوں آپ طاہرہ سے ضرور رابطہ کریں) اس ماہ عقیلہ حق کی کہانی مہرا ے ون تھی بالکل حقیقت لکھی ہے انہوں نے۔ فوزیہ اشرف کی زندگی تو حسین ہے بھی زبردست کہانی تھی۔ اس کے علاوہ ڈائری کے صفحات خوش ذائقہ، اشعار بلکہ سبھی کچھ پاکیزہ میں اچھا لگتا ہے۔ ہاں ذکیہ آپا اور اختر آپی کے مذہبی مضمون بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔'' (طاہرہ آپ فون پر تبصرہ لکھوا سکتی ہیں مگر خط بھی ضرور بھیجیں جب بھی نزدیکی شہر جانا ہو کیونکہ اگر فون پر تبصرے لکھنے لگے تو سارا وقت تو اسی میں لگ جائے گا پھر پاکیزہ کا کام کیسے کریں گے ڈیئر اور محکمۂ ڈاک کو بھی تو چلنا ہے ناں)

☜ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''جولائی کا پاکیزہ ملا مگر یہ کیسا ٹائٹل تھا جبکہ پاکیزہ کے ٹائٹل تو ہمیشہ شاندار ہوتے ہیں۔ (کبھی کبھی ایسا بھی سہی) افسانے بے حد شاندار...... فصیحہ آصف نے تو کمال کر دیا۔ ایک اور دھما کا رضوانہ پرنس صاحبہ کی اماں کی عید پڑھ کر مزہ آ گیا۔ میری دو، دو ہم نام فریدہ لا کہانی، فریدہ سیفی کے افسانوں نے مزہ دیا مبارک ہو۔ مائی فیورٹ عقیلہ حق کا تو نام ہی کافی ہے۔ کیا کمال کا افسانہ لے کر آئیں بے حد دعا اور سلام...... ریما نور رضوان واہ جی واہ کیا کہنے سجاں سنگ میری عید واقعی عید کا مزہ تو ساجن کے ساتھ ہی آتا ہے بہت ہی اچھی تحریر لگی۔ ناولٹ سب بہترین لگے ذکیہ کی تحریر اللہ اور اس کا نور پڑھ کر کانپ کر رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ ہماری مغفرت فرمائے، دین کی طرف راغب کرے، آمین۔ اور میں سوچ رہی ہوں کہ ہم لاکھوں میں کھیل رہے ہیں اور کئی گھروں میں دال روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی مدد کرنی چاہیے اس طرح ہمیں سکون ملتا ہے۔ (جی ہاں اللہ سب کی توفیقات میں اضافہ کرے) نزہت جی ہماری شاعری نہیں لگی (جی اس ماہ لگی ہے، کبھی کبھی ہو جاتا ہے فریدہ) اور اب تو ہر شہر میں اور لاہور میں بھی بے حد شدید گرمی پڑ رہی ہے گرمی سے ہمارا حال بے حد برا ہوتا ہے۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے تبصرے کا شکریہ)

☜ افتخار شوق کا ٹیلی فونک تبصرہ میاں چنوں سے۔ ''ڈیئر میں تو عذرا رسول کی پہلے ہی زبردست فین تھی اور اب مزید ہو گئی ہوں۔ انہوں نے نہایت خلوص و محبت سے بات کی اور اتنے پیارے انداز میں میرے لیے لکھا۔ میرا تو عشق پاکیزہ سے اور اہلِ پاکیزہ سے بے لوث ہے (جی بے شک) اتنی تکلیف کے عالم میں بھی رسالہ نہیں چھوٹا آپ سب کا بہت شکریہ کہ اتنی عزت دیتے ہیں (ارے افتخار آپ لائق عزت ہیں بھئی ایک تو آپ ماہر تعلیم ہیں دوسرے اتنی پُرخلوص سچی ساتھی ہیں تو یہ ہمارے لیے آنر ہے ڈیئر) میرے بھائی، بھابی تو میری کافی خدمت کر کے واپس کراچی چلے گئے مجھے بھی ساتھ لے جا رہے تھے مگر یہاں کی مصروفیات اور کمٹ منٹ ہیں۔ اب پچھلے دنوں میری بہن ماہ نور اور اس کے میاں زبردستی لاہور لے گئے کہ بڑے آرتھوپیڈک سرجن کو دکھائیں گے۔ اور وہاں چیک اپ کرایا دوائیں اور فزیوتھراپی اس نے لکھی مگر یہاں میں لاہور شہر کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہی ہوں کہ کافی عرصے بعد جانا ہوا تھا، بہت ہی خوب صورت اور بالکل بدل

گیا ہے۔ تاریخی مقامات جہاں ہم آرام سے ہر وقت چلے جاتے تھے جیسے شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، مینار پاکستان وغیرہ اب اندر جانا مشکل ہے یعنی سیکورٹی کی وجہ سے...... میری بہن، بہنوئی اور ان کے بچوں یاسر اور سارہ نے خوب لاہور کی سیر بھی کرائی۔ اب تو بھئی دبئی کے جیسے مالز ہر شہر میں بن گئے ہیں لاہور میں بھی ہاں مگر وہی بات کہ ہر طبقے کی پہنچ میں نہیں یعنی اندر تو چلے گئے مگر بچوں کی رائیڈز اتنی مہنگی فوڈ کورٹ مہنگا اور دکانوں اور سامان کے تو کہنے ہی کیا۔ ویسے بھی اب تفریح کافی مہنگی ہوگئی ہے۔ ضروری بات ایک اور بتاتی چلوں کہ وہاں میں نے اپنے پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اور ان کی فیملی سے بھی ملاقات کی۔ بہت لطف آیا تھا۔ ان کی مسز بھی پروفیسر ہیں۔ بیگم عذرا سعید انہوں نے بہت ہی پُرتکلف چائے کا اہتمام کیا تھا۔ ایک عرصے بعد اسٹوڈنٹس لائف کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ تکلیف تو میری تھوڑی بہت کم ہوئی ہے مگر آپ یقین کریں اسپتال میں اپنے سے زیادہ تکلیف میں مبتلا مریضوں کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں چل پھر رہی ہوں اور کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہوں اور میرے اردگرد کتنے چاہنے والے ہیں۔ سچ بات ہے انہیں دیکھ کر اپنی پریشانی کچھ نہ لگی۔'' (یہ بات تو ہے افتخار جبھی تو اللہ نے فرمایا کہ مالی طور پر اپنے سے کم لوگوں کی طرف نگاہ کرو اور پریشانی اور بیماری میں اپنے سے زیادہ پریشان حالوں کو دیکھو پھر اپنی تکلیف کچھ نہ لگے گی۔ ویسے لاہور شہر پر تو سفر نامہ بھی ہوسکتا تھا۔ کیا خیال ہے؟)

✉ رومانہ انور، اسلام آباد سے۔ ''پاکیزہ کی جتنی تعریف کروں کم ہے اس میں کہانیاں تو ہوتی ہی بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں مگر بہنوں کی محفل میں قارئین بہنوں کی آپس میں دوستی مشورے اور دکھ درد بیان کرنا بہت اچھا لگتا ہے اس طرح ایک دوسرے کے مسائل سے آگاہی ہوتی ہے اور ان کی پریشانیاں دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ماہ جولائی میں ایک دکھی بہن کے خط کے جواب میں تمام ماؤں، بہنوں سے گزارش ہے کہ بیٹیوں کی شادی کے سلسلے میں جلدی کیا کریں یعنی زیادہ نقص نہ نکالیں، رشتے دیکھ بھال کر ضرور کریں مگر معمولی باتوں پر یا شکل صورت کی کمی پر رشتے ریجیکٹ نہ کریں۔ اللہ پاک نے مرد عورت کے جسم میں فطری نظام بنایا ہے جس میں دیر یا بے قاعدگی کی صورت میں پیچیدگیاں ہوجاتی ہیں میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی ہوں۔ دکھی بہن کا مسئلہ مجھے دل سے دکھی کر گیا۔ اب بھی وقت نہیں گیا اگر ان کی شادی ہوجائے تو...... آپ لوگ اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں میں شعور دے رہے ہیں ایک سے ایک کہانیوں میں خواتین کے مسئلے اور ان کے حل بھی بتائے جاتے ہیں۔ یہ سب ایک طرح سے تعلیم و تربیت ہی تو ہے اللہ پاک آپ سب کو جزائے خیر دے۔ ایک گزارش ہے کہ مصنفات بچیوں کو یہ بھی سکھائیں کہ عورت ایک کامیاب زندگی کیسے گزارے اس طرح مردوں کی بھی رہنمائی ہوگی۔ پاکیزہ ہر عمر، ہر صنف اور ہر طبقۂ فکر میں مقبول ہے۔'' (رومانہ آپ نے بہت خوب صورت باتیں کیں۔ بے شک تفریح کے ساتھ با مقصد تحریر ہی ہمارا معیار ہے۔ ہماری مصنفات ان باتوں کو ضرور خیال رکھتی ہیں...... آپ کے مشورے قابلِ قدر ہیں)

✉ ثمینہ زاہرہ، کامرہ سے۔ ''میں سولہ سال سے پاکیزہ کی قاری ہوں۔ اٹک شہر سے باقاعدگی سے پرچا منگواتی ہوں۔ اس میں تمام کہانیاں دلچسپ اور سبق لیے ہوتی ہیں۔ مصنفات کے انٹرویوز کی روایت بہت اچھی ہے۔ میں نے تو بہت کچھ سیکھا آپ کے رسالے سے۔ کہانیوں کے ساتھ، ساتھ شعری سلسلے، لطائف، دلچسپ کارنرز اور پکوان کے صفحات بھی شوق سے دیکھتی ہوں۔'' (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)

✉ شہناز ظہور، ملتان۔ آپ طبع آزمائی کریں لیکن ساتھ، ساتھ مطالعہ جاری رکھیں۔ پاکیزہ کو پسند کرنے کا شکریہ۔

✉ رفیعہ ابدالی، کراچی سے۔ ''میرا بزم پاکیزہ کا انعام بھیج دیجیے گا۔ میں نے مکمل ایڈریس بھیج دیا ہے۔ (جی بھیج دیا اب تک تو وصول کرلیا ہوگا آپ نے) پاکیزہ تو میں ہمیشہ سے ہی پڑھ رہی ہوں یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ باجی میری بھتیجی کی شادی ہے اور رمضان میں میری بڑی بھابی کا انتقال ہوگیا۔ تیاری تو ساری مکمل تھی۔ نکاح بھی ہوگیا تھا۔ لڑکا امریکا میں ہے اب انتہائی سادگی سے سب ہوگا۔ (اللہ آپ کی بھابی کی مغفرت کرے) میری بھابی بہت اچھی تھیں، ہم مل جل کر رہتے تھے کبھی لڑے جھگڑے نہیں کیونکہ لڑنا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ میری گزارش ہے کہ میرے بھائی کی اور میری شادی کے لیے بھی سب بہنیں ضرور دعا کریں۔ میں عمرے پر گئی تھی وہاں بھی بہت دعا کی تھی۔ اب حج پر جانے کی خواہش ہے۔ (اللہ پاک آپ کو حج کی سعادت نصیب کرے آپ پریشان نہ ہوں اس رب کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور مایوسی کفر ہے)

✉ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ۔ پاکیزہ آپ کا اپنا ماہنامہ ہے آپ اپنے مراسلے، شاعری ضرور بھیجیں۔ کہانی کے لیے معذرت ہے۔ پہلے خوب مطالعہ کریں پھر لکھیں۔ مشق سے ہی تحریر ابھرتی ہے۔ یعنی لکھائی کی نہیں بلکہ انداز تحریر اور مضمون کی بات کر رہی ہوں۔ پاکیزہ کو پسند کرنے کا شکریہ۔

صبا آصف، گلشن حدید کراچی سے۔ ''جولائی کا شمارہ عید کے افسانوں اور خوب صورت رنگوں سے سجا بہت اچھا لگا۔ ٹائٹل پر عید کی مناسبت سے ماڈل کے حنائی ہاتھ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ رسالہ کھولنے پر مجھے کچھ کہنا ہے نے متوجہ کیا توجہ سے سنا ہر لفظ دل میں اتر گیا۔ افسانوں میں اماں کی عید، رضوانہ پرنس نے دل خوش کر دیا۔ دعا ہے کہ ہر ماں کو ایسا پیار کرنے والا اور خیال کرنے والا بیٹا نصیب ہو اور ہر شوہر کو ایسی پیار کرنے والی اور شوہر کے دل کی بات سمجھنے والی بیوی نصیب ہو۔ عقیلہ حق کے افسانے مہر نے تو رُلا دیا واقعی ایک عورت کو (شریف عورت کو) عزت اور محبت ہی چاہیے ہوتی ہے اور جو نصیب سے ملتی ہے۔ فوزیہ احسان کی تخلیق حقیقت سے قریب تر، کرن خان اسمی کی سسرال میں عید لڑکیوں اور خاص طور سے نئی شادی شدہ لڑکیوں کے لیے ایک بہترین تحفہ...... گوشہ ظرافت ایک بہت عمدہ اضافہ، وہ آدی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں ... کیا شاندار نقشہ کھینچا گیا جواب نہیں زندگی میں اکثر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیا خواتین کیا مرد حضرات ایک سے بڑھ کر ایک کی مکمل تفسیر اور چار پائی بہت ہی دلچسپ...... رفعت سراج کا ناول بڑی خوبی اور خوب صورتی سے کامیابی کے سفر کی طرف گامزن، تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی ایسے ہی جیسے نزہت اصغر کی پاکیزہ کی نوک پلک سنوارنے میں سخت محنت کی داد نہ دینا سو نزہت زیادہ نہیں بس تھوڑی سی تعریف ضرور کروں گی کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تعریف آپ کو زیادہ پسند نہیں ہے۔ آپ بہت خوبی سے مدیرہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ انجم آپی کی کمی تو محسوس ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ محسوس ہوگی بہت با اخلاق خاتون، بہت محبت کرنے والی ان کی اپنی جگہ ہے وہ ہمارے دلوں میں ذہنوں میں ہمیشہ رہیں گی اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے اور صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے (آمین) میری طرف سے انہیں پوتے کی بہت مبارک باد...... لیکن یہ بات میں ضرور کہوں گی کہ بہنوں کی محفل اسی طرح سجی ہے مجھے کچھ کہنا ہے میں بہت خوب صورتی سے اور ہلکے پھلکے انداز میں کہہ جانا افسانوں اور ناولٹ کا انتخاب اور گوشہ ظرافت بھی یقیناً آپ ہی کا انتخاب ہوگا۔ تعریف تو بہت ساری کرنے کو دل چاہ رہا ہے لیکن آپ ناراض نہ ہو جائیں اس لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ اور ہاں...... فصیحہ آصف خان کی جینا اسی کا نام ہے بہت خوب صورت تحریر مدتوں یاد رہنے والی تحریر...... فوزیہ اشرف کا ناولٹ زندگی تو حسین ہے۔ زندگی گزارنے کے درس دیتی تحریر تھی۔ پورا رسالہ ہی خوب صورت افسانوں اور ناولٹ سے سجا کس، کس کی تعریف کروں۔ وہ آئے بزم میں، فریدہ اشفاق سے گفتگو واقعی عید کا خاص تحفہ لگی۔ ان کی تلخ و شیریں باتیں بہت سچی اور اچھی لگیں۔ آج کی بچیوں کے لیے بہت پیاری بات کہیں اشعار کی صورت میں بھی اور نثر میں بھی کاش کہ بات سمجھ میں آجائے۔ فریدہ اشفاق کے لیے بہت ساری دعائیں اللہ تعالیٰ انہیں صحت کے ساتھ زندگی دے اور بہت سی آسانیاں آمین...... ثم آمین۔ نزہت آپ کے سوالات بہت اچھے اور فریدہ اشفاق کے جوابات بہت سچے آخر میں آپ کی چھوٹی سی پیاری سی بات دل کو بہت اچھی لگی اور بہت خوب صورت اور با مقصد اشعار...... بس اتنا کہوں گی کہ آپ نے تو میلا لوٹ لیا۔ (ارے ڈیئر صرف میری نہیں بلکہ رسالے کی تعریف اور ہماری مصنفات کی محنت کی تعریف ضرور کیجیے) سنبل ملک اعوان شاہدرہ کو عمرے کی بہت، بہت مبارک باد اکثر آپ کے خط نظر سے گزرتے ہیں اور سروے وغیرہ بھی، آپ میں ایک معصوم اور پیارے سے دل کی لڑکی چھپی نظر آتی ہے۔ آپ نے لکھا ہے میں نے گھر کی بنیاد رکھ لی ہے میں سمجھی کہ ذاتی گھر کی بنیاد اگلی سطور پڑھیں تو ششدر رہ گئی کہ یہ گھر بیوہ لاوارث اور بے سہارا عورتوں کو سہارا دے گا۔ بہت بڑا کام ہے اللہ تعالیٰ آپ کے نیک ارادوں کو پورا کرے اور ہر معاملے میں آسانی دے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کی ہر خوشی سے نوازے۔ (سنبل ملک خوش ہو جاؤ کہ تمہارے چاہنے والے کتنے ہیں) محترمہ عذرا رسول صاحبہ کو میری طرف سے بہت سا سلام۔ میری طرف سے انہیں بہت شکریہ کہیے گا کہ انہوں نے انجم انصار کی طرح دوسری مدیرہ بھی بہت اچھی منتخب کیں۔'' (عذرا صاحبہ کی طرف سے وعلیکم السلام اور دعائیں)

سنبل ملک اعوان، شاہدرہ لاہور سے۔ ''آنٹی جی آپ کی طرف سے بھیجی گئی انعامی کتاب مجھے مل گئی ہے۔ آپ کا شکریہ...... (چلیں اچھا ہوا) آپ نے میرا سرگرمیوں میں ذکر کیا، میری خوش ذائقہ میں ترکیب لگائی اور میرا خط شائع

کیا۔اس پیار کے لیے اس محبت کے لیے میں آپ کی تہ دل سے مشکور ہوں۔عنبر وسیم جی کو میں بہت مس کرتی ہوں۔پاکیزہ میں امرت، مجھے بہت پسند ہے گل پھوپھو سے امرت کا ملنا اور کامل کی محبت، امرت کا محتاط رہنا اور تمنا کا میثاق کے ساتھ رات بھر جاگنا۔ہمیں تو کسی پھپو کا پیار نہیں ملا......اس لیے یہ ہمیں بہت ہی اچھا لگتا ہے۔غلام گردش، نیلم احمد بشیر تو نام ہی کافی ہے۔بہت دیر کی مہربان آتے آتے، ہاجرہ ریحان صاحبہ آپ تو چھا گئیں۔جاؤں میں کہاں، بشریٰ سیال آپ نے خواجہ سرا کے بارے میں بہت اچھا لکھا۔وُڈی عذرا آفتاب کا افسانہ تھا مگر حقیقت کو سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ ہمیں درخت لگانے چاہئیں۔درختوں کے بہت فائدے ہیں۔آنٹی نسرین جمیل سیال کا ناول یہ خالی دامن میرا مقدر۔میرا اسلیوٹ آنٹی نسرین کو......اللہ موسیٰ کو تندرستی عطا کرے، آمین۔اخلاص، مقبول الٰہی اختر شجاعت آنٹی آپ نے تو کمال کا لکھ دیا۔میں نے ایف اے میں اخلاص پر پڑھا تھا مگر جیسے آپ نے لکھا۔دماغ کی ساری کھڑکیاں کھل گئیں۔شائستہ زریں اجنبی اور نادرہ اطہر سے ملاقات کروانے کا شکریہ۔کڑوا گھونٹ سیما بنت عاصم آپ نے پانی کا بہت رولا ڈالا۔کیا کیا جائے لاہور میں بھی اب ایسے ہی حالات ہیں۔رسائی نارسائی، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ آپ تو معاشرے پر ہر لحہ نظر رکھے ہوئے ہیں ریڈیو اسٹیشن کی جاب اور ایک مخلص انسان کا ملنا......فرح طاہر قریشی خاص مہمان رمضان المبارک کے حوالے سے افسانہ زبردست تھا۔خوش قسمت عقیلہ حق جی آپ نے عورت کی زندگی کو کوزے میں بند کر دیا کہ ایک عورت کس قدر قربانیاں دیتی ہے پھر کہیں جا کر اسے مقام ملتا ہے۔اونچی اڑان، رفعت شبانہ......انسان کو بھی غرور نہیں کرنا چاہیے۔کیونکہ ہر چیز اللہ کی عطا کی ہوئی ہے اولاد، مال، حسب نسب، عزت و آبرو، سب کچھ اللہ ہی عطا کرتا ہے۔(بے شک) رفعت سراج آنٹی کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔اللہ اور اس کا نور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی آپ نے جس قدر خوب صورتی سے محبت سے اور پیار سے سورۂ کو بیان کیا، تجزیے کے ساتھ تفسیر بتائی۔کمال ہے جزاک اللہ......مجھے کچھ کہنا ہے نزہت اصغر......آپ نے رمضان کے حوالے سے بہت اچھا لکھا ہے۔اللہ آپ کو صحت دے۔"(سنبل ملک آپ بہت پُرخلوص ہیں، آپ اپنی کوششوں کا اجر صرف اللہ تعالیٰ سے مانگیں، دنیا تو کسی کی نہیں اللہ آپ کے مسائل حل کرے۔بھرپور تبصرے کا شکریہ......)

✿ ملالہ اسلم، خانیوال سے۔"سب سے پہلے فریدہ فری کے لیے دعا گو ہوں خدا انہیں تندرستی دے، آمین۔ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کو دل سے مبارک باد دوں گی۔خدا آپ کو لمبی عمر کے ساتھ، ساتھ اس نیک کام کا اجر بھی دے، آمین۔مستقل سلسلوں میں بزم پاکیزہ کی جگہ کوئی اور سلسلہ شروع کر دیں۔تعارفی یا پھر کوئی افسانوی مقابلہ، اسٹارز کا بھی سلسلہ اچھا رہے گا۔خصوصی مضامین میں اللہ اور اس کا نور، شمع ہدایت اور بیادِ بانو قدسیہ پسند آیا۔مستقل سلسلوں میں دین کی باتیں، بہنوں کی محفل، پاکیزہ ڈائری، جلترنگ، میں اکثر گنگناتی ہوں، ٹوٹکے اور مشورے وغیرہ تو ویسے بھی سب کو پسند ہوتے ہیں۔خوش ذائقہ میں نئے طریقے سے گاجر کا حلوا ٹرائی کیا ہے ہاہاہا......ویسے ریسیپیز زیادہ دیا کریں۔عذرا آپی خدا آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے اور ڈاکٹر فاطمہ کو بھی خدا بہت سی خوشیاں دیں، آمین۔اب تو آپ بھی کہیں گی کہ مجھے دعاؤں کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں کرنا آتی ہاہاہا......"(دعائیں دینا بھی کسی کسی کو آتا ہے یہ بھی حقوق العباد میں شامل ہے۔آپ تحریروں پر بھی تبصرہ ضرور بھیجے گا)

✿ فرح بھٹو، سندھ سے۔"میں پاکیزہ ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں، مجھے پاکیزہ کا مطالعہ کرتے کافی عرصہ ہوا ہے لیکن کبھی تبصرہ نہیں کیا۔اس بار ہمت کر کے قلم اٹھایا ہے۔امید کرتی ہوں اس محفل میں خیر مقدم ہوگا۔(جی، بالکل) جولائی 2017ء کا پاکیزہ ڈائجسٹ میرے ہاتھوں میں ہے۔پیلے گوٹا کناری والے لباس میں ملبوس ماڈل جس کے ہاتھوں کی کہنیوں تک لگی مہندی مجھے بے حد پسند آئی۔سرورق آنکھوں کو بہت بھلا پھر حسب عادت لسٹ پر نظر دوڑائی میری فیورٹ کئی رائٹرز کے نام جگمگا رہے تھے۔پھر مدیرہ نزہت اصغر جی کا اداریہ پڑھا جو عید الفطر کے حوالے سے تھا بہت اچھا لگا۔اس کے بعد دین کی باتیں پڑھ کر علم میں اضافہ کیا۔پھر کہانیوں کی طرف جست لگائی قسط وار ناول سب اچھے جا رہے ہیں۔افسانوں میں رضوانہ پرنس کا اماں کی عید، ریما نور رضوان کا سجنا سنگ میری عید اور صاعقہ علی کا گھر سے چوراہے تک اچھے لگے۔ناولٹ میں منشا محسن علی کا چاند کی کھڑکی پڑھا۔زلیخا اور یوسف کی داستان نے لطف دیا۔یوسف اپنے حسن پر نازاں اور زلیخا روایتی مشرقی بیوی۔فوزیہ اشرف کا زندگی تو حسین ہے، میں شمو کے کردار نے بہت غصہ دلایا۔ایسی فطرت کی لڑکیاں اپنے آس

پاس رہتے لوگوں کو بھی خوش نہیں دیکھ سکتیں۔ نادیہ احمد کا مکمل ناول خلش بھی بہت پسند آیا۔ بعض اوقات ہم ہیرا چھوڑ کر پتھر چن لیتے ہیں پھر پچھتاتے ہیں۔ مستقل سلسلے سب ہی زبردست جارہے ہیں فریدہ اشفاق سے ملاقات خوب رہی۔ ان کے متعلق بہت کچھ جاننے کو ملا۔ میں اپنے متعلق مزید بتاتی چلوں کہ میں قاری کے ساتھ ساتھ لکھاری بھی ہوں، میں شاعری کرتی اور افسانے وغیرہ لکھتی ہوں جو کئی میگزینز اور ڈائجسٹوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اب اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ (پاکیزہ) میں بھی شامل ہونے کا پکا ارادہ ہے انشاء اللہ۔ پاکیزہ کی پوری ٹیم کے لیے نیک خواہشات اور دعائیں۔'' (فرح بھٹو، مختصر تبصرے کا شکریہ اب باقاعدگی سے آیئے گا آپ کی کہانی اس ماہ شامل ہے)

✉ شائستہ زریں، کراچی سے۔ ''عید نمبر کی مناسبت سے عید کا پیغام دیتا اداریہ بھلا لگا۔ ذکیہ آپا کی تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ سحر ساجد کے ناول میں کہیں، کہیں غیر ضروری طوالت کا احساس ہوتا ہے لیکن اس سے قطع نظر موضوع بہت عمدہ ہے۔ شیریں حیدر بڑے سلیقے سے کہانی آگے بڑھا رہی ہیں۔ ہم کو عبث بدنام کیا میں سیمارضا ہر نئی قسط میں چونکا دینے والی تبدیلیوں کے سبب قارئین کی توجہ ناول کی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہیں۔ جینی کا اسلام لانے کا واقعہ ہو یا ایمان کے تقاضے بیان کرتے ہوئے قرآنی آیات کے حوالے، کہیں بھی تبلیغ کا رنگ غالب نہیں اور یہ سیمارضا کا کمال ہے کہ سادہ اور عام فہم انداز میں دریا کو کوزے میں بند کرنے میں کامیاب ہیں۔ (سیمارضا شکریہ کہتی ہیں) اختر شجاعت کی شمع ہدایت قلب و روح کو منور ہی نہیں معطر بھی کر دیتی ہے۔ عید کے تحفۂ خاص نے عید کی خوشی دوبالا کر دی۔ واقعی وہ آئیں بزم میں اور چھا گئیں کہ یہ فریدہ اشفاق کا امتیاز ہے۔ ہماری فریدہ بھی کمال شے ہیں اگر صاف گوئی میں غضب ڈھاتی ہیں تو طرح دینے میں بھی بے مثل ہیں لیکن فریدہ اشفاق شعروں کی مار، مار کر آپ پسپا نہیں کر سکتیں۔ پاکیزہ میں تو آپ کو لکھنا ہی ہے۔ دلی دعا ہے کہ خوش رنگ ساعتوں میں آپ کی تخلیقی کاوش پاکیزہ کی رونق بڑھائے، عید کی اس غیر متوقع سوغات کے لیے نزہت اصغر تشکر اور ستائش کی حقدار ہیں۔ شکریہ نزہت' اپنی تیار کردہ سروے رپورٹ کے موضوعات کے ضمن میں اتنا کہوں گی کہ

اب جس کے جی میں آئے وہ پائے روشنی
ہم نے دیا جلا کے سرِ عام رکھ دیا

قارئین کی غیر جانبدارانہ اور صحت مند تنقید صرف رہنمائی ہی نہیں کرتی بلکہ ملٹی وٹامن کا کام بھی کرتی ہے۔'' (جی بالکل شائستہ آپ کی ستائش مصنفات تک پہنچ گئی ہے تبصرے کا شکریہ...... آپ کی اصلاح اور تنقید ہی بہتری لاتی ہے۔ شکریہ!)

☒ آسیہ مظہر چوہدری آزاد کشمیر۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ آپ باقاعدگی سے تبصرہ بھیجیں۔ گزشتہ کہانیوں کے لیے معذرت اب نئی کہانیاں بھیج دیں مگر پاکیزہ کا مطالعہ باقاعدگی سے کریں۔

☒ زندگی تنویر خلیل، گاؤں متھرا خیبر پختونخواہ۔ مصنفین کی تحریروں کا مطالعہ جاری رکھیں۔ آپ کا افسانہ اس بار شامل اشاعت ہے آپ خود دیکھیے گا کہ کیا محنت کی جاتی ہے۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ دُرِّ ثمن بلال، سرگودھا سے۔ ''پاکیزہ کا سفر کامیابی سے جاری ہے۔ پاکیزہ میں میرے ناول کو بہت پزیرائی ملی آپ لوگ مصنفات کو عزت دینا جانتے ہیں۔ میں اب جلد ہی نئی کہانی لے کر آؤں گی۔ آج کل جو ناول چل رہے ہیں بہت ہی عمدہ ہیں اور دیگر تحریروں میں بھی ورائٹی ہے۔'' (جی دُرِّ ثمن بلال، آپ کی تحریر کا انتظار ہے، رائٹر کو عزت دینا اور اس کی قدر کرنا اس کا حق ہوتا ہے)

✉ عذرا آفتاب خان، کراچی سے۔ ''ڈیئر نزہت آپ کے سوال نامے نے میرے قلم کی طاقت بڑھا دی ہے، تحریر کی سب سے بڑی خوبی میرے خیال میں یہ ہے کہ کوئی پڑھے نہ پڑھے سنے نہ سنے، دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں سو میں بھی جاگ گئی ہوں۔ آپ کے سوالنامے نے بہت خوب صورتی سے مجھے جگایا ہے۔ پاکیزہ سے میرا ناتا بہت پرانا ہے بس کچھ گیپ آ گیا تھا۔ جن بہنوں نے میرے افسانے وڈی کو پسند کیا ان کا شکریہ میں فطرت سے متاثر ہوں اور فطرت سے جڑی تحریریں ہی لکھتی ہوں۔ عذرا صاحبہ اور معراج صاحب کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی دعائیں۔'' (عذرا آپی بہت پیارے خیالات کا شکریہ اس دفعہ ہمارے قارئین بھی آپ کے خوب صورت خیالات سے انٹرویو کی شکل میں آگاہ ہو گئے)

ﷺ مسز یاسین مقام نامعلوم سے۔ ’’آنٹی میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں، میرے لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ پاک مجھے اولاد کی نعمت سے نوازے (الٰہی آمین) میری کزن بھی بہت بیمار ہے۔ آپ کے ہاں دعاؤں کا اچھا سلسلہ ہے سب بہنیں اس میں شامل ہوجاتی ہیں۔ آنٹی میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھ سے بات کی اور میرے میسج کا جواب بھی دیا۔‘‘ (آپ لوگ بہت اچھے ہیں)

ﷺ حدیث اختر، حاصل پور سے۔ ’’باجی آپ کو مدیرہ بننا مبارک ہو۔ انجم باجی کے ساتھ بھی میرا بہت پیارا رشتہ ہے۔ اللہ انہیں صحت دے۔ آپ نے بڑے اچھے طریقے سے سنبھالا ہے۔ میں یہاں اسلامی مضمون کی تعریف کروں گی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ اور کہانی میں اگر سورہ یا آیت کا حوالہ دیں تو خوب تصدیق کر کے رائٹر لکھا کریں۔ میں خود بھی معلّمہ ہوں اور پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں۔‘‘ (حدیث اختر آپ کا بہت شکریہ آئندہ تفصیلی تبصرہ بھی کیجیے گا)

ﷺ شگفتہ ناصر و مسٹر ناصر المعروف، کپل آف فیصل آباد ٹیلی فونک تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ ’’پاکیزہ نے ہمیں ہمیشہ بہت عزت اور مان دیا ہے۔ انجم باجی کے ساتھ تو خوب گپ شپ رہتی تھی۔ ہم یہاں ایک جیسے کپڑے پہننے والے کپل سے مشہور ہیں۔ سب پاکیزہ بہنیں آگاہ ہیں اور اب تو مختلف چینلو پر بھی آئے دن بلائے جاتے ہیں مختلف رپورٹرز وغیرہ اسٹوری اور انٹرویو کے لیے آتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اس نے بہت عزت دی ہے۔ میں پاکیزہ تو ہمیشہ سے پڑھتی آرہی ہوں بہت اچھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اب بچے بڑے ہوگئے ہیں، کافی ٹائم مطالعے کے لیے مل جاتا ہے۔ اللہ پاکیزہ کو بہت ترقی دے۔ آمین۔‘‘ (جی شگفتہ ناصر آپ تو کسی تعارف کی محتاج نہیں اکثر پاکیزہ میں آپ کی تصویریں بھی آتی ہیں۔ آپ سے گفتگو ہوتی رہے گی۔ انشاء اللہ......)

☆☆☆

برسات کے مزے لیتی پیاری بہنو! محفل کا وقت تمام ہوا مطلب کہ صفحات پورے ہوئے مگر اب بھی کئی خطوط منتظر ہیں تو انہیں آئندہ شمارے میں ضرور جگہ ملے گی۔ ماہ ستمبر کے دلہن نمبر کے لیے کہانیاں تو موصول ہوگئی ہیں۔ آپ لوگ اپنے کسی پیارے کی شادی کا احوال مع تصاویر بھیجنا چاہیں تو جلد از جلد بھیج دیں۔ آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں۔ سانس کی ڈور یونہی بندھی رہی تو اگلے ماہ مزید جوش و خروش سے محفل سجائیں گے۔ آپ کے تبصرے ہر ماہ کی پندرہ تا اٹھارہ تاریخ تک لازمی ہم تک پہنچ جانے چاہئیں۔ دفتر کا مکمل پتا اور رابطہ نمبرز اسی صفحے پر بھی ہیں اور محفل کے آغاز میں بھی...... پوسٹ بکس نمبر وای میل ایڈریس درج ہے۔

رجسٹرڈ اور کوریئر سروس سے آنے والی ڈاک دفتر کے پتے پر اور عام ڈاک پوسٹ باکس پر بہ آسانی مل جاتی ہے۔ بہنو! ماہنامہ پاکیزہ ہر ماہ کی 28 تاریخ کو کراچی سے شائع ہوجاتا ہے اور دیگر شہروں تک پہنچنے میں تین سے چار دن لگ جاتے ہیں۔

آخر میں رب کائنات اللہ جل شانہ کے حضور سب مل کر دعا کریں کہ اے میرے رب! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر، میرے عمل کو پاکیزہ بنادے، میرے دل کو ہدایت دے، میرے ایمان کی حفاظت کر۔

اے میرے معبود! مجھے اپنی اس نظرِ کرم سے بہرہ مند فرما جس سے میری سبھی سختیاں، آلام ٹل جائیں۔ یا ارحم الراحمین ہم پر موت کے وقت رحم فرما اور موت کے بعد عذابِ قبر، فشارِ قبر سے محفوظ رکھنا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

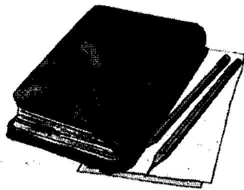
آپ کی خیریت کی طالب

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد

متاعِ غم کو وہی آنسوؤں میں ڈھالتا ہے
جو موتیوں سے بھری سیپیاں اچھالتا ہے
مرے وقارِ طلب کی ہوا نہیں بگڑی
مرا کریم مری لغزشوں کو ٹالتا ہے
اگرچہ لاکھ ہیں بے سمت وسوسے لیکن
مجھے وہ گردشِ حالات میں سنبھالتا ہے
اسی کے نام پر لہروں کے حرف نامے ہیں
جو سطحِ آب کی تحریر کو اجالتا ہے
اسی کی ذات نے تسکین معتبر بخشی
جو اپنی ذات میں اوروں کے درد پالتا ہے
نہیں ہے اس کی عطاؤں کی انتہا نادر
نئے ہدف کفِ ادراک میں جو ڈالتا ہے

کلام: نادر جاجوی

انتخاب: نگہت آصف، اسلام آباد

نعت

محمدؐ محمدؐ پکارے چلا جا
یونہی زندگی کو سنوارے چلا جا
نبیؐ کا مقدس ہے نامِ گرامی
اسے دل میں اپنے اتارے چلا جا
زمانے کے سارے غموں کو بھلانے
مدینے کو اے غم کے مارے چلا جا
مدینے کے منظر ہیں کتنے سہانے
کبھی دیکھنے وہ نظارے چلا جا
اثر ایسا دیکھا ہے ذکرِ نبیؐ میں
کہ ہر چیز ان پر تو وارے چلا جا
تجھے جسم و جاں کی رہے نہ کچھ پروا
دل و جان اپنے تو ہارے چلا جا
ملے گی ہر اک گام ساگر کو منزل
خدا اور نبیؐ کے سہارے چلا جا

کلام: ایوب ساگر

پسند: ہمشیرہ نبیل احمد، رینالہ خورد

ایمان و عمل صالح کے دو نتیجے

☆ آدمی کی برائیاں اس سے دور کردی جائیں گی۔
☆ اس کے بہترین اعمال کی اس کے اعمال سے بہتر جزا دی جائے گی۔

انتخاب، خالدہ، پتوکی

شاداب نسبتیں

میں جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں۔
میرا چہرہ ندامت کے اشکوں سے تر ہو جاتا ہے۔
میری کوتاہیوں کے بدلے میں تیری رحمت کا نزول ہوا ہے۔
میری خواہشِ اظہار سے پہلے بھی تیرے کرم کی بارشوں سے سیراب ہوتی ہے۔
میرے قلم کو جذبوں کی سچائیاں تیری ہی عطا ہیں
اے میرے پروردگار!
میں گناہوں سے آلودہ وجود لیے تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔
میں اور مجھ سے وابستہ تمام حوالے تیری رحمتوں کے طلب گار ہیں۔
ہمیں فکر و عمل کی اس اقلیم میں قدم رکھنے کی توفیق عطا کر جو باطن کی حقیقتوں کی مظہر ہے۔
اے مالک......
خیر کی روایت سے جڑی ہماری نسبتوں کو ہمیشہ

شاداب رکھ۔

از: رابعہ سرفراز، راول پنڈی

دعا

تم اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں دعا کیا کرو کہ تم قبولیت کا یقین رکھا کرو کہ اللہ تعالیٰ غفلت سے بھرے دل سے مانگی دعا قبول نہیں کرتا۔

ترمذی شریف

جسمانی کمزوری اور شہد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر صبح شہد کے شربت کا پیالہ نوش فرماتے تھے اور کبھی یہ مشروب نمازِ عصر کے بعد پسند فرمایا جاتا تھا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ اپنی پوری زندگی میں نہ کبھی بیمار پڑے اور نہ ہی کبھی تھکن کا اظہار فرمایا۔ آپ کی زندگی سے یہ سبق ہمارے اکثر مسائل کا حل ہے۔ یہ کسی بھی حالت، بیماری اور کمزوری میں بے کھٹکے پیا جاسکتا ہے۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

یا اللہ مجھے بچا

☆ ایسی نیند سے جس سے فجر کی نماز قضا ہو۔
☆ ایسی مصروفیت سے جس سے ظہر کی نماز قضا ہو۔
☆ ایسی مستی سے جس سے عصر کی نماز قضا ہو۔
☆ ایسی محفل سے جس سے مغرب کی نماز قضا ہو۔
☆ ایسی تھکاوٹ سے جس سے عشاء کی نماز قضا ہو۔

اچھا لگتا ہے

☆ ماں کا دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا۔
☆ بزرگوں کا مسکراتے ہوئے دیکھنا۔
☆ مل بیٹھ کر کھانا، کھانا۔
☆ رم جھم بوندیں برسنا۔
☆ پرندوں کا میٹھی آواز میں چہچہانا۔
☆ لوگوں کا حسنِ اخلاق سے پیش آنا۔
☆ رزقِ حلال کے لیے سرگرم رہنا۔
☆ چہار سو محبت کے پھول کھلانا۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

اپنے پیارے وطن کے لیے دعا

زندگی کے اس سفر میں
پُر پیچ راہ گزر میں
چاہتا ہے دل یہ اکثر
کوئی ایسا دن بھی آئے
ہر پھول کھلکھلائے
ہر پنچھی نغمہ گائے
اور میرے اس وطن پر
اس پیارے ارضِ چمن پر
مشکلات کی کوئی گھٹا نہ چھائے
ہر فصل لہلائے اور جھرنا گنگنائے
اب جو جشنِ آزادی آئے تو صرف خوشیاں لائے

شاعرہ: صائمہ سید، کراچی

حیرت انگیز معلومات

اردو میں
اللہ کے حروف چار ہیں۔
محمدؐ کے حروف چار ہیں۔
رسول کے حروف چار ہیں۔
قرآن کے حروف چار ہیں۔
کلمہ کے حروف چار ہیں۔
مسجد کے حروف چار ہیں۔
نماز کے حروف چار ہیں۔
زکوٰۃ کے حروف چار ہیں۔
جہاد کے حروف چار ہیں۔
سورج کے حروف چار ہیں۔
چاند کے حروف چار ہیں۔
زمین کے حروف چار ہیں۔
سمتیں چار ہیں۔
(مشرق، مغرب، شمال، جنوب) سب کے

حروف چار ہیں۔
کعبہ کے حروف چار ہیں۔
زم زم کے حروف چار ہیں۔
نکاح اور طلاق کے حروف چار ہیں۔
دنیا اور آخرت کے حروف چار ہیں۔
بہشت، جہنم کے حروف چار ہیں۔
خلفائے راشدین چار ہیں۔
مرسلہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

غزل

یہ کس نے کہا کہ گنہگار ہم ہیں
تیرے پیار کے سزا وار ہم ہیں
میرے دل میں اتری ہے شام غریباں
کبھی آ کے دیکھ عزادار ہم ہیں
اُدھر دشمنوں کی قطاریں ہیں ہر سو
تیرے پھر بھی دیکھو طرف دار ہم ہیں
تیرا ساتھ ہر دم نبھائے گی فری
تیری زندگی کے اداکار ہم ہیں
کلام: فریدہ فری، لاہور

نقطہ

مشکلات میں ڈالنے والوں سے، مشکلات سے نکالنے والا اللہ سب سے بڑا ہے اگر یہ نقطہ سمجھ میں آجائے تو کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔

تعلق

زمین والے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔
اگر تمہارا تعلق آسمان والے سے پختہ ہو جائے اور جب سجدے طویل ہو جائیں تو مشکلیں قلیل ہو جاتی ہیں۔

از: فرح طاہر قریشی، ملتان

پیاری پاکیزہ بہنوں کے لیے

سارے جہاں کی خوشیاں اس کے نصیب کر دے
ہنستا رہے سدا وہ اسے خوش نصیب کر دے
کبھی دل نہ اس کا ٹوٹے کبھی چوٹ وہ نہ کھائے
اس کو وفا کے یارب اتنا قریب کر دے
اس کے لبوں پہ یارب سدا مسکراہٹیں ہوں
قسمت میں اس کی ہنسنا میرے حبیب کر دے
چل کر جہاں بھی جائے پھولوں کے راستے ہوں
منزل ہر اِک خوشی کی اس کے قریب کر دے
دعا گو: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

انگریزی

شوہر، بیوی کو انگریزی سکھا رہا تھا۔
بیوی دوپہر میں: ''ڈنر لے لو جی۔''
شوہر: ''جاہل، یہ ڈنر نہیں لنچ ہے۔''
بیوی: ''جاہل ہو گے تم، یہ رات کا بچا ہوا کھانا ہے۔''

پروگرام

باس کی ڈانٹ کھا کر مایوس نوجوان....
''دل تو کہتا ہے کہ چھوڑ جاؤں یہ دنیا، پھر خیال آتا ہے کہ امی کی خدمت کے لیے بہو کون لائے گا۔
چلو پروگرام کینسل......ہاہاہا......''
مرسلہ: توقیر ہاشمی، منڈی بہاؤالدین

ایک کے بعد ایک

لوڈ شیڈنگ کے لیے کر کے دعائیں تھک گئے
اب دعا اپنا اثر کچھ اور دکھلانے لگی
اس قدر آیا اثر اپنی دعاؤں میں نہ پوچھ
ساتھ بجلی کے میاں اب گیس بھی جانے لگی
انتخاب: ثمینہ کوکب، ضلع جہلم

موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھنا

بس میں بے بس مسافروں کو دیکھ کر یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح انہیں یہاں سے زندہ سلامت رہا کروا دیا جائے۔ کیونکہ بسوں میں صرف ٹکٹ ہی ناقابلِ انتقال ہوتے ہیں جب کہ ویگنیں

تو بنی ہی عذابِ قبر کی ریہرسل کے لیے ہیں اور ٹرین وہ تو دیکھنے میں ہی یوں لگتی ہے جیسے قبروں کی ایک لمبی قطار مارچ پاسٹ کرتی گزر رہی ہو۔ ایسے میں جب کسی کو موٹر سائیکل کی لگا میں تھامے، اسے سرپٹ دوڑاتا دیکھتا ہوں تو میرا سارا خون اس منظر کو دیکھنے کے لیے چہرے کے چبوترے پر اکٹھا ہو جاتا ہے۔

موٹر سائیکل بھی جوانی کی طرح ہے، یعنی اس کے آنے کا پتا چلتا ہے نہ جانے کا۔ کہتے ہیں جو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر بھی شرارت نہ کرے یقین کرلیں وہ بیمار ہے یا شادی شدہ......

موٹر سائیکل کا چال چلن سیاستدانہ ہے، یعنی آپ آنکھیں بند کر کے اس پر بے اعتباری کر سکتے ہیں مگر موٹر سائیکل میں ایک ایسی خوبی ہے جس کی خاطر اس کی ہر خامی خام خیالی خیال کی جا سکتی ہے۔

وہ ہے اس پر پیچھے بیٹھنے کے لیے ایک سیٹ! بلکہ موٹر سائیکل بنایا ہی پچھلی سیٹ کے لیے گیا ہے اور اس پر بیٹھنے والا شخص اتنا اہم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور کا بیٹھنا خلافِ قانون ہے۔ اسی لیے تو حکومت نے ہر چوک میں باوردی سپاہی کھڑا کر دیا ہے جو ایسی گستاخی کرنے پر فی الفور چالان کر سکے۔

اقتباس از مزاحیات
تحریر: ڈاکٹر محمد یونس بٹ
انتخاب: عرشیہ جنید، کراچی

ہم چاہتے ہیں

کلیوں کو ہم گل بنانا چاہتے ہیں
فصلِ بہار ہر سو ہم لانا چاہتے ہیں
سبزہ زاروں کی تعمیرِ نو کی خاطر
ہم تو مٹی میں مل جانا چاہتے ہیں
روشنی علم و عمل کی مانگ کر ہم
شمع کے مانند جل جانا چاہتے ہیں
بھوکی، ننگی مرتی ہوئی انسانیت کو
اِک لقمۂ حلال کھلانا چاہتے ہیں
در بدر بچوں کو محنت کش بنا کر
اک چھوٹا سا گھر دلانا چاہتے ہیں
شب اندھیری میں دیا امید کا ہے
سویرا ہر سو ہم پھیلانا چاہتے ہیں
نہیں مایوس ہونا کوثر راہ کی مشکلوں سے
دیواریں بدی کی ہم گرانا چاہتے ہیں

کلام: کوثر خالد، جڑانوالہ

سنہری باتیں

☆ خوش اخلاقی ایک ایسا عطر ہے جسے آپ جتنا زیادہ دوسروں پر چھڑکیں گے اتنی ہی زیادہ خوشبو آپ کو اپنے اندر سے آئے گی۔

☆ موت سے بڑھ کر کوئی چیز سچی نہیں اور امید سے بڑھ کر کوئی چیز جھوٹی نہیں۔

از: زریں زبیر، کوٹھاری، کراچی

ماں کی دعا

نورِ نظر لکھوں یا جانِ جگر لکھوں
حیران ہوں کہ میں تجھے کیا لکھوں
تیرے ہی دم سے ہیں منور میرے صبح و شام
تیری ہی ذات سے ہے وابستہ میرا کام
جیتی ہوں تیرے لیے مرنے سے لگتا ہے ڈر
ہر قدم پر کہکشاں بنے تیری رہ گزر
ہر دم لبوں سے کرتی ہوں تیرے لیے دعائے خیر
جانِ حیات تم نہ رکھنا کبھی کسی سے...... بیر
چار دن کی زندگی ہے تم ہو جاؤ امر
میرے بچے میرے لعل لگ جائے تجھ کو میری عمر

شاعرہ: نگہت عبدالغفار، کراچی

زندگی

زندگی تجھ کو اگر وجد میں لاؤں واپس
چاک پہ کوزہ رکھوں خاک بناؤں واپس
تھا تیرا حکم سو جنت سے زمیں پر آیا
ہو گیا ختم تماشا تو میں جاؤں واپس

از: زرمینہ خان، بہارہ کہو

☆☆☆



☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ
عیدوں پہ خوش رہنے والو سدا ہنسو اور مسکراؤ
جانِ تمنا، جانِ دلبر ایسی ہزاروں عیدیں پاؤ
☆شمع خالد......فیصل آباد
اے دوست تجھے عید کی خوشیاں ہوں مبارک
اور خوشی نہ بھی ہو، زندگی کی یہ خوشی کافی ہے
☆یاسمین کنول......پسرور
وقت کیسا یہ مجھ پہ آیا ہے
ہنس رہی ہوں مگر خوشی ہی نہیں
☆زرینہ خان......بہارہ کہو
بھول جاتی ہیں اپنی ہستی کو
ساری مائیں عجیب ہوتی ہیں
☆تسنیم منیر......دبئی
اپنا آنچل سنبھال کر رکھنا
چھیڑ خانی ہوا کی عادت ہے
☆ایمان چوہدری......فیصل آباد
آخر تو میں وہی ہوں مجھے کیوں بھلادیا
وہ کیا ہوا تپاک، وہ الفت کدھر گئی
☆کوثر خورشید......یوکے
دل میں اِک ہوک اٹھی، آنکھوں میں آنسو آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا
☆شمع حفیظ......گوجرانوالہ
محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا
☆تسنیم کوثر......کراچی
میرے دل کا ساتھ دیتی میری زندگی کہاں تک
مجھے ہوش آرہا تھا کہ گزر گئی جوانی

☆عابش جنجوعہ......تونسہ شریف
مزہ برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آبیٹھو
وہ برسوں میں کہیں برسے یہ برسوں سے برستی ہیں
☆سعدیہ خان......ملتان
غیروں سے پوچھتی ہے طریقہ نجات کا
اپنوں کی سازشوں سے پریشان زندگی
☆ارم کمال......فیصل آباد
کتنا دشوار ہوتا ہے کسی کو یوں بھلادینا
کہ جب وہ شخص شامل ہو رگوں میں خون کے مانند
☆علشبہ رانی......کمالیہ
ایک دھڑکن کے فاصلے پر وہ
ایک مدت رکا رہا مجھ میں
☆رعنا مشتاق......سرگودھا
عجب شے ہے یہ انساں بھی
تقسیم ہو کر مکمل ہوتا ہے
☆زرینہ عمران......منڈی بہاؤالدین
قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں، میں دکھا آیا
☆حمیرا وحید......واہ کینٹ
ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سو ترا غم
☆جبیں نیاز......ملتان
اس کو لوٹائیں گے ہم سود کے ساتھ
قرض ہے ہم پہ بے حسی اس کی
☆صبا سجاد......دبئی
اپنی تو یہ عادت ہے بری ہے کہ بھلی ہے
ہنستے ہوئے ہر بات زمانے کی سہی ہے

☆کرن......کراچی
جو ہوسکے تو بھلا دینا رنجشیں دل کی
کہ محبت کا تقاضا ہے درگزر کرنا
تیرے طرزِ تغافل سے کیا گلہ ہمیں
شاید ہمیں ہی آتا نہیں دلوں میں گھر کرنا

☆شازیہ ہاشم میواتی......ضلع قصور
سنو الفاظ ہیں کم اور تمنائیں ہزاروں ہیں
مبارک ہوں مری جانب سے تم کو عید کی خوشیاں

☆سیدہ غزالہ عالم......کراچی
الٰہی آبرو رکھنا بڑا نازک زمانہ ہے
دلوں میں بغض رکھتے ہیں بظاہر دوستانہ ہے

☆فریدہ جاوید فری......لاہور
نہ کبھی ہماری محبت کی آزمائش کرسکو گے
جاں سے زیادہ کیا فرمائش کرسکو گے
چاہتے ہیں تم کو اتنا جتنا سمند میں ہے پانی
کیا سمندر کے پانی کی پیمائش کرسکو گے

☆ثمینہ کوکب......جہلم
غیروں کی دشمنی نے نہ مارا مگر ہمیں
اپنوں کے التفات کا زہراب لے گیا
اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا

☆حمنیٰ قندیل......ٹوبہ ٹیک سنگھ
زندگی کو زندگی تو ہم نے سمجھا ہی نہ تھا
ہم تو سمجھے تھے ہنسی کا کھیل ہے یہ زندگی
ٹھوکریں دنیا کی کھائیں تو ہمیں آئی سمجھ
زندگی کہتے ہیں کس کو اور کیا ہے زندگی

ساجدہ ظفر......کمالیہ
میں نہیں مانتا کاغذ پر لکھا شجرۂ نسب
بات کرنے سے قبیلے کا پتا چلتا ہے

☆شبینہ گل......راولپنڈی
گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو
اس میں رونے کی کچھ جگہ رکھنا

☆فرح طاہر قریشی......ملتان
کس سہولت سے اسے دل سے نکالا میں نے
اب یہی بات مرے دل سے نکلتی ہی نہیں

☆ماہ نور ارسلان......لاہور
وقت ازالہ نہ کرسکا جن کا
لوگ ایسے بھی ہم نے کھوئے ہیں

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص
ہماری آنکھ میں کب دیر تلک ٹھہرا ہے کوئی
یہ تو تم تھے کہ پہلی نگاہ میں اپنے سے لگے

☆رفیعہ عدنان......چیچاوطنی
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا تار بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

☆صدف علی......لاہور کینٹ
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

☆بتول رضا......جرمنی
صورتِ نقشِ قدم، دشت میں رہنا محسن
اپنے ہونے سے نہ ہونے کا پتا بھی دینا

☆نگینہ ضیا بنگش......کراچی
کچھ لوگ تحفے بھی کمال دیتے ہیں
وحشتیں، تنہائیاں، الجھنیں، رسوائیاں

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
تم سے اب اتنا تعلق تو نہیں ہے پھر بھی
جب وہ دن آئے تو گھر اپنا سجایا کرنا
میں نے مانا ہے کہ تو اور کہاں بارِ ستم
ہاں مرے واسطے یہ بوجھ اٹھایا کرنا

☆مہرین ضیا......کیماڑی
ہمارے نصیب میں لکھا تھا اس طرح شاید
نگر، نگر ہی کسی کو پکارنا ہوگا
وہ مل تو جائے گا ارشد مگر ذرا ایسے
طلب میں اس کی زمانے کو ہارنا ہوگا

☆☆☆

منتخب غزلیں



باذوق قارئین کی خدمت میں اس ماہ دو بے حد نامور اور مقبول شعرا احمد فرازؔ اور امجد اسلام امجدؔ کا خوب صورت کلام حاضر ہے۔



تپتے صحراؤں پہ گرجا، سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو، مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اِک بوند
دل میں اِک لہر اٹھی، آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب، کوئی ماہیِ بے آب ہوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیسا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اٹھانے والے
چند بوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسا

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اٹھا، یا برسا

ابر و باراں کے خدا، جھومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنا برسا

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فرازؔ
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسا

کلام: احمد فرازؔ

شام ڈھلے جب بستی والے لوٹ کے گھر کو آتے ہیں
آہٹ، آہٹ دستک، دستک کیا، کیا ہم گھبراتے ہیں

اہلِ جنوں تو دل کی صدا پر جان سے اپنی جا بھی چکے
اہلِ خرد اب جانے ہم کو کیا سمجھانے آتے ہیں

جیسے ریل کی ہر کھڑکی کی اپنی، اپنی دنیا ہے
کچھ منظر تو بن نہیں پاتے کچھ پیچھے رہ جاتے ہیں

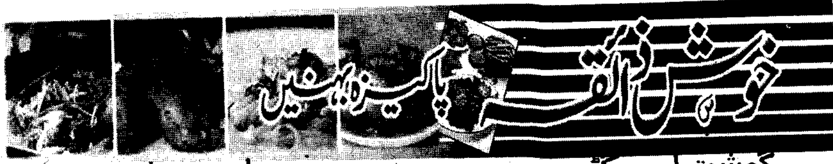
جس کی ہر اِک اینٹ میں جذب ہیں ان کے اپنے ہی آنسو
وائے کہ اب وہ اہلِ دعا ہی اس محراب کو ڈھاتے ہیں

آج کی شب تو کٹ ہی چلی ہے خوابوں اور سرابوں میں
آنے والے دن. اب دیکھیں کیا منظر دکھلاتے ہیں

ساری عمر ہی دل سے اپنا ایسا کچھ برتاؤ رہا
جیسے کھیل میں ہارنے والے بچے کو بہلاتے ہیں

ناممکن کو ممکن امجدؔ اہلِ وفا ہی کر سکتے ہیں
پانی اور ہوا پر دیکھو کیا، کیا نقش بناتے ہیں

کلام: امجد اسلام امجدؔ



گوشت اسپیگٹی

اشیا: گوشت بوٹی، ایک کلو۔ابلے انڈے، چار عدد۔پیاز، ایک عدد۔ مٹر ابلے ہوئے ،دو کپ۔ٹماٹر، ایک عدد۔آلو ابلے ہوئے، دو عدد۔ہری مرچیں، دو عدد۔ گاجر ابلی ہوئی، دو عدد۔نمک ،سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔اسپیگٹی ایک پیکٹ ابال لیں۔

ترکیب: گوشت کو پیاز، ٹماٹر، ہری مرچ، سرخ مرچ اور نمک ڈال کر گلالیں۔ اس کے بعد آئل ڈال کر بھونیں۔گوشت گل جائے تو ایک ڈش میں ایک تہ اسپیگٹی کی ڈالیں۔اس کے اوپر گوشت کی تہہ رکھیں پھر مٹر، گاجریں .... انڈے، آلو کاٹ کر اوپر سجالیں اور پیش کریں۔

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

قیمہ رول

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ بند گوبھی، ایک عدد۔ ٹماٹر، ایک عدد۔لیموں، دو عدد۔ ادرک، ایک چائے کا چمچ۔ کالی مرچ، ایک چائے کا چمچ۔نمک، مرچ، حسب ذائقہ۔ چاول ابلے ہوئے، آدھا کپ۔تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: بند گوبھی کو صاف کر کے نمک ملے پانی میں ثابت ابال لیں پھر کھولے بغیر اسی طرح ڈھکی رہنے دیں۔دوسری دیگچی میں تھوڑا تیل گرم کر کے اس میں ٹماٹر، نمک، مرچ ...... اور قیمہ ڈال کر پکائیں۔ پکنے کے بعد دم دے دیں۔اب اس میں ابلے ہوئے چاول بھی شامل کرلیں۔اور لیموں کا عرق نچوڑ دیں۔ آنچ بہت دھیمی رکھیں۔ گوبھی بھی نکال کر احتیاط سے پتے الگ کریں پھر ہر پتے میں قیمہ، چاول بھر کر رول بنائیں اور رکھتے جائیں۔انڈے میں ڈپ کر کے تل لیں۔ورنہ ہلکی آنچ پر یہ رول دم کر کے بھی بنائے جاسکتے ہیں۔

مرسلہ: شاہ زیب، چھنیاں

مصری لیمن بیف

اشیا: گوشت، ایک کلو، (اندر کٹ) لیموں کا رس، چار کھانے کے چمچ۔نمک، کُٹی لال مرچ۔ حسب ذائقہ۔مسٹرڈ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔لہسن کے جوے، چھ سے آٹھ عدد۔(باریک چوپ کیا ہوا) زیتون کا تیل، ایک چائے کا چمچ۔مارجرین، دو کھانے کے چمچ۔ پارسلے، ایک گٹھی۔(باریک کٹی ہوئی)

ترکیب: گوشت میں لیموں کا رس، نمک، کُٹی لال مرچ، مسٹرڈ پاؤڈر، لہسن اور زیتون کا تیل لگا کر چار گھنٹے کے لیے میرینیٹ کرلیں۔اب ایک دیگچی میں مارجرین کو ہلکا سا پگھلا کر مسالا لگی بوٹیاں ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔گل جائے تو پیش کرتے وقت پارسلے ڈال کر روغنی نان یا گارلک بریڈ کے ساتھ سرو کریں۔

گارلک بریڈ کے لیے:

ایک چوتھائی کپ مکھن میں دو چائے کے چمچ لہسن پیسٹ ملالیں تھوڑا سا پارسلے بھی ڈال دیں۔ اب اس مکھن کو بریڈ سلائس پر لگا کر اوون میں دو منٹ کے لیے گرل کریں۔گارلک بریڈ تیار ہے۔

مرسلہ: فضہ زیدی، بہارہ کہو

افغانی پلاؤ

اشیا: مرغی ،آدھ کلو۔لہسن، ایک چائے کا چمچ۔نمک، آدھا چائے کا چمچ۔ بادام، (کوٹ کر) چوتھائی کپ۔تیز پات، دو عدد۔دہی، چوتھائی کپ۔(مرغی میں نمک اور تیز پتا ڈال کر اور تھوڑا سا ادرک، ایک چائے کا چمچ پانی ڈال کر ابال لیں۔ پیاز، تلی ہوئی ایک کپ۔تیل ،ایک چوتھائی کپ۔چاول، ایک پاؤ۔

ترکیب: تیل گرم کریں۔ پیاز تل لیں آدھی

پیاز نکال لیں اور پھر ابالی ہوئی مرغی، ادرک، لہسن، دہی میں ڈال کر فرائی کریں۔ چاول ابالیں اور بادام کو دو کھانے کے چمچ مکھن میں تل لیں۔ اب پتیلے میں ابلے ہوئے چاول ڈالیں پھر مرغی اور پھر چاول ڈال کر دم پر دو منٹ رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر بادام اور تلی پیاز چھڑک دیں مزیدار افغانی پلاؤ گرم گرم پیش کریں۔

مرسلہ: ماہ نور خان، بہارہ کہو

بیف مسالا رائس

اشیا: پسندے، (ابال لیں کہ گل جائیں) ایک کلو۔ ہری پیاز (سلائس کاٹ لیں) آدھا کپ، مسٹرڈ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ کالی مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ باربی کیو ساس، ایک چائے کا چمچ۔ گاجر، (کیوبز کاٹ لیں) دو عدد۔ بند گوبھی، (چوکور کاٹ لیں) آدھا کپ۔ انڈے، دو عدد۔ باسمتی چاول، آدھا کلو۔ (ابال لیں) ہلدی، ایک چٹکی۔ تیل، آدھا کپ۔ شملہ مرچ، دو عدد۔

ترکیب: دیگچی میں تیل گرم کر کے پسندے ڈال کر ہلکا فرائی کر لیں اور نکال کر پلیٹ میں رکھ لیں۔ اس کے بعد اس میں انڈے پھینٹ کر ڈالیں اور فرائی کر لیں اور نکال لیں۔ اس میں فرائی کیے ہوئے پسندے، گاجر، ہری پیاز، بند گوبھی، شملہ مرچ، ابلے ہوئے چاول۔ کالی مرچ، ہلدی، سرکہ، سویا ساس اور مسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر تھوڑی دیر فرائی کریں اور دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ آخر میں فرائی کیے ہوئے انڈے ڈال دیں۔ مزیدا بیف مسالا رائس تیار ہیں، سلاد اور رائتے کے ساتھ گرم، گرم سرو کریں۔

مرسلہ: نگہت اعوان، سرگودھا

اچار

اچار سب کو پسند ہوتا ہے مزیدار اچار کی ترکیب بتاتی ہوں۔

سرسوں کا تیل۔ دو کلو۔ کچے آم، کیری، آدھا کلو۔ سبز مرچیں، پاؤ۔ کریلے، پاؤ۔ سفید چنے، ابلے ہوئے آدھا پاؤ۔ کلونجی، ایک چھٹانک۔ دھنیا خشک، ایک چھٹانک۔ نمک، مرچ سرخ، حسب ذائقہ، ہلدی، ایک چمچ۔

ترکیب: آم کو کاٹ کر دھوپ میں پھیلا دیں تاکہ پانی خشک ہو جائے۔ سبز مرچیں بیچ میں سے کاٹ کر ان میں نمک بھر کر ایک برتن میں رکھ لیں۔ کلونجی، دھنیا، سفید چنے، سرخ مرچیں، نمک ان سب کو تھوڑے سے تیل میں مکس کر لیں پھر مرتبان یا شیشے کا جار لے کر سب سے نیچے کٹے آم پھر اچاری مسالا جو بنایا ہے تیل میں ڈال کر سبز مرچیں ڈال دیں اور باقی ماندہ سرسوں کا تیل ڈال کر مکس کر لیں، مزیدار اچار تیار ہے۔ دو تین دن دھوپ میں ایئر ٹائٹ جار میں رکھ لیں۔

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ، لاہور

ڈبل کا میٹھا

اشیا: ڈبل روٹی کے سلائسز، چار عدد۔ دودھ، ایک لیٹر۔ چینی، ایک پیالی۔ کھویا، ایک پیالی۔ چھوٹی الائچی، دو سے تین عدد۔ بادام پستے کٹے ہوئے، حسب پسند۔ گھی، حسب ضرورت۔ زردے کا رنگ، ایک ٹی اسپون

ترکیب: ڈبل روٹی کے سلائسز کو چھوٹے چار ٹکڑوں میں کاٹیں اور گھی میں سنہرے فرائی کر لیں۔ دودھ کو ابالنے رکھیں اور ابال آنے پر اس میں رنگ، چینی اور پسی ہوئی الائچی ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ دودھ گاڑھا ہونے پر آ جائے۔ پھر اس میں تلے ہوئے ڈبل روٹی کے سلائس ڈال دیں۔ اسے لکڑی کے چمچ سے چلاتے ہوئے اچھی طرح دودھ خشک ہونے تک پکائیں پھر اس میں چورا کیا ہوا کھویا اور بادام پستے ڈالیں اور چولھے سے اتار لیں۔ مزیدار میٹھا تیار ہے۔

مرسلہ: ہینا عباس، کراچی



بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ جینا......کراچی

سوال ﴿ آدمی کے دل کا میل کچیل اور روح کی گندگی صاف کرنے کا صابن کیوں نہیں بنا؟

جواب ﴿ ارے ہے تو...... درگزر اور خلوص کا ہینڈ واش۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ فلک بنت ندیم......حیدر آباد

سوال ﴿ کاجل لگاتے منہ کیوں کھل جاتا ہے؟

جواب ﴿ اپنی شکل ہونق نظر آنے پر منہ ہی کھلتا ہے۔

☆ ساجدہ ظفر، کمالیہ

سوال ﴿ مجھے میاں کے خراٹوں سے اور انہیں میرے کراٹوں سے ڈر لگتا ہے، ہم میں سے زیادہ بہادر کون ہے؟

جواب ﴿ میاں جی......

سوال ﴿ غلطی کرنا انسان کا کام ہے اور غلطی کر کے دوسروں کے کھاتے میں ڈالنا کس کا کام ہے؟

جواب ﴿ دوسرے انسان کا۔

☆ توقیر ہاشمی......منڈی بہاؤالدین

سوال......میری سالگرہ پر وہ......؟

جواب ﴿ آزردہ تھے......پھر تحفہ دینا پڑے گا۔

سوال ﴿ سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگا دن آ گیا؟

جواب ﴿ بغیر تحفے کے تم بھاگ جگوا لو گی اچھی بات ہے۔

سوال ﴿ میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی انہوں نے......؟

جواب ﴿ بھاؤ کہہ کر ڈرا دیا۔

☆ حسینہ ممتاز خان، اسلام آباد

سوال ﴿ جب مرد دوسری شادی کرتا ہے تو اسے پچھتاوا نہیں ہوتا؟

جواب ﴿ کس بات کا پچھتاوا پہلی کو چھوڑنے کا یا دوسری کرنے کا وضاحت کریں۔

سوال ﴿ زندگی میں ہمیشہ دھوکا ہی کیوں ملا؟

جواب ﴿ تم نے دھوکے کی عینک ہی کیوں لگائی ہوئی ہے، اسے شفاف کپڑے سے صاف کر کے دیکھو......

☆ ایمن رانی......کمالیہ

سوال ﴿ رائٹ لیفٹ اور رائٹ رانگ میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴿ اول الذکر سمتوں کے لیے اور بعد الذکر صحیح، غلط کے لیے، سمجھ آئی۔

سوال ﴿ آدابِ شاہی اور آدابِ غلامی میں سے کون سا کام زیادہ مشکل ہے؟

جواب ﴿ دونوں ہی مشکل ہیں، آدابِ غلامی کے معنی نیازمندی و بندگیِ پروردگار ہو تو بہت ہی اعلیٰ۔

☆ زرینہ مشتاق......منڈی بہاؤالدین

سوال ﴿ کس عمر میں رشتوں کے بجائے فرشتے آنے کا ڈر ہوتا ہے؟

جواب ﴿ فرشتہ آنے کی تو بی بی کوئی عمر نہیں ہے۔

☆ ماہ رخ......لطیف آباد

سوال ﴿ نکاح پر چھواروں کے بجائے بادام کیوں نہیں بانٹے جاتے؟

جواب ﴿ ارے بادام بھرے کھجور بھی بانٹے

جاتے ہیں۔

سوال ﴾ عقل مند کو اشارہ کافی اور بے عقل کو؟

جواب ﴾ دو ہتڑ

سوال ﴾ شیطان اور انسان میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴾ اول الذکر نفس کا پیرو کار......دوسرا اللہ کے احکام کا۔

☆ ذوالنورین......ہری پور ہزارہ

سوال ﴾ محبت میں دولت کی اہمیت کتنی ہے؟

جواب ﴾ وہی جو چائے میں دودھ کی......یاد رہے آج کل سب قہوے کی طرف راغب ہو رہے ہیں، آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

☆ نسرین یاسین......الندیم اسکوائر

سوال ﴾ ساس اور سالی میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴾ اب اتنی تو نادان نہیں ہو کہ رشتے ہی نہیں سمجھو۔

سوال ﴾ جو شخص کسی فرد کا خون کرتا ہے اسے پھانسی کی سزا ملتی ہے اور جو دل کا خون کرے؟

جواب ﴾ اس مظلوم کی آہ قیامت تک پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

سوال ﴾ دنیا میں تین جھوٹ ایسے ہیں جو سب سے زیادہ بولے جاتے ہیں بھلا کون سے؟

جواب ﴾ کہہ دو کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔

گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔

تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔

☆ شازیہ ہاشم میواتی......کھڈیاں خاص ضلع قصور

سوال ﴾ دارالعنکبوت میں دارالوفا کا ایڈریس؟

جواب ﴾ دارالعقل استعمال کیجیے۔ دارالکامرانی کھل جائے گا پھر دارالوفا بھی مل جائے گا۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر

سوال ﴾ میرے میاں کہتے ہیں کہ عورت کو بے وقوف بنانا بہت آسان ہے۔ کیا وہ درست کہتے ہیں؟

جواب ﴾ آپ جیسی سادہ لوح کے لیے تو یہ بات درست ہی ہے۔

سوال ﴾ گرمی سے برا حال ہے لائٹ بھی نہیں ہے، مچھر بھی بہت ستا رہے ہیں کیا کروں؟

جواب ﴾ اس پر بھی شکر خدا ہی کرو۔

☆ ثمینہ کوکب......جہلم

سوال ﴾ آنکھیں پھیرنے والے کو طوطا چشم کہا جاتا ہے، منہ پھیرنے والے کو کیا کہتے ہیں؟

جواب ﴾ فٹے منہ۔

☆ ناعمہ تحریم......کراچی

سوال ﴾ آج کل کے لڑکے، لڑکیوں کو دیکھ کر بال کیوں سنوارنے لگتے ہیں؟

جواب ﴾ سب نے اپنے، اپنے سیلون بنا لیے ہیں تو فرق بتاتے ہیں' میرا اسٹائل سب سے اچھا ہے۔

سوال......زیادہ کھانا صحت کے لیے مضر ہے مگر تقریبات میں لوگ زیادہ کیوں کھاتے ہیں؟

جواب ﴾ ایک ہی وقت تو بیچارے کھا رہے ہوتے ہیں تو کھانے دیجیے۔

☆ رفعت خادم یونس......ملتان

سوال ﴾ میں جب بھی خواب دیکھتی ہوں تو اس میں مجھے گلاب جامن ہی نظر آتے ہیں؟

جواب ﴾ تم نے جتنی گلاب جامنیں چرا کر کھائی ہیں وہ سب نظر آتی ہوں گی۔

سوال ﴾ دل، دریا سمندروں ڈونگے پھر میں اسے کہاں سماؤں؟

جواب ﴾ یہ تو ظرف کی بات ہے سمندر تو کوزے میں بھی سما سکتا ہے۔

☆ جینا......کراچی

سوال ﴾ گئے وقتوں کے زخموں کو بھلانے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

جواب ﴾ صبر کا مرہم اور شکر کا سیرپ پی کر۔

☆ عظمیٰ زہری......اوستہ محمد

سوال ﴾ یہ صبر کس چڑیا کا نام ہے؟

جواب ﴾ وہی جو نادر آباد میں اڑتی ہے۔

☆☆☆



☆نیلوفر خان...... بہارہ کہو

سوال ﴾ باجی واک کے بارے میں بتائیں کہ کس عمر میں کریں اور کتنی کریں۔ اس سے پٹھے تو ہو جاتے ہیں مگر ٹانگوں میں درد ہو جاتا ہے۔

جواب ﴾ پیاری نیلوفر...... آپ نے بہت عام سوال مگر بڑے خاص پیرائے میں پوچھا ہے۔ آج کل ڈاکٹر واک ضرور بتاتے ہیں مگر اس کے بھی کچھ وقت اور اصول ہیں۔ واک سے جسم کے اعضا مضبوط رہتے ہیں اور اندرونی اعضا کو خون میں آکسیجن کی سپلائی بہتر رہتی ہے۔ چالیس سال کی عمر کے بعد واک بہت ضروری ہے۔ دل کے مریض ڈاکٹر کے مشورے کے بعد واک کی رفتار اور وقت تعین کریں۔ مارننگ واک تو ہے ہی بہترین...... سرسبز ماحول اور کھلے میدان میں گہری، گہری سانسیں لینا بہترین ہے۔ آج کل فلیٹ سسٹم کے باعث گھر میں تو زیادہ چہل قدمی ہوتی نہیں۔ نزدیک ترین جگہ جانے کے لیے بھی سواری کا استعمال ہے اسی لیے وزن اور ہڈیوں کے درد کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ اس کے لیے آپ گھر کی چھت پر بھی چہل قدمی کر سکتے ہیں۔ اور کمرے یا لاؤنج میں جہاں ٹہلنے میں گھریلو سامان حائل نہ ہوں وہاں واک کرنے کا وقت متعین کر لیں۔ صبح کے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر یا رات کے کاموں اور کھانے کے ایک گھنٹے بعد واک کریں۔ کم جگہ ہے تو چکر گنتی کر لیں دس سے بیس اور پھر پچاس اس طرح بڑھاتی جائیں۔ یہ عمومی طور پر بتا رہے ہیں اگر کسی کو کوئی خاص بیماری یا تکلیف ہے تو وہ ضرور ڈاکٹر کو دکھائیں۔

☆سعیدہ بانو......لوئر مال، مری

سوال ﴾ باجی آج کل کیلے بھی ہیں اور تربوز بھی، میں نے سنا ہے ان دونوں چیزوں کا بھی ماسک ہوتا ہے آپ طریقہ بتا دیں۔

جواب ﴾ سعیدہ بی بی زیادہ تر پھلوں اور سبزیوں کے ماسک گھریلو طور پر تیار کیے جا سکتے ہیں۔ ہم وقتاً فوقتاً دیتے بھی رہتے ہیں۔ کیلا تو مکمل غذا ہے۔ کیلا کھائیں بھی۔ کیلے کا چھلکا اندرونی طرف سے چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ملیں...... خوشگوار تبدیلی چند دن میں ہی محسوس کریں گی۔ کیلے کو چھیل کر کانٹے کی مدد سے گود (میش) لیں اس میں ایک ٹیبل اسپون خشک دودھ اور چند قطرے لیموں نچوڑ کر پیسٹ سا بنا لیں اور چہرے، گردن اور ہاتھوں پر بھی لگائیں۔ کیلے میں جلد کی تعمیر کے لیے کولاجن ہوتا ہے جو اسے ٹائٹ رکھتا ہے۔ یہ ماسک تین دن فریج میں رکھ کر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ دو ہفتے میں فرق نظر آ جائے گا۔ تربوز کے گودے کو پیس کر اس میں خشک دودھ، کارن فلاور، شہد اور لیموں ملا کر اچھی طرح یکجان کر لیں پھر اسے چہرے پر لگائیں۔ دونوں ماسک بیس سے پچیس منٹ تو لگے رہنے دیں۔ پُرسکون ہو کر لیٹ جائیں اور خوشگوار سوچوں کو ذہن میں لائیں۔ پھر پانی سے دھو لیں۔ چہرہ چمک اٹھے گا۔ اسی طرح کھیرے اور کچے آلو کو پیس کر چہرے پر لگائیں اس میں کچھ اور مت ڈالیں، یہ آنکھوں کے حلقے دور کرے گا۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے......

اکثر لوگوں کو آنکھوں کے گرد حلقوں کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ چہرہ تو صاف ہوتا ہے مگر آنکھوں کے اردگرد رنگ گہرا ہو جاتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ذہنی تھکن، بے خوابی، فکر و پریشانی، کم روشنی میں پڑھنا لکھنا، سیاہ حلقے چہرے کا نکھار کم کر دیتے ہیں۔ اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ گھریلو طور پر کچے آلو اور کھیرے کے قتلے آدھے گھنٹے کے لیے آنکھوں پر رکھیں۔ برف کی ڈلی ململ کے کپڑے میں لپیٹ کر پھیریں۔ دودھ کی بالائی ململ کے کپڑے میں رکھ کر فریزر میں رکھیں اور ایک گھنٹے کے بعد آنکھوں کے گرد پھیریں۔ پانی زیادہ پئیں۔ جب لیٹیں تو کسی بھی موئسچرائزر سے انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کے گرد مساج کریں۔ صبح کے وقت ہریالی کی طرف دیکھیں، آسمان پر نظریں اٹھا کر دیر تک دیکھیں۔ اس کے علاوہ ہیموگلوبن چیک کروائیں اور آئرن یعنی فولاد والی غذا کھائیں۔ جس میں پھلیاں، ہرے پتوں والی سبزیاں، کیلا، سیب، ناشپاتی، بینگن، کلیجی شامل ہیں۔

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

عزیز بہنو! دیکھا گیا ہے کہ بچیوں کی شادیاں روز بروز مسئلہ بن رہی ہیں۔ آج جہاں معاشرہ تعلیم یافتہ ہو رہا ہے وہیں لگتا ہے جہالت بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ ساری پریشانیاں دینِ اسلام کی تعلیمات سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اس لیے آپ سب کی پریشانی دُور کرنے کو خصوصی دعائیں بتائی جا رہی ہیں۔

قابلِ غور

1۔ اگر آپ کی بہنوں اور بیٹیوں کے رشتے نہیں ہو رہے تو آپ ان پر لعن طعن نہ کریں اور نہ ہی ان سے ایسی باتیں کریں کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں یا وہ ذہنی مریضہ بن جائیں، اپنی چہیتی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ ہرگز ایسا سلوک نہیں کریں جن سے انہیں اپنی توہین محسوس ہو۔

ہماری بیٹیاں ہمارے پاس مہمان ہیں ان سے ایسا سلوک ہرگز نہ کریں جن سے ان کو صدمہ ہو، بیٹیاں خود کثرت سے یالطیف کا ورد کیا کریں۔

شادی میں بندش ختم کرنے کے لیے

سورۂ طٰہٰ دن میں ایک مرتبہ لازمی پڑھیں۔ خصوصاً وہ لڑکیاں جن کے رشتوں پر کسی قسم کی بندش ہے۔ انشاءاللہ ان کی شادی اچھی جگہ اور جلد ہو گی۔

جہیز کی وجہ سے شادی میں تاخیر

امیر طبقہ منہ مانگا جہیز دیا کرتا ہے۔ مڈل کلاس گھرانے بھی کسی نہ کسی طرح لڑکیوں کی شادی اپنی اوقات سے بڑھ کر کرتے ہیں۔ مگر اس وقت سب سے زیادہ پریشان لوئر مڈل کلاس اور غریب طبقہ ہے۔ جن کی بچیاں ہر لحاظ سے اچھی ہیں مگر جہیز نہ ہونے کی وجہ سے اپنے گھر میں بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں، ایسی تمام لڑکیاں ان کے والدین بطور روحانی علاج رات سونے سے پہلے 101 مرتبہ سورۂ غاشیہ کی آیت نمبر 88 اول آخر درودِ ابراہیمیؑ گیارہ، گیارہ مرتبہ پڑھ کر یہ دعا کریں۔ کہ ان کے حق میں رشتہ صحیح رہے اور ان کی بیٹیاں شادی کے بعد خوش و خرم رہیں۔

بیٹیوں کی رخصتی

ہمارے ہاں شادی کا معیار جب سے بڑھا لیا گیا ہے لڑکیوں کی شادی ایک مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ ایک تو لڑکیوں کی شادیاں بہ مشکل طے پاتی ہیں اور جب طے ہو جاتی ہے تو رخصتی میں رخنے پڑ جاتے ہیں، اب یہ دور منگنی کا رہا ہی نہیں ہے جیسے ہی شادی کا پیغام قبول کیا جائے فوراً ہی شادی کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے مگر کوئی تیاری کے لیے وقت لیتا ہے تو کوئی ٹال مٹول کرنے کے لیے، بے اعتباری اس قدر بڑھ چکی ہے کہ منگنی کے بعد بھی اکثر گھرانے لڑکے اور لڑکی کی تلاش جاری رکھتے ہیں مگر زیادہ تر برے اثرات لڑکی کے خاندان پر پڑتے ہیں۔ منگنی کے بعد لڑکا اپنی جاب کے لیے پریشان ہے یا وہ باہر ہے وہاں سے آنے کے لیے چھٹی نہیں مل رہی ہے یا اس کی بڑی بہن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اس کی شادی جب تک نہیں ہو جائے وہ اپنی منگیتر کو بھی انتظار کی سولی پر چڑھائے رکھتا ہے ایسی وہ تمام لڑکیاں، جن کا رشتہ طے ہونے کے باوجود ان کی رخصتی میں تاخیر ہو رہی ہے وہ سب لڑکیاں فجر کی نماز کے بعد ایک سو ایک مرتبہ یاوہابُ اول و آخر درود شریف گیارہ، گیارہ مرتبہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کر کے اپنے چہرے پر پھیر لیں اور روزانہ دو نفل حاجت کے پڑھ کر اپنے لیے یہ دعا کریں کہ ان کی شادی خیر و عافیت کے ساتھ جلد سے جلد ہو اور انہیں اپنی زندگی میں حقیقی خوشیاں نصیب ہوں، خیال رہے کہ یہ عمل سورج نکلنے سے قبل کیا جائے کسی روز تاخیر ہو جائے تو یہ عمل نہ کریں وہ لوگ جن کے کاموں میں رکاوٹیں زیادہ آتی ہوں وہ روزانہ کم از کم پانچ تسبیح درود ابراہیمی پڑھنا اپنی عادت بنا لیں۔ پھر دیکھیں اللہ کی رحمتیں اور برکتیں، سبحان اللہ!

لڑکے کی تعلیم کا مسئلہ

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا اپنے سے کم تعلیم یافتہ لڑکی سے بخوشی شادی کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے مگر جب لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی ہیں تو وہ اپنے سے کم تعلیم کے حامل شخص خواہ وہ دیگر خصوصیات میں کتنا ہی اعلیٰ و ارفع ہو...... سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ جو ایک غلط بات ہے...... اور اکثر لڑکیوں کی شادی نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ مجھے اپنی پیاری بہنوں اور بیٹیوں سے یہ کہنا ہے کہ دیندار، نیک، بااخلاق، کماؤ، صحت مند لڑکے کو اگر آپ صرف کم تعلیم کی وجہ سے انکار کرتی ہیں تو اپنے حق میں خود کانٹے بو رہی ہیں۔

شادی میں آسانی

بہت سی بہنوں نے اپنا مسئلہ لکھا ہے کہ رشتے ضرور آتے ہیں مگر کہیں بات نہیں بنتی اس کے لیے کس طرح دعا کی جائے۔ اس کا سیدھا سا جواب یہی ہے کہ نماز فجر یا مغرب کے بعد خضوع وخشوع کے ساتھ دو رکعت نماز حاجت پڑھیں اور اپنی حاجت ذہن میں رکھ کر مندرجہ ذیل دعا پڑھیں...... اور اپنے لیے دعا کرنے کے ساتھ، ساتھ اپنے جیسی تمام لڑکیوں کے لیے بھی دعا ضرور کریں۔

ایک نابینا صحابی حضرت عثمان بن حنیفؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور حاضر ہوئے کہ یا رسول اللہ دعا فرمائیں کہ اللہ میری بینائی لوٹا دے۔

آپ نے انہیں ان مخصوص الفاظ کے ساتھ دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا۔

ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلۂ جلیلہ سے متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمدؐ میں آپ کے توسل سے آپؐ کے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ وہ میری فلاں حاجت (اپنی حاجت کا ذکر کریں) پوری فرمائے۔ اے اللہ تو اپنے نبیؐ کی شفاعت کو میرے حق میں قبول فرما (سنن ترمذی)

مشکلات پر فتح حاصل کرنے کی دعا

ترجمہ: ہر چیز کا علم اللہ تعالیٰ کے احاطہ میں ہے ہم نے اللہ پر بھروسا کیا ہے۔ اے اللہ! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کو فتح دے اور تو بہترین فتح دینے والا ہے۔ (پ۹ سورۂ اعراف، آیت ۸۹)

ہر فرض نماز کے بعد ان آیات کا ورد کریں۔

رشتے کا مسئلہ

آج کل شادی ہونا، شادی کروانا اور شادی طے کرنا شدید ترین مشکل مرحلہ بنتا جا رہا ہے اگر کلام پاک سے رجوعِ قلب کے ساتھ استفادہ کریں تو تمام مشکلات حل ہو سکتی ہیں، پروردگار ہم سب کو قرآن فہمی اور دین فہمی عطا کرے، الٰہی آمین۔

مفہومِ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے کہ ہر نمازِ فریضہ کے بعد دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ نماز شب، تہجد میں دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ اپنے اس شدید مسئلے کے لیے لڑکی، لڑکا خود یا لطیفُ کا ورد کریں اس کے علاوہ عشا کی نماز کے بعد آسمان کے نیچے قبلہ رو کھڑے ہو کر پانچ سو مرتبہ یا مُسبّبَ الاسباب (اے اسباب پیدا کرنے والے یعنی کام بنانے والے) کا ورد کریں۔ انشاء اللہ ہر معاملے میں آسانی ہوگی۔

ہر مسئلے کا حل

والدین کی دعا اولاد کے حق میں ضرور پوری ہوتی ہے۔ اپنی اولاد کے حق میں دعا ہر نماز فریضہ کے بعد ضرور کریں۔ ہر پریشانی سے نجات کے لیے ایک وظیفہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیارے صحابی اور چچازاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرمایا تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم
لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" یہ وظیفہ بغیر گنتی اور وضو سارے گھر کے افراد پڑھتے رہیں...... اور دن میں کسی بھی وقت یا قاضیُ الحاجات یعنی اے حاجات کو پورا کرنے والے ہر نماز فرض کے بعد 111 مرتبہ بھی پڑھ لیا کریں۔ باوضو تو ہر وقت رہنا چاہیے اگر نہ ہو تو بھی پڑھتے رہیں۔

☆☆☆



میل پیدل چلا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Pulsatilla 30,Calc. Carb 30 ایک ماہ تک استعمال کر کے اپنا تمام حال تفصیل سے لکھیں۔

عجیب بیماری

نسرین......کوٹ ادّو

ڈاکٹر صاحب میں پاکیزہ میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میری والدہ کو سانس کی بیماری ہے۔ انہیں یہ بیماری اتنی شدید ہو چکی ہے کہ محض چند قدم چلنے پر ہی سانس پھول جاتی ہے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ کھانسی بھی تقریباً مستقل رہتی ہے اور ساتھ بلغم بھی آتا ہے اور ہر تھوڑے دن بعد بخار اور نزلہ ہونا معمول ہو گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹرز نے کہا کہ ٹی بی کی شکایت ہے اور ٹی بی کا علاج شروع کر دیا۔ چونکہ میری امی کو جوانی میں بھی ٹی بی ہوئی تھی اس لیے دوبارہ ہونے پر دو ماہ تک انجکشن بھی لگے مگر حالت بہتر ہونے کے بجائے مزید بگڑتی گئی۔ مختلف ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تو ڈاکٹرز نے کہا کہ ٹی بی نہیں ہے بلکہ یہ بیماری انہیں پالتو پرندوں سے لگی ہے اور ان کے پھیپھڑے بہت زیادہ متاثر ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے آکسیجن کی کمی ہونے سے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی ہے۔ انہوں نے دوائیاں بھی تجویز کیں اور اب دو سال ہو چکے ہیں۔ ان کی تجویز کردہ ایک دوا Deltacortrill Tablet کے بہت زیادہ سائڈ افیکٹ ہیں جو اب ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ انہیں جسم کے مختلف حصوں میں شدید درد ہوتا ہے اور بخار کے ساتھ بلغمی کھانسی بھی ہوتی ہے اور اکثر کھانسی کا دورہ بھی پڑتا ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ یہ ان کی لاسٹ اسٹیج ہے۔ اب حالیہ رپورٹس میں ان کے دل کا سائز بھی بڑھا ہوا ہے۔ ہم اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں۔ میں اس خط کے ساتھ ان کی تین سال پرانی اور حالیہ رپورٹس کی کاپیاں بھیج رہی ہوں۔ ان رپورٹس کی روشنی میں ہماری رہنمائی کریں۔ اگر ہومیو پیتھک طریقہ علاج سے ان کا علاج ممکن ہے تو پلیز اچھی سی دوائیں ..... تجویز کر دیں۔ پلیز خط کا جواب جلدی دیجئے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ درازیٔ عمر عطا فرمائے آمین۔

جواب: یہ کیس ایسا ہے جس میں ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ مریض کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ مسئلہ ٹی بی، سانس اور دل کا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علاج صحیح نہیں ہوا۔ جب دل کا درد ہو تو Arnica-200 کی ایک خوراک دے دیا کریں۔ Cactus-Ø کے 3-3 قطرے اور Craetegus-Ø کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہی استعمال کریں۔ پتا وغیرہ ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔

چہرے پر نشان

مسز اے آر خان......دوحا

میرا مسئلہ میرے چہرے پر براؤن تل اور Acne کے داغ ہیں۔ میں نے Acne کے لیے کئی بار اینٹی بائیٹک کورس کیے ہیں۔ Acne پہلے سے کافی بہتر ہے۔ اب دانے پورے منہ کے بجائے ٹھوڑی پر نکلتے ہیں اور 4-3 دانے نکلتے ہیں۔ براؤن تل منہ کے علاوہ باقی جسم پر بھی ہیں لیکن منہ پر زیادہ ہیں۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Graphites-30، Sabina-30 اور Thuja-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ چار ماہ تک پئیں۔ اس کے بعد دوبارہ کیفیت بتائیں۔

جوڑوں کی سوزش

مسز کامران......ریاض

میں ہر ماہ پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور صحت کے متعلق شوابے ہومیو کلینک بھی خاص طور پر

پڑھتی ہوں۔ کچھ ماہ پہلے میں نے شوابے ہومیو کلینک میں Osteo Arthritis کے بارے میں پڑھا تو مجھے کچھ حوصلہ ملا اور آپ کی نذر کچھ درخواست کرنے کی ہمت پیدا کی۔ بہت احترام کے ساتھ گزارش ہے کہ میرے شوہر کامران عمر 60 سال ہے، جنوری 2015ء میں گرنے کی وجہ سے کمر میں کچھ چوٹ آئی تھی۔ پہلے تو بالکل چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔ ایلو پیتھک اور ہومیو پیتھک دونوں طرح کے علاج کرائے لیکن کچھ زیادہ افاقہ نہیں ہوا۔ Stick کے ساتھ تھوڑا چل لیتے ہیں۔ Osteo Arthritis پر جب مضمون پڑھا تو احساس ہوا کہ کافی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ جب چلتے ہیں تو کسی ٹانگ کو جھٹکا سا لگتا ہے اور وہ قدم (چند سیکنڈ) نہیں اٹھا پاتے۔ ایکسرے رپورٹ کی فوٹو کاپی بھی ساتھ میں بھیج رہی ہوں۔ اگر کچھ اور ٹیسٹ کروانے ہوں تو برائے مہربانی بتا دیجیے۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Arnica-1M کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر پلائیں ہر پندرہ دن بعد اور اس کے ایک دن بعد Calc carb-30 اور Rhustox-30 کے 5-5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

ہڈیوں کی کمزوری

مہر یار بانو......اختر کالونی کراچی

میں ریٹائرڈ آفیسر ہوں۔ ایک دفعہ گر گئی تھی۔ کولہے کی ہڈی میں ذرا سا بال آ گیا۔ آپریشن کے بعد بالکل ٹھیک نہیں ہوا اور میں اسٹک لے کر یا واکر سے چلتی ہوں۔ اس وجہ سے زیادہ آرام کرتی ہوں، رسالے پڑھتی ہوں، قرآن شریف پڑھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ گھرداری سے فرصت ہے۔ اب بہوئیں سنبھالتی ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر میں گھوں گھوں ہوتا رہتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ زیادہ تر صبح کے وقت محسوس ہوتا ہے۔ ایلو پیتھک ڈاکٹر کا علاج کیا۔ انہوں



نے Serc، Stomatil دی مگر بالکل ختم نہیں ہوا۔ پچھلے سال رمضان میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ان ہی دواؤں سے ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب ہومیو پیتھک کی کوئی دوا بتائیں۔ بعض وقت بہت بے چینی ہوتی ہے۔ کیا زیادہ نہ چلنے کی وجہ سے ہے یا گردن پر بار پڑ جاتا ہے؟ ویسے اللہ کا شکر ہے ٹھیک رہتی ہوں۔

جواب: Cervical X-Ray Ap+Lateral View کرائیں۔ بہتر ہوتا کہ آ کر چیک کرائیں۔ بلڈ پریشر اور شوگر چیک کرائیں۔ Arnica-cm کی ایک خوراک لیں اس کے بعد Calc carb-30، Rhustox-30 اور Gelsemium-30 کے 5-5 قطرے ہر 3 گھنٹے بعد آدھے کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں۔

پرانا بخار

مسز آفتاب......حافظ آباد

میں پہلی بار ایک مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ میری بھانجی کو تین چار سال پہلے ٹائیفائیڈ ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا سارا جسم پھول گیا ہے۔ اس کا پیٹ بھی کافی بڑھ گیا ہے۔ پیٹ کے نچلے حصے میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ اسے بخار بھی رہتا ہے، دن کو اتر جاتا ہے اور رات میں بہت تیز ہو جاتا ہے۔ بہت سے ڈاکٹروں سے علاج کروایا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔

جواب: بچی کو پانی زیادہ سے زیادہ پلائیں اور ہلکی سادہ غذا دیں۔ فروٹ زیادہ استعمال کرائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حالت بتائیں۔

Baptisia-30، Merc.Cor-30 اور Pulsatilla-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں آدھے گلاس پانی میں ڈال کر۔

معدے کا مسئلہ

محمد رمضان خان......کوٹ اذو

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 3 سال سے ہے۔ میں نے اس کا بہت علاج کرایا ہے۔ کوئی ڈاکٹر کہتا تھا کہ گردے کا مسئلہ ہے اور کوئی کہتا تھا کہ فلاں چیز کا مسئلہ ہے لیکن اس کا کوئی مناسب علاج نہیں ہوا ہے۔ اب ایک ڈاکٹر نے کہا ہے کہ معدے کا السر ہے۔ الٹرا ساؤنڈ رپورٹ منسلک کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔

جواب: محمد رمضان آپ نے جو تفصیل بتائی ہے۔ اس میں اپنا حال نہیں بتایا کہ آپ کو ہوتا کیا ہے؟ لہٰذا اپنے حال کی تفصیل بیان کریں۔ الٹرا ساؤنڈ میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ دوا آپ کے حال کے مطابق تجویز کی جائے گی اور قارئین بھی اس کو نوٹ کر لیں۔

موٹاپا/ ہارمونز کا مسئلہ

نمرہ ندیم............لاہور

ماہنامہ پاکیزہ میں ہومیو کلینک کے ذریعے آپ جو دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں وہ حد درجہ قابلِ تعریف ہے۔ اللہ آپ کو اجرِ عظیم عطا کرے۔ میں بہت امید لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ میں بچپن سے ہی موٹی تھی اور پھر آہستہ، آہستہ وزن بڑھنے لگا۔ بچپن میں کبھی پرہیز کیا کبھی نہیں پھر وزن بڑھتے، بڑھتے 120 کلو ہو گیا۔ تین سال سے مجھے لیکوریا کی شکایت ہے اور ماہانہ نظام کا بھی مسئلہ ہے۔ میری ٹھوڑی پر بہت موٹے بال اُگ آئے ہیں۔ اور چہرے کا رنگ بھی متاثر ہوا ہے۔ جسم پر خارش بھی رہتی ہے جس سے جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ نسوانی حسن میں کمی ہے۔ میں نے اب تک صرف ڈائٹ کر کے وزن کم کرنے کی کوشش کی ہے کوئی دوا استعمال نہیں کی۔ آپ پر اعتماد کرتے ہوئے التجا کرتی ہوں کہ کوئی اچھی سی دوا بتا دیں جس سے میرا وزن کم ہونے لگے۔ مجھے ان بیماریوں سے نجات حاصل ہو۔

جواب:۔ ہمارے ہاں سب سے بڑا مسئلہ عورتوں کی صحت کا ہے اس پر توجہ نہیں دی جاتی یا تو ان کے مسائل کو مسائل نہیں سمجھا جاتا یا پھر وہ شرما شرمی میں اپنی صحت کے مسائل سے آگاہ بھی نہیں کرتیں اور بیماری میل کی بیل بن جاتی ہے۔ بچے ہمیں گول مٹول (فٹ بال کی طرح) اچھے لگتے ہیں۔ اس لیے عموماً مائیں بچوں کو موٹا کرنے کے لیے مختلف غذائیں اور ادویات کھلاتی ہیں کہ بچہ موٹا ہو جائے۔ اس جدید زمانے میں اب ہم کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ عورت کی صحت پوری قوم کی صحت ہے۔ وزن، ماہواری، لیکوریا، چہرے پر بال، نسوانی حسن جیسے مسائل کے لیے سب سے پہلے متوازن غذا کا استعمال کریں۔ دودھ، دہی، پنیر، انڈے (دیسی ابلا ہوا) گوشت، سبزیاں، پھل کا استعمال کریں۔ سادہ کھانا ہو مرغن نہ ہو۔ بازاری یا بازای ٹائپ کے نہ ہوں۔ ورزش کریں کم از کم ایک گھنٹا یا اس سے زیادہ لیکن اسٹیمنا دیکھ کر۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں اور 3 ماہ بعد حال بتائیں۔ Calc Carb 200 ہر ہفتہ ایک خوراک 7 قطرے آدھا کپ پانی میں۔ اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی دوا نہ کھائیں۔ Phytolacca e baccisQ, Fucus Ves Q کے 15 قطرے ایک کپ پانی میں 3 مرتبہ Thyreoidinum 30 کے 7,7 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

☆☆☆